فیض العارفین حضرت علامہ شاہ غلام آسی پیا حسنی

رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری نور اللہ مرقدہ

ربیع الاول - ربیع الآخر ۱۴۲۸ھ

مدیر اعلیٰ	خوشتر نورانی
مشیر اعلیٰ	قمر احمد اشرفی مصباحی
مدیر	ذیشان احمد مصباحی
معاون مدیر	رفعت رضا نوری
سرکولیشن منیجر	محمد عارف فیضی
اشتہار منیجر	غلام قادر فیضی
مارکٹنگ منیجر	محمد اسرائیل فیضی
تزئین کار	کوثر سمنانی
تزئین کار	منظر سبحانی
آپریٹر	محمد نعیم
کاتب	عبد المجید فیضی
کمپوزنگ	جام نور کمپیوٹرز

عام شمارہ :	15/=
زر سالانہ :	170/=
قیمت پاکستان میں :	20/=
بیرون ملک (ہوائی ڈاک)	$30 امریکی ڈالر
	£20 پونڈ
لائف ممبر شپ (اندرون ملک)	5000/=
لائف ممبر شپ (بیرون ملک)	$300 امریکی ڈالر

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ

ملت کا ترجمان
ماہنامہ جام نور دہلی

۴۲۲ مٹیا محل جامع مسجد دہلی
Tele Fax: 011 23281418

MILLAT KA TARJAMAN
JAAM-E-NOOR Monthly
422 Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi - 6
Ph : (Off) 011- 23281418, 9313783691
E-mail: editor@jaamenoor.com
E-mail: info@jaamenoor.com
website: www.jaamenoor.com

قانونی آگاہی: کسی بھی قسم کی قانونی اور عدالتی چارہ جوئی صرف دہلی کی عدالت میں قابل سماعت ہوگی (ادارہ)

ڈرافٹ MILLAT KA TARJAMAN
پر صرف **JAAM-E-NOOR** Monthly لکھیں

پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر غلام ربانی نے اسٹار آفسیٹ پرنٹنگ پریس A/2229 احاطہ جن بی، رود گران، لال کنواں، دہلی سے طبع کرا کر آفس "ماہنامہ ملت کا ترجمان جام نور" 422 مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی -۶ سے شائع کیا

انتساب

ان مجتہدین امت کے نام جنہوں نے اصول شریعت وضع کر کے امت کے لیے بے شمار آسانیاں پیدا کر دیں

ان بلند قامت علما کے نام جنہوں نے ائمہ اربعہ کی تقلید پر اتفاق کر کے شیرازہ ملت کو متحد رکھا

اور

ان محققین کے نام جو نئے حالات میں شریعت کے انطباق کے لیے مخلصانہ کوشاں ہیں

خوشتر نورانی

مشمولات

اداریہ

تحریک وہابیت: جس نے امت کی مذہبی وسیاسی وحدت کا خاتمہ کر ڈالا	خوشتر نورانی	5

باب (۱)

قیاس واجتہاد کی حقیقت وضرورت	قاضی فضل احمد مصباحی	12
اجتہاد و مجتہدین کے مختلف طبقات	مفتی آل مصطفیٰ مصباحی	19
عہد رسالت میں اجتہاد کا وجود	مفتی محمود اختر قادری	25
فقہ واصول کی تدوین کی طرف اہل علم کا التفات	مفتی ارشاد احمد ساحل سہسرامی	31
تقلید فقہی: حقیقت، نوعیت اور ضرورت	مولانا یٰسین اختر مصباحی	42
تقلید: امت کا اجماعی موقف	ڈاکٹر امجد رضا امجد	47
تقلید کی مخالفت: ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ	مولانا سلمان رضا ازہری	53
اجتہاد سے تقلید تک	ذیشان احمد مصباحی	61
تقلید: شوق یا ضرورت؟	پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد	71

باب (۲)

انٹرویو

اجتہاد و تقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات

مولانا محمد احمد مصباحی	جماعت اہل سنت	78
مولانا عبد الوہاب خلجی	اہل حدیث	78
مولانا وحید الدین خان	اسلامی مرکز	78
مولانا عبد الحمید نعمانی	دیوبندی جماعت	78

تحریری مباحثہ

اجتہاد و تقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں کا دلچسپ تحریری مباحثہ

مفتی عبد المنان اعظمی	جماعت اہل سنت	97
مولانا ظل الرحمٰن تیمی	جماعت اہل حدیث	102

مولانا وارث مظہری	دیوبندی جماعت	104
مولانا شفیع مونس	جماعت اسلامی	106
مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی (پاکستان)	جماعت اہل سنت	107

مذاکرہ

شام کے نامور عالم دین شیخ سعید رمضان البوطی کی ایک غیر مقلد عالم سے علمی گفتگو 109

ترجمہ: مولانا نعمان احمد ازہری

اظہار خیالات

تقلید واجتہاد پر علما و دانشوران کی گرانقدر آراء 114

باب (۳)

امام اعظم ابوحنیفہ کا علمی مقام اور اجتہادی خدمات	مولانا نفیس احمد مصباحی	124
امام مالک کی علمی واجتہادی خدمات	مولانا ذکی اللہ مصباحی	137
امام شافعی کی علمی واجتہادی خدمات	ڈاکٹر عبدالحکیم ازہری	145
امام احمد بن حنبل کی علمی واجتہادی خدمات	مولانا انوار احمد بغدادی	148

باب (۴)

امام اعظم کے مخالفین اور ان کے الزامات کا تحقیقی جائزہ	مولانا منظر الاسلام ازہری	161
امام اعظم اور عمل بالحدیث	مولانا سید الحق محمد عاصم قادری	172
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نظریہ تقلید واجتہاد	ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی	179
ائمہ حدیث اور تقلید	مولانا کوثر امام قادری	190
علمائے تفسیر اور تقلید	مولانا رفعت رضا نوری	195
مولانا دلشاد احمد قادری	مسانید امام اعظم	209
امام اعظم کے مخالفین کے الزامات پر ایک نظر	مولانا ملک الظفر سہسرامی	215

باب (۵)

غیر مقلدین کی بنیاد کتاب وسنت یا ائمہ مجتہدین سے مخاصمت؟	مولانا فیضان المصطفیٰ قادری	226
سعودی حکومت کے نظریات اور عملی کردار	وقار احمد ندوی	235
شہید ناز کی تربت کہاں ہے؟	علامہ کامل سہسرامی قدس سرہٗ	247
تحریک وہابیت: ہندوستانی تناظر میں	مولانا سید سیف الدین اصدق	250

وہابیائی تحریک

جس نے امت کی مذہبی و سیاسی وحدت کا خاتمہ کر ڈالا

پہلا منظر:- ریاض سعودیہ عربیہ میں ایک برطانوی فیشن اسٹور ہے، جس کا نام "Harvey Nichols" ہے، اس کے پارٹنر ایک سعودی پرنس ہیں، اس اسٹور کے سلیز پرموٹر کی حیثیت سے ہندوستان سے سید زبیر احمد ملیگ ارض حرم کی زیارت کی آرزو لیے گئے اور کئی سال وہاں مقیم رہے، وہاں رہ کر سعودی معاشرے کی بدکرداری، عریانیت، فحاشی، جنسی بے راہ روی، مغربی آقاؤں کی سیاسی غلامی، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، عدم مساوات اور مادّہ پرستی کے جو مناظر دیکھے، وہ ان کے لیے ناقابل یقین تھے- شاید اسی لیے انہوں نے اپنے مجروح جذبات کے شعوری مشاہدے میں دوسرے مسلمانوں کو شامل کر کے ان کی آنکھوں سے مملکتِ اسلامیہ کے مقدس پردے کو ہٹانے کے لیے ناقابلِ تردید حوالوں پر مشتمل ایک نہایت عبرتناک آپ بیتی بنام 'یادِ حرم' لکھی، جس کا یہ اقتباس خاص طور پر ہمارے اداریے کا حاصل ہے:

''سعودی مملکت کو اسلامی مملکت کہنا سراسر اسلام کا مذاق اڑانا ہے اور اسلام کے ساتھ ناانصافی ہے، یہ حکومت فی الحقیقت یزیدی حکومت ہے...... انہی نام نہاد مسلم حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی، نفس پرستی اور اقتدار کی ہوس کی وجہ سے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا، اسرائیل کا ناپاک وجود عمل میں آیا، یہود و نصاریٰ کی فوجیں وصیتِ رسول ﷺ کو پامال کرتی ہوئی جزیرۃ العرب میں داخل ہوئیں- لاکھوں مسلمان شہید کیے جا رہے ہیں، فلسطینی، افغانی و عراقی عوام بالخصوص اور یوروپی ملتِ اسلامیہ بالعموم ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے- جب پاسبانِ حرم ہی ہر جگہ ذلیل و رسوا کیے جا رہے ہوں تو حرم کی حرمت و تقدس کیا معنی رکھتا ہے؟''- (ص:۱۱،۱۲)

اگر اس اقتباس کو پڑھ کر آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ اس اقتباس سے ہمارے عنوان کو کیا مناسبت؟ تو میں آپ کو یاد دلا دوں کہ اس مملکتِ اسلامی کی سیاسی زمام اسی ابن سعود اور مذہبی زمام اسی شیخ نجد کی مطلق العنان نسلوں کے ہاتھوں میں ہے جنہوں نے آج سے تقریباً ڈھائی سو برس قبل خالص توحیدی اور اسلامی مملکت کی تشکیل کی غرض سے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے کر ریگزارِ عرب میں ایک طوفان برپا کیا تھا، توسل و استعانت، تعظیم انبیاء و اولیاء اور تقلید کو شرک و کفر کہہ کر لاکھوں مسلمانوں اور علمائے اسلام کا خون ناحق بہایا تھا اور اساطین امت کی قبروں پر بے دردی سے بلڈوزر چلائے تھے، اسی کے نتیجہ میں آج ایک ایسی مملکتِ اسلامی کا ظہور ہوا ہے جہاں ہر پل اسلامی روح کو تڑپا تڑپا کر مارا جا رہا ہے..... ع

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

اٹھارہویں صدی میں آل شیخ اور آل سعود کے سیاسی و مذہبی معاہدے نے جزیرۂ عرب میں جو آگ لگائی تھی اگر وہ وہیں سرد ہو گئی ہوتی تو اسے سیاسی انارکی اور مذہبی دہشت گردی کی تاریخ کا ایک بدترین باب سمجھ کر بند کر دیا جاتا، لیکن اس آگ نے آج پورے عالم اسلام کو مذہبی و سیاسی سطح پر اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے- حکومت انگلشیہ نے جزیرۂ عرب سے ترکی فوجوں کے انخلاء اور خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے لیے آل سعود سے معاہدہ کر کے جو اپنی اطاعت اور محکومی لکھوائی تھی وہ ہمیشہ کے لیے عالم اسلام کا مقدر بن گئی اور پھر جس اسلامی ریاست نے بھی مغربی حکومتوں کی محکومی سے انکار کیا کشت و خون سے لالہ زار کر دی گئی اور اس کے اقتصادی اور معاشی ذرائع کی کمر توڑ دی گئی- عالم اسلام کے خلاف مغربی طاقتوں کے ظلم و بربریت کے لیے آج بھی سعودی عرب اپنی وفاداری اور غلامی کا ثبوت پیش کر رہا ہے اور انہیں اسلامی ممالک پر حملے کے لیے بنیاد Base فراہم کر رہا ہے، افغانستان، عراق، فلسطین، چیچنیا اور البانیہ اس کی زندہ مثالیں ہیں- دوسری طرف شیخ نجد نے توحید کے نام پر مسلمانوں کو ایمان کا جو تنگ دائرہ دیا تھا، اس ایمانی دائرے میں مٹھی بھر وہی لوگ آتے تھے جو لیلائے نجد کے فیضان سے موحد ہو چکے تھے، بقیہ دنیا کے وہ کروڑوں مسلمان اسلام سے باہر نکل کر کفر و شرک کے صنم کدہ میں آ گئے، جو عہد رسالت اور عہد صحابہ سے چلے آ رہے موروثی عقائد اور رسوم و روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور اساطین امت کے اجماعی موقف

☆k_noorani@yahoo.com

''تقلید'' پر گامزن رہتے ہوئے کتاب وسنت کی پاسداری کر رہے تھے- مختصر یہ کہ مغرب سے آل سعود کی سیاسی معاہدہ غلامی نے جہاں اسلامی ریاستوں کے اتحاد کو کمزور کر کے اپاہج اور بے دست و پا بنا دیا ہے وہیں آل شیخ کی نظریاتی تحریک نے ملت میں کئی فرقوں کو جنم دیا، جو فرقے ایک دوسرے سے پیدا ہوئے اور مذہبی تشدد میں ہر دوسرا پہلے والے کو مات دیتا گیا، انھی فرقوں میں آج عالم عرب میں سلفیہ (وہابیہ) اور برصغیر میں اہل حدیث (غیر مقلدین) کے نام سے معروف ہیں- یہ بھی وقت کا ایک مضحکہ خیز المیہ ہے کہ اپنی عددی قوت سے خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بھی انھیں ملت اسلامیہ کی نمائندگی کا دعویٰ ہے اور انتشار و افتراق کی ایک مسلسل، معلوم اور مربوط تاریخ رکھتے ہوئے بھی یہ اتحاد ملت پر نعرہ زن ہیں- حالاں کہ ملت کے زخمی وجود کو کرید کرید کر آج انھوں نے ایک ایسے ناسور کی شکل دے دی ہے جو مندمل ہونے کا نام نہیں لیتا-

دوسرا منظر:- اٹھارہویں صدی میں دو غیر مقلدین ابن سیف نجدی اور محمد حیات سندھی کی تعلیمی و فکری تربیت کے نتیجے میں شیخ نجد کی متشددانہ تحریک ابن تیمیہ کے فکری منہج پر شروع ہوئی، جس منہج نے چودھویں صدی عیسوی میں پہلی بار اسلام کے آٹھ سو سالہ متوارث منہج میں سیندھ لگا کر اہل اسلام میں غیر مقلدیت کا بالکل نیا اور غیر فطری شوشہ چھوڑا، ابن تیمیہ کا نظریہ اس وقت اس لیے پھل پھول نہ سکا کہ اس کے ہاتھ میں صرف دوات و قلم تھے، لیکن اس نظریے کو جب ابن عبدالوہاب نے اپنایا تو اس کے ایک ہاتھ میں بے لگام قلم تھا تو دوسرے ہاتھ میں ابن سعود کی دی ہوئی ننگی تلوار، جس نے جزیرۂ عرب میں انتشار و افتراق اور ظلم و عدوان کی ایک نئی تاریخ رقم کی- شیخ نجد نے جزیرۂ عرب میں جو آگ لگائی تھی اس کی لپٹیں خلیجی ممالک تک تو پہنچ گئی تھیں، لیکن برصغیر ابھی محفوظ تھا، مگر ہندوستان کے کچھ لوگوں نے شیخ نجد کے فکری بطن سے جنم لینے والے معروف غیر مقلد عالم قاضی شوکانی کی شاگردی اختیار کی، اس تحریک کی آنچ برصغیر تک پہنچ گئی- یہ وہ دور تھا جب تحریک آزادی ہند اپنے پورے شباب پر تھی اور اسلامیان ہند متحد ہو کر برطانوی حکومت کے انخلاء کا منصوبہ بنا رہے تھے- اٹھارہویں صدی میں آل سعود اور آل شیخ نے اقتدار کی ہوس میں ترکی کی اسلامی حکومت کے خلاف انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی طاقتوں سے معاہدہ کر کے عرب کے خوش گوار ماحول میں زہر گھول دیا اور برصغیر میں اسی تحریک کے پروردہ برطانوی حکومت سے ساز باز کر کے برصغیر کی اجتماعی تحریک آزادی کو ناکام کرنے کی کوششیں کیں، یہاں تک کہ غیر مقلد عالم محمد حسین بٹالوی نے برطانوی سامراج کے خلاف علمائے ہند کے دیے گئے فتویٰ جہاد کو حرام قرار دیا اور اس مسئلے پر اپنے برطانوی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے **الاقتصاد فی مسائل الجہاد** نام کی کتاب تصنیف کی- برصغیر کے مسلمانوں میں افتراق و انتشار کی یہ پہلی باضابطہ کوشش تھی- عرب میں ظلم و عدوان کا بدترین کردار اور برصغیر کے سواد اعظم کے خلاف اس تحریک کے چند علماء کی غداری نے ان کے لیے ہندوستان میں عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، اسی وجہ سے انھوں نے حکومت انگلشیہ سے اپیل کی کہ ان کا نام بدل کر وہابی سے ''اہل حدیث'' رجسٹرڈ کرا لیا جائے- (دیکھیے اشاعۃ السنۃ: شمارہ ۲ رجلد نمبر ۱۱) بعد میں انہوں نے اپنے آپ کو اہل حدیث اور سلفی کہلا کر دنیا کو یہ تأثر دینا چاہا کہ ان کا شجرۂ شریعت عہد رسالت سے مربوط ہے، حالاں کہ پہلے انہوں نے اپنے آپ کو موحد کہا، پھر محمدی، پھر غیر مقلد، پھر وہابی اور پھر اہل حدیث اور سلفی کہلانے لگے، اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں ایسی کوئی بھی مثال نہیں پیش کی جا سکتی کہ کسی مذہبی جماعت کو اپنی شناخت رجسٹرڈ کرانے کے لئے کسی عیسائی اور فرنگی حکومت کی مہر کی ضرورت پڑی ہو اور اس نے اتنے نام اور رنگ و روپ بدلے ہوں-

تیسرا منظر:- یہ حقیقت واضح ہے کہ اہل حدیث کا قبلۂ فکر شیخ نجد ہیں اور قبلہ نما شاہ اسمٰعیل اور اہل دیوبند کے قبلۂ حاجات بھی شیخ نجد ہیں اور قبلہ نما شاہ اسمٰعیل، یہ دونوں مکاتب فکر ایک عرصے تک ہم خیال، ہم پیالہ اور ہم نوالہ رہے اور ان دونوں پر ہی فیضان آل سعود کی بارش ہوتی رہی، جس کے نتیجے میں ان کے ادارے، مدارس، تنظیمیں اور افراد راتوں رات آسمان سے باتیں کرنے لگے- بات وہاں سے خراب ہوئی جب اہل دیوبند پر آل سعود کی نوازشات کے دروازے کچھ زیادہ ہی کشادہ ہونے لگے تو ہند و پاک کے اہل حدیث نے اس دروازے کو بند کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب عربی میں لکھی، جس کا نام **الدیوبندیۃ عقائدھا و فکرھا** رکھا اور جزیرۂ عرب میں اپنے قبلۂ فکر کی بارگاہ میں پیش کر دیا- اس کتاب میں اہل حدیث نے اس راز سربستہ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ان کے عقائد بھی وہی ہیں جو بریلویوں کے ہیں، یہ حنفی مقلد ہیں اور اپنے بزرگوں سے استعانت اور استغاثہ کے قائل بھی، اس طرح یہ دور رخے عقائد کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں- بات غلط بھی نہیں تھی، پھر کیا تھا اہل دیوبند پر انعام و اکرام کی بارش روک دی گئی اور حلقۂ دیوبند قحط سالی سے گزرنے لگا- گہری نیند میں سوتے شخص کے تاریک کمرے میں اچانک تیز روشنی کر دی جائے تو

وہ سمجھتا ہے کہ آفتاب نکل آیا ہے، اس انتشار، اختلال اور ہواس باختگی کے وقت اسے، بقول رشید احمد صدیقی ''دیو میں پری کا حسن و جمال معلوم ہوتا ہے، عجوز ہفتاد سالہ پر نازنین شانزدہ سالہ کا دھوکہ ہوتا ہے اور دیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگتا ہے''۔ اہل دیوبند کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، برسوں پہلے سواد اعظم سے کٹ کر اپنی الگ راہ بنانے کی پاداش میں انہیں عومی برشتگی کا جو سامنا رہا، اگر آل سعود نے سہارا نہ دیا ہوتا تو انہیں اپناوجود بھی سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ جہاں عوامی چندے کے لالے پڑے ہوں وہاں ریال اور ڈالر کی بارش ہونے لگے تو پھر ظاہر ہے کہ آل شیخ کا تشدد بھی سحاب رحمت اور آل سعود کا ظلم و جبر بھی ناصحانہ اور پدرانہ شفقت کے سوا اور کیا لگیں گے؟ اب حال یہ ہے کہ جماعت اہل حدیث اور اہل دیوبند سوتن کے رول میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں اور ان کے آپسی بیان، رد اور جواب الجواب پر مشتمل درجنوں کتابیں دستیاب ہیں، ان کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے آپسی اختلافات کی بنیاد مادی منفعت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دونوں کے لٹریچر کے مطالعے کے بعد آپ پر بھی یہ واضح ہو جائے گا کہ دونوں ہی آل شیخ اور آل سعود پر اپنی مسلکی دعویداری کی بڑھ چڑھ کر دلیل پیش کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو ان سے الگ کرنے کی کوشش میں سرگرم ہیں، جب کہ دونوں کی جہت قبلہ اور مرکز عقیدت ایک ہی ہے۔ حسب ذیل تین اقتباسات ملاحظہ ہوں:

الديوبندية عقائدها و فكرها میں اہل دیوبند کے بارے میں اہل حدیث لکھتے ہیں:

''یہ علمائے دیوبند بریلویوں سے خائف رہتے ہیں، بلکہ ان کے سامنے کانپتے رہتے ہیں اور محمد بن عبدالوہاب کو گالیاں دیتے ہیں اور انھیں برا بھلا کہتے ہیں''۔

اسی ''الدیوبندیہ'' کے جواب میں دیوبند کے ایک پرانے فارغ ابوبکر غازی پوری نے وقفة مع اللا مذهبية في شبه القارة الهندية لکھی، اس کتاب کی تقریظ میں نورالدین نوراللہ اعظمی قاسمی کہتے ہیں کہ:

''آج کل اس ٹولے (اہل حدیث) کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جماعت سلفیہ میں ان کا انضمام ہو جائے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کے بزرگوں نے اس جماعت کے لئے بطور شعار جو عقائد وضع کیے ہیں وہ اس آرزو کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ بن رہے ہیں، مگر یہ آرزو اس قدر زرخیز اور گہربار ہے کہ اس کے لئے تقیہ بھی کرنا پڑے تو سودا سستا ہے''۔ (ص:۱۴)

ایک جگہ اور فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عربوں کو جو زبردست اقتصادی خوشحالیوں کا خزانہ مرحمت فرمایا ہے اور اس خزانے کے ساتھ دعوت اسلام اور عقیدۂ توحید کی نشر و اشاعت کے سچے جذبے سے جوش مارتا ہوا دل ان کے سینوں میں رکھا ہے، مزید جود و سخا کے محبوب وصف سے بھی حصۂ وافر عطا کیا ہے''۔ (ص:۱۶)

قارئین ان تینوں اقتباسات کے بین السطور سے میرے دعوے کی تصدیق کریں گے۔

چوتھا منظر: ۔نجدی تحریک کا اگر سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو بات واضح ہو جائے گی کہ جن مسائل کو لے کر امت میں فتنہ کھڑا کیا گیا، قتل و غارت گری کی گئی اور مسلمانوں کو خانوں میں بانٹا گیا ان میں اکثر اصولی نہیں، فروعی تھے، خواہ وہ توسل و استعانت ہو یا پھر دوسرے فقہی مسائل۔ یہ تمام مسائل خیر القرون سے امت مسلمہ کے معمول رہے، جن پر علماء کا اجماع ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''سب سے بہتر زمانہ میرا ہے، پھر اس کے بعد کا زمانہ، پھر اس کے بعد کا زمانہ''۔ انہی زمانوں میں ائمۂ اربعہ پیدا ہوئے اور پردہ فرما گئے، گویا خیر القرون میں پیدا ہوئے اور خیر القرون میں وصال فرمائے اور ان چاروں کے ماخذ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس ہی تھے جو عہد رسالت اور عہد صحابہ میں بھی تھے، جن کے اصول و ضوابط پر اعتبار کرتے ہوئے دنیا کے کروڑوں مسلمان صدیوں سے ان کی تقلید اور علماء اتباع کرتے رہے، لیکن شیخ نجد اور ان کے متبعین کے نزدیک ایسا کرنے والے چودہ سو سال کے سارے مسلمان (جن میں کبار محدثین و مفسرین بھی ہیں، اولیائے صالحین بھی ہیں اور غوث و اقطاب بھی) کافر ہیں، جو فوت ہو گئے وہ کفر پر مرے اور جو زندہ ہیں وہ واجب القتل ہیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آج بھی دنیا کے نناوے فیصد مسلمان ائمۂ اربعہ میں کسی نہ کسی کے مقلد و متبع ہیں، جو ان کے عقیدے اور تحریک کے مطابق کفر و شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں اور واجب القتل ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب سارے مسلمان ہی واجب القتل ٹھہرے تو پھر یہ بات بات پر کس امت کے اتحاد کے لیے نعرہ زن رہتے ہیں؟ برسوں

پہلے اس تحریک نے امت میں جو انتشار وافتراق کا بیج بویا تھا آج اس کے نتیجے میں ملت اسلامیہ ہر شعبہ میں زوال سے دو چار ہے، عالم اسلام کی وحدت ٹوٹ چکی ہے، مشرق وسطی کے مسلمان زخموں سے چور چور ہیں، مسلمانوں کی اقتصادی قوت ورلڈ بینکوں میں گروی رکھی ہوئی ہے اور علوم نبویہ میں تحریف کا سلسلہ جاری ہے تا کہ روح محمدی مسلمانوں کے جسموں سے نکال دی جائے- ایسے میں آج وقت تھا کہ فروعی مسائل پر ایک دوسرے کے جیب وگریباں پر ہاتھ ڈال کر اپنی مردانہ قوت آزمانے کی بجائے ملت کے امہات المسائل پر مسلمان اپنی نگاہ مرکوز رکھیں، لیکن برسوں پہلے جس بھیانک اور نا قابل تلافی جرم کا ارتکاب کر کے انھوں نے ملت کو انحطاط سے دوچار کیا تھا، اسے آج بھی یہ دہرانے پر مصر ہیں اور احیاے سنت کے نام پر رفع یدین، قرأت خلف الامام، آمین بالجہر، آٹھ رکعت تراویح، ننگے سر نماز اور طلاق کے عدد و معدود جیسے فروعی مسائل پر مرنے مارنے کو تیار ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ دین کی متعصبانہ اور متشددانہ تعبیر کرنے والے یہ جنگجو کبار محدثین، مفسرین اور ائمہ مجتہدین کا علمی قد ناپنے کے لئے بھی ہمیشہ تیار رہتے ہیں- پوری دنیا بالخصوص برصغیر کا گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ اور شہر شہران کی بتائی ہوئی دین کی سیاسی اور مادی تعبیر میں اس قدر الجھ گیا ہے کہ انہیں اسلام کا چودہ سو سالہ علمی وفکری سرمایہ سمندر کا حباب لگنے لگا ہے، جس کا نہ کوئی وزن ہے، نہ جہت ہے اور نہ اس میں کوئی استقرار، ایسے میں آج ان سے یہ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا امت کو وحدت کی ایک لڑی میں پرونے کا یہی محمدی منہج ہے؟ اور کیا دوسری صدی ہجری سے آج تک ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کے علاوہ اسلام کی وہ تمام قدآور شخصیتیں دین کی صحیح تشریح نہ کرسکیں جن کی صدیوں سے امت تقلید واتباع کرتی چلی آرہی ہے؟

پردہ گرتا ہے:- یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح ہے کہ ہر شخص اپنے مسلک، عقائد ونظریات کی پیروی اور تبلیغ، حق اور صحیح سمجھ کر کرتا ہے کہ ان عقائد میں کسی طرح کا تضاد اور منافقت نہیں ہے، مگر آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہابیائی تحریک یا بلفظ دیگر اہل حدیثیائی تحریک نے جن امور کو زوال امت سے تعبیر کر کے قتل وغارت گری اور تکفیری مہم چلائی تھی اور آج بھی وہ اس تحریک میں سرگرم عمل ہیں، انہیں امور کے وہ خود بھی بڑے سچے پکے عامل ہیں، بس فرق ہے تو اتنا کہ دنیا کے کروڑوں مسلمان خیر القرون کے ائمہ مجتہدین کی تقلید واتباع کرتے ہیں اور یہ آٹھویں صدی ہجری کے بعد کے تخت گیر علماء، مثلاً ابن تیمیہ، ابن قیم اور قاضی شوکانی کے پکے مقلد ہیں جنہوں نے سواد اعظم سے یکسر ہٹ کر دین کی ایک نئی تعبیر پیش کی- استعانت کے یہ قائل ہیں، استغاثہ یہ کرتے ہیں اور توسل ان کا عمل ہے- مشتے نمونہ از خروارے، چند مثالیں حاضر ہیں:

تقلید کو شرک سے تعبیر کرنے والے یہ اہل حدیث بہت سے مسائل میں ابن تیمیہ کو اپنا امام تسلیم کرتے ہوئے ان کی پیروی کرتے ہیں، مثال کے طور پر شدِ رحال، آٹھ رکعت تراویح اور تین طلاق کے مسائل کو لے لیجیے- عہد رسالت سے لے کر آٹھ سو سالوں تک علماء، حدیث شد رحال کا مفہوم (جس میں مسجد نبوی، مسجد حرام اور مسجد قدس کے سفر کے لیے کہا گیا ہے) یہی سمجھتے رہے کہ ان تینوں مسجدوں کی زیارت کی تاکید کی گئی ہے، لیکن ان مقامات کی تاکید کا مطلب دوسرے مقامات کی زیارت کی نفی نہیں ہے، مگر آٹھ سو سالوں کے بعد ابن تیمیہ نے اس حدیث کا مفہوم یہ نکالا کہ مزارات ومقابر اور آثار کی زیارت حرام بلکہ شرک وکفر ہے- ابن تیمیہ کے اس نظریے کی تقلید اور تبلیغ آج تک غیر مقلدین اہل حدیث کر رہے ہیں- اب ان سے کون پوچھے کہ تقلید جامد کا بدترین جرم کر کے جو شرک وہ کر رہے ہیں، ایسے میں انھیں کس مقتل میں لے جا کر قربان کیا جائے؟ اسی طرح حدیث عائشہ، جس میں آٹھ رکعت صلوۃ اللیل کا ذکر ہے، عہد رسالت سے لے کر آج تک صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور کبار علماء نے یہی سمجھا کہ اس سے مراد تہجد کی رکعتیں ہیں، لیکن آٹھ سو سال کے بعد ابن تیمیہ نے اسے تراویح کی رکعت مان کر امت مسلمہ کے سامنے پہلی بار اس حدیث کا بالکل اجنبی مفہوم پیش کیا- اس کے بعد سے لے کر آج تک غیر مقلدین اہل حدیث آٹھ رکعت تراویح پر نہ صرف عامل ہیں بلکہ بیس رکعت پڑھنے پر لڑنے مارنے پر آمادہ ہیں- تقلید کا اتنا جنون تو ہمارے موروثی مقلدین کے یہاں بھی نہیں ہے کہ وہ امام اعظم کے کسی قول کو ترک کرنے پر اپنی آستینیں چڑھالیں- اسی طرح وقوع طلاق میں عدد کا مسئلہ ہے، عہد صحابہ سے آٹھ سو سالوں تک خیر القرون کے تمام اجلہ محدثین، مفسرین، شارحین اور بعد کے ادوار کے علماء تین طلاق کو تین ہی مانتے رہے، لیکن آٹھ سو سالوں کے بعد ابن تیمیہ نے تین طلاقوں کو تین ماننے سے انکار کرتے ہوئے تین پر ایک طلاق کا شوشہ چھوڑا- اس کے بعد سے آج تک تمام غیر مقلدین اسی نظریے کی تقلید سختی سے کرتے چلے آرہے ہیں، شاید اسی پس منظر میں ایک مشہور غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں نے کہا تھا کہ:

''ہمارے اہل حدیث بھائیوں نے ابن تیمیہ، ابن قیم اور شاہ ولی اللہ اور مولوی اسمٰعیل صاحب کو دین کا ٹھیکدار سمجھ رکھا ہے جہاں کسی مسلمان نے ان بزرگوں کے خلاف کسی قول کو اختیار کیا بس اس کے پیچھے پڑ گئے اور برا بھلا کہنے لگے- بھائیو! ذرا غور تو کرو اور انصاف کرو جب تم نے ابوحنیفہ، شافعی کی تقلید چھوڑی تو ابن تیمیہ اور ابن قیم اور شوکانی جو ان سے بہت متاخر ہیں ان کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟''-

(حیات وحید الزماں، بحوالہ تقلید، ص:۱۵)

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

اللہ کے نبیوں اور ولیوں سے توسل، ان سے مدد چاہنا اور ان کی بارگاہ میں استغاثہ کرنا صدیوں سے علماء، صوفیہ اور امت اسلامیہ کا معمول تھا اور ہے، لیکن اس معمول کو ابن تیمیہ، ابن عبدالوہاب نجدی اور ان کے پیروکار شرک وکفر کہتے ہیں اور اسی استعانت وتوسل کو لے کر سعودیہ میں شیخ نجد نے ابن سعود کی مدد سے تمام کبار صحابہ، محدثین، امہات المومنین اور اولیائے کاملین کی قبروں پر بے رحمی سے بلڈوزر چلا کر برابر کر دیا، جب کہ درونِ خانہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے اماموں سے توسل بھی کرتے ہیں، استغاثہ بھی کرتے ہیں اور استعانت بھی- مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خاں اپنے آقاؤں کو پکارتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں:

''قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے　　ابن قیم مددے قاضی شوکاں مددے

حیرت ہے کہ اللہ کے مقرب نبیوں اور ولیوں سے استغاثہ کیا جائے تو وہ شرک ٹھہرے اور ماضی قریب کی متنازع ترین شخصیتوں سے یہی غیر مقلدین استعانت چاہیں تو وہ عین اسلام ہو جائے؟ خدایا! یہ کیسی دوپیاگی اور دورخی شریعت ہے؟

بات کچھ نہیں بس اتنی سی ہے کہ سوادِ اعظم نے اپنی طبیعتوں کو مزاجِ محمدی کے مطابق ڈھال کر ائمۂ مجتہدین کے بتائے ہوئے خطوط پر قرآن وسنت کی پاسداری کرتے رہے اور ان لوگوں نے اپنے مزاج وطبیعت کے مطابق دین کو ڈھال کر دنیا کے سامنے اس کا ایک ایسا نیا جغرافیہ پیش کیا جس کی پیچیدگیوں میں الجھ کر آج تک وہ خود اپنا نشانِ منزل تلاش نہ کر سکے ہیں اور شاید یہی بنام ''توحید'' ان کے سیاسی اور مادی ڈرامے کا ڈراپ سین ہے-

---

اہل حدیث/ غیر مقلدین کی اسی دوپیاگی کو بے نقاب کرنے اور اہل سنت کو بیدار کرنے کے لیے ہم نے یہ خصوصی شمارہ نکالنے کا ارادہ کیا -اس سلسلے میں اس سعودی لٹریچر نے مزید مہمیز کا کام کیا جو عوام وخواص اور طلبہ واساتذہ میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے اور اس میں بیک وقت انتشار امت پر مرثیہ خوانی بھی ہوتی ہے، اتحاد کی آرزو بھی ہوتی ہے اور ائمۂ مجتہدین کی توہین وتذلیل اور عامۃ المسلمین کی تکفیر بھی- اس کے لیے جب ہم نے اپنی ٹیم سے مشورہ کیا تو سب نے یہ کہا کہ اپنی پوری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارا اسلوب معروضی ہو اور ہمارا مقصد مخالفین کی زباں بندی کی بجائے اصل مسئلے کی علمی توضیح وتفہیم- خصوصی شمارے کو متوازن بنانے کے لیے موافقین ومخالفین کی آراء اور انٹرویوز بھی شامل کیے گئے تاکہ قارئین کے سامنے بحث کا ہر پہلو آجائے، اس کے باوجود اگر بعض حضرات اس نیک کوشش کو افتراق وانتشار کا نام دیں تو ہم انہیں معذور سمجھیں گے، کیونکہ ایسے لوگ ریت پر اتحادِ امت کا محل تعمیر کر رہے ہیں-ھدانا اللہ وایاھم

اس خصوصی شمارہ میں ہمارے کرم فرماؤں نے قدم قدم پر ہماری معاونت کی- تعاون کی نوعیتیں مختلف تھیں، کسی نے اس خصوصی شمارے میں مضمون لکھ کر تعاون کیا، کسی نے نہ لکھنے کا عذر پیش کر کے تعاون کیا، کسی نے اشتہارات دیکر تعاون کیا، کسی نے واہ واہ کر کے تعاون کیا، کسی نے ناگواری کا اظہار کر کے تعاون کیا، بہرحال ہم ان تمام حضرات کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں- جی چاہتا ہے کہ میں اپنے عزیز دوست مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری، مولانا قمر احمد اشرفی، مولانا سجاد عالم مصباحی، مولانا ذیشان احمد مصباحی، مولانا ملک الظفر سہسرامی اور مولانا منظر الاسلام ازہری کا بھی خصوصی شکریہ ادا کروں، لیکن میں ایسا کروں گا نہیں، کیونکہ شکریہ ان کا ادا کیا جاتا ہے جو مہمان ہوتے ہیں اور یہ لوگ تو میزبان ہیں- آخر میں، میں مولانا انیس اشرفی، مولانا امجد علی قادری، مولانا ذوالفقار برکاتی، مولانا علاء الدین رضوی اور ڈاکٹر غلام جابر مصباحی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ممبئی کی سرزمین پر اس نمبر کی اشاعت کے لیے خصوصی توجہ فرمائی- ☆☆

باب

۱

تفہیم و تعبیر

قاضی فضل احمد مصباحی ☆

قیاس و اجتہاد کی حقیقت و ضرورت

یہ امر مسلم ہے کہ ہر حکومت کیلئے قوانین وضوابط کا مجموعہ ضرور ہوتا ہے جس کے ماتحت حکومت کا نظم ونسق برقرار رہتا ہے۔لیکن سر دست ہم روئے زمین پر انسانی حکومت کی نہیں ، خدائی حکومت کی بات کرتے ہیں اور خدا کی زمین پر سلامتی کا راستہ صرف اسلام ہے، یہ وہ دین ہے جو دنیا سے آقا اور غلام، گورے اور کالے، عربی اور عجمی کی تمیز مٹاتا ہے اور عدل وانصاف کے تقاضے صرف اس آئین کی بالا دستی سے پورے ہوسکتے ہیں جو طاقتور اور کمزور، ادنی اور اعلی، امیر اور غریب کا امتیاز مٹا سکتا ہے۔اسلامی حکومت اور دین الٰہی کے قوانین کا پہلا مجموعہ قرآن عظیم ہے اور اس کی تفصیلات کا دوسرا مجموعہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

قرآن کریم اور احادیث کریمہ کی روشنی میں جو مسائل مسلمانوں کی راہ عمل معین کرنے کیلئے مرتب ہوئے ہیں انہی مسائل کے مجموعہ کا نام فقہ ہے، فقہ میں ان کے علاوہ ایسے مسائل شرعیہ بھی ملیں گے جو قرآن کریم اور احادیث کریمہ میں صراحۃً موجود نہیں ، بلکہ وہ یا تو اجماع سے ثابت ہیں یا پھر قیاس واجتہاد کے ذریعہ اخذ کیے گئے ہیں۔بایں ہمہ اجماع اور قیاس کی بنیاد قرآن کریم کے شہ پاروں اور احادیث کریمہ کے ذخائر میں ضرور ملے گی۔

الغرض اسلامی حکومت اور نظام مملکت کا سارا دارومدار کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجماع امت اور قیاس پر ہے۔

یوں تو فقہ اسلامی کا اصل ماخذ قرآن کریم وسنت اور اجماع ہی ہیں کہ یہی مثبت حکم ہیں اور قیاس کو بھی ضمناً ماخذ میں شمار کرلیا گیا ہے، گو کہ یہ مثبت حکم نہیں مظہر حکم ضرور ہے۔اس وقت چونکہ قیاس واجتہاد ہی ہماری فکری وقلمی جولانگاہ ہے، اس لیے ذیل میں ہم صرف قیاس واجتہاد کی حقیقت وضرورت کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

قیاس واجتہاد کی حقیقت:۔سطور بالا میں اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے کہ فقہ اسلامی میں قیاس کی حیثیت چوتھے درجہ کی ہے۔قیاس کا معنی لغت میں اندازہ کے ہیں، چنانچہ عرب میں کہا جاتا ہے "قس النعل بالنعل" نعل کا نعل کے ساتھ اندازہ کرو۔اور اصطلاح شرع میں فرع کو اصل کے ساتھ حکم وعلت میں برابر کردینے کو قیاس کہا جاتا ہے۔اصل کو مقیس علیہ اور فرع کو مقیس اور جو چیز قدرے مشترک طور پر دونوں میں پائی جاتی ہے اسے علت مشترکہ اور جو اثر مرتب ہوتا ہے اسے حکم کہتے ہیں۔

قیاس واجتہاد میں کوئی فرق نہیں بلکہ یہ ایک ہی شئی کے دو نام ہیں۔جیسا کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کی مشہور کتاب "الرسالہ" میں ہے۔

"قال فما القیاس ؟ اھو الاجتہاد؟ ام ھما مفترقان؟ قلت ھما اسمان لمعنی واحد"

(الرسالۃ، الجزو الثالث، القیاس)

مشہور حنفی فقیہ امام سرخسی کے نزدیک قیاس کو مجازاً اجتہاد کہہ دیا جاتا ہے۔ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"ویسمی ذلک اجتہاداً مجازاً ایضا لان ببذل المجھود یحصل ھذا المقصود۔"

(اصول السرخی، الجزء الثانی ص ۱۴۳)

قیاس کی حجیت:۔صحابہ کرام، تابعین عظام، ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین نے ہر زمانہ میں قیاس پر عمل کیا ہے اور غیر منصوص مسائل میں قیاس واجتہاد ہی کے ذریعہ حکم شرع کو ظاہر وواضح کیا ہے، البتہ اصحاب ظواہر کے نزدیک قیاس اس قابل نہیں کہ اس کے ذریعہ منصوص کا حکم غیر منصوص تک متعدی کیا جائے۔اور جہاں تک حکم شرع کا مسئلہ ہے تو قیاس کو اس میں کوئی دخل نہیں، بلکہ اس باب میں قیاس پر عمل باکل باطل ہے۔اصحاب ظواہر میں سب سے پہلا شخص جس نے صحابہ وتابعین اور مجتہدین صالحین کے خلاف قول کیا ابراہیم نظام ہے۔اس شخص نے سلف صالحین کو محض اس لیے طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا کہ سلف صالحین قیاس سے استدلال کرتے تھے اور اسے شرعی دلیل جانتے تھے۔پھر بغداد کے بعض متکلمین نے ابراہیم نظام کے قول کا اتباع کیا لیکن ان لوگوں نے

سلف صالحین پر تبرا بازی سے اجتناب کرتے ہوئے یہ کہا کہ صحابہ کرام نے قیاس کے ذریعہ جو احکام اور فیصلے اخذ فرمائے وہ در حقیقت احکام نہیں، بلکہ دو فریق کے درمیان صلح ومصالحت کے لیے اپنی رائے کا اظہار ہے، جس کا حکم شرع سے کوئی علاقہ نہیں۔لہذا اصحابہ کرام کے اس اظہار رائے کو قیاس کی حجت ہونے کی دلیل بنانا درست نہیں۔

اس کے بعد اک ایسا شخص آیا جو شریعت کے مسائل سے بالکل غافل، بلکہ علم کی زبان میں کہیں تو متجاہل، جس کا نام داؤد اصبہانی ہے، اس نے اس کی زحمت ہی گوارہ نہ کی کہ علمائے ماسبق نے کیا کہا ہے اور ان کی مراد کیا ہے، یکلخت قیاس پر عمل کو باطل قرار دیا اور کہہ دیا کہ قیاس حجت ہے ہی نہیں اور نہ احکام شرع میں اس پر عمل جائز ہے۔بعد کے زمانے میں جن لوگوں نے داؤد اصبہانی کا اتباع کیا انہیں اصحاب ظواہر کہا جاتا ہے۔ان میں سے بعض نے ذرا ہمت جٹائی اور افترا پردازی اور بہتان طرازی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے مذہب کو حضرت قتادہ مسروق وابن سیرین رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے اجلۂ تابعین سے منسوب کردیا، العیاذ باللہ۔اس کی پوری تفصیل اصول السرخسی اور فقہ اہل العراق وحدیثہم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نظام کے افکار وخیالات:۔ابراہیم نظام مذہبا معتزلی تھا، حضور کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف براہین کے اقوال نظام کو بہت پسند تھے، لیکن تلوار کے خوف سے ان کے اظہار کی جسارت نہ کرتا تھا، یہاں تک کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات مثلاً انشقاق قمر، کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، انگلیوں کے درمیان سے چشمہ کا بہہ نکلنا، ان سب کا انکار اس لئے کیا کہ انکار نبوت کی راہ ہموار ہوجائے۔اس کی نشوونما اچھے ماحول میں نہ ہوئی اور نشست وبرخاست بھی کچھ اچھے لوگوں کے ساتھ نہ تھی۔جس کا اثر اس کے ذہن ودماغ پر پڑا اور بہت سے بنیادی عقاید کا انکار کردیا۔(الفرق بین الفرق ص ۷۹/۸۰)

نظام کے تعلق سے علماء کی رائے ۔منکرین قیاس کے موسس اول ابراہیم نظام باوجود یکہ مذہبا معتزلی تھا، اس کے گندے عقائد کی وجہ سے اکثر معتزلیوں نے بھی اس کی تکفیر کی۔رہے اہل سنت وجماعت کے وہ علماء ومشائخ جنہوں نے نظام کی تکفیر کی وہ حد شمار سے باہر ہیں۔کتاب ''فقہ اہل العراق وحدیثہم'' کے محشی ''الفرق بین الفرق'' کے ص ۸۰ تا ۹۱ سے اخذ کرتے ہوئے بطور اختصار لکھتے ہیں۔

اکثر معتزلہ نظام کی تکفیر پر متفق ہیں، جاحظ وغیرہ معتزلی بجز قدریہ نے اس کا اتباع کیا۔لیکن انہوں نے بھی بعض گمراہیوں میں اس کی مخالفت کی اور کچھ نے مزید گمراہیوں کا اضافہ کردیا۔اکثر مشائخ معتزلہ نے اس کی تکفیر کی۔انہی میں اس کے ماموں ابوالہذیل ہیں، جنہوں نے اپنی مشہور کتاب ''الرد علی النظام'' میں اس کی تکفیر کی۔جبائی نے بھی متعدد مسائل میں اس کی تکفیر کی، جس کی تفصیل ابومنصور بغدادی نے لکھی ہے۔نظام کے رد میں اس کی ایک کتاب بھی ہے۔نظام کی تکفیر کرنے والوں میں اسکافی کا نام بھی ہے جس نے نظام کی تکفیر میں کتاب لکھی اور اس کے بیشتر مسائل میں اس کی تکفیر کی، رہی وہ کتابیں جو نظام کی تکفیر میں اہل سنت نے لکھیں تو ان کی تعداد خدا ہی کو معلوم۔شیخ ابوالحسن اشعری کی نظام کی تکفیر میں تین کتابیں ہیں۔قلانسی کے متعدد کتب ورسائل ہیں اور قاضی ابوبکر باقلانی کی ایک ضخیم کتاب ہے، جس میں نظام کے متعدد اصول کا رد کیا گیا ہے۔''

حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمہ نے بھی ''المستصفی'' ج۲، ص ۲۳۶/۲۴۷، مبحث قیاس کے اوائل میں ''نظام معتزلی'' کی خباثت کا ذکر کیا ہے۔

مثبتین قیاس کے دلائل:۔جمہور علماء جو قیاس کو حجت اور دلیل شرع مانتے ہیں وہ اپنے موقف پر تین قسم کے دلائل قائم کرتے ہیں۔(۱) کتاب (۲) سنت (۳) دلیل معقول۔ان تینوں قسم کے دلائل کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ان کے کلام میں پایا جاتا ہے، یہاں ان سب کا احاطہ مضمون کی طوالت کا باعث ہوگا، اس لئے ہم یہاں قدر معتدبہ حصہ کے بیان ہی پر اکتفا کریں گے۔

کتاب:(۱) اللہ تعالی کا ارشاد ہے''فاعتبروا یااولی الابصار'' (آل عمران) اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو۔

اس آیت میں ''اعتبار'' کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اعتبار کا معنی شئی کے حکم کو اس کی نظیر کی طرف لوٹا دینا ہے، یہی وجہ ہے کہ جس اصل سے اس کے نظائر کو ملا دیا جاتا ہے اسے عبرت کہتے ہیں۔چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے۔

''ان فی ذلک لعبرة لاولی الابصار''

اعتبار کے اسی مفہوم کا نام قیاس ہے، تو ثابت ہوگیا کہ اس آیت میں قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "ولو ردوہ الی الرسول واولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم۔"

اس آیت میں استنباط کا معنی قیاس کے ذریعہ نص سے علت کا استخراج ہے، اب یہ استخراج علت یا تو اس لئے ہوگا کہ نص کے حکم اس کے نظائر تک متعدی کر دیا جائے اور یہی عین قیاس ہے یا اس لئے کہ اس سے طمانیت قلب حاصل ہو جائے، اور طمانیت قلبی اسی وقت حاصل ہوگی جب اس علت اور لم پر انسان مطلع ہو جائے جو نص میں حکم کی بنیاد ہے۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت طاہرہ کو آنکھوں کا نور اور شرح صدور بنایا۔ ارشاد ہے۔ "افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ۔" (الزمر)

جس طرح آنکھ موجود چیز کو بینائی سے دیکھتی ہے، ٹھیک اسی طرح قلب غیر موجود چیز کو غور وفکر سے دیکھتا اور ادارک کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو غور وفکر سے کام نہیں لیتا اس کے بارے میں اللہ عز وجل ارشاد فرماتا ہے۔ "فانھا لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔" (الحج)

پھر آنکھ سے دیکھ کر کسی چیز کے بارے میں آدمی کو جو اطمینان حاصل ہوتا ہے، خبر کے ذریعہ سن کر اتنا اطمینان نہیں ہوتا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لیس المخبر کالمعاینۃ۔" (خبر مشاہدہ کی طرح نہیں ہے۔)

یہی معاملہ رویت قلب کا بھی ہے کہ جب معنی منصوص میں غور وفکر کرنے کے بعد اس پر اطلاع پا جائے تو مکمل انشراح صدر اور طمانیت قلب حاصل ہو جاتا ہے، تو اس غور وفکر سے روکنا اور یہ کہنا کہ نص میں حکم کی علت اور سبب کی تلاش وجستجو میں نہ پڑو، ایک طرح سے اس انشراح صدر اور طمانیت قلب کا حاصل کرنے کے ذریعہ کو ختم کر دینا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد "لعلمہ الذین الآیۃ" سے ثابت ہے۔

شبہ: ۔ استخراج واستنباط بلفظ دیگر قیاس واجتہاد موجب علم نہیں ہے، بلکہ مجتہد مخطی بھی ہوتا ہے اور مصیب بھی، پھر یہ کہنا کیسے درست ہوگا کہ مجتہد معانی نصوص میں غور وفکر کر کے علم واطمینان حاصل کر لیتا ہے۔

ازالہ شبہ: ۔ یہ صحیح ہے کہ قیاس موجب علم نہیں ہے مگر اجتہاد کے ذریعہ بظاہر ایسا علم حاصل ہو جاتا ہے جو اطمینان قلب کا باعث ہو، اگرچہ اجتہاد سے اس بات کا یقینی علم حاصل نہیں ہوتا کہ یہی حق ہے۔ یعنی قیاس سے من حیث الظاہر علم حاصل ہوتا ہے اور بس۔ چنانچہ اصول سرخسی ۲، ص ۱۲۹ میں ہے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ یہ درست کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ قیاس کو تو خود آپ بھی موجب علم نہیں مانتے؟ مجتہد کبھی خطا پر ہوتا ہے اور کبھی درستگی پر؟ تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اجتہاد سے مجتہد کو بظاہر ایسا علم ضرور حاصل ہو جاتا ہے، جس سے اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اجتہاد کے ذریعہ یہ نہیں جانتا کہ قطعی طور پر حق کیا ہے؟ اس کی نظیر خدا کے اس فرمان میں موجود ہے۔ فان علمتموھن مؤمنات ۔ کیوں کہ اس میں ظاہری علم ہی مراد ہے۔

الرسالۃ، الجزء الثالث کے بحث قیاس میں ہے۔

"وعلم اجتھاد بقیاس علی طلب اصابۃ فذلک حق فی الظاھر عند قایسہ لا عند العامۃ من العلماء ولا یعلم الغیب فیہ الا اللہ۔"

سنت: ۔ (۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بحالت صوم عورت کے بوسہ کے تعلق سے حکم شرعی دریافت فرمایا تو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا۔

"ارایت لو تمضمضت بماء ثم مججتہ اکان یضرک" یعنی بھلا بتاؤ تو سہی کہ اگر تم پانی سے کلی کرو پھر اسے پھینک دو تو کیا یہ تمہارے روزہ کو نقصان پہنچائے گا؟

اس حدیث شریف میں قیاس کی تعلیم دی گئی ہے کہ منہ میں پانی داخل کرنے سے پینے کا راستہ کھل جاتا ہے، باوصف اس کے پینا نہیں پایا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح روزہ کی حالت میں بوسہ لینے سے قضاء شہوت کے راستے کھل جاتے ہیں، لیکن صرف اسی سے قضاء شہوۃ نہیں ہو جاتی ہے۔ تو جس طرح منہ میں پانی داخل کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا جب تک کہ حلق کے نیچے نہ اترے بوسہ لینے سے بھی روزہ فاسد نہ ہوگا۔ جب تک انزال نہ ہو جائے۔

(۲) قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے والد بہت ضعیف ہیں، سواری پر سفر نہیں کر سکتے ہیں، ان پر حج فرض ہو گیا ہے، کیا میں ان کی طرف سے حج ادا کروں؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا۔

"ارایت لو کان علی ابیک دین اکنت تقضینہ؟

فقالت نعم قال فدين الله احق -" یعنی اگر تیرے باپ پر قرض ہوتا تو تم اسے ادا کرتی ؟ کہا ہاں !فرمایا تو اللہ کا دین ادائیگی کے زیادہ لائق ومناسب ہے-

یعنی جو حج ان کے ذمہ باقی ہے وہ دین ہے، لہٰذا اس کی طرف سے حج بدل ادا کرو- اس حدیث میں قیاس کی تعلیم اور رائے پر عمل کرنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے-

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا-

"الھرة ليست بنجسة لانها من الطوافين عليكم والطوافات-"

یعنی بلی کا جوٹھا ناپاک نہیں ہے، یہ تو تمہارے گھروں میں چکر لگانے والے جانوروں میں سے ہے-

اس حدیث میں بھی قیاس کی تعلیم ہے کہ وہ وصف جو تخفیف حکم میں موثر ہے وہ طواف ہے اور عموم بلویٰ اور ضرورت کی وجہ سے ان جیسے جانوروں کے جوٹھے کو ناپاک نہیں کہا جائے گا-

(۴) جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف مبلغ اور قاضی بنا کر بھیج رہے تھے، آپ نے حضرت معاذ سے فرمایا! اے معاذ کس چیز سے فیصلہ کروگے؟ حضرت معاذ نے جواب دیا اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن کریم سے، حضور نے ارشاد فرمایا اگر تم نے کتاب اللہ میں اس مسئلہ کا حل نہ پایا تو کیا کروگے؟ حضرت معاذ نے عرض کیا اس وقت رسول اللہ کی سنت سے مسئلہ کا حل نکالوں گا، پھر حضور نے پوچھا اگر تم نے رسول کی سنت میں بھی اس کا حل نہ پایا تو کیا کروگے؟ حضرت معاذ نے فرمایا اس وقت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کے قول کو درست قرار دیتے ہوئے فرمایا-

"الحمد لله الذي وفق رسول رسوله لما يرضى به رسوله-" (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق بخشی جس سے اس کے رسول راضی ہیں-)

دلیل معقول - قیاس کے حجت ہونے پر عقلی دلیل یہ ہے کہ "اعتبار" یعنی امثال میں غور وفکر بنص قرآن واجب ہے- یعنی کفر، تکذیب اور عداوت رسول کی وجہ سے قتل وجلا وطنی پر مجبور ہوئے، تو اب اس میں غور وفکر کا حکم ہوا کہ اے بصیرت والو تم اپنے حالات کے درپے رہو تو تمہیں بھی قتل وجلا وطنی میں مبتلا ہونا پڑے گا، جس طرح وہ کفار مبتلا ہوئے اور قیاس شرعی اسی تامل کی نظیر ہے کہ حکم عقوبت کو مثبت عداوت کی وجہ سے ان کفار معہودین سے ہر بصیرت والے کے حال کی طرف منتقل کردیا جائے- جس طرح مقیس علیہ سے حکم کو مقیس تک متعدی کردیا جاتا ہے- تو اس طور پر قیاس کی حجیت دلیل معقول سے ثابت ہوگئی-

منکرین قیاس کے دلائل - جو لوگ قیاس کے منکر ہیں اور اسے حجت شرعیہ نہیں مانتے وہ بھی اپنے موقف پر تین طرح سے دلائل قائم کرتے ہیں- (۱) کتاب (۲) سنت (۳) دلیل معقول-

کتاب: -(۱) اللہ عزوجل کا ارشاد ہے-

"اولم يكفهم انا انزلنا عليك الكتب يتلىٰ عليهم" (العنكبوت)

(کیا انہیں کافی نہیں ہے کہ ہم نے ان پر ایسی کتاب اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے-)

اب اگر کسی مسئلہ میں قیاس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ کا حکم وہاں کافی نہیں ہے، اور یہ فرمان الٰہی کے خلاف ہے-

(۲) ارشاد الٰہی ہے-

"ونزلنا عليك الكتاب تبيانا لكل شئ-" (النحل)

یعنی ہم نے تم پر ایسی کتاب اتاری جس میں ہر چیز کا روشن بیان ہے-

نیز ارشاد ہے: "ما فرطنا في الكتب من شئ-" (الانعام)

نیز ارشاد ہے: "ولا رطب ولا يابس الا في كتب مبين-" (الانعام)

ان آیتوں میں اس بات کا واضح بیان ہے کہ تمام چیزیں کتاب اللہ میں اشارۃ دلالۃ اقتضاء نصاً موجود ہیں- اور قیاس کی طرف مراجعت کا معنی یہ ہے کہ وہ حکم کتاب اللہ میں موجود نہیں- حالانکہ یہ بات اللہ عزوجل کے ارشاد کے واضح خلاف ہے-

(۳) ارشاد الٰہی ہے-

"يايها الذين آمنوا لاتقدموا بين يدى الله ورسوله-" (الحجرات)

نیز ارشاد ہے: "ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الكافرون-" (المائدة)

ان آیتوں کا مفاد یہ ہے کہ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو، اور جس نے اللہ کے نازل کیے ہوئے کلام کے مطابق حکم اور فیصلہ نہ کیا وہی کافر ہیں- تو اب اجتہاد و قیاس کے مطابق عمل کرنا اللہ اور اس کے رسول پر سبقت لے جانے کے مترادف ہے- یوں ہی قیاس کے مطابق حکم کرنا اللہ عزوجل کے نازل کردہ احکام کے علاوہ حکم کرنا ہے جو کفر و فسق ہے-

احادیث کریمہ: -(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا-

"لم یزل بنو اسرائیل علی طریقة مستقیمة حتی کثر فیھم اولاد السبایا فقاسوا مالم یکن بما قد کان فضلوا واضلوا-" (یعنی بنی اسرائیل سیدھے راستے پر قائم تھے یہاں تک کہ ان میں قیدیوں کی اولاد زیادہ ہوگئی تو انہوں نے گذشتہ چیزوں پر آئندہ چیزوں کا قیاس کیا، خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا-)

(۲) حضرت ابوہریرہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- **"تعمل ھذه الامة برھة بالکتاب ثم برھة بالسنة ثم برھة بالرای فاذا فعلوا ذلک ضلوا-"**

یعنی یہ امت کبھی کتاب اللہ کے مطابق عمل کرے گی، کبھی سنت کے مطابق پھر کبھی قیاس واجتہاد کے مطابق عمل کرے گی- جب وہ ایسا کریں تو وہ گمراہ ہوگئے-

(۳) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا-

"ایاکم واصحاب الرای فانھم اعداء الذین اعیتھم السنة ان یحفظوھا فقالوا برأیھم فضلوا واضلوا-"

یعنی تم قیاس کرنے والوں سے بچو کہ وہ دین کے دشمن ہیں، وہ سنت کو تو اپنے حافظہ میں محفوظ نہ رکھ سکے اور قیاس واجتہاد سے کہنا شروع کر دیا- خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا-

دلیل معقول - قیاس کے منکرین اپنے دعویٰ پر جو عقلی دلائل قائم کرتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں-(۱) دلیل عقلی من حیث الدلیل (۲) دلیل عقلی من حیث المدلول-

دلیل عقلی من حیث الدلیل - یہ ہے کہ قیاس کی اصل میں شبہ ہے، اس لئے کہ جس وصف وعلت کے ذریعہ حکم کو متعدی کیا جاتا ہے وہ علت بذات خود منصوص نہیں ہے-

دلالت النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص کسی سے وہ ثابت بھی نہیں ہے- اور قیاس واجتہاد کے نتیجہ میں جو حکم ایجاب یا اسقاط، تحلیل یا تحریم کی صورت میں ہوگا وہ محض حق اللہ ہوگا اور اس بات کی قطعی کوئی گنجائش نہیں کہ حق اللہ کو ایک ایسے طریقہ سے ثابت کیا جائے جس میں شبہ موجود ہو- کیوں کہ صاحب حق کمال قدرت سے متصف ہے اور اس کی شان اس سے بہت بلند وبالا ہے کہ عجز اس کی طرف منسوب ہو، یا وہ اپنے حق کے اثبات میں ان چیزوں کا محتاج ہو جن میں شبہ ہے- اور قیاس میں اس قسم کے شبہ کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ قیاس بالاتفاق علم یقینی کا افادہ نہیں کرتا، اور جب قیاس سے علم یقینی کا افادہ نہیں ہوتا تو وہ بحکم قرآن منھی عنہ ہوگا- جیسا کہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے-

"ولا تقف مالیس لک به علم-" (بنی اسرائیل)
جس کا تجھے علم نہیں اس کی ٹوہ میں نہ پڑو-

"ولا تقولوا علی الله الا الحق-" (النساء)
اللہ کے بارے میں سچی بات ہی کہو-

دلیل معقول من حیث المدلول - احکام شرع اللہ کی طاعت وعبادت ہی کے لیے ہیں اور طاعت وعبادت کی معرفت میں قیاس واجتہاد کو کوئی دخل نہیں، یہی وجہ ہے کہ قیاس واجتہاد سے اصل عبادت کا اثبات جائز نہیں- اور ایسا اس لئے ہے کہ اللہ کی طاعت، اظہار عبودیت اور انقیاد وتسلیم ہی میں منحصر ہے- اور جو حکم تعبدی ہوتا ہے مقتضائے قیاس پر اس کی بنیاد نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ بطور ابتلا ہوتا ہے- چنانچہ ہمیں ایسے بھی احکام ملتے ہیں جن کا قیاس واجتہاد سے اصلا ادراک نہیں ہوتا، جیسے نماز میں رکعتوں کی تعداد، عقوبات میں سزاؤں کی مقدار، بلکہ بعض احکام تو ایسے ہیں جو یکسر قیاس واجتہاد کے خلاف جاتے ہیں اور جب صورت حال یہ ہے تو احکام کی معرفت قیاس واجتہاد سے کیوں کر ممکن ہے؟ ایسی صورت میں قیاس پر عمل کرنا عمل بالعلم نہیں عمل بالجہل کہلائے گا-

منکرین کے دلائل کا جواب: -منکرین کا استدلال میں اللہ تعالیٰ کے اس قول "ولم یکفھم" کو پیش کرنا درست نہیں، اس لئے کہ ہم کتاب اللہ کو کافی ووافی یقینا مانتے ہیں لیکن قیاس واجتہاد کے ذریعہ استخراج کردہ حکم اگر کتاب اللہ میں نصا وصراحۃ موجود نہیں مگر اشارۃ ضرور موجود ہوتا ہے چونکہ قیاس واجتہاد اسی اعتبار کا نام ہے جس کا حکم

آیت کریمہ "فاعتبروا الایہ" میں دیا گیا ہے۔ تو ظاہر ہو گیا کہ جو حکم قیاس واجتہاد کا نتیجہ ہو وہ کتاب اللہ کے حکم کے موافق ہی ہوگا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قیاس واجتہاد کے ذریعہ جو حکم شرع ظاہر ہوگا وہ اللہ عزوجل کے قول "تبیانا لکل شیئ" کے تحت داخل ہوگا، اور وہ حکم کتاب اللہ میں نصا یا دلالۃ، اشارۃ یا اقتضاء ضرور موجود ہوگا کہ یہ قیاس واجتہاد اسی اعتبار کا دوسرا نام ہے جس کا حکم خود اللہ عزوجل نے دیا ہے۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قیاس واجتہاد پر عمل اللہ اور اس کے رسول پر سبقت لے جانے کے مترادف نہیں ہے، بلکہ درحقیقت وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی بجا آوری ہے، اور اس طریقہ پر چلنا ہے جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دی ہے۔ یعنی احکام شرع سے باخبر ہونے کا کیوں کہ ہم غیر منصوص مسائل میں علت موثرہ کے ذریعہ حکم ثابت کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ علت ہمارے قیاس واجتہاد سے موثر نہیں ہوتی بلکہ وہ اللہ عزوجل ہے کے موثر بنانے سے موثر ہے۔ ہمارے قیاس واجتہاد کا صرف اتنا دخل ہے کہ اصل کے مجملہ اوصاف میں سے علت موثرہ کو منتخب کر کے اس کی تاثیر فرع میں ظاہر کر دیتے ہیں ہاں! البتہ منکرین نے یہ کہہ کر کہ "عمل بالقیاس باطل ہے" خود اپنے لئے اللہ اور اس کے رسول پر تقدیم وسبقت کا اشارہ دے دیا ہے، اس لیے کہ یہ لوگ اپنے اس قول کو "عمل بالقیاس باطل ہے۔ نص میں صراحۃ کہیں نہیں دکھا سکتے اور استنباط کو یہ جائز ہی نہیں قرار دیتے کہ اس کے ذریعہ نص کے اشارہ پر اطلاع ہو سکے تو ان لوگوں کا یہ قول بلا دلیل رہ گیا، اور احکام میں یہ بلا دلیل عامل ٹھہرے۔ الامان والحفیظ۔

اور جہاں تک ان احادیث کا سوال ہے جنھیں منکرین نے بزعم خویش اپنے موقف کی تائید میں ذکر کیا ہے تو ان میں حقیقۃ علی الاطلاق قیاس واجتہاد کی مذمت نہیں بیان کی گئی ہے بلکہ ان سے مراد یہ ہے کہ وہ قیاس واجتہاد مذموم ہے جو خواہش نفس کی متابعت میں ہو یا وہ رائے مذموم ہے جس سے مقصود نص کا رد وانکار ہو، لیکن وہ قیاس واجتہاد جس سے ہمارے بیان کردہ طریقہ کے مطابق اظہار حق مقصود ہو وہ مذموم نہ ہوگا۔ چنانچہ اصول سرخسی میں ہے۔

"واما عمر رضی اللہ عنہ فالقول عنہ بالرای اشہر من الشمس وبہ یتبین ان مرادہ بذم الرای عند مخالفۃ النص او الاعراض عن النص فیما فیہ نص والاشتغال بالرای الذی فیہ موافقۃ ہوی النفس والی ذلک اشار فی قولہ اعیتہم السنۃ ان یحفظوھا۔"

(اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۳۳)

(حضرت عمر کی قیاس کرنے کی بات اظہر من الشمس ہے، اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ رائے کی مذمت سے ان کی مراد ایسی رائے ہے جو نص کے مخالف ہو یا نص ہوتے ہوئے اس سے اعراض کرنے اور ہوائے نفس کی موافقت میں قیاس واجتہاد میں مشغول ہونے کی مذمت ہے۔ اسی کی طرف ان کے ارشاد اعیتہم السنۃ میں اشارہ بھی ہے۔)

یوں ہی بعض منکرین قیاس نے یہ جو کہا ہے کہ صحابہ کرام کا قیاس واجتہاد پر عمل الزام حکم کے لیے نہ تھا بلکہ یہ دو فریق کے درمیان مصالحت کی صورت کا اظہار تھا، یہ بات بالکل بے بنیاد ہے بلکہ خلاف واقعہ ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام نے جہاں بھی صلح ومصالحت کی صورتیں نکالیں ہیں وہاں اس کی صراحت بھی کر دی ہے اور جہاں صلح ومصالحت کا لفظ مذکور نہیں یا وہاں بطور خاص لفظ قضاء وحکم مذکورہ ہے تو اس سے مراد الزام حکم ہی ہے، اور کیوں نہ ہو کہ عمل بالقیاس کی بعض صورتیں بصورت فتاوی تھیں۔ اور ہمارے زمانے میں مفتی مستفتی کو حکم مسئلہ بتاتا ہے، شاذ ونادر ہی ایسا ہوتا ہوگا کہ مفتی مسئلہ کا حکم نہ بتا کر صلح ومصالحت کی دعوت دیتا ہو، ٹھیک یہی صورت حال زمانہ صحابہ میں بھی تھی، لہذا صلح ومصالحت والی بات علی العموم درست نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں صحابہ کرام کا قیاس واجتہاد ان مسائل میں بھی ہوا ہے جہاں دو فریق میں باہم خصومت کا کوئی مسئلہ ہی نہیں، جیسے عبادات، طلاق، عتاق وغیرہ۔ تو جن لوگوں نے یہ کہا کہ صحابہ کرام کا قیاس بطور صلح تھا یہ اختراعی بات ہے۔ جیسا کہ اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۳۴ میں ہے۔

"ومن قال منہم ان القول بالرای کان من الصحابۃ علی طریق التوسط والصلح دون الزام لحکم فھو مکابر جاحد لما ھو معلوم ضرورۃ لان الذین نقلوا الینا ما احتجو بہ من الرای فی الاحکام قوم عالمون عارفون بالفرق بین القضاء والصلح فلایظن بھم انھم اطلقوا لفظ القضاء فیما کان طریق الصلح بان لم یعرفوا لفرق بینھما او قصدوا التلبیس۔

(جو یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کا قیاس کرنا بطور صلح ومفاہمت تھا، الزام

حکم کے لیے نہیں تھا تو وہ مکابر وجاحد ہے- کیوں کہ بدیہی طور سے یہ معلوم ہے کہ جن لوگوں نے صحابہ کے اجتہادات ہم تک نقل کر کے پہنچائے ہیں، وہ قضاء وصلح میں فرق سے آگاہ وآشنا تھے، اس لیے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکے ور صلح کو قضا کہہ دیا اور نہ یہ کہہ سکتے کہ انہوں نے تلبیس سے کام لیا-

دلیل معقول کا جواب یہ ہے کہ قیاس واجتہاد کے ذریعہ حکم ظاہر ہوگا تو وہ ہمارے نزدیک حق ہوگا، اگر چہ عند اللہ اس کا حق ہونا ہمیں یقینی طور پر معلوم نہ ہو جیسے وہ شخص جس پر جہت قبلہ مشتبہ ہو تو بعد تحری جس طرف رائے جمے اس طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اس پر لازم ہوگا اور اس صورت میں یہ قطعا ضروری نہیں کہ حقیقت میں جہت قبلہ بھی وہی ہو- حق العبد اور حق اللہ میں فرق ساقط الاعتبار ہے کہ آخر جو جہت قبلہ مطلوب ہے وہ بھی خالص حق اللہ ہی ہے مگر اس کے لئے علم یقینی حقیقی ضروری نہیں-

اب رہ گئی یہ بات کہ بعض احکام عقل وقیاس کے خلاف ہوتے ہیں، وہاں قیاس واجتہاد کی گنجائش کیوں کر ہوگی؟ تو اس سلسلہ میں ہمارا موقف بالکل صاف اور بہت ہی واضح ہے کہ اگر امر غیر معقول المعنی ہو تو وہاں بذریعہ قیاس حکم کو متعدی کرنا جائز نہیں، بلفظ دیگر وہاں عمل بالقیاس جائز ہی نہیں لہذا اس کے ذریعہ استحالہ پیش کرنا اور قیاس و اجتہاد کا یکسر انکار کرنا حق وصداقت سے بہت دور ہے-

یہاں تک ہم نے مثبتین ومنکرین کے اقوال ودلائل قدرے شرح وبسط کے ساتھ پیش کر دیے اور ساتھ ہی منکرین کے دلائل کا منصفانہ تجزیہ بھی پیش کر دیا- اب قارئین کے لئے یہ فیصلہ کرنا بڑا آسان ہے کہ حق کس جماعت کے ساتھ ہے-

قیاس کب حجت ہے؟- یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ قیاس ہر جگہ اور ہر حال میں حجت ہے، بلکہ قیاس کی صحت کے لئے کافی ووافی شرائط ہیں- پھر قیاس واجتہاد ہر کس وناکس کا وظیفہ نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ عالم کتاب وسنت ہو، جو احکام فرائض وواجبات کی شکل میں ہیں ان سے باخبر ہو، ناسخ ومنسوخ، اقوال سلف، اجماع امت، اختلاف ناس اور زبان عرب کا عالم ہو، ساتھ ہی کامل غور وفکر سے کام لے- اس وقت اجتہاد وقیاس حجت ہے اور اس پر عمل واجب ہے- چنانچہ امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

قیاس وہی کرے جس کے پاس آلہ قیاس موجود ہو، اور یہ کتاب اللہ کا علم ہے، جس میں فرض وادب، ناسخ ومنسوخ، عام وخاص اور توجیہ کی معرفت شامل ہے، اسی طرح محتمل آیتوں کی سنت رسول سے تاویل کی اہلیت ہو- اور اگر سنت میں نہ ملے تو اجماع مسلمین سے اس کی تاویل کرے اور اگر اجماع بھی نہ ہو تو قیاس کرے اور کسی کے لیے بھی قیاس کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ مذکورہ بالا امور سے واقف نہ ہو- یعنی سنت رسول، ارشادات سلف، اجماع واختلاف اور زبان عرب- اسی طرح سالم العقل ہو، مشتبہ امور میں فرق کرنے والا ہو اور پورے غور وفکر کیے بغیر عجلت میں رائے نہ قائم کرتا ہو، مخالفین کی باتیں سننے سے گریز نہ کرتا ہو، اس لیے کہ مخالف کی باتیں بسا اوقات مشتبہ کرنے والی ہوتی ہیں-(الرسالہ الجزء الثالث، بحث القیاس)

اجتہاد اور عصر حاضر کے غیر مقلدین - غیر مقلدین زمانہ شعوری یا لاشعوری طور پر نظام معتزلی کی تقلید میں گرفتار ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اجتہاد وقیاس کی وجہ سے ائمہ مجتہدین کی شان میں گستاخی کا محاذ کھول رہے ہیں- اس کے باوصف میاں نذیر حسین دہلوی جو غیر مقلدوں کے امام ہیں وہ قیاس واجتہاد کو حجت اور اقوال ائمہ کو حق وصواب قرار دیتے ہیں- حالاں کہ ان کی یہ بات پوری جماعت اہل حدیث کے لئے خاصی حیران کن ہے- وہ اپنے ایک فتوی میں رقم طراز ہیں:

"جیسے ائمہ اربعہ کا قول ضلالت نہیں ہو سکتا، ایسے ہی کسی مجتہد کا مذہب بدعت نہیں ٹھہر سکتا، جو ایسا کہے وہ خبیث خود بدعتی اور رہبان پرست ہے-"

ائمہ اربعہ کے علاوہ وہ کون مجتہدین ہیں جن کا قول ضلالت نہیں، اس کی وضاحت بھی میاں نذیر حسین نے خود ہی کر دی ہے- لکھتے ہیں:

"امام الحرمین، حجۃ الاسلام غزالی، وکیا ہراسی وابن سمعان وغیرہم ائمہ محض انتساب میں شافعی تھے اور حقیقتا مجتہد مطلق-"

پھر مزید لکھتے ہیں: "بے شک جو منصف مزاج ہے وہ ہرگز امام شعرانی کے منصب کامل واجتہاد میں کلام نہیں کر سکتا-"

میاں نذیر حسین دہلوی کا یہ قول ان غیر مقلدین کے لئے تازیانہ عبرت ہے جو اجتہاد وقیاس کو باطل اور تقلید کو شرک وبدعت قرار دیتے ہیں، بلکہ ایک طرح سے ان لوگوں کے لئے یہ دعوت فکر بھی ہے کہ "اجتہاد وقیاس" کا حجت ہونا ہی حق وصواب ہے اور اسے باطل کہنا گمرہی وضلالت ہے- ☆☆☆

مفتی آل مصطفیٰ مصباحی☆

اجتہاد و مجتہدین کے مختلف طبقات

اجتھاد و قیاس کی شرعی حیثیت مانی جاتی ہے اور یہ فقہ کے ان چار دلائل و اصول میں سے ہے جو فقہ کی بنیاد و اساس ہیں اور جن پر فقہی احکام و مسائل کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ شریعت کے وہ چاروں دلائل علی الترتیب کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس مجتہد ہیں۔ اجتہاد و قیاس کی حیثیت پورے طور پر گو کہ اصل کی نہیں، فرعیت کی بھی ہے، لیکن اس کا فرعی ہونا اسی لحاظ سے ہے کہ اس کا بنیادی ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ مستند ارباب لغت نے جہاں اجتہاد کا لغوی معنی بیان فرمایا ہے اسی ضمن میں اس کے مرادی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے کتاب وسنت کو ماخذ و مرجع بھی قرار دیا ہے۔

اجتہاد و قیاس کا معنی:۔ اجتہاد از روئے لغت جہد بمعنیٰ "طاقت و مشقت" سے ماخوذ ہے، بعض لوگوں نے اس کے مفہوم میں مشقت و طاقت اٹھانے میں انتہا کو پہنچنا بھی بتایا ہے، تاج العروس میں ہے:

الجهد بالفتح الطاقة، قال ابن الأثير وهو بالفتح المشقة، و قيل المبالغة و الغاية، و بالضم الوسع و الطاقة الاجتهاد افتعال من الجهد و الطاقة وفي التهذيب الجهد بلوغك غاية الأمر الذى لايألوا على الجهد فيه (۱)

لسان العرب للامام علامہ ابن منظور (۶۳۰ھ ۷۱۱ھ) میں اجتہاد کا مرادی مفہوم یہ بتایا ہے کہ حاکم کے پاس پیش آنے والے معاملے کو بطور قیاس کتاب وسنت پر پیش کرنا نہ کہ اپنی ذاتی رائے جو کتاب وسنت کی روشنی میں نہ ہو، علامہ ابن منظور اپنی شہرۂ آفاق لغت میں لکھتے ہیں

الاجتهاد و التجهد.... بذل الوسع و في حديث معاذ اجتهد برأى..... الاجتهاد بذل الوسع في طلب الأمر و هو افتعال من الجهد الطاقة و المراد به رد القضية التى تعارض للحاكم بطريق الكتاب و السنة و لم يرد الرأى الذى رآه من قبل نفسه من غير حمل على كتاب او سنة (۲)

اور اصطلاح اصول میں اجتہاد نام ہے کسی قضیہ کا حکم شرعی ظنی کے حاصل کرنے میں طاقت صرف کرنے۔ الاجتهاد بذل الطاقة من الفقيه في تحصيل حكم شرعي ظني (۳)

اور قیاس کا معنی ہے اندازہ کرنا، علي یا لام کے صلہ کے ساتھ ہو تو "نمونہ پر اندازہ کرنے" کے معنی میں آتا ہے (۴) اور شریعت میں کسی فرع شی کو اصل مسئلہ کے ساتھ حکم وعلت میں لاحق کرنے کو کہتے ہیں القياس في اللغة التقدير و في الشرع تقدير الفرع بالاصل في الحكم و العلة (۵)

اجتہاد و قیاس کی حجیت:۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ جب کسی مسئلے میں قرآن کریم یا سنت ثابتہ کوئی قطعی اور دوٹوک فیصلہ صادر فرمادے تو پھر کسی کے لئے اجتہاد و قیاس کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اجتہاد کی ضرورت وہاں پیش ہوتی ہے جہاں قرآن وسنت میں صریح، منطوق اور واضح قطعی حکم نہ ملے اور اجماع امت بھی نہ ہو، ایسی صورت میں اجتہاد و قیاس کا حجت شرعیہ ہونا صحابۂ کرام و تابعین اور ہر زمانے کے علمائے امت کے نزدیک مسلم ہے۔۔۔ اور یہ چاروں مکاتب فکر حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور ان سے منسلک اہل سنت و جماعت کا متفق مسئلہ ہے۔ یہ اتفاق کرنے والے حدیث پاک کے مطابق "ملت واحدہ" کے حامل اور "ما أنا عليه و أصحابي" کے صحیح مصداق ہیں۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اجتہاد و قیاس کسی حکم مستقل کے اثبات کے لئے نہیں ہوتے بلکہ در اصل قرآن وسنت میں جو احکام عام عقلوں کے لحاظ سے غیر ظاہر ہیں، متعلقہ پیش آمدہ مسئلے میں انھیں ظاہر کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ بلفظ دیگر یہ مظہر حکم ہیں نہ کہ مثبت حکم، اس لئے علمائے اصولیین نے فرمایا

القياس حجة من حجج الشرع يجب العمل به عند انعدام مافوقه من الدليل في الحادثة و هذا مذهب جميع

☆Jamia Amjadia Razvia,Po Ghosi,Distt Mau(U P)

الصحابة و التابعين و علماء الكرام في كل عصر خلافا لبعض اهل الاهواء كالشيعة و الخوارج(٦)

احادیث و آثار میں تو حجیت قیاس و اجتہاد پر ایسے واضح اور کثیر وافر دلائل موجود ہیں جن کا انکار دعویٔ اسلام و ایمان رکھتے ہوئے نہیں کیا جا سکتا۔ خود قرآن کریم میں اس کے ثبوت پر دلائل موجود ہیں۔

حدیث معاذ: ۔حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ حدیث تو زبان زد خواص اور بڑی واضح ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ ابن جبل کو یمن کا قاضی و حاکم بنا کر بھیجا تو بطور امتحان آپ نے جو سوال فرمایا اور حضرت معاذ نے جواب عرض کیا وہ حدیث کی متعدد کتابوں میں مذکور ہے۔ ترمذی، ابوداؤد، دارمی میں یہ حقیقت مروی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

كيف تقضى اذا عرض لك قضاء قال اقضى بكتاب الله، قال فان لم تجد في كتاب الله قال فبسنة رسول الله ﷺ. قال فان لم تجد في سنة رسول الله قال اجتهد برائى ولا آلو، قال فضرب رسول الله ﷺ على صدره و قال الحمد الذى وفق رسول رسول الله لما يرضىٰ به رسول الله (٧)

ترجمہ: ۔حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جب تمہیں کوئی معاملہ در پیش ہو تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا، فرمایا اگر تم اللہ کی کتاب میں نہ پاؤ؟ عرض کیا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر رسول اللہ کی سنت میں بھی نہ پاؤ؟ عرض کیا: اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہ کروں گا۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے سینے پر اپنا دست کرم مارا اور فرمایا حمد ہے اللہ عزوجل کی جس نے رسول اللہ کے رسول کو اس کی توفیق دی جس سے اللہ کے رسول راضی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو سوال کیا اور انھوں نے جو جواب عرض کیا وہ کسی کی وساطت سے نہیں بلکہ براہ راست اور بالمشافہ ہوا، اجتہاد و قیاس اگر کوئی شجر ممنوعہ ہوتا تو صاحب شریعت علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام حضرت معاذ کے اظہار اجتہاد پر نکیر فرماتے، ناراضگی ظاہر کرتے، منع فرماتے مگر نہ نکیر فرمائی، نہ منع کیا بلکہ آپ نے حضرت معاذ کے اس جواب کی تقویت و تائید فرماتے ہوئے ان کے سینے پر دست مبارک سے تھپکی دی اور شکر الٰہی بجا لا کر خوشی و مسرت کا اظہار فرمایا۔

حدیث خثعمیہ: ۔قبیلہ خثعم کی ایک عورت جس کا نام اسماء بنت عمیس ہے حضور اقدس ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے باپ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان پر حج واجب ہے مگر وہ سواری پر بیٹھنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتے تو کیا میں، اگر ان کی جانب سے حج کروں تو یہ کافی ہوگا، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا

ارايت لو كان علىٰ ابيك دين فقضيت اما كان يجزيك فقالت بلىٰ فقال عليه السلام فدين الله أحق بالقضاء.

بھلا بتاؤ تو کہ اگر تمہارے باپ پر قرض ہو اور تم اسے ادا کر دو تو کیا یہ کافی نہ ہوگا؟ اس عورت نے کہا کیوں نہیں، تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا اللہ کا دین (قرض) ادا کیے جانے کے زیادہ لائق ہے۔

غور کیجیے تو درج بالا حدیث پاک میں علت جامعہ کی بنیاد پر اجتہاد کرنے کا واضح اشارہ موجود ہے کہ اس ارشاد رسول میں شیخ فانی کے حق میں حج کو حقوق مالیہ سے ملحق کیا گیا۔ حقوق مالیہ کو مقیس علیہ اور حق حج کو مقیس قرار دیا گیا۔ اس قسم کی روایت صحیح بخاری و نسائی میں بھی ہے، امام نسائی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو روایت نقل فرمائی ہے اس میں یہ ہے کہ سائل مرد تھا جس نے اپنے باپ کے بدلے حج کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ تو حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا

افرايت لو كان عليه دين فقضيته اكان مجزأ قال نعم قال فحج عن ابيك(٨)

اور نسائی ہی میں فضل بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنی ماں کے بدلے حج کرنے کی بابت پوچھا جس پر حضور اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا۔ الغرض ان متعدد واقعات میں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر مستفاد ہے کہ ''اجتہاد و قیاس'' نہ صرف جائز و روا ہے، بلکہ اہل فہم وارباب علم کو اجتہاد کی ترغیب و تلقین بھی کی گئی ہے۔

امام بخاری نے کتاب الاعتصام میں جو باب باندھا ہے اس باب سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے۔ ''**باب من شبه أصلاً معلوماً بأصل مبين قد بين الله حكمها ليفهم به السائل**'' یہ باب ہے اس

بارے میں کہ جو کسی معلوم قاعدہ واصل کو ایسے قاعدے سے تشبیہ دے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے تا کہ سائل اسے سمجھ لے۔)

پھر درج بالا مضمون کی حیثیت ذکر کی ہے، اس سے دین و شریعت میں سوجھ بوجھ رکھنے والا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اجتہاد و قیاس شجر ممنوعہ نہیں، اس کی تائید درج ذیل اثر سے بھی ہوتی ہے۔

اثر ابن مسعود:۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما فقہاء صحابہ میں سے ہیں اور بڑی عظمتِ شان کے مالک ہیں، ان سے پوچھا گیا ایک عورت کا انتقال ہو گیا جب کہ اس عورت کا نہ مہر مقرر ہوا تھا اور نہ زن و شوہر میں قربت ہوئی تھی تو اس عورت کو کتنا مہر ملے گا؟ اس تعلق سے دوسرے صحابہ بھی ایک مہینہ تک غور و فکر کرتے رہے پھر حضرت عبد اللہ ابن مسعود نے فرمایا۔۔۔

أجتهد فيها برائي فان كان صواباً فمن الله و ان كان خطأً فمن ابن ام عبد (كنى به عن نفسه) فقال أرى لها مهر مثل نساء ها، لاو كس و لا شطط. (۹)

نسائی کی روایت میں ہے: **سأقول فيها بجهد رائي فان كان صواباً فمن الله وحده لاشريك له و ان كان خطأً فمني و من الشيطان ـــ و الله و رسوله منه براء أرى ان اجعل لها صداق نساء ها لا وكس و لاشطط ولها ميراث و عليها العدة اربعة أشهر و عشراً قال و ذلك بسمع اناس من اشجع فقاموا فقالوا نشهد انك قضيت بما قضى به رسول الله ﷺ في امرأة منا يقال لها بروع بنت و اشق قال فمارئي عبدالله فرح فرحةً يومئذٍ الا باسلامه. (۱۰)**

ابوداؤد کی روایت میں بھی یہی مضمون ہے، اس کے اخیر میں یہ ہے:

ففرح ابن مسعود فرحاً شديداً حين وافق قضاء ه قضاء رسول الله ﷺ. (۱۱)

ان سب روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود نے فرمایا:

اس مسئلے میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اگر یہ اجتہاد درست ہو تو یہ من جانب اللہ ہے جو وحدہ لاشریک ہے اور اگر اس میں غلطی ہو تو یہ میری جانب سے ہے اور شیطان کی جانب سے، اللہ اور اس کے رسول اس سے بری ہیں۔ پھر فرمایا، اس عورت کے لیے مہر مثل (اس جیسی عورتوں کا مہر) کا حکم کرتا ہوں جس میں کمی ہو نہ زیادتی، اور اس پر عدت بھی ہے اور اس کے لیے میراث بھی، راوی کہتے ہیں قبیلۂ اشجع کے کچھ لوگ وہاں موجود تھے انھوں نے کھڑے ہو کر یہ گواہی دی کہ اے عبد اللہ ابن مسعود آپ نے جیسا فیصلہ کیا رسول اللہ ﷺ نے بھی ہمارے قبیلے کی ایک عورت بروع بنت واشق کے متعلق ایسا ہی فیصلہ فرمایا تھا۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود اس سے بہت خوش ہوئے، وجہ یہ تھی کہ ان کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق ہو۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود نے یہ حکم صحابۂ کرام کی موجودگی میں دیا اور اپنے قیاس و اجتہاد سے دیا، کسی نے انکار نہیں فرمایا، بلکہ اس فیصلے کی تائید بھی اسی مجلس میں ہو گئی۔ یہ منکرین قیاس و اجتہاد کے لئے اب انکار کی کوئی گنجائش باقی ہے۔۔۔

اثر عبد الرحمٰن:۔ نئے پیش آمدہ مسئلے میں اجتہاد کی شرعاً اجازت ہی کی بناء پر اجلۂ صحابۂ کرام نے حضور اقدس ﷺ کی ظاہری حیات کے بعد نہ صرف یہ کہ اجتہاد فرمایا، بلکہ اجتہاد کرنے کا حکم بھی دیا۔ تا کہ جن کے اندر مجتہد کی صلاحیت ہے وہ پیش آمدہ قضیے میں اجتہاد سے کام لیں اور شرعی حکم و فیصلہ صادر فرمائیں۔ اس تعلق سے اثر عبد الرحمن ابن یزید میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود کا یہ واضح ارشاد موجود ہے، جب لوگوں نے ان سے بکثرت سوالات شروع کئے تو فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ نہ ہم یہاں ہوں گے نہ میرا فیصلہ ہوگا، پھر فرمایا:

من عرض له منكم قضاء بعد اليوم فليقضي بما في كتاب الله فان جاء ه امر ليس في كتاب الله فليقض بما قضي به نبيه ﷺ، فان جاء ه امر ليس في كتاب الله و قضي به نبيه ﷺ فليقض بما قضي به الصالحون فان جاء ه امر ليس في كتاب الله و ماقضا به نبيه ﷺ ولاقضابه الصالحون فليجتهد برائه و لايقول انى أخاف و انى أخاف فان الحلال بين و الحرام بين و بين ذلك أمور مشتبهات فدع مايريبك الى مالايريبك، قال ابو عبدالرحمن هذا لحديث حديث جيد جيد". (۱۲)

ترجمہ: جب آج کے بعد کسی کے سامنے قضا کا کوئی معاملہ درپیش ہو تو وہ کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کرے، اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جو کتاب اللہ میں نہ ملے تو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر ایسا مسئلہ ہو جو نہ تو کتاب اللہ میں ملے نہ ہی رسول اللہ کا

فیصلہ ملے تو نیکو کار اہل علم نے جو فیصلے کیے ہیں اس کے متعلق فیصلہ کرے اور اگر کتاب اللہ، سنت رسول اللہ واقوال صلحاء میں بھی نہ ملے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے- اور یہ نہ کہے کہ میں خوف کھاتا ہوں، میں ڈرتا ہوں، کیوں کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور حلال و حرام کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، تو جس میں شک ہو اسے چھوڑ کر غیر مشکوک کو اپناؤ---

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے اجتہاد و قیاس کا بھر پور ثبوت فراہم ہوتا ہے علم و دیانت کے ساتھ غیر مقلدین بھی اگر غور کریں تو حقیقت واضح ہو جائے گی- اس حدیث کے تعلق سے ابوعبدالرحمن کہتے ہیں یہ حدیث بہت عمدہ ہے- اگر غور کیجیے تو واضح ہوتا ہے کہ جن معاملات میں ابھی وحی نازل نہ ہوئی تھی ان میں خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اجتہاد فرمایا جس کی ایک طویل تفصیل ہے، احادیث پر گہری نظر رکھنے والے اچھی طرح اخذ کر سکتے ہیں-

محققین اہل فقہ و اصول نے قرآن کریم کی بعض آیتوں سے قیاس و اجتہاد پر بطور اشارۃ النص استدلال فرمایا ہے، قرآن مجید میں فرمایا، فاعتبروا یا أولی الأبصار اعتبار کا معنی ہے شئی کو اس کی نظیر کی طرف پھیرنا، تو آیت کا معنی یہ ہوا کہ شئی کو اس کی نظیر پر قیاس کرو- یہ قیاس عام ہے، حکم عام ہے جس کے عموم میں اصول پر فروع شرعیہ کا قیاس بھی داخل ہے کیوں کہ مورد اگر چہ خاص ہے جو کفار کی عقوبتوں سے متعلق ہے مگر حکم عام ہے- اجتہاد و قیاس کے منکرین پہلے صرف شیعہ و خوارج تھے مگر اب غیر مقلدین وہابیہ بڑی شد ومد سے انکار کرتے ہیں-

منکرین اپنے دعویٰ کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم کے بارے میں ہے، "تبیاناً لکل شئی " قرآن میں ہر چیز کا روشن بیان ہے تو پھر قیاس کی کیا ضرورت ہے؟ نیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی اسرائیل کے قیاس کی مذمت کی جیسا کہ دارمی و بزار کی روایت میں ہے، پھر یہ کہ جسے حکم کی علت قرار دیا جاتا ہے وہ مقام شک میں ہے یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہی علت حکم ہے---

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ قیاس کتاب وسنت کے حکم کا مزاحم ہوتا تو یہ دلیل دی جاری ہو سکتی تھی، قیاس واجتہاد تو کتاب اللہ کے حکم کا مظہر و کاشف ہے- اسرائیلیوں کے قیاس کی مذمت اس لئے کی گئی کہ ان کا قیاس تعنت و سرکشی کے طور پر تھا اور مجتہدین کا قیاس حکم شرعی کے اظہار کے لئے، اور جہاں تک علت حکم کے شبہ کی بات ہے تو ہمارے خلاف نہیں کیوں کہ ہم قیاس سے ثابت شدہ حکم کو واجب عمل مانتے ہیں نہ کہ فرض اعتقادی-

مذکورہ بالا حوالوں سے واضح و انکشاف ہے کہ قیاس واجتہاد حجت شرعیہ ہیں جس کی پشت پر قرآن و احادیث کی مہریں ثبت ہیں- لہذا اجتہاد کو قرآن وسنت کے معارض سمجھنا ایک باطل نظریہ ہے---

شرائط اجتہاد:- اجتہاد کی بنیادی شرط یہ ہے کہ مجتہد کو احکام سے متعلق قرآنی آیات ونصوص کا بھر پور علم ہو، لغوی وشرعی معنی کے ساتھ اس کے تمام وجوہ سے واقفیت ہو، ناسخ ومنسوخ کا پورا علم رکھتا ہو، اسی طرح احکام سے متعلق سنت رسول اللہ کا علم اسانید و اقسام کے ساتھ تفصیلاً ہو، قیاس کے وجوہ وطرق اور شرائط سے بھی بھر پور واقفیت ہو، نیز نحو وصرف، معانی و بلاغت وغیرہ میں پوری مہارت ہو "وشــرط الاجتهاد ان يحوى علم الكتاب معانيه اللغوية و الشرعية و وجوهه التي قلنا من الخاص و العام و الامر و النهي، وعلم السنة بطرقها المذكورة في اقسامها و ان يعرف وجوه القياس بطرقها و شرائطها". (۱۳)

ایسے اجتہادی صفت کے حامل مجتہد کو احکام کے استخراج واستنباط کی اجازت ہے کہ وہ اپنے غالب رائے سے حکم کا استنباط کرے مگر اس کا یہ اجتہادی حکم یقینی نہ ہوگا ظنی ہوگا اور خطا وصواب دونوں کا احتمال رکھے گا، اس لیے علمائے اصول نے فرمایا:

و حكم الاصابة بغالب الرای دون اليقين حتى قلنا ان المجتهد يخطى و يصيب(۱۴)

البتہ اگر مجتہد استخراج حکم میں خطا بھی کر جائے جب بھی اسے اجتہادی جدوجہد کا ایک اجر ملے گا اور مستنبط کردہ مسئلہ کے صحیح و درست ہونے کی صورت میں دو اجر ملے گا- ایک اصابت رائے کا دوسرے اجتہادی کاوش کا--- یہ حکم حضور اقدس ﷺ کے درج ذیل ارشاد گرامی سے ماخوذ ہے:

"اذا حكم الحاكم فاجتهد و أصاب فله أجران، و اذا حكم فاجتهد و أخطأ فله اجر واحد (۱۵)

اس حدیث سے اجتہاد میں خطا وصواب دونوں کے احتمال کا ثبوت ہوتا ہے اور ساتھ ہی اجتہاد کے جواز کا بھی---

مجتہدین کے طبقات: - مجتہد فقہا کے چھ طبقات ہیں:

(۱) مجتہد مطلق مستقل/ مجتہد فی الشرع: یہ وہ حضرات ہیں جو شرائط اجتہاد کا جامع ہونے کی وجہ سے تمام اجتہادی احکام کے استخراج کا ملکۂ راسخہ رکھتے ہیں اور استنباط مسائل کے لئے قواعد و اصول وضع کرتے ہیں- یہ اصول و فروع کسی میں تقلید کے محتاج نہیں ہوتے جیسے سراج الامہ کاشف الغمہ سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۸۰ھ/۱۵۰ھ) سیدنا امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۹۰ھ/۱۷۹ھ) سیدنا امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱۵۰/۲۰۴ھ) سیدنا امام احمد ابن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱۶۴ھ/۲۴۱ھ)

یہ وہ چار ائمۂ مطلق اور مجتہد فی الشرع ہیں جن کی پوری دنیا کے اہل سنت پیروی و تقلید کرتے ہیں- امام اعظم کی تقلید کرنے والے کو حنفی، امام شافعی کی تقلید کرنے والے کو شافعی، امام مالک کی تقلید کرنے والے کو مالکی، امام احمد ابن حنبل کی تقلید کرنے والے کو حنبلی کہتے ہیں- یہ وہ چار ائمۂ مذاہب ہیں جن کی پیروی و تقلید کرنے والے سواد اعظم اہل سنت و جماعت ہیں اور یہی فرقہ ناجیہ ہے- اس کے علاوہ فرقے جہنمی ہیں-

علامہ سید احمد طحطاوی فرماتے ہیں:

و هذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم في مذاهب اربعة و هم الحنفيون و المالكيون و الشافعيون و الحنبليون رحمهم الله و من كان خارجاً عن هذه الأربعة في هذا الزمان فهو من أهل البدعة و النار.(۱۶)

''اور یہ فرقہ ناجیہ فی زمانہ چار مذاہب میں جمع ہو گیا ہے جنہیں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کے نام سے جانا جاتا ہے تو جو اس زمانے میں ان چاروں میں سے کسی کی تقلید نہ کرے وہ بدعتی اور جہنمی ہے—

(۲) مجتہد فی المذہب/ مجتہد مطلق غیر مستقل: - یہ وہ مجتہد مطلق ہیں جو اصول و قواعد میں مجتہد فی الشرع کی تقلید کرتے ہیں اور فروعی مسائل میں خود استنباط و استخراج پر قدرت رکھتے ہیں، کسی کی تقلید نہیں کرتے، فروعی مسائل میں اپنے استاذ کے مقررہ قواعد کی روشنی میں احکام کا استخراج فرماتے ہیں- جیسے قاضی الشرق والغرب حضرت امام ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۸۳ھ) حضرت امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۸۹ھ) حضرت عبد اللہ ابن مبارک (م ۱۸۱ھ) و جملہ تلامذۂ امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو متقدمین اصحاب حنفیہ کہلاتے ہیں—

(۳) مجتہد فی المسائل: - یہ وہ حضرات ہیں جو اصول و فروع دونوں میں اپنے امام کے مقلد ہوتے ہیں اور اصول و فروع کسی میں امام کی مخالفت کی طاقت نہیں رکھتے اور وہ مسائل جن میں امام سے کوئی صریح روایت نہیں ان کا استنباط اپنے امام کے اصول موضوعہ اور مسائل مستخرجہ کو سامنے رکھتے ہوئے کرتے ہیں—

اس میں اکابر متاخرین حنفیہ کا طبقہ ہے جیسے ابو بکر احمد خصاف (م ۲۶۱ھ) امام ابو جعفر طحاوی (م ۳۲۱ھ) ابو الحسن کرخی (م ۳۴۰ھ) شمس الائمہ حلوانی (م ۴۵۶ھ) شمس الائمہ سرخسی (م ۴۸۳ھ) فخر الاسلام بزدوی (م ۴۸۲ھ) فخر الدین قاضی خان (م ۵۹۲ھ) وغیرھم-

(۴) اصحاب تخریج: - جو اجتہاد و استنباط مستقل کی قدرت تو نہیں رکھتے یہاں تک کہ امام کے غیر مصرح مسائل کو بھی اصول موضوعہ اور مسائل مستخرجہ سے معلوم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے— بلکہ امام کے قول مجمل کی تفصیل اور قول محتمل کی تعیین اپنی فہم و رائے سے کرنے کی قدرت رکھتے ہیں- جیسے ابو بکر رازی الجصاص (م ۳۷۰ھ) اور ان کے ہم رتبہ فقہا علیہم الرحمۃ والرضوان-

(۵) اصحاب ترجیح: - یہ وہ حضرات ہیں جو فقاہت میں اصحاب تخریج کی بہ نسبت کم درجے کے حامل ہیں، یہ حضرات اپنے امام سے منقول چند روایات میں سے بعض کو ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں— مثلاً وہ کہتے ہیں: هذا اولى، هذا اصح رواية. هذا أوضح، هذا أوفق للقياس، هذا أرفق للناس،

جیسے ابو الحسن قدوری (م ۴۲۸ھ) علامہ برہان الدین مرغینانی صاحب ہدایہ (م ۵۹۳ھ) وغیرہما-

(۶) اصحاب تمیز: - یہ وہ حضرات ہیں جو ظاہر الروایۃ، ظاہر مذہب اور روایت نادرہ میں فرق کرنے کی قدرت رکھتے ہیں- اسی طرح قول ضعیف اور قول قوی اور اقوی میں امتیاز کر سکتے ہیں- نیز مقبول و مردود اقوال میں فرق کر سکتے ہیں جیسے اصحاب متون معتبرہ جیسے صاحب کنز عبد اللہ ابن احمد نسفی (م ۷۰۱ھ) صاحب مختار عبد اللہ ابن محمود موصلی (م ۶۸۳ھ) وغیرہما—

راقم نے فقہاء کے درج بالا طبقات کی مختصر تفصیل خاتم الفقہاء علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۵۲ھ) کے مقدمہ شامی

"شرح عقود رسم المفتی" سے اخذ کی ہے۔ بعض علماء نے بعض حضرات مجتہدین کو ان کے مراتب عالیہ کے پیش نظر نیچے درجے کے بجائے اوپر درجے میں شامل فرمایا ہے جس پر بحث و گفتگو کی گنجائش ہے لیکن اختصار کی خاطر میں نے صرف علامہ شامی کی تصریحات ذکر کی۔

اس طرح علامہ شامی نے ایسے مقلدین کو فقہاء کے ساتویں طبقے میں شمار فرمایا جن سے بقدر اجتہاد کی صلاحیت نہ ہو، وہ صرف اقوال سے فرماتے ہوں یوں کہ ہم نے مجتہدین کے طبقات کا عنوان دیا ہے اس لئے اس طبقہ کا خصوصی ذکر نہیں کیا، بعض حضرات نے طبقہ فقہاء کی تعداد پانچ بھی بتائی ہے جس سے ان کی مراد ایسے فقہاء ہیں جو مجتہد مطلق کے درجے پر فائز نہیں اور اصحاب تمیز کے درجے سے نیچے درجے میں نہیں۔

ماخذ و مراجع

(۱) تاج العروس جلد دوم ص: ۳۳۰، للامام محب الدین محمد مرتضی الحسینی الواسطی الحنفی
(۲) لسان العرب للامام علامہ ابن منظور ۶۳۰ھ-۷۱۱ھ ص: ۳۹۶ ج ۲
(۳) فواتح الرحموت ج ۲ ص ۴۰۲ مطبوعہ بیروت
(۴) عام لغت
(۵) نورالانوار ص: ۲۸۸، باب القیاس
(۶) فصول الحواشی ص ۳۱۷ باب القیاس
(۷) مشکوٰۃ ص ۳۲۴، باب العمل فی القضاء
(۸) نسائی ج ۲ ص ۲۵۹، کتاب آداب القضاء
(۹) ترمذی ابوداؤد، نسائی، دارمی
(۱۰) نسائی، ج ۲ ص: ۳۰، ۴۷، کتاب النکاح
(۱۱) ابوداؤد ج ۱ ص: ۲۸۸ کتاب النکاح، ترمذی، ج ۱ ص: ۱۳۶ ابواب النکاح و ابواب الرضاع مطبوعہ مجلس برکات مبارکپور
(۱۲) نسائی، ج ۲ ص: ۲۶۰ کتاب آداب القضاء
(۱۳) نورالانوار ص: ۲۵۰ فواتح الرحموت
(۱۴) فواتح الرحموت، نورالانوار
(۱۵) مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم ص ۳۲۴، باب العمل فی القضاء
(۱۶) حاشیۃ الطحطاوی علی الدر ج ۴ ص: ۱۵۳

☆☆

مفتی محمود اختر قادری☆

عہد رسالت میں اجتہاد کا وجود

کلام الٰہی اور احادیث نبویہ کی روشنی میں ائمہ مجتہدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا قیاس واجتہاد فرمانا ایک اجماعی مسئلہ ہے، لیکن اسے باطل قرار دینا اور بدعت سیئہ وگمراہی ٹھہرانا ایسے لوگوں کا شیوہ ہے جو ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے لوگوں کے اقوال پر ایسا عقیدہ رکھتے ہیں اور ایسی اندھی تقلید کرتے ہیں گویا ان کے نزدیک ان کے اقوال نصوص قطعیہ کا درجہ رکھتے ہیں، بلکہ بسا اوقات ان کے اقوال کے مقابل نص قطعی کو بھی رد کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہ لوگ سیدھے سادھے، کم علم، صحیح العقیدہ مسلمانوں کو بہکانے اور ورغلانے کے لیے اس کذب وافترا سے ذرہ برابر بھی نہیں شرماتے کہ ائمہ مجتہدین کا اجتہاد، بدعت وبے اصل ہے، قرآن وسنت سے نہ اس کی اجازت ہے اور نہ ہی عہد رسالت وعہد صحابہ میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے۔ غیر مقلدین کے اس دعوے کی قلعی کھولنے کے لیے نیز صحیح العقیدہ مسلمانوں کے اطمینان قلبی اور عقیدہ کے استحکام وثبات کی خاطر یہاں ہم دلائل وبراہین سے ثابت کریں گے کہ عہد رسالت میں بھی بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اجتہاد کی اجازت تھی اور انہوں نے بوقت ضرورت اجتہاد وقیاس فرمایا، جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرزنش فرمانے یا ناراضی ظاہر کرنے کی بجائے تائید وتصویب فرمائی اور خطا واقع ہونے کی صورت میں اس کی نشاندہی فرمائی اور صحابہ کرام کو اجتہاد سے قطعاً منع نہ فرمایا۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اجتہاد وقیاس کی ابتدا عہد رسالت کے بعد ہوئی ہے، عہد رسالت میں نہ اجتہاد ہوتا تھا نہ ہی اجتہاد کی ضرورت تھی، کیونکہ وہ نزول وحی کا دور تھا اور صحابہ کرام تمام تر احکام ومسائل کو کتاب اللہ اور احادیث کی تصریحات سے جان لیتے تھے تو انہیں قیاس واجتہاد کی ضرورت ہی کیا تھی۔

یہ خیال اس حد تک تو صحیح ہے کہ اجتہاد کی ضرورت عہد رسالت کے بعد ہوئی اور اہل اجتہاد نے اس منصب کو باقاعدہ عمدہ طور پر نبھایا بھی یہاں تک کہ مستقبل میں پیدا ہونے والے مسائل میں انہوں نے مسلمانوں کو مستقل اجتہاد سے مستغنی بھی کر دیا لیکن یہ سمجھنا کہ عہد رسالت میں اجتہاد کی کسی اعتبار سے نہ ضرورت تھی نہ ہی اجتہاد ہوا صرف ایک تخمینی خیال ہے واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ہاں! اس موقع پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اجتہاد وقیاس کے لیے کتاب وسنت کی بھرپور معرفت ایک بنیادی شرط ہے "مسلم الثبوت" میں ہے:

"شرائط الاجتہاد معرفة الکتاب متنا ومعنی وحکما ومعرفة السنة معنی وسندا" الخ (فواتح الرحموت، ص ۶۰۳)

یعنی کتاب اللہ کی عبارت ومعنی اور حکم کا جاننا نیز احادیث رسول کے معنی وسند کا جاننا اجتہاد کے شرائط میں سے ہے۔ تاکہ مجتہد کا اجتہاد کسی حکم منصوص کے خلاف نہ ہو، لہٰذا زمانہ رسالت میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنفس نفیس تشریف فرما ہونا بمنزلہ نص ہے کہ تمام احکام شرع کا علم آپ سے حاصل ہوسکتا تھا تو اگر آپ کے ہوتے ہوئے قیاس یا اجتہاد کی اجازت دی جائے تو ایک بڑا فساد یہ لازم آئے گا کہ معرفت احکام کے قریب تر اور قوی ترین ذریعہ کو چھوڑ کر کسی ایسے طریقہ کا اختیار دیا جا رہا ہے جس میں احتمال خطا بھی موجود ہے۔

اس سوال پر معمولی غور کے بعد بھی یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ عہد رسالت میں اجتہاد کی اجازت دینے میں اس خرابی کا احتمال تو اس وقت ہوتا جب کہ احتمال خطا باقی رہ جاتا اور یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ وحی کا سلسلہ جاری ہو اور خطائے اجتہاد پر تنبیہ نہ کی جائے۔

علاوہ ازیں وحی معرفت احکام کا سب سے قوی ترین ذریعہ اس وقت ہے جبکہ معرفت وحی کا موقع ہو اور حکم دریافت کرنے والے صحابی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوں، لیکن اگر صحابی بارگاہ رسالت سے اتنی بعید مسافت پر ہوں کہ مسئلہ دریافت کرنے کا کوئی موقع ہی نہ ملے تو ان

کے لئے قوی ترین اور قریب تر وسیلہ معرفت قیاس واجتہاد ہی ہے اور احتمالی خطا بھی مضر نہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عہد رسالت کے اجتہادات میں احتمال فساد سے تحفظ کے ساتھ ہی ساتھ صحابہ کرام کی اجتہادی تربیت کا عظیم فائدہ بھی مضمر ہے جس کے نتیجے میں فقہ کا مستقبل نہایت تابناک ہوگیا اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحب لیاقت صحابہ کرام کو مخصوص حالات میں اجتہاد کی اجازت دے رکھی تھی چنانچہ حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو صراحۃً اجازت تفویض فرمائی (اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۳۰)

اجتہاد صحابہ:۔ہماری معلومات کے مطابق صحابہ کرام کی اجتہادی تربیت تین حصوں میں تقسیم کردی گئی تھی (الف) مشاورت (ب) اجتہاد بوقت ضرورت۔(ج) نصوص احکام کی تاویل۔

ان میں سے ہر ایک کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

(الف) مشاورت:۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب رائے صحابہ سے بعض ایسے امور میں مشورہ فرماتے تھے جن سے حکم شرع بھی متعلق ہوتا تھا۔قرآن حکیم میں اس مشاورت کا حکم اس طرح دیا گیا،

وشاورھم فی الامر قرآن حکیم کا یہ حکم اس بات کی دلیل ہے کہ بوقت مشاورت صحابہ کرام کو اپنے قیاس واجتہاد کی روشنی میں مشورہ دینے کا پورا حق حاصل تھا۔یہ الگ بات ہے کہ ان مشوروں میں سے کسی ایک ہی کو ترجیح دے کر ماسوا کو خطا یا غیر اولیٰ قرار دے دیا جاتا۔

چنانچہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت فرمایا کہ ان قیدیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ آپ کی قوم وقبیلہ کے لوگ ہیں میری رائے میں انہیں فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے اس سے مسلمانوں کو قوت بھی پہنچے گی اور کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اسلام نصیب کرے۔حضرت عمر سے دریافت فرمایا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں! قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں میری وہ رائے نہیں جو ابوبکر کی ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کفر کے سردار اور سرپرست ہیں، میری رائے یہ ہے کہ آپ ان پر ہمیں مقرر فرمائیں، تو علی کو عقیل پر مسلط فرمائیں کہ وہ اس کی گردن ماریں اور مجھے میرے فلاں رشتہ دار پر مقرر فرمائیں کہ میں اس کی گردن ماردوں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کا قول پسند فرمایا یعنی فدیہ ہی لینے کی بات طے پائی اور جب فدیہ لیا گیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی

"ما کان لنبی ان یکون لہ اسریٰ حتی یثخن فی الارض (الی قولہ تعالی) حلالا طیبا. (الانفال:۶۷)

کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کرے جب تک زمین میں ان کا خون خوب نہ بہائے۔

یونہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب مسلمان مدینہ طیبہ آئے تو جمع ہوکر نماز کا اندازہ لگا لیتے تھے، نمازوں کی اذان نہیں دی جاتی تھی، ایک دن صحابہ کرام نے اس سلسلہ میں مشورہ کیا بعض نے کہا کہ عیسائیوں کے ناقوس کی طرح ناقوس بنالو، بعض نے کہا کہ یہود کے بگل کے مثل بگل بناؤ، تب حضرت عمر نے فرمایا کہ کسی کو نماز کی منادی کرنے کے لیے کیوں نہیں مقرر کررہے ہو؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یا بلال قم فناد بالصلوۃ. (بخاری ج ا ص ۸۵/مسلم، ا ر ص:۱۶۴)

اس مشاورت میں حضرت عمر نے اپنے اجتہاد سے یہود ونصاریٰ کا طریقہ اعلان اختیار کرنا ناپسند فرمایا اور اعلان نماز کا مشورہ بھی اپنے اجتہاد سے دیا، پھر حضور نے اسے پسند بھی فرمایا۔

(ب) اجتہاد بوقت ضرورت:۔صحابہ کرام کو کسی سفر میں یا کسی اور جگہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما نہ ہوتے فوری اجتہاد کی ضرورت پیش آتی کیونکہ بعد مسافت اور حکم کی عجلت کی وجہ سے انہیں فوراً دربار رسالت سے مراجعت کا موقع نہ مل پاتا تھا اس لیے صحابہ کرام کو ایسے مواقع پر اجتہاد کی اجازت تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کا والی اور قاضی مقرر کرتے وقت ارشاد فرمایا

"کیف تقضی اذا عرض لک قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال بسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم قال اجتہد برائی

ولا آلو قال فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم بصدرى وقال الحمد لله الذى وفق رسول رسول الله لما يرضى به رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم"۔

(ترمذی، ج: ا ص ۱۵۹، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی ابوداؤد ص ۱٦اباب الاجتهاد)

جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے گا تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا، کتاب اللہ سے، فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو، عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے، فرمایا اگر سنت میں بھی نہ پاؤ تو، عرض کیا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں غفلت کو دخل نہ دوں گا' معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بطور تحسین) میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ، اللہ کا شکر ہے کہ جس نے رسول اللہ کے قاصد کو وہ توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔

اب ذیل میں بوقت ضرورت صحابہ کرام کے اجتہاد کی چند نظیریں پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ غزوۂ احزاب کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بھی نماز عصر نہ پڑھے مگر قبیلۂ بنی قریظہ میں، تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ وقت عصر ہو گیا، ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم بنی قریظہ ہی میں پہونچ کر نماز پڑھیں گے، بعض نے کہا کہ ہم یہیں نماز پڑھیں گے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ نہیں تھی کہ بنی قریظہ سے پہلے اگر وقت آجائے تو بھی نہ پڑھنا، جب یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی گئی تو آپ نے کسی کو بھی ملامت نہ کی۔

(بخاری، ج ۲ ص ۵۹۱ کتاب المغازی)

جن صحابہ کرام نے راستہ میں نماز نہیں پڑھی تھی، ان کا اجتہاد یہ تھا کہ یہاں "نہی" حقیقت پر محمول ہے، لہذا خروج وقت میں کوئی حرج نہیں اور وقت سے تاخیر کرکے نماز پڑھنے کی جو "نہی" وارد ہے وہ "نہی اول" ہے اور یہ "نہی ثانی" ہے اور "نہی ثانی" کو "نہی اول" پر ترجیح ہوتی ہے، گویا یہ نہی یک مخصوص وقت کے لیے نسخ ہے اور وہ صحابہ کرام جنہوں نے راستہ ہی میں نماز عصر ادا کرلی تھی، ان کا اجتہاد یہ تھا کہ یہاں 'نہی' حقیقت پر محمول نہیں ہے بلکہ بنی قریظہ کی جانب تیزی اور سرعت کے ساتھ پیش قدمی کرنے کا اشارہ و کنایہ ہے۔

اس اختلاف پر مطلع ہونے کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی بھی ملامت نہیں فرمائی، یہ اس پر دلیل ہے کہ مجتہد پر کوئی گناہ نہیں، خواہ مصیب ہو یا خاطی، بلکہ ان دونوں اجتہادات میں سے کسی ایک کا انکار نہ فرمانا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرنا واجب ہے، اگرچہ اس کے اجتہاد میں خطا واقع ہو، کیونکہ قاعدہ کے مطابق اس موقع پر دونوں اجتہادوں میں سے ضرور ایک ہی صواب ہوگا اور دوسرا خطا، مگر چونکہ یہ حکم مخصوص موقع ہی کے لیے تھا اور وہ موقع باقی نہ رہا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کی خطائے اجتہادی کا اظہار بھی ضروری نہ سمجھا، لہذا یہاں اس سوال کی گنجائش نہیں کہ حضور نے کسی کی خطا کا اظہار کیوں نہ کیا؟

(۲) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "دو شخص سفر میں گئے، نماز کا وقت آگیا اور ان کے پاس پانی بھی نہ تھا، لہذا انہوں نے پاک مٹی سے تیمم کرکے نماز ادا کرلی پھر وقت ہی میں پانی دستیاب ہو گیا تو ان میں سے ایک نے وضو کرکے نماز کا اعادہ کرلیا، اور دوسرے نے اعادہ نہیں کیا، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر یہ ماجرا ذکر کیا، تو جنہوں نے وضو کرکے اعادہ نہیں کیا تھا ان سے آپ نے فرمایا "اصبت السنة و اجزا تک صلا تک" تو نے سنت پالی اور تیری نماز صحیح رہی، اور جن صاحب نے وضو کرکے نماز کا اعادہ کیا تھا ان سے فرمایا "لک الاجر مرتین" تجھے دوہرا ثواب ہے۔

اس حدیث میں ایک صحابی نے یہ اجتہاد کیا کہ تیمم کرکے نماز ادا کرلینے کے بعد وقت ہی میں پانی مل جانے پر وضو کرکے اعادہ نہیں ہے، کیونکہ آیت تیمم مطلق ہے، اس میں بعد ادائے صلاۃ پانی ملنے یا نہ ملنے کی کوئی شرط نہیں ہے۔

دوسرے صحابی کو یہ شبہ ہوا کہ "تیمم کا جواز پانی نہ ملنے کی صورت میں ہے" گو اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ پورے وقت میں پانی ملنا متعذر ہونے کی صورت میں تیمم ہے، اس لیے تقاضائے احتیاط یہی ہے کہ نماز کا اعادہ کرلیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اول کی تصویب کے ساتھ دوسرے کو بھی سراہا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ مجتہد کو جب دلیل سے واضح

نتیجہ نہ ملے تو احتیاطی پہلو پر عمل کرے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ "مجتہد کو اگر دوہرا کام کرنا پڑے تو دوہرے اجر کا اس وجہ سے مستحق ہوا کہ اس نے دونوں عمل ایک ہی نیت سے کیے تھے" لکل امرئ ما نوی"

(۳) حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں "حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا" میں حالت جنابت میں پانی نہ پاؤں تو کیا کروں؟ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے امیر المومنین! کیا آپ کو یاد نہیں؟ کہ ہم اور آپ سفر میں تھے (اور ہم دونوں کو جنابت لاحق ہوئی) آپ نے نماز نہیں پڑھی اور میں نے مٹی میں خوب لوٹ لگائی پھر نماز ادا کر لی، میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا " انما کان یکفیک ھکذا فضرب النبی ﷺ بکفیہ الارض ونفخ فیھما ثم مسح بھما وجھہ وکفیہ" تم کو اس طرح کافی تھا، پھر حضور نے اپنے دونوں مبارک ہاتھ زمین پر مارے اور ان پر پھونک ماری پھر انہیں منہ اور ہاتھ پر پھیر لیا (بخاری ج ۱ص ۴۸، مسلم ج ۱ ص ۱۶۱، ابوداؤد ج ۱ ص ۵۳، طحاوی ج ۱ ص ۶۷)

اس حدیث سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین قیاس واجتہاد کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس گمان پر توقف کیا کہ تیمم صرف وضو کا نائب ہے، جنابت کے لیے جائز نہیں، اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے یہ قیاس فرمایا کہ وضو کے بدلے میں وضو ہی کی ہیئت پر تیمم کا حکم ہے تو غسل کے بدلے میں غسل ہی کی ہیئت پر تیمم ہوگا۔

لہذا اس بنیاد پر پورے جسم پر خاک مل لی۔ لیکن سرکار نے اس پر سرزنش نہیں فرمائی۔ جس سے واضح وظاہر ہے کہ مجتہد کا اجتہاد اگر صواب ودرست نہ ہو، اسے ملامت نہ کی جائے گی اور اس اجتہاد پر عمل کرنے سے اعادہ بھی لازم نہیں۔

(فتح الباری ج ۱ص ۳۴، اشعۃ اللمعات ج ۱ص ۲۶۳)

حدیث مذکور کی شرح میں امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں "ویستفاد من ھذا الحدیث وقوع اجتھاد الصحابۃ فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم" اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی صحابہ کرام کا اجتہاد واقع ہے۔ (فتح الباری ج ۱ص ۳۰۳)

(ج) نصوص احکام کی تاویل:- اجتہاد کی تعریف اس طرح کی گئی ہے "**الاجتھاد بذل الطاقۃ من الفقیہ فی تحصیل حکم شرعی ظنی** (مسلم الثبوت مع فواتح الرحموت ۳۰۳)

یعنی حکم شرعی ظنی کی تحصیل میں فقیہ کا پوری کوشش کرنا اجتہاد ہے۔ اس تعریف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احکام شرعیہ کے تعلق سے بعض نصوص قرآنیہ کی تاویل وتخصیص بھی اجتہاد ہی میں داخل ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ عہد رسالت میں صحابہ کرام سے اس طرح کے اجتہادات وقوع پذیر ہوئے ہیں یا نہیں؟

حالانکہ انہیں تفصیل وتاویل دریافت کرنے کے مواقع میسر تھے، پھر بھی ان کے یہاں نصوص کی تاویلات کی مثالیں نظر آتی ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں کثرت سوال سے روک دیا گیا تھا، چنانچہ ارشاد ربانی ہے "**یایھا الذین امنوا لا تسئلوا من اشیاء ان تبدلکم تسؤکم**" اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھو جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری لگیں۔

لہذا یہ حضرات وقت ضرورت تاویل وتخصیص وغیرہ میں اجتہاد کا عمل جاری رکھتے تھے، اور اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں انہیں ملکہ حاصل ہو جائے اور اس کام میں ان کی مکمل تربیت بھی ہو جائے۔ کیونکہ بعض تاویلات کی تصویب بارگاہ رسالت سے ہو جاتی اور بعض کی خطا ظاہر کر دی جاتی اور بعض کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا جو تصویب ہی کے زمرے میں آتی ہے۔

یہاں ذیل میں اب ہم صحابہ کرام سے احکام شرعیہ سے متعلق تاویل نصوص کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں، ان مثالوں سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نصوص قرآنیہ میں صحابہ کرام کی اجتہادی تاویلات میں سے کس کو بارگاہ رسالت سے تصویب ملی اور کس کو خطا قرار دیا گیا۔

(۱) حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "غزوہ ذات سلاسل کی ایک سرد رات میں مجھے احتلام ہو گیا، مجھے خوف ہوا کہ کہیں غسل کرنے سے ہلاک نہ ہو جاؤں، لہذا تیمم کرکے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھادی۔ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا۔

آپ نے فرمایا، اے عمرو! تم نے جنابت کی حالت میں اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھادی؟ میں نے غسل نہ کرنے کا سبب بیان کیا، اور عرض پرداز ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی میں نے سنا ہے:

"ولا تقتلوا انفسکم ان الله کان بکم رحیما" (۲۹/۴)

اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو بیشک اللہ تم پر مہربان ہے۔ تو حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہنس فرمایا اور کچھ نہ کہا (ابوداؤد ج ۱ ص ۵۶)

یعنی عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ

"ولا تقتلوا انفسکم"

کو عموم اطلاق پر جاری رکھ کر تیمم کا جواز اخذ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس استنباط واجتہاد کو رد نہ فرمایا بلکہ تبسم فرمایا اور یہ استنباط واجتہاد کے صحت کی تائید وتصویب ہے۔

اس حدیث سے بالکل واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں اجتہاد جائز تھا جیسا کہ اس حدیث کی شرح میں امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: "وفیه جواز الاجتهاد فی زمن النبی صلی الله تعالی علیه وسلم" اور یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اجتہاد جائز تھا۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں گئے، تو ہم میں سے ایک شخص کو پتھر لگنے سے سر میں زخم ہوگیا، پھر اسے احتلام ہوگیا تو اس نے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ کیا تم میرے لئے تیمم کی اجازت پاتے ہو؟ ان لوگوں نے کہا، تمہارے لئے تیمم کی اجازت نہیں پاتے، تم پانی پر قادر ہو۔ لہٰذا انہوں نے غسل کیا، جس کی وجہ سے ان کی وفات ہوگئی۔

جب ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کو اس واقعہ کی خبر دی گئی۔ آپ نے فرمایا

"قتلوه قتلهم الله الا سئلوا اذا لم یعلموا فان شفاء العی السوال انما کان یکفیه ان یتیمم ویعصب علی جرحه خرقة ثم یمسح علیها وغسل سائر جسده.

انہیں خدا غارت کرے، اسے انہوں نے مار دیا، جب جانتے نہ تھے تو پوچھ کیوں نہ لیا، کیونکہ بے علمی کا علاج پوچھ لینا ہی ہے، اسے تیمم کافی تھا اور اپنے زخم پر کپڑا لپیٹ کر اس پر ہاتھ پھیر لیتا اور باقی جسم دھو ڈالتا۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۵۶)

جن لوگوں نے زخمی صحابی کو غسل کا حکم دیا تھا انہوں نے آیت کریمہ فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا

(تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو) کا مطلب اپنے اجتہاد سے یہ اخذ کیا کہ آیت کے ظاہر الفاظ کا معنی یہ ہے کہ جواز تیمم کے لیے پانی کا نہ ملنا شرط ہے، اور جب تک پانی موجود ہے تو انہیں تیمم کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اس اجتہاد کا حاصل یہ ہے کہ "لم تجدوا ماء" کا یہی معنی لیکر زخمی صحابی کو غسل کا حکم دیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاویل کو رد فرمادیا کہ پانی نہ ہونے ہی کے ساتھ تیمم کا جواز خاص نہیں، بلکہ اگر پانی موجود ہو مگر استعمال میں ہلاکت یا مرض کا پورا خطرہ بھی ہے تو بھی تیمم جائز ہے۔

یعنی لم تجدوا ماء سے لغوی معنی مراد نہیں ہے پانی پر قدرت نہ ہونا مراد ہے خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ پانی مفقود ہے یا یہ کہ پانی کے استعمال سے شدت مرض یا ہلاکت کا خطرہ ہے۔ چنانچہ حضرت عمرو بن عاص نے بھی یہی سمجھا تھا اور حضور نے اپنے تبسم سے اس کی تائید بھی فرمادی تھی۔ صحابہ کرام سے اس قسم کے اجتہادات کی مثالیں حدیث کی کتابوں کو تلاش کرنے کے بعد وافر مقدار میں جمع کی جاسکتی ہیں۔

صحابہ کی اجتہادی تربیت کے ضمن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث بھی پیش کی جاسکتی ہیں جن میں احکام شرع کا بیان اجتہاد کے انداز میں کیا گیا ہے اس سلسلہ میں دو حدیثیں بطور ثبوت ذکر کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی مگر وہ حج نہ کرسکی اور اس کا انتقال ہوگیا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ تو سرکار نے فرمایا "حجي عنها أرأيت لو كان علی امک دین اکنت قاضیة اقضوا الله فالله احق بالوفاء" اس کی جانب سے حج کرو بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں پر کوئی قرض ہوتا تو کیا تم اسے ادا نہ کرتیں؟ تو اللہ کا فریضہ ادا کرو کہ (اوروں سے) ادائیگی میں اللہ کا حق ظاہر ہے۔ (بخاری شریف ج ۱ ص ۲۵۰)

حج بدل کی ادائیگی واجب ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو بطور نظیر ذکر فرمایا کہ جو کام اپنے ذمہ آئے اس کی ادائیگی

لازم ہوتی ہے جیسے لوگوں کا قرض تو اللہ کا جو قرض بندے پر ہے اس کی ادائیگی اور زیادہ اہم ہے۔

(۲) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے نشاط میں روزہ کی حالت میں بوسہ لے لیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آج مجھ سے ایک بہت بڑی بات ہوگئی ہے کہ روزہ کی حالت میں میں نے بوسہ لے لیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ارأیت لو تمضمضت بماء وانت صائم فقلت لا باس بذالک فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ففیم.

تم بتاؤ کہ اگر روزہ کی حالت میں پانی سے کلی کر لیتے تو کیا ہوتا میں نے عرض کیا اس میں کوئی حرج نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اس میں کیوں (حرج ہوگا) (طحاوی کتاب الصوم ج اص ۳۴۴) بوسہ کے مفسد صوم نہ ہونے پر پانی سے کلی کرنے کو بطور نظیر پیش فرمایا کہ جس طرح پانی سے کلی کرنا روزہ کے فساد کا سبب نہیں ہے اسی طرح منہ سے بوسہ لینا بھی مفسد صوم نہیں علت مشترکہ یہ ہے کہ دونوں میں منافی صوم (کھانا پینا اور جماع) کا معنی نہ پایا گیا۔

کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان نظائر کے ساتھ ساتھ احکام کا ذکر اسی لئے فرماتے تھے کہ باصلاحیت صحابہ کو نظائر وعلل کے ذریعہ اجتہاد کرنے کا طریقہ ہاتھ آجائے، بارگاہ رسالت کی کامیاب ترین تربیت سے فیض یاب ہونے والے صحابہ کرام نے عہد رسالت کے بعد تمام نئے پیدا ہونے والے مسائل میں بے انکار نکیر اجتہاد وقیاس سے کام لیا اور اپنے تلامذہ واصحاب کو باضابطہ اجتہاد کی تربیت بھی دی جس کا سلسلہ فقہ کی تدوین وتہذیب، تفصیل وتبویب اور اصول استنباط کے تعین تک پہنچا اور احکام شرع کے اصول وفروع کا عظیم ترین خزانہ اجتہاد ہی کی بدولت پردۂ غیب سے منصۂ شہود پر آیا۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مقدس میں اجتہاد کی تربیت نہ دی گئی ہوتی تو اجتہاد کی شرعی راہیں متعین کرنا تقریباً متعذر ہوتا بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں صحابہ کا اجتہاد کرنا اجتہاد کے دلیل شرعی ہونے کا علمی ثبوت بھی ہے اور بعد والوں کے لیے اجتہاد کے قواعد وشرائط کی قیمتی دستاویز بھی ہے۔ ☆☆☆

مفتی ارشاد احمد ساحل سہسرامی (علیگ)☆

فقہ و اصول کی تدوین کی طرف اہل علم کا التفات

عہد رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سنہرے اور بابرکت دور کو دنیا نے جب الوداع کہا تو اسلام بحر و بر کی وسعتوں کو اپنی سعادتوں سے ہم کنار کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ جیش اسامہ کی روانگی نے عراق و ایران کی سرحدیں مملکت اسلام میں ضم کرنے کی طرح ڈالی اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گرامی دور خلافت تک خاصے ممالک اسلام کی آغوش رحمت میں آگئے۔ توسیع کا یہ سلسلہ دراز رہا اور عہد عباسیہ میں مسلم سلطنتیں ہر قابل رشک نعمت سے سرفراز ہو چکی تھیں۔

تہذیب و ثقافت کا انضمام اور ملک و قوم کے تبادلے اپنے ساتھ بہت سے وسائل بھی لاتے ہیں اور مسائل بھی۔ مسائل و وسائل کے ہجوم بہت سی طرفہ سامانیوں کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ زبان پر سان چڑھتی ہے، نت نئے الفاظ درآمد ہوتے ہیں، نئی تہذیبیں جنم لیتی ہیں، افکار نو کا ہجوم ہوتا ہے، نئے نویلے آداب و فنون سے آگاہی ہوتی ہے۔ نیا سماج، نئے لوگ، نیا ماحول، نیا انداز، سب کچھ نیا نیا سا، اس اچھوتے ماحول میں اسلام اور اہل اسلام کو جذب [Adjust] ہونے کے لیے فکر و عمل کے طور طریقوں میں خاص تراش خراش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی ضرورت نئی اصطلاحات، نئے فنون، نئے علوم و آداب کی ایجاد و تدوین کی اصل محرک ہوتی ہے۔

اسلام دین فطرت ہے، اس لیے اس کے اصول و مبادی اور قوانین و آداب ہر قدم پر مزاج فطرت کا خاصا خیال رکھتے ہیں، اسلام صرف ان پہلوؤں سے دامن کشاں گزرتا ہے، جن سے فطرت کا پاکیزہ صحن آلودگیوں کا شکار ہوتا ہو۔ فطرت کی مثبت حوصلہ افزائی اور منفی گوشوں پر قدغن اسلام کا ایسا دلکش امتیاز ہے، جو اپنے آپ میں منفرد ہے، اسلام کائنات کی ہر خوبی کو اپنا سرمایہ سمجھتا ہے۔ **الحکمة ضالة المومن /الحکیم فحیث وجدها فهو احق بها** (مشکوۃ، کتاب العلم، رواہ ابو ہریرہ) اسلام کی اسی کشادہ قلبی نے اسے آفاقی وسعتیں عطا کی ہیں۔

اسلام جب حرا کی آغوش سے نکل کر پھیلا تو اس کی کرنوں نے نہاں خانۂ دل روشن کر دیے۔ آفتاب رسالت کی موجودگی میں کسی فن کے حضور زانوئے ادب تہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وحی الوہیت اور نطق نبوت ہر مسئلے کا شافی علاج تھی۔ البتہ دور دراز کے علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لیے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دو صورتیں تجویز کی تھیں۔ کتاب و سنت سے براہ راست استفادہ یا پھر ان کی روشنی میں مسئلے کا عقلی استنباط جس نے آگے چل کر اسلامی فنون بالخصوص فقہ و اصول کی تدوین کے لیے راہیں ہموار کیں۔

یہاں پر ایک سوال سہج ذہن پر ابھرتا ہے کہ کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے فقہ و اصول کی تدوین اور ان کے قواعد کے انضباط کی ضرورت کیا ہے؟ قرآن حکیم میں ہر خشک و تر کا بیان ہے، سارے اصول و ضوابط موجود ہیں۔ قرآنی اصول کی جامع تشریحات احادیث مبارکہ میں مکمل طور سے ملتی ہیں۔ اللہ اور رسول نے ہر ہر قدم پر امت مسلمہ کو رہنما اصول دیے ہیں تو پھر ایک نئے فن کی تدوین اور اس کے ہاتھوں میں امت مسلمہ کی زمام دینے کی ضرورت کیا ہے؟ حبل اللہ کے ہوتے ہوئے، کسی عبقری کی نیازمندی کا قلادہ اپنی گردن میں کیوں ڈالا جائے؟ کتاب و سنت کے سرچشمہ شیریں کے ہوتے ہوئے کسی اور سمت رخ کرنے کا جواز کہاں پیدا ہوتا ہے؟ یہ سوالات ہماری ایمانی حس کے تقاضے ہو سکتے ہیں۔ ان کا واضح اور مفصل جواب کثیر صفحات اور وسیع اوقات چاہتا ہے۔ لیکن ذیل کی چند سطروں میں اس کی واجبی وضاحت ضرور پیش کی جائے گی۔

یہ جہان فطرت تغیر پذیر اور مائل بہ ارتقا ہے۔ کائنات کا یہ ارتقائی سفر اس وقت تک جاری رہے گا، جب تک اس کی قبائے وجود مکمل طور سے تار تار نہ ہو جائے۔ **کل یوم فی شان** (رب کائنات ہر دن ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے) کی جلوہ گری کائنات کے ذرے ذرے میں سمائی ہوئی ہے۔ جو سماں کل تھا، وہ آج نہیں، جو آج ہے وہ کل نہیں

☆C/o Masha Allah Cottage,Jamalpur Aligarh(U.P)

رہے گا- معاشرے کے دہرے دہرے وجود میں یہ تبدیلیاں اور ترقیاں بہت واضح انداز سے محسوس کی جاسکتی ہیں- یہاں تک کہ مظاہر فطرت جو ایک سے دکھتے چلے آرہے ہیں، ان کی جلوہ گری بھی ایک سی نہیں ہوتی- بوڑھا سورج بظاہر اسی مشرق سے نکلتا ہے اور اسی مغرب میں ڈوبتا ہے- لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ اس کی جائے طلوع ہر دن بدلتی رہتی ہے اور مقام غروب بھی ہر دن تبدیل ہوتا رہتا ہے- سرد و گرم موسم لمبی اور چھوٹی راتیں، مہ و نجوم اور بادلوں کی آنکھ مچولیاں، چاند اور سورج کی داغداریاں (گہن)، رتوں کی بھیگتی سوکھتی پلکیں، حکومتوں کے بدلتے زاویے، ثقافتوں کے تبادلے، سمٹتی پھیلتی سرحدیں، فطرت کا اصول درشاتی ہیں، قانون قدرت کا مزاج سمجھاتی ہیں، حرکت و عمل پر آمادہ رکھتی ہیں، زمانے کی سبک رفتار کا ساتھ دینے پر مہمیز کرتی ہیں- یہ بتاتی ہیں کہ اجماد و تعطل کا زندگی سے بھرپور اس شاداب بستی ہوتی کائنات سے دور کا واسطہ نہیں- جو فطرت کا یہ مزاج نہیں سمجھے گا، اس کی گھومتی بدلتی تیز رفتار کا ساتھ نہیں دے گا، وہ پس منظر میں چلا جائے گا اور زمانہ اس سے دامن جھٹک کر بہت برق رفتاری سے آگے بڑھتا چلا جائے گا- چاہے وہ شخص ہو یا تحریک، مذہب ہو یا تمدن، علم ہو یا انداز عمل- اسلام جب دین فطرت ہے تو وہ فطرت کی ان رواں دواں تبدیلیوں اور تغیر آشنا مزاج سے دامن کش کیسے ہو سکتا ہے؟ اسلام تو قیامت تک اس دنیا کا ہمدم و ہم ساز سدابہار رہنما مذہب ہے، اس لیے اس کا اجماد و تعطل سے بھلا کیا ربط ہو سکتا ہے؟ ہاں اس کی اپنی ٹھوس، غیر متزلزل اور مستحکم بنیادیں ہیں، اس کا اپنا دلکش و پاکیزہ دائرہ کار ہے- وہ دنیا کے دامن میں نہیں سمٹتا بلکہ دنیا کو اپنی مقدس آغوش میں سمیٹتا ہے-

اس تغیر تاب کائنات کے پس منظر میں اب دنیاوی اصول و قوانین کی حدیں، ماہیتیں اور کیفیتیں ملاحظہ کیجیے- کسی ملک کا قانون ہو، ہر نصف صدی کے بعد اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے- کئی دفعات نکالنی پڑتی ہیں- بہت سی شقیں داخل کرنی ہوتی ہیں اور کسی میں جزوی ترمیم (Amendment) جگہ پاتی ہے، حالات اور کیفیات کے منظر نامے جوں جوں تبدیل ہوتے ہیں، اصول و قوانین کے کینوس بھی رخ بدلتے رہتے ہیں- قوانین کی یہ توسیعاتی کیفیت ایسی روشن ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی-

اب اسلام کے قانونی رخ کو دیکھتے ہیں تو اس پر **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینـــاً** (المائدۃ ۵) ترجمہ: آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو منتخب کرلیا) کی مہر ثبت ملتی ہے- اس کے جتنے اصول و ضوابط تھے، مکمل ہو چکے، دین تکمیل کے مرحلے سے گزر چکا، کتاب و سنت کا لازوال سرچشمہ امت مسلمہ اور سعید دنیا کی پیاس بجھاتا رہے گا- ہر خشک و تر کتاب و سنت کی وسعتوں میں سما چکے- اب اس ضابطۂ خالق کائنات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکے گی- پھر قدرت کے ان اصولوں کا کیا ہوگا، جنہیں تبدیلیاں ہی راس آتی ہیں، یہ تغیر پذیر کائنات اسلام کے غیر متبدل اور اٹل مزاج کا ساتھ کیسے دے سکے گی؟ آئے دن طوفانوں کی مانند جو مسائل امنڈتے رہتے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ اسلام عرب سے نکل کر، بحر و بر کی وسعتوں میں پہنچے گا تو بھانت بھانت کے سماج، بولیاں، روایتیں، رسمیں، تہذیبیں اسلام سے کس طرح مانوس ہوں گی- کیا اسلام کائنات کی ان تمام رنگا رنگیوں کو دفن کر دے گا یا انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر چلے گا- نئے سماج، نئے وقت اور نئے حالات کی تبدیلیوں کو اسلام کی میزان پر کیوں کر تولا جا سکے گا- اگر مزاج اور ماحول کی ان تبدیلیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو دنیا اس کی مقدس آغوش میں کیسے سما سکے گی- اس طرح کے نہ جانے کتنے سوالات ہیں جو دماغ کی زیریں سطح پر ابھرتے رہتے ہیں- جبکہ اسلام ابدی اور لافانی مذہب ہے، اسے ہر زمانے کی قیادت کرنی ہے-

غرض بے ثبات دنیا کی بوقلمونی، حالات کی رنگا رنگی، زمانے کی تبدیلیاں فطرت کے تیکھے نقوش ہیں، جنہیں بہر صورت رونما ہونا ہے اور اسلام کی عالمگیر ابدیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے- ایک مسلسل تغیرات کا خوباں ہے اور دوسرا مکمل استقلال کا، دونوں قدرت کے بنائے ہوئے اصول ہیں، جن کی نہ تغلیط ہو سکتی ہے، نہ انہیں توڑا جا سکتا ہے- اسلام کے شاداب اور مستحکم اصول اور یہ نگار خانہ کائنات دونوں قیامت تک سدابہار رہیں گے- پھر ان دونوں کو ہم آہنگ کرنے کی صورت کیا ہے؟ اس خلیج کو پاٹنے، اس گیپ (Gap) کو ختم کرنے اور ان دونوں مختلف جہتوں کو مانوس کرنے کی صرف ایک راہ ہے، جسے اجتہاد کہتے ہیں اور اسی نشان منزل کی توجہ کے لیے فقہ و اصول کی تدوین عمل میں آئی- بات ذرا مبہم سی رہ گئی- کتاب و سنت کے ارشادات سے اعتبار دیتے ہوئے

اس کی مختصر وضاحت پیش ہوتی ہے۔

کتاب اللہ میں یقیناً ساری چیزوں کا بیان ہے لیکن اس کے اصول جامع، مختصر اور گہرے گہرے ہیں، جن تک ہم آپ تو کجا حضرات صحابہ بھی رسول محتشم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تشریح کے محتاج تھے۔ سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورۂ بقرہ کی تعلیم ڈھائی سال میں حضور سے مکمل فرمائی۔ تکمیل کے بعد خوشی میں احباب کی شاندار ضیافت کا اہتمام فرمایا۔ حضرت فاروق اعظم خود فصیح عرب تھے، انہیں قرآنی متن کو سمجھنے کے لیے کسی کے تعاون کی ضرورت ہی کیا تھی، پھر آپ حضور سے ڈھائی سال ڈھائی پارے کی تعلیم میں کیا سیکھتے رہے، کیا صرف لفظوں کے معانی؟ نہیں بلکہ وہ اسرار قرآنی اور رموز ربانی جو نور الٰہی سے روشن دلوں کو عطا ہوتے ہیں، انہیں اسرار کے گہرے قرآنی سمندر کی نشاندہی یہ حدیث پاک فرماتی ہے کہ اگر سارے سمندر روشنائی اور سارے درخت قلم بنا دیے جائیں اور ان سے قرآن حکیم کے اسرار وعجائب قلم بند ہوں پھر بھی وہ ختم نہ ہوں گے۔

اگر قرآن حکیم کا معاملہ صرف متن کے ظاہری رخ تک محدود ہوتا تو پھر اس کے عجائبات لامحدود کیسے ہو سکتے تھے۔ قرآن حکیم اسرار ومعانی کا ناپیدا کرنا سمندر ہے، جس کی شناوری ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے ایک مخصوص معیار کا علم، نور الٰہی سے روشن سینہ، مشکوٰۃ نبوت کی جاں بخش ضیاؤں سے مستنیری اور خاص کر توفیق الٰہی سے سرفرازی ضروری ہے، تبھی وہ قرآن میں چھپے کائنات اور ماورائے کائنات کے اسرار دریافت کر سکتا ہے۔ یہ معیار فقہائے صحابہ کو حاصل تھا، جو ارشادات نبوت کے قیمتی خزانوں کے امین ہیں، اسی لیے اسلام کا یہ مسلم اصول ہے کہ قرآن حکیم بصرف متن قرآن اور لفظوں کی پرکھ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے لیے احادیث مبارکہ کی پرنور رہنمائی ضروری ہے۔ اس کے بغیر جو قرآن کو سمجھنا چاہے، گمراہی اس کا مقدر ہے۔

اب احادیث مبارکہ کی معنوی گہرائی کی سمت توجہ کی جائے تو ہمیں یہ ارشاد رسالت جگمگاتا نظر آتا ہے: او تیت بجوامع الکلم۔ مجھے مختصر اور جامع کلمات کا معجزہ عطا کیا گیا۔ معجزہ وہی چیز ہوتی ہے جو مافوق الفطرت ہو، جو دوسروں کا مقدور نہ ہو، جسے حضور نے بطور امتیاز پیش فرمایا ہو۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ حضور کے ارشادات معانی ومفاہیم کی گہری تہیں رکھتے ہیں، جو بیک نگاہ منکشف نہیں ہو سکتیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مبارک بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے علم کے دو برتن حاصل کیے ہیں، ایک کو بیان کرتا ہوں، اور دوسرا بیان کروں، تو میرا یہ گلا کاٹ دیا جائے۔ (بخاری شریف ۱/۲۳) ارشادات نبوت کی تفہیم کے لیے ان نفوس قدسیہ کی تشریحات مطلوب ہیں، جن کی پرنور نگاہیں جمال نبوت کے دیدار سے جگمگ جگمگ کرتی ہیں، جن کے دل انوار نبوت سے روشن روشن ہیں، جن کی سماعتیں الفاظ نبوت کی لذت چشیدہ ہیں، جنہوں نے براہ راست مہبط وحی سے ان ناطق اور غیر ناطق وحیوں کو سمجھا اور دل میں بسایا ہے، جو بارگاہ رسالت کے مزاج شناس تھے، اور حضرات صحابہ کی رہنمائی کے بغیر کوئی حدیث کے سرچشمے سے فیض اٹھانا چاہے تو ٹھوکریں اس کا مقدر ہیں۔ یوں کہ اہل محفل ہی میر محفل کے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں، یونہی اکابر تابعین کہ جو ان سے حاضر باش، حضرات تابعین کے توسط سے سمجھیں۔

کوئی بھی قانون ایسا جامع نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک دو سطر سے سارے حالات ومعاملات، وسائل ومسائل کا حکم واضح کر سکے، چہ جائیکہ وہ سارے زمانوں کے حالات اور معاملات کا احاطہ کر سکے۔ قانون، ہمیشہ ایک کسوٹی ہوتا ہے، حالات اور معاملات کو اس پر پیش کر کے پرکھا جاتا ہے، اس پیش کش اور اس کے نفاذ کے لیے بار بار ان قانون کو فکر وتدبر اور سیاست مندی سے کام لینا پڑتا ہے۔ قانون کی سطح عموماً سپاٹ ہوتی ہے۔ لیکن وہی قانون زندہ اور رائج ہوتا ہے، جس کے اندر Flexibility ہوتی ہے، اور زمانے کے مزاج کو ایک حد تک ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے نفاذ کی کوشش کی جاتی ہے۔ بے لوچ اور کرخت، یک رخا مزاج رکھنے والا قانون یا تو خود ٹوٹ جاتا ہے یا پھر اسے توڑ دیا جاتا ہے۔ اسلام ابدی اور لازوال مذہب ہے اور قیامت تک کے دردمندوں کا چارہ ساز، اس لیے اس کے سارے اصول آفاقیت سے ہم آہنگ اور اس کے مزاج کا خاص خیال رکھتے ہیں، ان میں نرم خوئی، لچک داری اور ہر حال، ہر ماحول میں ضم (Adjust) ہونے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے، ان میں بے تکا پن اور کرختگی نہیں ہے۔ لیکن اسے ہر حال، ماحول اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرنے کے لیے اعلیٰ اسلامی شعور کی ضرورت ہے، جو ان جامع اصولوں اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرنے کے لیے اعلیٰ

اسلامی شعور کی ضرورت ہے، جو ان جامع اصولوں سے نئے نئے مسائل کے احکامات برآمد کر سکے۔ اسی شعور کی قوت کو ملکۂ اجتہاد کہتے ہیں۔ قرآن وسنت میں دین اسلام کی تکمیل کا یہی مطلب ہے کہ اسلام کے سارے بنیادی احکام اور لازمی اصول مکمل ہو چکے۔ **الحلال ما احل اللہ والحرام ما حرم اللہ و ماسکت عنہ فھو معفو عنہ** (حلال وہ چیز ہے جسے اللہ نے حلال ٹھہرایا اور حرام وہ چیز ہے جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا اور جس کے بارے میں کوئی حکم وارد نہیں ہے، وہ مباح ہے)۔ ان بنیادی اصولوں میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔ لیکن ماحولیات کے بدلاؤ سے جو حالات رونما ہوتے ہیں، ان کی اسلامی اصولوں کی روشنی میں تفہیم ضرور ہو سکتی ہے۔ فقہ واصول یہی کارنامہ انجام دیتے ہیں، ملکہ اجتہاد یہی فرض ادا کرتا ہے، فقہ الگ سے ہٹ کر کچھ نہیں کہتے۔ وہ نور خدا سے منور دل رکھتے ہیں، علم لدنی کے شرف سے سرفراز ہوتے ہیں، اسلامی اصول ومصادر کا گہرا شعور رکھتے ہیں، وہ نت نئے حالات کو کتاب وسنت کے معیار پر پیش کر کے ان کی زیریں سطحوں سے اس کا شرعی حکم برآمد کر لیتے ہیں، جہاں تک عام نگاہوں کی رسائی نہیں ہوتی، جیسے دنیاوی ایجادات کرنے والے افراد کائنات فطرت کا گہرا مشاہدہ کر کے عام نگاہوں سے چھپے راز دریافت کر لیتے ہیں، پھر انہیں عوام کے لیے مفید بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ ساری دنیا اس سے بے تکلف فائدہ اٹھاتی ہے۔ لیکن ایسے موجدین، خالق نہیں ہوتے بلکہ منتظم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی ایجادات بھی قدرت کا کرشمہ ہی کہی جائیں گی اور اللہ کی ملکیتیں ہی شمار ہوں گی۔ البتہ ایسے موجدین مادی دنیا کے قائد اور محسن ضرور سمجھے جائیں گے۔ یونہی ائمہ مجتہدین شریعت کا گہرا شعور رکھنے کی وجہ سے نت نئے معاملات کی تفہیم کا فریضہ اسلام کی سطح سے انجام دیتے ہیں۔ شریعت کے مصادر کی روشنی میں انہوں نے ایسے اصول ایجاد کیے ہیں، جن کی روشنی میں حالات ومعاملات کا اسلامی فہم آسان ہو جاتا ہے، اور پوری دنیا ان کے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں اسلامی قوانین پر سہولت کے ساتھ عمل پیرا ہو جاتی ہے۔ اہل دنیا کو خود احکام اخذ کرنے اور استنباط کرنے کی زحمتیں گوارہ نہیں کرنی پڑتیں، نہ وہ اس کے اہل، یہ ائمہ مجتہدین اس ترتیب واستنباط کے سبب شارع نہیں ہو جاتے، بلکہ شریعت کے خادم ہی رہتے ہیں۔ البتہ اعلیٰ سطح کی اسلامی خصوصیات کے سبب وہ امت کے لیے آسانی کا سبب بنتے ہیں، اس لیے امت مسلمہ میں انہیں ایک خصوصی امتیاز نصیب ہوتا ہے اور اس کی بدولت وہ اسلامی قائد، رہنما، امام اور قابل اقتدا شخصیت شمار ہوتے ہیں اور یہ بات بالکل ظاہری ہے کہ امتیازات چاہے وہ جس رخ کے ہوں، بہر طور قابل تقلید واحترام ہوتے ہیں اور ایسے افراد قبول عام سے بہر طور سرفراز ہوتے ہیں۔ اس لیے ائمہ مجتہدین کی تقلید کو دین سے جدا کسی فکر کی پیروی سمجھنا عقل وفہم کا دیوالیہ پن ہے۔ حضرات ائمہ جیسے افراد تو امت مسلمہ کا انتخاب ہوتے ہیں اور قرآن حکیم کے ارشاد کی روشنی میں امت کے رہنما، ارشاد ربانی ہے:

فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین و لینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (التوبۃ: ۱۲۲) تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں، اس امید پر کہ وہ بچیں۔ ایسے فقیہ افراد کو قرآن حکیم نے قائدانہ منصب عطا کیا ہے۔

احادیث مبارکہ میں ایسی خوبیوں والے افراد کو بہت سراہا گیا ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین (مشکوۃ کتاب العلم)

جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دین کی سمجھ اور فقاہت عطا کر دیتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: **نعم الرجل الفقیہ فی الدین ان احتیج الیہ نفع و ان استغنی عنہ اغنی نفسہ**۔ کتنا اچھا ہے وہ شخص جو دین کا فقیہ ہو، اگر کوئی اس کے پاس دینی حاجت لے کر حاضر ہو تو وہ اس کی مدد کرے اور اگر اس سے دنیا بے نیازی کا معاملہ رکھے تو وہ بھی اپنے آپ کو بے نیاز بنا لے۔ تیسری حدیث پاک میں ہے: **فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد** (رواہ ابن عباس مشکوۃ، العلم) ایک فقیہ شیطان کی جان پر ہزار عابد سے زیادہ گراں بار ہے۔

یہ امتیازات اللہ اور رسول کی بارگاہ سے ایک فقیہ اور مجتہد کو عطا ہوئے ہیں، اس لیے ان کی ذوات قدسیہ یقینا قابل احترام اور لائق تقلید ہیں۔

اصول دین کی تفہیم کے لیے نئے نئے اچھے اچھے طریقے ایجاد کرنا، جن سے مقاصد دین پورے ہوتے ہوں، مطلوب شریعت بھی

ہے، معروف حدیث جریر بن عبداللہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے:

من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شیء (مشکوٰۃ، کتاب العلم ص ۲۵)

جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کرے، اس ایجاد کا ثواب ملے گا اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے، ان سب کا مجموعی ثواب اس موجد کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا اور لطف یہ ہے کہ ان پر عمل پیرا لوگوں کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ ایسے فنون و آداب، اطوار و عادات کو برتنا جو نئے ہوں، لیکن دین سے متعلق ہوں، اس کے مقاصد کی تکمیل میں مفید ہوں اور ان سے اسلام کے کسی متعین اصول کی نفی نہ ہوتی ہو، فرمان رسول اور مزاج شریعت کے مطابق ہے، یہی وہ بنیادی ہدایت ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کو حالات زمانہ کے اعتبار سے ایڈجسٹ کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اور زمانے کے تغیرات کو بہت سہولت، نرمی Flexebility اور سلیقے سے برتتی ہے۔ قرآن حکیم کی جمع و ترتیب، علوم قرآن اور فنون حدیث کی تدوین یہ سب کچھ بعد کی چیزیں ہیں اور مخلصین اسلام کی پاکیزہ ذہنوں کی ایجاد۔ حضرات ائمہ مجتہدین اس حدیث کے بہترین مصداق ہیں، وہ امت مسلمہ کے سامنے ایسے بہتر طریقے پیش کر گئے، جن کی برکتوں سے ہزار سال کے بعد بھی دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ اگر وہ اور ان کے یہ عظیم الشان کارنامے نہ ہوتے تو آج امت مسلمہ کس مشقت سے دوچار ہوتی، ہم آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن ائمہ مجتہدین کی یہ ایجاد فنون کتاب وسنت کے سرچشمے سے ہی مستفاد ہے۔ جس طرح قرآن حکیم کی جمع و ترتیب، احادیث مبارکہ کی تدوین عہد رسالت کے بعد کی چیزیں ہیں لیکن ان کا سرا عہد رسالت میں موجود تھا۔ کیونکہ خود حضور قرآن حکیم کو چمڑوں پر، کھجور کی چھالوں پر لکھوتے باضابطہ کاتبین وحی متعین تھے، جو حضور کی بیان فرمودہ ترتیب کے مطابق آیات و سور کو لکھتے جاتے۔ کتابت حدیث کا بھی قرآن جیسا نہ سہی لیکن اہتمام ضرور تھا، اس لیے بعد میں جمع قرآن اور تدوین حدیث کا کارنامہ منشائے نبوت کے مطابق تھا اور خود ان کے پس پردہ الٰہی مشیت اور ایزدی تائید کارفرما تھی۔ ٹھیک اسی طرح فقہ واصول اور اجتہاد و تقلید کا نقطۂ آغاز بھی عہد رسالت کی ہی دین ہے اور ان کی جڑیں کتاب وسنت کے سمندروں سے پانی لیتی ہیں۔

یہ حدیث اہل علم کے درمیان کافی شہرت رکھتی ہے کہ ۱۰ ھ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ارشاد فرمایا: معاذ! تم امت مسلمہ کے مسائل کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ عرض کی یارسول اللہ! کتاب اللہ کی روشنی میں، حضور نے فرمایا: اگر وہ حکم صراحتاً اس میں نہ ملے تو؟ عرض کیا: آپ کے ارشادات کی روشنی میں، فرمایا: اگر میری حدیث میں بھی تمہیں وہ حکم دستیاب نہ ہو تو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! **اجتهد برائی ولا آلو**۔ میں بے تکلف کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ رسول محتشم کا چہرہ اس جواب سے کھل اٹھا، حضرت معاذ کے مبارک سینے پر دست کرم پھیرتے ہوئے فرمایا:

الحمد الله الذی وفق رسول رسول الله لما يرضیٰ به رسول الله ۔ اللہ تعالیٰ کا بے پناہ شکر و احسان کہ اس نے اپنے رسول کے ترجمان کو ایسی اچھی فکر کی توفیق دی، جس سے اس کا رسول راضی ہے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم (مشکوٰۃ۔ کتاب الامارہ)

اس حدیث کا روشن مفہوم یہی ہے کہ فقہ واجتہاد وقت کی ضرورت ہے اور اسلام کی تفہیم کا شاندار ذریعہ، جسے بارگاہ نبوت کی بھرپور تائید حاصل ہے اور اسی کے ذریعہ اسلام کے مستحکم اصول ہر زمانے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان بنتے ہیں۔ یہی نرمی اسلامی قوانین کو قبول دوام اور ہر ماحول میں انضمام کا سہرا عطا کرتی ہے۔

عہد رسالت کے بعد عہد صحابہ کی روش بھی فقہ واصول کی بنیاد میں مستحکم کرتی نظر آتی ہے۔ سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں صحابی رسول حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (گورنر) کو ایک طویل فرمان بھیجا، جس میں یہ ہدایت بھی تھی

الفهم الفهم فی ما يختلج فی صدرک مما لم يبلغک فی القرآن والسنة۔ اعرف الأمثال والاشباه ثم قس الامور عند ذلک فاعمد الیٰ احبها الی الله واشبهها بالحق فی ماتری (تاریخ علم فقہ مفتی سید عمیم الاحسان، ڈھاکہ ص:۱۲) اچھی طرح سمجھ کر فیصلہ کرو بالخصوص اس مسئلہ میں جو تمہارے

دل میں تردد کا سبب بن رہا ہو، قرآن وسنت سے وہ بات تم کو معلوم نہ ہوئی ہو، ایسے موقع پر ملتے جلتے یک دوسرے سے مشابہ مسائل کو پہچانو پھر اس وقت مسائل میں قیاس سے کام لو اور جو جواب تم کو اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور حق سے زیادہ قریب نظر آئے، اس کو اختیار کرو۔

علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین (تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین کے طریقوں کی پیروی لازم ہے) کی روشنی میں ان دونوں بیانات سے خوب اندازہ ہوتا ہے کہ حضرات ائمہ نے فقہ واصول کی تدوین کر کے اپنے لیے اور ساری امت کے لیے کیسی سعادت کا سامان کیا ہے اور امت مسلمہ کی کیسی دستگیری فرمائی ہے۔

فقہ واصول کتاب وسنت کے عصری تقاضوں کی کیسی خدمت کرتے ہیں اور ان پر کتاب وسنت کا فیض بار سائبان کس طرح سایہ کناں ہے۔ اس کا اندازہ اسی بات سے کیجیے کہ فقہ واصول کی چار بنیادیں ہیں (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ (۳) اجماع (۴) اور قیاس۔ ان میں کتاب وسنت تو بنیادی مصادر ہیں اور اجماع وقیاس کتاب وسنت کی تائید سے مزین اور مستفاد۔ اجتہاد صرف اس صورت میں ہوتا ہے، جب کسی مسئلے کا حکم کتاب وسنت میں صراحتاً نظر نہ آئے تو نظائر وامثال پر اس مسئلے کو پیش کر کے اس کا شرعی حکم دریافت کرتے ہیں۔ اس لیے فقہ واصول کی تدوین اور اسے منشائے شریعت کی تکمیل کی خاطر مشیت الٰہی کی تائید سے عمل میں آئی۔ اس کے بغیر اسلامی احکام کی مکمل تفہیم ناممکن ہے۔ حضرت امام سلیمان اعمش رضی اللہ تعالیٰ عنہ زبردست محدث اور حضرت امام اعظم کے استاذ ہوتے ہیں۔ حضرت امام اعظم آپ سے بہت مانوس تھے، ایک مرتبہ آپ حضرت اعمش کی محفل میں حاضر تھے، کسی شخص نے حضرت امام اعمش سے کچھ مسائل دریافت کیے، انہوں نے امام اعظم سے پوچھا کہ آپ ان مسائل کے بارے میں کیا کہتے ہیں، حضرت امام اعظم نے ان سب مسائل کے شرعی احکام بیان فرما دیے۔ امام اعمش نے حیرت سے پوچھا: یہ کہاں سے کہتے ہو؟ فرمایا: آپ ہی کی بیان کردہ ان احادیث سے اور وہ احادیث سندوں کے ساتھ بیان فرما دیں۔ امام اعمش نے فرمایا: بس بس! میں نے آپ سے جتنی حدیثیں سو دن میں بیان کیں، آپ نے وہ سب ایک دن میں سنا ڈالیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ ان احادیث پر عمل کرتے ہیں۔ اے گروہ فقہا تم طبیب ہو اور ہم محدثین عطار اور اے نوجوان! تم نے دونوں (حدیث اور فقاہت) کو حاصل کیا۔ (خیرات حسان ص ۶۷)

جس طریقے سے قرأت قرآنی کے لہجوں میں اختلاف کی وجہ سے اہل عجم کا اس آسمانی صحیفے میں الجھنا تدوین قرآن کا سبب بنا، حضرات صحابہ کا تسلسل کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونا اور ان کے رواۃ میں اختلاف تدوین حدیث کا باعث تھا، وضع حدیث کے فتنے سے احادیث کے سرمائے کو محفوظ کرنے کے لیے اسماء الرجال کا فن مدون ہوا۔ اسی طرح کتاب وسنت کے معانی کی تفہیم میں اختلاف۔ فقہائے صحابہ کے فتاویٰ میں اختلاف اور کتاب وسنت سے مسائل کے استنباط کے طریقوں میں اختلاف نے ایسی فضا پیدا کی، جس کی وجہ سے اسلام کے ہمدردوں کو ایسے اصول استنباط وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، جن کی روشنی میں آسانی کے ساتھ مسائل کے احکام دریافت کیے جا سکیں اور درست فیصلے تک پہنچا جا سکے۔

حضرات تابعین کی اخیر صفوں نے فقہ واصول کی تدوین کی سمت توجہ فرمائی اور اس کاروان سعادت کی سرخیل، امام الائمہ، سراج الامۃ کاشف الغمۃ، سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات قدسی صفات ہے، جن کے نور باطن سے آج بھی دنیا درخشانیوں کی سوغات حاصل کر رہی ہے۔ حضرت امام مزنی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"ابو حنیفة اول من دون علم الفقه و افرده بالتالیف من بین الاحادیث النبویة و بوبه فبدأ بالطهارة ثم بالصلوة ثم بسائر العبادات ثم المعاملات الی ان ختم الکتاب بالمواریث و قفاه فی ذلک مالک بن انس وقفاه ابن جریج و هشام

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تدوین فقہ میں اولیت کا مقام حاصل ہے جنہوں نے اس علم کو احادیث نبویہ سے اخذ کر کے الگ ممتاز فن کی شکل عطا کی اور اس کے ابواب متعین کیے۔ سب سے پہلے باب طہارت کے مسائل رقم کیے، پھر نماز کے پھر ساری عبادات کے ان کے بعد معاملات کے، یہاں تک کہ میراث کے مسائل پر فقہی ابواب کا اختتام فرمایا۔ اسی طرز تدوین وترتیب کو بعد میں حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر حضرت ابن جریج اور حضرت ہشام قدس سرہما نے اختیار فرمایا (تاریخ علم الفقہ۔ عمیم الاحسان)

فقہی مسائل کے استنباط اور اس فن کی تدوین کا اندازہ کی تھا،

کسی ایک فقہی باب کے مسائل اٹھائے جاتے، ایک ایک مسئلہ قرآن وحدیث کے معیار پر پرکھا جاتا- گرما گرم بحثیں ہوتیں، اس محفل بحث و استنباط میں ہر ایک کو شمولیت کی اجازت نہیں بلکہ اسلامی علوم کے اعلی ماہرین اور نور باطن سے سرفراز ایسے تقدس مآب چالیس افراد اس تدوین بورڈ میں شامل تھے جو اپنی نظیر آپ تھے اور ہر ایک درجہ اجتہاد پر فائز- قول فیصل حضرت امام اعظم کا ہوتا، اس مجلس تدوین کے استناد کے لیے مشہور محدث حضرت وکیع بن الجراح کا یہ بیان کافی ہے-

"كيف يقدر ابو حنيفة ان يخطی ومعه مثل ابی يوسف و زفرومحمد فی قياسهم و اجتهاد هم و مثل يحیٰ بن ابی زائدة وحفص بن غياث و حبان ومندل فی حفظهم للحديث و معرفتهم به والقاسم بن معن يعنی ابن عبد الرحمن بن عبد الله بن مسعود فی معرفته باللغة والعربية وداؤد بن نصير الطائی و فضيل بن عياض فی زهد هما وور عهما فمن كان اصحابه هؤلاء وجلسائه لم يكن ليخطی لانه ان اخطا ردوه الی الحق (جامع المسانید ص ۳۳) امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کام میں غلطی کیسے باقی رہ سکتی ہے، جبکہ واقعہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ ابو یوسف، زفر اور محمد جیسے لوگ قیاس واجتہاد کے ماہر موجود تھے اور حدیث کے باب میں یحیٰ بن زکریا زائدہ، حفص بن غیاث حبان اور مندل جیسے ماہرین حدیث ان کی مجلس میں شریک تھے اور لغت وعربیت کے ماہرین میں قاسم بن معن یعنی عبد الرحمن بن عبد اللہ بن مسعود کے صاحبزادے جیسے حضرات شریک تھے- اور داؤد بن نصیر طائی اور فضیل بن عیاض جیسے لوگ تقویٰ وورع اور زہد و پرہیز گاری رکھنے والے موجود تھے، تو جس کے رفقائے کار اور ہم نشین اس قسم کے لوگ ہوں، وہ غلطی نہیں کرسکتا- کیوں کہ غلطی کی صورت میں صحیح امر کی طرف یہ لوگ یقیناً واپس کردیتے ہوں گے-

فقہ واصول دونوں کی تدوین کا آغاز ساتھ ہی ہوا کیونکہ اصول کی روشنی میں ہی مسائل کا استخراج ہوتا ہے لیکن ممتاز فن کی حیثیت سے اصول نے اپنی شناخت ذرا بعد میں بنائی- حضرت امام اعظم کے ممتاز مجتہد تلامذہ سیدنا امام ابو یوسف اور امام محمد نے اصول فقہ کے باب میں تحریریں چھوڑی ہیں- حضرت امام مالک نے بھی موطا میں اس فن کے بعض قواعد کی جانب واضح اشارات دیے ہیں- لیکن اصول فقہ کے باب میں ممتاز تصنیف کی شکل میں حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تحریر فرمودہ "الرسالۃ" سامنے آیا، جسے خاصی شہرت ملی، یہاں تک کہ ابن خلدون جیسے محقق کو یہ گمان ہوگیا کہ اس فن کی تدوین کا سہرا حضرت امام شافعی کے سر ہے- وہ لکھتے ہیں

"اصول فقہ پر سب سے پہلے امام شافعی نے قلم اٹھایا اور اپنا مشہور الرسالۃ قلم بند کیا، جس میں اوامر ونواہی، بیان وخبر، نسخ، علۃ القیاس کے حکم وغیرہ پر بحثیں کیں، پھر فقہائے حنفیہ نے مبسوط کتابیں تالیف کیں، جن میں اصول فقہ کے قواعد وضوابط وضاحت وتفصیل سے ساتھ مقرر ومدون کیے اور دوسری طرف متکلمین نے بھی اسی طرح کی کتابیں تصنیف کیں   غرض فقہائے حنفیہ کو فقہی باریکیوں پر دسترس اور مسائل فقہیہ سے اصول فقہ کے قواعد وقوانین اخذ کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے-(تاریخ افکار وعلوم اسلامی- راغب طباخ ۲/۳۰)

لیکن مشہور شافعی مورخ ابن خلکان اس فن کی تدوین کا سہرا حضرت امام ابو یوسف کے سر باندھتے ہیں- ان کا بیان دیکھیے.

"سب سے پہلے انہوں نے (امام ابو یوسف) فقہ حنفی سے متعلق اصول فقہ کی تحریری بنیاد رکھی اور مسائل کا املا کرایا اور ان کی اشاعت ہوئی اور تمام اطراف اور بلاد وامصار میں امام ابو حنیفہ کا علم پھیل گیا (تاریخ افکار وعلوم اسلامی، راغب طباخ- ۲- ۳۳)

حضرات محققین نے خوب فرمایا

"فقہ کی کاشت سیدنا عبد اللہ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی حضرت علقمہ نے اس کی آبیاری کی، حضرت ابراہیم نخعی نے اس کھیتی کو کاٹا، حضرت حماد نے اس کی بھوسی اتاری، حضرت امام اعظم نے اسے باریک پیسا، حضرت امام ابو یوسف نے اسے گوندھا اور حضرت امام محمد بن حسن شیبانی نے اس کی روٹیاں پکائیں- اب ساری امت ان روٹیوں سے شکم سیر ہورہی ہے" (فتاویٰ ملک العلماء، ص ۲۴)

اجتہاد وتدوین فقہ کے سارے معاملات محض کتاب وسنت کی تفہیم اور مسائل حیات کی اسلامی تشریح اور تحلیل کے لیے عمل میں لائے گئے اور کتاب وسنت کی روشنی میں احکام شریعت بتائے گئے- البتہ خدا داد شعور شریعت اور تفقہ کی نعمت سے ضرور استفادہ رہا، اس لیے یہ کارنامے تو ان بزرگوں کے ہیں- لیکن یہ سارے احکام علوم نبوت کا فیضان اور کتاب وسنت اور شریعت کے احکام ہی شمار ہوں گے- ان کی

پیروی اللہ اور رسول کے حکم کی پیروی ہی کہی جائے گی- انہیں اسلام سے الگ کسی غیر کی فقہ سمجھنا سرسر نادانی ہے اور اسلامی فہم وشعور سے بے گانگی- حضرات ائمہ اسی لیے تو ہمارے مقتدا اور مقدس پیشوا ہیں کہ یہ حضرات بارگاہ خدا اور رسول سے زیادہ قرب رکھتے ہیں- ان کا قرب الٰہی دیکھنا ہے تو حضرت امام اعظم کی حیات مبارکہ کا روشن ورق ہی ملاحظہ کرلیں- آپ حضور کی بشارت ہیں، سارے ممتاز محدثین کے بالواسطہ یا بلا واسطہ استاذ ہیں- آپ کے تلامذہ میں چالیس ایسے جلیل الشان تھے جو منصب اجتہاد پر فائز تھے اور قرب خدا کی اعلیٰ منزل میں رکھتے تھے- آپ نے چالیس سال تک عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی، چالیس سال اس طرح روزہ دار رہے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوسکی- رمضان مقدس میں اکسٹھ ختم قرآن کرتے- ایک ختم دن میں، ایک رات میں اور ایک پورے مہینے کی تراویح میں- آپ سو۱۰۰ بار خواب میں رب تبارک وتعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوئے- قاضی بغداد عمارہ بن حسن نے آپ کو آخر غسل دیا- غسل دیتے جاتے اور یہ کہتے جاتے تھے، واللہ تم سب سے بڑے فقیہ، سب سے بڑے عابد، سب سے بڑے زاہد تھے، تم میں تمام خوبیاں جمع تھیں، تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کردیا ہے کہ وہ تمہارے مرتبے کو پہنچ سکیں- (نزہۃ القاری ۱۶۳/۱) اجلہ اولیائے کرام جیسے حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت شقیق بلخی، حضرت معروف کرخی، حضرت بایزید بسطامی، حضرت فضیل بن عیاض، حضرت عبداللہ بن مبارک ولی، حضرت وکیع بن جراح، حضرت شیخ الاسلام ابوبکر بن وراق، حضرت سلطان الہند خواجہ سید معین الدین حسن چشتی اجمیری سنجری حنفی رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے آپ کی اقتدا کو باعث فخر جانا- آپ جلیل الشان تابعی ہیں جنہوں نے متعدد صحابہ کرام کی زیارت کا شرف حاصل کیا- اسی تقدس اور طہارت کا اثر تھا کہ آپ کی دینی فکر اور شرعی خدمات کو ایسا قبول عام حاصل ہوا کہ دو تہائی اسلامی دنیا آپ سے شرف نیاز رکھتی ہے اور حنفی کا لقب ان کے لیے باعث افتخار اور دین ودنیا کا سرمایۂ سعادت ہے- صاحب مجمع البحارین ،،قوامی شہرت یافتہ ہندی شافعی محدث اور فقیہ علامہ محمد طاہر فتنی (م۹۸۶ھ) نے ''المغنی'' میں بہت پیاری بات فرمائی ہے-

"فلو لم يكن للّٰه سر خفي فيه لما جمع له شطر الاسلام او ما يقاربه على تقليده حتى عبدالله بفقهه و عمل برائه الى يو منا ما يقارب اربع مائة و خمسين سنة و فيه اول دليل على صحته" (المغنى ص: ۸۰)

اگر اس مذہب حنفی میں اللہ تعالیٰ کی قبولیت کا راز پوشیدہ نہ ہوتا تو نصف یا اس کے قریب مسلمان اس مذہب کے مقلد نہ ہوتے- ہمارے زمانے تک، جس کو امام صاحب سے تقریباً ساڑھے چار سو برس کا عرصہ ہوتا ہے، ان کی فقہ کے مطابق اللہ وحدہ کی عبادت ہورہی ہے اور ان کی رائے پر عمل ہورہا ہے- یہ اس مذہب کے عنداللہ مقبول اور صحیح ہونے کی شاندار دلیل ہے''-

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ) کے علاوہ امام مالک بن انس (م۱۷۹ھ) امام محمد بن ادریس شافعی (م۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) حضرت سفیان ثوری (م: ۱۶۱ھ) امام لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ) امام ابوثور (م ۲۴۰ھ) امام عبدالرحمن بن عمر اوزاعی (م ۱۵۷ھ) نامور مجتہد فقہا گزرے ہیں، یہ بھی ائمہ قرآن وحدیث کے بہترین شناور، احادیث طیبہ سے بہرہ مند ماہر علم وادب کے امام، زہد وتقویٰ کے نورانی منارے ہیں، جن سے دنیا سطح پر رہنمائی حاصل کرتی رہی- یہ بے نفس بزرگ کوئی ایسی بات دین واسلام کے تعلق سے کیسے فرما سکتے ہیں، جو قرآن وحدیث سے مطلوب سے ہٹ کر ہو، جبکہ ان کا امتیاز ہے کہ مخلوق خدا میں سب سے زیادہ خشیت الٰہی انہیں کا حصہ ہے- انما يخشى الله من عباده العلماء- حضرت امام اعظم کا صاف ارشاد ہے: اذا صح الحديث فهو مذهبي جب کوئی حدیث صحت سند کے ساتھ دستیاب ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے- حضرت امام شافعی نے مکہ معظمہ میں ایک مرتبہ فرمایا

''جو چاہو، مجھ سے دریافت کرو، میں تمہیں کتاب اللہ سے اس کی خبر دوں گا'' (فضائل قرآن مشمولہ کنزالایمان ص: ۹۰) حضرت امام غزالی ایک فقیہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''فقیہ وہ ہے جو دنیا سے دل نہ لگائے اور آخرت کی طرف ہمیشہ راغب رہے، دین میں کامل بصیرت رکھتا ہو، طاعات پر مداومت اپنی عادت بنالے، کسی حال میں بھی مسلمانوں کی حق تلفی برداشت نہ کرے، مسلمانوں کا اجتماعی مفاد ہر وقت اس کے پیش نظر ہو، مال کی طمع نہ رکھے، آفات نفسانی کی باریکیوں کو پہنچانتا ہو، عمل کو فاسد کرنے والی چیزوں سے بھی باخبر ہو، راہ آخرت کی گھاٹیوں سے واقف ہو، دنیا کو حقیر سمجھنے کے

ساتھ ساتھ اس پر قابو پانے کی قوت بھی اپنے اندر رکھتا ہو، سفر و حضر اور جلوت وخلوت میں ہر وقت دل پر خوف الٰہی کا غلبہ ہو (احیاء العلوم)

ایک غیر مجتہد فقیہ کے جب یہ اوصاف مطلوب ہیں تو پھر مجتہد فقیہ کے لیے اوصاف کی کیسی کوالیٹی مطلوب ہوگی، اس کا ہر باشعور شخص اندازہ کر سکتا ہے، اس لیے ان ائمہ کرام کے سارے معاملات اللہ اور رسول کی رضا میں گم ہیں-وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے-گفتۂ او گفتۂ اللہ بود، ان کا امتیاز ہے-یہ حضرات یا تو قرآن حکیم سے نور لیتے ہیں یا حدیث پاک سے روشنی-پھر اپنی بصیرت آشنا ژرف نگاہی سے علوم شریعت کی غواصی کر کے امت مسلمہ کے لیے آسانیاں فراہم کرتے ہیں-ان کی اقتدا ایسے نفوس قدسیہ کی پیروی ہے جس کی دعا ہر نماز میں کی جاتی ہے **اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم** یہ انعامات الٰہیہ سے سرفراز حضرات ہیں، جن کی اقتدا کا ہمیں حکم دیا گیا ہے-**واتبع سبیل من اناب الی و کونوا مع الصادقین** اسی گروہ کے اشارے ہیں، اس لیے ان کی اطاعت دراصل حکم الٰہی کی تعمیل ہے-وہ بے نصیب لوگ ہیں جو ان حضرات سے دامن کشاں گزرتے ہیں-

یہاں اس گوشے کی وضاحت کر کے اپنی بات مکمل کرتا ہوں کہ جب کتاب وسنت کے سرچشمے قیامت تک تازہ اور رواں دواں ہیں تو پھر قرن اول اور ثانی کے ائمہ مجتہدین کی پیروی ہی کیوں کی جائے-بعد کے دور میں بھی تو اہل اجتہاد پیدا ہوں گے جو دور حاضر کے نت نئے مسائل کو اپنی خداداد صلاحیتوں کی روشنی میں حل کرتے ہیں-ساری دنیا چار فقہی مذاہب حنفی شافعی مالکی حنبلی میں ہی کیوں محدود رہے-اس سلسلے میں پہلے یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ دوسری صدی ہجری میں صرف چار فقہی مذاہب ہی نہیں تھے اور حضرات ائمہ مجتہدین میں ائمہ اربعہ کا ہی شمار نہیں ہوتا تھا بلکہ بیسوں اکابر اسلام ایسے تھے جو منصب اجتہاد پر فائز تھے بلکہ کئی ایک دیگر ائمہ کے مذاہب چھپے بھی-کوفہ میں حضرت سفیان ثوری، مصر میں امام لیث، بغداد میں ابو ثور، اندلس اور دمشق میں امام اوزاعی کے متبعین پائے جاتے تھے لیکن ان حضرات ائمہ کو تسلسل کے ساتھ متبعین دستیاب نہیں ہوسکے کہ ان کا مذہب ہمارے دور تک پہنچتا، نہ ان کے افکار کو ان کے اخلاف نے تحریری طور سے منضبط کیا، اس لیے ان ائمہ کے فقہی مسائل رفتہ رفتہ زمانے کی تہوں میں گم ہوتے چلے گئے-جب ان کے ذخائر افکار اور مستنبط مسائل ساری ضروریات حیات اور اسلامی گوشوں کو محیط ہو کر محفوظ ہی نہیں رہے تو بھلا امت اسے اپنائے گی کیسے؟ جبکہ رائج چاروں فقہی مذاہب اپنی مکمل تفصیلات کے ساتھ سارے فقہی ابواب پر محیط ہو کر اب بھی جوں کے توں محفوظ ہیں، بلکہ آئے دن ان کے ذخائر میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے-بلا مبالغہ ہر فقہی مذہب کی تفصیلات اور تشریحات پر مشتمل اب تک لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس لیے ساری صحیح العقیدہ دنیا ان چاروں مذاہب کے دائرے میں سمٹی سمٹائی ہے-

رہ گئی قرآن وحدیث کی شاہراہ سعادت تو وہ قیامت تک ہر زمانے میں امت کے لیے کشادہ ہے، اس کا در کبھی بند نہیں ہوا-لیکن ان سمندروں سے تب وتاب والے گہر ہائے ثمین نکالنے والے اہل ظرف عرصے سے مفقود ہیں-ان کی مجتہدانہ شناوری کے لیے جس معیار کا علمی شعور چاہیے وہ اہل نظر کی نگاہ میں تیسری صدی ہجری کے بعد سے دستیاب نہیں-اگر رب قادر کوئی ایسا بندہ پیدا کردے، جو ان تمام گوشوں پر حاوی ہو جو اجتہادی صلاحیت کے لیے درکار ہوتے ہیں تو وہ بے تکلف اجتہاد کر سکتا ہے-

حضرت ائمہ مجتہدین عہد رسالت سے قرب کی بدولت جو انشراح صدر رکھتے تھے، اس کے دستیاب ہونے کی تو اب کوئی صورت ہی نہیں ہے، لیکن کتاب وسنت کی جتنی واقفیت اور علوم وآداب کے جن گوشوں کی ابھی نشاندہی ہوئی، کیا اب کوئی ایسا نظر آتا ہے، جو ان فنون وآداب سے واجبی سی واقفیت بھی رکھتا ہو چہ جائیکہ ان میں اسے مہارت کی گیرائی حاصل ہو، پھر بہت سے ایسے علوم ہیں، جو زمانے کی تہوں میں دفن ہو کر رہ گئے اور اہل علم انہیں اپنے سینوں میں لے کر قبر کی آغوش میں جا سوئے، خود حدیث پاک اس بات کی نشاندہی فرماتی ہے کہ جوں جوں قیامت کا زمانہ قریب آتا جائے گا، علم کی گہرائی کم ہوتی جائے گی-ارشاد رسالت ہے

ان اللہ لایقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد و لکن یقبض العلم بقبض العلماء (مشکوۃ شریف، ص:۳۵)

اللہ تعالیٰ بندوں سے علم کی گہرائی کو یوں نہیں ختم کرے گا کہ ان کے دلوں سے علم چھین لے بلکہ جیسے جیسے جید علماء دنیا سے اٹھتے جائیں گے، ان کا علم بھی ان کے ساتھ رخصت ہوتا جائے گا (پھر بعد میں ان کا

کوئی جانشین اور ان جیسا علم والا نہیں پیدا ہوگا- اس طور سے علم کی گہرائی رفتہ رفتہ ختم ہوتی جائے گی)

جب اجتہاد کی بنیادی شرطیں ہی مفقود ہیں تو پھر اجتہاد کا جواز ہی کیا رہ جاتا ہے؟ لیکن یہیں دوسرا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ جب اجتہاد امکانی سطح پر نہ رہی، عملی سطح پر بھی گم ہے تو پھر نت نئے پیش آنے والے مسائل کا کیا ہوگا، انہیں کون حل کرے گا؟ یہاں تو پھر وہی جمود نکل آیا جسے دور کرنے کے لیے فقہ واصول کی تدوین ہوئی تھی اور اسلامی قوانین کا Flexible رخ سامنے آیا تھا- اس کی توضیح یہ ہے کہ مجتہد مطلق کی شرطیں تو صدیوں سے مفقود ہیں لیکن ائمہ کے متعین کردہ اصول استنباط کی روشنی میں آنے والے مسائل کی تشریح کرنے والے اصحاب بصیرت پیدا ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے، جو اپنی مومنانہ فراست سے امت کے درد کا علاج پیش فرماتے رہیں گے- اسی لیے اہل نظر نے فقہائے کرام کے سات طبقات متعین کیے ہیں

۱- مجتہد فی الشرع/مجتہد مطلق مستقل یہ فقہائے اسلام کا وہ طبقہ ہے جنہیں اصولی قواعد کی تاسیس، کتاب وسنت، اجماع اور قیاس سے فرعی احکام کے استنباط کی ذاتی سطح پر استعداد حاصل ہو، اور وہ اصول وفروع میں کسی کی تقلید کے محتاج نہ ہوں- جیسے سراج الامۃ امام اعظم ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) وغیرہ)

۲- مجتہد فی المذہب/مجتہد مطلق غیر مستقل:- یہ ایسے فقہاء ہوتے ہیں جن میں مجتہد مطلق کی ساری صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں لیکن وہ خود کو اصول میں کسی مجتہد مطلق کا تابع رکھتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے اصول کی روشنی میں کتاب وسنت، اجماع اور قیاس سے مسائل کے استخراج کی صلاحیت رکھتے ہیں- یعنی اصول میں مقلد ہوتے ہیں اور فروع میں مجتہد- جیسے حضرت امام ابو یوسف (م ۱۸۳ھ) امام محمد (م ۱۸۹ھ) امام عبد اللہ بن مبارک (م ۱۸۱ھ) وغیرہ تلامذۂ امام اعظم قدست اسرارہم-

۳- مجتہد فی المسائل/مجتہد مقید:- ایسے فقہاء اس زمرے میں آتے ہیں جو اصول وفروع دونوں میں مجتہد مطلق کے تابع ہوں اور ان کے وضع کردہ اصول وفروع کی روشنی میں ایسے مسائل کا استنباط کر سکتے ہوں، جن کے بارے میں ائمہ مذہب سے کوئی روایت نہیں ملتی- جیسے امام ابو بکر خصاف (م ۲۶۱ھ) امام ابو جعفر طحاوی (م ۳۲۱ھ) امام ابو الحسن کرخی (م ۳۴۰ھ) شمس الائمہ حلوائی (م ۴۵۶ھ) شمس الائمہ سرخسی (م ۵۰۰ھ) امام فخر الاسلام بزدوی (م ۴۸۲ھ) امام فخر الدین قاضی خاں (م ۵۹۲ھ)

۴- اصحاب تخریج حضرات فقہاء کا یہ طبقہ اجتہاد واستنباط مستقل کی قدرت نہیں رکھتا، البتہ ان کی مذہب کے وضع کردہ سارے اصول وفروع پر گہری نگاہ ہوتی ہے، جس کی روشنی میں یہ مجمل کی تشریح، محتمل کی تعیین مثالوں کے حوالے سے کر سکتے ہیں- حضرت امام ابو بکر احمد بن علی رازی (م ۳۷۰ھ) اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں

۵- اصحاب ترجیح - یہ حضرات اصحاب تخریج سے کم تر مقامات کے حامل ہوتے ہیں اور امام مذہب سے منقول روایات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں- جیسے امام ابو الحسن قدوری (م ۴۲۸ھ) صاحب ہدایہ امام ابو الحسن علی بن ابی بکر فرغانی مرغینانی (م ۵۹۳ھ) وغیرہ-

"ھذا اولیٰ، ھذا اصح، ھذا اوضح، ھذا اوفق للقیاس، جیسے اقوال ان کی پہچان ہوتے ہیں-

۶- اصحاب تمیز فقہاء کا یہ گروہ مذہب کے قوی اور ضعیف، مقبول اور مردود اقوال میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے- ظاہر الروایہ اور نادر روایات کے درمیان امتیاز کی قدرت ان میں موجود ہوتی ہے، جیسے اصحاب متون معتبرہ مثلاً صاحب مختار، صاحب وقایہ، صاحب مجمع وغیرہ-

۷- مقلد محض - جن میں مذکورہ بالا کوئی صلاحیت موجود نہ ہو، ان حضرات کا ذاتی قول قابل عمل نہیں ہوتا، بس یہ امام مذہب سے اقوال نقل کر سکتے ہیں، جیسے موجودہ دور کے بیشتر محبان فقہ

(فتاوی ملک العلماء ۲۵-۲۶)

ان میں ایسے ایسے افراد شامل ہیں، جن کی جوتیوں کی خاک بھی آج کے غیر مقلدین کو نصیب نہیں لیکن ان سب فضائل وکمالات کے باوجود یہ حضرات ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی کے مقلد ہی رہے- خود حضرت امام بخاری جنہیں چھ لاکھ احادیث مبارکہ مع سند، رجال اور متن کی ساری جزئیاتی تفصیلات کے ساتھ یاد تھیں، سیدنا امام شافعی کے مقلد تھے، تو یہ غیر مقلد حضرات بخاری شریف کی تین ساڑھے تین ہزار حدیث کی زیارت کرکے مجتہد ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں! یہاں حضرت [illegible] رشید القادری کا وہ جملہ یاد آتا ہے کہ حضرت امام

بخاری، بخاری شریف محض بخاری مقلد ہی رہے اور یہ غیر مقلد صاحبان بخاری شریف کو صدیوں میں حجت کر مجتہد بنے پھرتے ہیں''۔ غیر مقلدین کی فکری بے کلی اس بات سے بھی نمایاں ہے کہ وہ جو بھی کہتے ہیں، وہ انہیں حضرات ائمہ میں کسی کا قول ہوتا ہے۔ اگر واقعی دعوائے اجتہاد رکھتے ہیں تو ان حضرات ائمہ سے جدا گانہ کوئی ممتاز حکم دلیل سے ثابت کر دکھائیں۔ شاخ و بن سے جدا ہو کر پتے کی بے بسی ایسی ہی ہوتی ہے۔

علامہ سید محمد طحطاوی حنفی نے اپنے حاشیہ در مختار میں بجا تحریر فرمایا:

هذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم في مذاهب اربعة وهم الحنفيون والمالكيون والشافعيون و الحنبليون رحمهم الله تعالى و من كان خارجا عن هذه الاربعة في هذا الزمان فهو من اهل البدعة والنار (حاشيه الطحطاوي على الدر ۴ ۱۵۳ كتاب الذبائح)

امت کا نجات یافتہ طبقہ اب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی چار مذہب میں منحصر ہے۔ جو اس زمانے میں ان چار گروہ سے خارج ہو وہ بد مذہب ہے اور جہنم کا مستحق''۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دین و شریعت کی فہم، پختہ شعور، حسن ادب اور گرامی توفیق سے سرفراز فرمائے اور ہدایت یافتہ حضرات کی صفوں میں باقی رکھے۔ آمین

مولانا یٰسین اختر مصباحی☆

تقلیدِ فقہی: حقیقت، نوعیت اور ضرورت

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دینِ اسلام کی مذہبی و علمی اور عملی تعبیر و تشریح ہیں۔ عقائد و مبادی اور احکام و مسائل کے سرچشمے ہیں اور پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جملہ احوال و قضایا اور شعبہ ہائے حیات میں اُسوہ و قدوہ اور نمونۂ کامل ہیں جن کا ہر قول و فعل و عمل صحابۂ کرام اور قیامت تک کی امتِ مسلمہ کے لئے دلیل و حجتِ شرعی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک دین اسلام ایک ہی ہے اور یہی دین اسلام قیامت تک کے لئے اللہ کا محبوب اور منتخب دین ہے۔ لیکن ہر صاحب شریعت پیغمبر کو اللہ نے جس شریعت مطہرہ سے نوازا وہ بعد میں اختلاف زمان و مکان کی وجہ سے مشیت الٰہی کے مطابق تغیر پذیر ہوتی رہی جب کہ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اس نے یہ امتیاز و اختصاص بخشا ہے کہ اس کے بعد اب کوئی شریعت جدیدہ نہیں اور یہی شریعت محمدی اپنے کمال و جامعیت کی بنیاد پر جہاں مسلمانانِ عالم کے لئے واجب الاتباع ٹھہری وہیں اپنی زندگی و تابندگی اور تازگی و شادابی کے لحاظ سے بقائے دوام کی خلعت سے بھی سرفراز ہوئی۔ فالحمد للّٰه علیٰ ذلك۔

سنتِ رسول کے ساتھ سنتِ خلفائے راشدین کی اطاعت و اتباع ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسی طرح صحابۂ کرام کی جماعتِ مبارکہ بھی عدول و مقتدائے شریعت و امت ہے جس پر آیات و احادیث کی بے شمار ہدایات ناطق و شاہد ہیں اور ساری امتِ مسلمہ کا اسی کے مطابق اعتقاد و عمل ہے اور اسی پر اس کا اجماع بھی ہے۔ اس سفینۂ نوح پر جو سوار ہوا وہ ساحلِ مراد کو پہنچا اور جس نے ان نجوم ہدایت کی روشنی میں اپنا سفرِ حیات شروع کیا وہ کامیابی و کامرانی کے ساتھ اپنی منزل مقصود سے ہم کنار ہوا۔

تعقل، تفکر، تدبر اہلِ اسلام کے لئے بموجب ہدایات و ارشاداتِ کتاب و سنت ہر عہد و قرن میں ضروری ہے اور ان کا یہ دینی و شرعی و اجتماعی فریضہ ہے کہ اسرار و رموزِ حیات و کائنات میں غور و خوض کر کے ان کی گتھیاں سلجھائیں اور انسانی معاشرہ کی صلاح و فلاح کے لئے وہ تمام تر تدابیر بروئے کار لائیں جن کی انہیں کچھ بھی ضرورت و حاجت محسوس ہو اور بنی نوع انسان کے حق میں کسی بھی جہت سے جس امر مطلوب کی کوئی بھی افادیت و اہمیت متصور ہو۔ لیکن تحقیق و تفحص و اکتشاف و ایجاد اور اقدام و عمل کے ہر مرحلے میں قدم قدم پر اس کی رعایت اور اس کا التزام ہر مسلمان کے اوپر واجب ہے کہ اسلام و شریعت مطہرہ نے جو اصول و قواعد و ضوابط مقرر فرما دیے ہیں اور جو ہدایات جاری فرما دی ہیں ان کی کسی طرح خلاف ورزی نہ ہو اور الحاد و اعتزال و انحراف و ضلال و تجاوز و خروج سے اپنے آپ کو ہر قیمت پر محفوظ رکھا جائے۔

مہد سے لحد تک عقائد و عبادات و معاملات کے جو دائرے اسلام و شریعت مطہرہ نے متعین کر دیے ہیں ان کی پابندی فرض شرعی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی اطاعت و اتباع سے کسی مسلمان کو کسی حال میں مفر نہیں۔ اسی طرح کتاب و سنت سے ثابت و واضح احکام و مسائل میں کسی کی ذاتی رائے اور قیاس آرائی کا کوئی دخل نہیں۔ نہ ہی ان کے اندر کسی بڑے سے بڑے عالم و فقیہ و مجتہد کو مجال دم زدن و جرأت این و آں و جسارت چنیں و چناں کی کوئی گنجائش ہے۔

عقائد میں کسی مجتہد کی تقلید جائز نہیں نہ ہی عبادات توقیفیہ میں کسی طرح کی تقلید کا کوئی دخل ہے۔ یعنی کتاب و سنت سے ثابت اور منصوص احکام میں تقلید کا کوئی جواز نہیں۔ نہ عہد رسالت و عہد صحابہ میں زمانہ مابعد کی اصطلاحی تقلید فقہی کا نام تھا نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔ کیوں کہ ان کے اقوال و اعمال براہ راست وحی ربانی اور مشکاۃ نبوت سے مستنیر ہوا کرتے تھے۔ ہاں! صحابۂ کرام کے مراتب و مدارج علم و فہم متفاوت تھے اس لئے اعلم و افقہ صحابۂ کبار سے دیگر صحابۂ کرام مسائل شرعیہ میں رجوع کیا کرتے تھے اور ان کے بیان کردہ احکام و مسائل کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔

اعلم و افقہ کی طرف رجوع و سوال کا حکم خود رب کائنات نے دیا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے

فسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون (سورۃ النحل آیت ۴۳)

تو اے لوگو علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں۔

اور تفقہ کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے

و ماکان المومنون لینفروا کافۃ. فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین و لینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون. (سورۃ التوبہ. آیت ۱۲۲)

اور مسلمانوں سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب نکلیں تو کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈر سنائیں اس امید پر کہ وہ بچیں۔

اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں

انما شفاء العیّ السوال. (ابوداؤد) مرض جہل کا علاج سوال ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو دعا دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اللھم فقھہ فی الدین و علّمہ التاویل. (الحدیث)

اے اللہ! انھیں دین کی فقاہت اور تفسیر و تاویل کا علم عطا فرما۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بارگاہ رسول کی ملازمت اور کثرت اکتساب کی وجہ سے جلیل القدر صحابۂ کرام کے درمیان اپنی دینی بصیرت اور تفقہ کے باب میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود کے بارے میں فرمایا

لاتسئلونی مادام ھذا الحبر فیکم. (مشکوۃ بروایت بخاری)

جب تک یہ عالم و فقیہ تمہارے درمیان موجود ہیں اس وقت تک مجھ سے نہ پوچھو۔

کتاب و سنت اصل مصادر شریعت ہیں اور انہیں کی روشنی میں قیاسِ مجتہد کو بھی علما و فقہائے اسلام نے مصادر شریعت میں شمار کیا ہے جس کی تائید مندرجہ ذیل حدیث نبوی سے ہوتی ہے۔

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو حاکم یمن بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقت روانگی سوال فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی معاملہ فیصلہ کے لئے لایا جائے گا تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ حضرت معاذ نے عرض کیا کہ کتاب اللہ سے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس میں نہ پاؤ تب کیا کرو گے؟ عرض کیا کہ سنتِ رسول سے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس میں بھی نہ پاسکو تب کس طرح فیصلہ کرو گے؟ اس وقت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

اجتھد برائی ولا آلو. قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ صدرہ و قال. الحمد للہ الذی وفق رسولَ رسولِ اللہ لما یرضیٰ بہ. (ابواب الاحکام للجامع الترمذی. ج ۱. و دارمی و مشکوۃ)

اس وقت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اللہ کا حمد و شکر ہے جس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس کی توفیق دی جس سے اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) راضی ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ظاہری کے بعد لاتجتمع امتی علی الضلالۃ (الحدیث) اور دیگر ارشادات کی روشنی میں عہد تابعین و تبع تابعین ہی میں علما و فقہائے اسلام نے اجماع امت مسلمہ کو بھی مصادر شریعت میں شامل کر لیا۔ اس طرح (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ (۳) قیاس شرعی (۴) اجماع امت۔ یہ چار مصادر شریعت (ادلّہ اربعہ) قرار پائے اور سواد اعظم نے فقہا و مجتہدین امت کے علم و فضل، ان کی دینی و ایمانی فہم و فراست، ان کی دیدہ وری، نکتہ رسی، ان کے ورع و تقویٰ، ان کے حزم و احتیاط، اور ان کی خدا ترسی و مآل اندیشی پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے وضع کردہ اصول و ضوابط و کلیات و جزئیات کو جملہ احکام و مسائلِ غیر منصوصہ میں حرزِ جاں بنایا اور درجہ بہ درجہ و عہد بہ عہد انہیں قبول کرتے اور ان کے مطابق عمل کرتے چلے آ رہے ہیں کہ یہی ہدایت صراط مستقیم و اتباع سبیل مومنین اور ادوار مابعد کی اصطلاحی تقلید ائمۂ مجتہدین ہے۔

مختلف علوم و فنون کی طرح رفتہ رفتہ فقہ اسلامی کے بھی اصول و قواعد مرتب ہوتے گئے اور تفصیلی دلائل کے ساتھ احکام شرعیہ فرعیہ کے جاننے کو علم فقہ کہا جانے لگا اور اصول فقہ کی یہ اصطلاحی تعریف کی گئی کہ

العلم بالقواعد الکلیۃ التی یتوصل بھا الیٰ استنباطِ الاحکام الشرعیۃ العملیۃ من ادلّتھا التفصیلیۃ.

کتاب و سنت کی روشنی میں مقاصدِ شریعت یعنی حفظ دین و نفس و نسل و عقل و مال ان فقہا و مجتہدین کا مطمحِ نظر ہے اور ان کی ساری کد و کاوش اسی محور کے گرد ہمیشہ گردش کرتی رہی ہے۔ مجتہدین کے بھی

طبقات (۱) مجتہدین فی الشریعہ (۲) مجتہدین فی المذھب (۳) مجتہدین فی المسائل (۴) اصحاب تخریج (۵) اصحاب ترجیح (۶) اصحاب تمییز نے انھیں مقاصد شریعت کی تکمیل کی راہ میں اپنی دینی، علمی وفکری واجتہادی توانائیاں صرف کیں اور اپنی عمر عزیز کو اسی تفقہ و اجتہاد کے لئے وقف کردیا۔ نمبر ۲ سے نمبر ۶ تک کے مجتہدین حقیقی طور پر مجتہدین فی الشریعہ کے مقلد فقہی قرار پاتے ہیں۔ اور انھیں کی طرف ان سب مجتہدین اور دیگر مقلدین کا انتساب ہوتا ہے۔

استخراج مسائل شرعیہ کا کام اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ کہ یہ شریعت جاوداں اور پیہم رواں دواں ہے اور ہر عہد و عصر کے مسائل وقضایا کو حل کرنے کی اس کے اندر بھرپور صلاحیت موجود ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ آج آخری درجۂ اجتہاد کے حاملین یعنی اصحاب تمییز کا ملنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ باب اجتہاد بند نہیں ہوا ہے مگر اس کا اہل بھی تو کوئی ہو؟ تعبیر کی غلطی سے اچھے خاصے حضرات کہتے نظر آتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے تو موجودہ علما کو بھی اجتہاد کرنا چاہیے۔ جس سے ان کا مقصد اس کے سوا عموماً کچھ نہیں ہوتا کہ نئے حالات و مسائل کا شریعت کی روشنی میں کوئی حل ڈھونڈھنا چاہیے۔ ان کی یہ خواہش صد فی صد درست ہے مگر انہیں چاہیے کہ لفظ اجتہاد کی بجائے لفظ استخراج کا استعمال کریں تاکہ ان کا لفظ ان کی بات اور ان کا مافی الضمیر صحیح طور پر اور صحیح تناظر میں واضح ہوسکے۔

مذکورہ طبقات میں سے کسی طبقہ میں بلکہ آخری طبقہ (اصحاب تمییز) میں بھی کسی موجودہ عالم ومفتی وفقیہ کے شامل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طبقہ مقلدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور ان کے لئے تقلید فقہی ہر حال میں واجب ہے۔ کیوں کہ دو دو چار کی طرح یہ حقیقت روشن ہے کہ جو شخص مجتہد نہیں وہ مقلد ہے۔ اور تقلید ہی میں اس کے لئے عافیت اور راہ نجات ہے۔

جو شخص علم طب سے واقف نہیں وہ طبیب نہیں۔ جو علم سے نابلد ہے وہ عالم نہیں۔ یہ بات ایک عام آدمی بھی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ سمندر کے اندر موتیوں کی کمی نہیں ہوتی ہے مگر انہیں سمندر کی تہ سے باہر وہی شخص نکال سکتا ہے جو ماہر غوطہ خور ہو۔ ورنہ جسے غوطہ خوری نہ آتی ہو وہ موتیوں کی طلب میں سمندر کے اندر چھلانگ لگا کر اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

تقلید فقہی کا تعلق صرف ابواب فقہ سے ہے۔ اور احکام ومسائل غیر منصوصہ میں ہی اس کا وجود و وجوب ہے۔ باقی علوم وفنون اسلامیہ و عربیہ اور عصری علوم وفنون میں ہر عالم ومحقق اپنی استعداد و لیاقت و صواب دید کے مطابق جو کچھ کرنا چاہے اور جس شعبۂ علم وفن میں آگے بڑھنا چاہے اس کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ ڈاکٹری، انجینئرنگ، سائنس وغیرہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ تحقیق وریسرچ کرے اور اونچے سے اونچے درجہ پر فائز ہو تو یہ اس کی بڑی کامیابی اور قابل رشک ترقی ہے جس پر علما وفقہائے اسلام کی جانب سے کوئی قدغن اور کوئی پابندی نہیں۔ بس صرف اتنی شرط ہے کہ حدود شریعت سے اس کے قدم آگے نہ بڑھنے پائیں۔

لغوی طور پر اپنی گردن میں قلادہ ڈالنے کو تقلید کہا جاتا ہے جب کہ اصطلاحی طور پر تقلید فقہی کی تعریف یہ ہے۔ احکام ومسائل شرعیہ غیر منصوصہ میں کسی امام مجتہد کی تحقیق کو بلا دلیل وحجت مان لینے کا نام تقلید ہے۔ چنانچہ علمائے متقدمین نے صراحت ووضاحت کے ساتھ اپنی مستند کتب ورسائل میں یہی بات تحریر فرمائی ہے جن میں سے چند عبارات درج ذیل ہیں۔

التقلید عبارة عن قبول قول الغیر بلاحجة و لادلیل. (التعریفات للسید الشریف الجرجانی)

التقلید اتباع الرجل غیرہ فیما سمعه یقول او فی فعله علیٰ زعم انه محقق بلانظرٍ فی الدلیل. (نور الانوار بحث تقلید و حاشیہ حسامی باب متابعة الرسول ﷺ)

التقلید هو قبول قولٍ بلاحجة (المستصفیٰ جلد دوم للامام الغزالی)

التقلید العمل بقول الغیر من غیر حجة. (مسلم الثبوت لمحب الله البهاری)

ظاہر ہے کہ جو عالم مجتہد نہیں ہوگا وہ مقلد ہی ہوگا اور اسے تقلید فقہی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جس طرح مختلف علوم وفنون کے ماہرین اپنے علم وفن کے تعلق سے جو تحقیق بیان کریں وہ ان کی علمی وفنی تحقیق کا نتیجہ ہوتا ہے جسے دنیا کے کروڑوں انسان بلاچون وچرا تسلیم کرتے ہیں اور کوئی جاہل ومدعی شخص اگر کج بحثی پر آمادہ ہوتا ہے تو اسے ہر عاقل انسان ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ صدیوں پیشتر کے جلیل القدر علما وفقہائے اسلام بھی تقلید فقہی کے قائل اور اس پر عامل تھے جن کی عظمت و فضیلت دینی وعلمی پر شرق وغرب کے مسلمان متفق ہیں۔ عالم اسلام کے

بڑے بڑے علما وفقہا وفضلا کا اگر آج جائزہ لیا جائے تو ان میں ایسے افراد واشخاص صحیح معنوں میں نادر الوجود ہیں جنھیں کلیات وجزئیات فقہ پر عبور ہو۔ اور بڑے بڑے دار الافتاء کے نامور مفتیان کرام بھی معرفت دلائل تفصیلیہ کے بعد اجرائے فتویٰ کرنے والے اصحاب فتویٰ نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت ناقلین فتاویٰ سے زیادہ نہیں ہے۔

ائمۂ مجتہدین فی الشریعہ یعنی امام ابوحنیفہ وامام شافعی وامام مالک وامام احمد بن حنبل رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مرتبہ ومدون فقہی اصول وضوابط اور ان کی تاصیل وتفریع کو اسلامی بلاد وامصار میں شروع ہی سے اتنا شرف قبول حاصل ہوا کہ سواد اعظم نے انھیں میں سے کسی ایک کی تقلید فقہی پر اتفاق کرلیا اور تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزرا کہ اسی پر اس کا اجماع بھی ہوگیا۔ **مارآہ المسلمون حسناً فهو عندالله حسن (اثر ابن مسعود)** کا یہ ایک بہترین نمونہ اور جلوۂ حق نما ہے جس کے اندر سواد اعظم کا اصل چہرہ صاف عیاں اور ہر طرح نمایاں ہے۔

چودھویں صدی ہجری کے ایک عظیم وجلیل فقیہ ومفتی مگر مقلد حنفیت کی زبانی فقہ اسلامی کی حقیقت سن کر اور اسے سمجھ کر قارئین کرام بھی اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ اجتہاد تو بڑی چیز ہے آج کل تفقہ بھی ایک جنس نایاب سے کم نہیں ہے۔

فقاہت کیا چیز ہے اور تفقہ فی الدین کب حاصل ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں فقیہ اسلام امام احمد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) رقم طراز ہیں:

''فقہ یہ نہیں کہ کسی جزئیہ کے متعلق کتاب سے عبارت نکال کر اس کا لفظی ترجمہ سمجھ لیا جائے۔ یوں تو ہر اعرابی ہر بدوی فقیہ ہوتا کہ ان کی مادری زبان عربی ہے۔

بلکہ فقہ بعد ملاحظۂ اصول مقررہ، وضوابط محررہ، ووجوہ تکلم، وطرق تفاہم، وتنقیح مناط، ولحاظ انضباط، ومواضع یسر واحتیاط، وتجنب تفریط وافراط، وفرق روایات ظاہرہ ونادرہ، وتمیز درایات غامضہ وظاہرہ، ومنطوق ومفہوم صریح ومحتمل، وقول بعض وجمہور ومرسل ومعلل، ووزن الفاظ مفتین، وسبر مراتب ناقلین، وعرف عام وخاص، وعادات بلاد واشخاص، وحال زمان ومکان، واحوال رعایا وسلطان، وحفظ مصالح دین، ودفع مفاسد مفسدین، وعلم وجوہ تجریح، واسباب ترجیح، ومناہج توفیق، ومدارک تطبیق، ومسالک تخصیص، ومناسک تقیید، ومشارع قیود، وشوارع مقصود، وجمع کلام، ونقد مرام، وفہم مراد کا نام ہے۔

کہ تطلع تام، واطلاع عام، ونظر دقیق، وفکر عمیق، وطول خدمت علم، وممارست فن، وتیقظ وافی، وذہن صافی، معتاد تحقیق، مؤید بتوفیق کا کام ہے۔

اور حقیقۃً وہ نہیں مگر ایک نور کہ رب عزوجل بحض کرم اپنے بندہ کے قلب میں القا فرماتا ہے:

و ما یلقّٰها الّا الّذین صبروا و ما یلقّٰها الّا ذو حظ عظیم. (ص ۱۳، ابانة المتواری (۱۳۳۱ھ) مطبوعہ بریلی)

آج جو لوگ فقہائے اسلام سے بے نیاز ہوکر اجتہاد کے دعویدار ہیں ان کا جائزہ لیجیے تو مذکورہ مراتب ومدارج تو کجا عربی دانی سے حاصل بھی نہیں ہے۔ چند مشکل آیات واحادیث اور اشعار عرب پیش کر کے دیکھیے، صحیح ترجمہ وتفہیم سے بھی قاصر نظر آتے ہیں۔

فقہا ومجتہدین اسلام کے احکام اجتہادیہ اور مسائل مستنبطہ میں اگر اختلاف زمان ومکان اور ضرورت وحاجت وغیرہ کی بنیاد پر تغیر وتبدیلی کی جائے تو ایسا کرنا روا ہے مگر اس کے لیے مشق وممارست اور درک ومہارت رکھنے والے فقہائے اسلام کی ماذون ومجاز ہیں اور یہ کام نہ ہر کس وناکس کا ہے نہ عام علما ومفتیان کرام کا ہے۔ یہ صراحت فتاویٰ رضویہ جلد اول میں اس طرح مذکور ہے۔

''اختلاف زمانہ، ضرورت، تعامل وغیرہ جن وجوہ سے قول امام کے غیر پر فتویٰ مانا جاتا ہے وہ درحقیقت قول امام ہی ہوتا ہے۔''

''چھ باتیں ہیں جن سے قول امام بدل جاتا ہے۔ لہٰذا قول ظاہر کے خلاف عمل ہوتا ہے۔ اور وہ چھ باتیں (۱) ضرورت (۲) دفع حرج (۳) عرف (۴) تعامل (۵) دینی ضرورت ومصلحت کی تحصیل (۶) کسی فساد موجود یا مظنون بہ ظن غالب کا ازالہ۔ ان میں بھی حقیقۃً قول امام ہی پر عمل ہے۔''

جو حضرات تقلید فقہی کو غیر ضروری بلکہ باطل قرار دیتے ہیں وہ دو قسم کے افراد ہوتے ہیں۔ (۱) مذہب ومسلک ابن حزم ظاہری وابن تیمیہ حرانی کے متبعین ومقلدین (۲) جدید تعلیم یافتہ مگر علم دین سے نابلد طبقہ۔

پہلی قسم کے حضرات کا دعویٰ کچھ ہے اور عمل کچھ ہے۔ ان کی طرف سے ترک تقلید کا دعویٰ ہوتا ہے جب کہ عمل یہ ہے کہ وہ اپنے مذکورہ

ائمہ کے متبع نہیں بلکہ متقلد محض ہوتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے افراد اپنی تجدد پسندی اور روشن خیالی کے زعم میں ایسی باتیں کرجاتے ہیں جو سنجیدہ کم اور مضحکہ خیز زیادہ ہوتی ہیں اور علم و بصیرت و فقہ و افتا سے ان کی دوری و ناآشنائی ایک ایک جملہ سے عیاں ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح کے افراد ائمہ مجتہدین پر طعن و تشنیع اور سواد اعظم کی تقلید و مذمت کرکے اختلاف و انتشار امت و ملت میں اضافہ کا سبب بننے کے سوا کچھ اور نہیں بن سکے ہیں۔ جس تقلید کے خلاف انھوں نے ہنگامہ خیزی و معرکہ آرائی کی اس سے الگ ہٹ کر انھوں نے کون سے کارنامے اور کون سی خدمات انجام دی ہیں اس کا بھی ساری امت کو علم ہے۔ مقلدین سے زیادہ اس طرح کے غیر مقلدین کتاب و سنت سے کتنے قریب اور ان پر کتنے عامل ہیں اور اپنی خواہشات و ہوائے نفس کو چھپانے کے لئے کس طرح وہ کتاب و سنت کی آڑ لیتے ہیں اس حقیقت سے بھی ساری امت مسلمہ شرق سے غرب تک اچھی طرح واقف و باخبر ہے۔

عام مسلمانوں کی بات کی گیا ہے کہ انھیں ہر مسئلہ شرعیہ میں کسی عالم دین کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور یہی حال عام علمائے کرام کا بھی ہے کہ انھیں جزئیات فقہ پر مشتمل ان کتب فقہیہ کے مطالعہ پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو مقلد علما و فقہا ہی نے تحریر فرمائی ہیں۔ معدودے چند حضرات جو براہ راست اور ہمہ وقت فقہ و افتا سے وابستہ رہتے ہیں ان کا جائزہ لیجئے پر آخری طبقۂ مجتہدین یعنی اصحاب تمییز میں انھیں شمار کیا جانا بھی اتنا مشکل اور دقت طلب امر ہے کہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں سواد اعظم اور ان کے موجودہ علما و فقہا سے صفر رو گردانی کرکے تقلید فقہی کو اپنے حق میں لازم و واجب سمجھتے ہیں تو یہ ان کی عین سعادت و سلامت روی ہے۔ اور اسی میں امت مسلمہ کے لئے خیر و برکت و امن و عافیت و صلاح و فلاح بھی ہے۔ اس سے سواد اعظم کو اسی جادۂ اعتدال و صراط مستقیم پر ہمیشہ گامزن رہنا چاہیے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے

اتبعوا السواد الاعظم فانه من شذ شذ فی النار (ابن ماجه)

سواد اعظم کی پیروی کرو، کیوں کہ جو اس سے الگ ہوا وہ جہنم میں گیا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم اہل سنت و جماعت کو اپنے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و خلفائے راشدین و صحابہ کرام کی سنت کی طاعت و اتباع اور ائمہ مجتہدین کے نقوش قدم پر چلتے رہنے کی ہمیشہ توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

ڈاکٹر امجد رضا امجد☆

تقلید اُمّت کا اجماعی موقف

در راہ عشق وسوسۂ اہرمن بس است
ہشدار گوش دل بہ پیام سروش را

تقلید کو ہر زمانے میں امت کے اجماعی موقف کا درجہ حاصل رہا ہے، اس پر علوم دینیہ کی پوری تاریخ شاہد ہے یہی وجہ ہے کہ اس اجماعی موقف پر جب بھی کسی طبقے نے ''توحید خالص'' کے جوش اجیا میں قدغن لگانا چاہا ہے اور اس سے انکار کی راہ اپنائی ہے تو اسے شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری میں جب فرقہ ظاہریہ کے امام ابوداؤد ظاہری نے تقلید سے انکار کا نظریہ اپنایا تو انہیں اہل سنت سے خارج قرار دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں: ''داؤد ظاہری ومتابعانش را از اہل سنت شمردن در چہ مرتبہ از جہل وسفاہت است۔'' (النہی الاکید عن الصلاۃ وراء عدی التقلید: امام احمد رضا) چوتھی صدی میں علامہ ابن حزم نے تقلید سے انکار کیا تو ان کی کتابیں جلادی گئیں یا دریا برد کردی گئیں۔ کچھ اسی طرح آٹھویں صدی ہجری میں جب ابن تیمیہ اور ابن قیم نے تقلید پر کلام کیا تو ان کی بھی مخالفت ہوئی اور انہیں ''سیئی العقل'' اور الا ان فی عقلہ شیئاً کہہ کر امت کو ان سے ہوشیار کردیا گیا۔

تقلید شخصی کی روایت یوں تو باضابطہ دوسری صدی میں قائم ہوئی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا رشتہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صحابہ سے جڑا ہوا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''لان الناس لم یزالو امن زمن الصحابة الی ان ظهرت المذاهب الاربعه یقلدون من اتفق من العلماء من غیر نکیر یعتبر انکاره ولو کان ذالک باطلا لانکروه یعنی'' عہد صحابہ سے ظہور مذاہب اربعہ تک علماء کرام میں سے جس پر بھی اتفاق ہوتا لوگ ان کی تقلید کرتے رہے۔ اور یہ عمل بغیر کسی اعتراض کے برابر جاری رہا اگر تقلید باطل ہوتی تو وہ لوگ ضرور اس کی مخالفت کرتے''

(عقد الجید، ص:۳۳)

اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ نے تقلید کو الہام الٰہی سے تعبیر کیا ہے چنانچہ آپ غایۃ الانصاف، ص ۹۷ر میں فرماتے ہیں

وبالجملة فالتمذهب للمجتهدين سر الهمه الله تعالی العلماء وجمعهم عليه من حيث يشعرون ولايشعرون۔ ''خلاصہ کلام یہ کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید ایک راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علمائے کرام کے دل میں ڈال دیا ہے''۔

حضرت شاہ صاحب قبلہ کی اس عبارت کو اگر بڑے کینوس پر پھیلا کر دیکھا جائے تو اس میں تقلید کی پوری عملی تاریخ سمٹی ہوئی نظر آئے گی جس کی تفصیل کتب اسماء الرجال اور دیگر معتمد کتب مثلاً الجواہر المضیہ تہذیب التہذیب تہذیب ۱۱۱ا، وامقت طنووی، تذکرۃ الحفاظ، تاریخ بغداد، جامع البیان العلم وفضلہ، مفتاح السعادہ، تاریخ الخلفاء سیوطی، تاریخ ابن خلدون وغیرہ میں موجود ہے۔ حضرت شاہ صاحب کو ماننے کا دعویٰ کرنے کے باوجود عام غیر مقلدین ان کے نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ خیر القرون سے چوتھی صدی تک تقلید کا وجود نہیں تھا اور یہ کہ تقلید چوتھی صدی کی بدعت ہے مگر ان مذکورہ کتابوں میں یہ صراحت موجود ہے کہ چوتھی صدی سے قبل بھی ائمہ معین اور مذہب متعین کی تقلید رائج تھی۔ اور اس وقت کے ان مقلدین میں جلیل القدر علماء مفسرین، محدثین اور قاضی القضاۃ حضرات تک شامل تھے۔ تفصیل کے لئے ان کتابوں سے رجوع کریں۔

تقلید ائمہ اور اجماع امت: -خیر القرون سے ظہور مذاہب اربعہ تک امت میں کئی ایک مجتہد مطلق ہوئے اور ایک خاص مدت تک سبھوں کی تقلید ہوتی رہی جن میں حضرت امام اوزاعی المتوفی ۱۵۷ھ- حضرت امام ابن خزیمہ المتوفی ۳۱۱ھ، امام ابن جریر طبری اور حضرت امام ابوثور المتوفی ۲۴۰ھ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں- چنانچہ علامہ برہان الدین ابراہیم بن علی المالکی اپنی کتاب الدیباج المذہب میں اس تعلق سے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

☆Idara Sharia Sultanganj Patna,Bihar

شام اور جزیرہ اندلس میں حضرت امام اوزاعی کا مذہب غالب تھا اور دو صدیوں کے بعد ان کا مذہب ختم ہو گیا اور وہاں امام مالک کا مذہب غالب آ گیا۔ اور امام حسن بصری اور امام سفیان ثوری کے پیروکار زیادہ نہ تھے ورنہ ان کی تقلید کا زمانہ لمبا تھا بلکہ جلد ہی ان کا مذہب ختم ہو گیا۔ باقی رہے امام طبری اور امام ابوثور کے مقلد، تو یہ بھی زیادہ نہ تھے اور نہ ان کی تقلید کا زمانہ لمبا تھا اور امام ابوثور کے مقلد تیسری صدی کے بعد اور امام طبری کے پیروکار چوتھی صدی کے بعد ختم ہو گئے۔

اور پھر اس کے بعد بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی:

"بجز مذاہب اربعہ کے اور سارے مذاہب ختم ہو گئے تب انہیں مذاہب اربعہ کا اتباع سواد اعظم کا اتباع قرار پایا اور ان چاروں مذہب سے نکلنا سواد اعظم سے نکلنے کے مرادف ٹھہرا"۔ (عقد الجید، ص:۳۸)

مذاہب اربعہ کی تقلید پر اجماع ہو جانے کی شہادت دیتے ہوئے حضرت شاہ پھر لکھتے ہیں: **هذه المذاهب الاربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الامة او من يعتد بها منها علىٰ جواز تقليدها الى يومنا هذا** یعنی تمام امت نے یا امت کے قابل اعتماد افراد نے مذاہب اربعہ مشہورہ کی تقلید کے جواز پر اجماع کر لیا ہے جو آج تک جاری ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ۔ ج:۱، ص:۲۳)

علامہ ابن خلدون نے ائمہ اربعہ میں تقلید کے انحصار اور اس پر اجماع امت کی حکمت بڑی وضاحت سے بیان کی ہے۔ چنانچہ وہ مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں:

دیار و امصار میں انہی ائمہ اربعہ کی تقلید منحصر ہو گئی اور ان کے سوا جو امام تھے ان کے مقلد ناپید ہو گئے۔ اور لوگوں نے اختلافات کے دروازے بند کر دیئے اور چونکہ اصطلاحات علمیہ مختلف ہو گئیں اور لوگ مرتبہ اجتہاد تک پہنچنے سے رہ گئے اور اس امر کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اجتہاد کے میدان میں غیر اہل لوگ نہ کود پڑیں اس لئے علمائے زمانہ میں جو محتاط تھے انہوں نے اجتہاد سے اپنا عجز ظاہر کر دیا اور اس کے دشوار ہونے کی تصریح فرما دی اور انہی ائمہ مجتہدین کی تقلید کی رہنمائی کرنے لگے جن کے مقلد ہو رہے تھے، اس لیے کہ کبھی ایک امام اور کبھی دوسرے امام کی تقلید کرنے میں دین کھلونا بن جاتا۔ اب صرف نقل مذہب رہ گیا اور بعد تصحیح اصول و اتصال سند بالروایہ ہر مقلد اپنے اپنے امام مجتہد کی تقلید کرنے لگا اور فقہ سے بجز اس امر کے کچھ اور مطلب نہیں۔ اور فی زمانناً مدعی اجتہاد مردود اور اس کی تقلید مہجور و متروک ہے اور اہل اسلام انہی ائمہ اربعہ کی تقلید پر گامزن ہو گئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب قبلہ بھی اس اجماع کو مصلحت سے تعبیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں جو پوشیدہ نہیں بالخصوص اس زمانہ میں کہ ہمتیں پست ہو گئیں اور انسانوں میں خواہشات کا غلبہ، اور ہر رائے والا اپنی رائے پر مغرور ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں: **وفي ذلك كلها من المصالح مالايخفىٰ لا سيما في هذه الايام التي قصرت فيها الهمم جدا و اشربت النفوس الهوىٰ واعجب كل ذي راي برايه.** (حجۃ اللہ البالغہ)

اجتہاد اور اس کے شرائط:- علامہ ابن خلدون اور شاہ صاحب قبلہ نے ائمہ اربعہ میں تقلید کے انحصار کی جو حکمت و مصلحت بیان کی ہے وہ عجز عن الاجتہاد ہے۔ یہاں فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر اجتہاد کے لئے کس علمی معیار کی ضرورت ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا اور اس عہد کے بڑے بڑے فقہا و محدثین و علماء و مفسرین اور اولیاء کاملین میں بھی خود کو اجتہاد سے کنارہ کش رکھا اور تقلید ائمہ اربعہ میں ہی عافیت سمجھی۔ اس سلسلے میں اصول فقہ کی درسی اور متداول کتابوں مثلاً نور الانوار، مسلم الثبوت، فواتح الرحموت، التوضیح والتلویح، کتاب الملل والنحل اور منہاج الاصول وغیرہ میں پوری تفصیل موجود ہے۔ یہاں امام عبد الکریم شہرستانی المتوفی ۵۴۸ھ کی کتاب الملل والنحل کا ایک حوالہ ملاحظہ کریں جس میں جامعیت کے ساتھ اجتہاد کی شرطیں بیان کر دی گئی ہیں:

اجتہاد کی شرطیں یہ ہیں: (۱) بقدر ضرورت لغت عربیہ کی معرفت ہو اور الفاظ وضعیہ اور استعاریہ اور نص و ظاہر، عام و خاص، مطلق و مقید، مجمل و مفصل، فحوائے خطاب اور مفہوم کلام میں تمیز کرنے کی اہمیت ہو (۲) قرآن کریم کی تفسیر خصوصاً جو احکام سے متعلق ہے کی معرفت ہو (۳) پھر احادیث کی ان کی اسانید اور متون کے ساتھ معرفت اور ناقلین اور رواۃ کے احوال کی معرفت کا احاطہ ہو (۴) پھر حضرات صحابہ کرام تابعین تبع تابعین وغیرہم سلف صالحین کے اجماع کے مواقع کی معرفت تاکہ مجتہد کا اجتہاد اجماع کے خلاف نہ واقع ہو (۵) پھر قیاسات کے مواقع اور استدلال کی کیفیت اور ان میں غور و فکر کرنے کے مواقع کی شناسائی اور ہدایت ہو۔

شرائط اجتہاد میں امام احمد رضا کا موقف:- امام احمد رضا

بریلوی نے بھی اپنے رسالہ الفصل الموهبی فی معنی اذا صح الحدیث فهو مذهبی میں غیر مقلدین کا رد کرتے ہوئے انتہائی منضبط اور توضیحی انداز میں اجتہاد کے شرائط بیان فرمائے ہیں۔ اس سے جہاں مرتبہ اجتہاد کی عظمت واہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں خود امام احمد رضا کی فقہی بصیرت اور علم حدیث وفن اسماء الرجال میں مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ آپ ان شرائط کو چار خانوں میں تقسیم کر کے اسے یوں بیان کرتے ہیں۔

منزل اول :۔ نقد رجال کہ ان کے مراتب ثقہ وصدق وحفظ وضبط اور ان کے بارے میں ائمہ شان کے اقوال ووجوہ طعن ومراتب توثیق ومواضع تقدیم، جرح وتعدیل وحوامل طعن ومنا شئ توثیق ومواضع تحمل وتساہل وتحقیق پر مطلع ہو، استخراج مرتبہ اتقان راوی بنقد روایات وضبط مخالفات واوہام وخطیات وغیرہا پر قادر ہو، ان کے اسامی والقاب وکنی وانساب ووجوہ مختلفہ تعبیر رواۃ خصوصاً اصحاب تدلیس شیوخ وتعیین مبہمات ومتفق ومتفرق ومختلف ومؤتلف سے ماہر ہو، ان کے موالید ووفیات وبلدان ورحلات ولقاء وسماعات واساتذہ وتلامذہ وطرق تحمل ووجوہ ادا وتدلیس وتسویہ وتغیر واختلاط وآخذین من قبل وآخذین من بعد وسامعین حالین وغیرہا تمام امور ضروریہ کا حال اس پر ظاہر ہو ۔۔ ان سب کے بعد صرف سند حدیث کی نسبت اتنا کہہ سکتا ہے کہ صحیح یا حسن یا صالح یا ساقط یا باطل یا معضل یا مقطوع یا مرسل یا متصل ہے۔

اس کے بعد دوسری منزل اس طرح بیان کی۔

منزل دوم :۔ صحاح وسنن ومسانید وجوامع ومعاجیم واجزاء وغیرہا کتب احادیث میں اس کے طرق مختلفہ والفاظ متنوعہ پر نظر تام کرے کہ حدیث کے تواتر یا شہرت یا فردیت نسبیہ یا غرابت مطلقہ یا شذوذ یا نکارت واختلافات، رفع ووقف وقطع ووصل ومزید فی متصل الاسانید اضطرابات سند ومتن وغیرہا پر اطلاع پائے۔ نیز اس جمع طرق واحاطۂ الفاظ سے رفع ابہام ودفع اوہام وایضاح خفی واظہار مشکل وابانت مجمل وتعیین محتمل ہاتھ آئے ولہذا امام ابوحاتم رازی فرماتے ہم جب تک حدیث کو ساٹھ وجہ سے نہ لکھتے اس کی معرفت نہ پاتے۔ اس کے بعد اتنا حکم کرسکتا ہے کہ حدیث شاذ یا منکر معروف یا محفوظ مرفوع یا موقوف فرد یا مشہور کس مرتبہ کی ہے۔ منزل سوم کے تعلق سے فرمایا

منزل سوم : اب علل خفیہ وغوامض دقیقہ پر نظر کرے جس پر صدہا سال سے کوئی قادر نہیں۔ ہاں بعد اجتہاد وجوہ اعلال تام مطلع ہونے سے منزہ پائے تو یہ تینوں منزلیں طے کرکے صرف صحت حدیث معنی مصطلح پر حکم لگا سکتا ہے۔ تمام حفاظ حدیث واجلہ نقد ونا اصحاب فن رد وشناخت اجتہاد کی رسائی صرف اس منزل تک ہے . [illegible] انصاف انہیں منازل کی دشواری دیکھیں جس میں ابوعبداللہ حاکم جیسے محدث جلیل القدر پر کتنے عظیم شدید مواخذے ہوئے۔ امام ابن حبان جیسے ناقد بصیر تساہل کی طرف نسبت کیے گئے۔ ان دونوں سے بڑھ کر امام اجل ابوعیسی ترمذی تصحیح وتحسین میں تساہل مشہور ہے۔ امام مسلم جیسے جبل رفیع نے بخاری وابوزرعہ کے لوہے مانے

چوتھی منزل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

باقی رہی **منزل چہارم** اور تو نے کیا جانا کیا ہے منزل چہارم، سخت ترین منازل دشوار ترین مراحل جس کے سالکین کو قلیل قلائل اس کی قدر کون جانے

گدائے خاک نشینی تو حافظا مخروش
که نظم مملکت خویش خسرواں دانند

اس کے لیے واجب ہے کہ جمیع لغات عرب وفنون ادب ووجوہ تخاطب وطرق تفاہم واقسام نظم وصنوف معنی ومدارک عقل ومشق مناط واستخراج جامع وعرفان مانع ومواردو تعدیہ ومواضع قصر وادلہ خصوصیات واحادیث واقاویل صحابہ وائمہ فقہ قدیمہ وحدیث ومواقع تعارض واسباب ترجیح ومناہج توفیق ومدارک دلیل ومعارک تاویل ومسالک تخصیص ومناسک تقیید ومشارع قیود وشوارع مقصود وغیرہ ذلک پر اطلاع تام ووقوف عام ونظر غائر وذہن رسا وفہم ثاقب وبصیرت ناقدہ وبصر صحیح رکھتا ہو۔

امام احمد رضا مذکورہ منازل پر گفتگو کے بعد امام شیخ الاسلام زکریا انصاری کا یہ قول نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے فرمایا کہ کہاں یہ شرائط اور کہاں یہ لوگ؟ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

ایاکم ان تبادروا الی الانکار علی قول مجتهد او تخطئته الا بعد احاطتکم بادلة الشریعة بمعرفتکم بمعانیها وطرقها یعنی خبردار مجتہد کے کسی قول پر انکار یا اسے خطا کی طرف نسبت نہ کرنا جب تک شریعت مطہرہ کی تمام دلیلوں پر احاطہ نہ کرلو، جب تک تمام لغات عرب جن پر شریعت مشتمل ہے پہچان نہ لو جب تک ان کے معانی اوران کے راستے جان نہ لو۔ وانی لکم بذلک بھلا کہاں تم اور کہاں یہ

احاطہ (الفضل الموہبی ص ۱۴ بحوالہ میزان الشریعۃ الکبریٰ)

ان شرائط کو لکھنے کے بعد امام احمد رضا نے لکھا ہے کہ جو شخص ان چاروں منازل کو طے کر جائے وہ بھی مجتہد مطلق نہیں مجتہد فی المذہب ہے۔ جیسے مذہب حنفی میں امام ابو یوسف، امام محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہما ——اور یہ حضرات بھی باایں جلالت شان اصول میں امام اعظم کے متبع اور مقلد ہیں اور اگرچہ بعض مسائل میں انہوں نے امام اعظم سے اختلاف کیا ہے مگر بقول امام ابو یوسف:

ما خالفته فی شیٔ قط فتدبرته الا رأیت مذهبه الذی ذهب الیه انجیٰ فی الآخرة و کنت ربما ملت الی الحدیث فکان هو ابصر بالحدیث الصحیح منا۔ یعنی کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں نے کسی مسئلے میں امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خلاف کر کے غور کیا ہو مگر یہ کہ انہیں کے مذہب کو آخرت میں زیادہ وجہ نجات پایا اور بارہا ہوتا کہ میں حدیث کی طرف جھکتا پھر تحقیق کرتا تو امام مجھ سے زیادہ حدیث صحیح کی نگاہ رکھتے تھے۔ (الفضل الموہبی ص ۱۵)

علامہ ابن عابدین شامی نے ردالمحتار میں بعض اکابر فقہا کی نسبت تصریح کی کہ یہ حضرات مخالف مذہب درکنار روایات مذہب میں ایک کو راجح بتانے کے اہل نہیں - چنانچہ کتاب الشہادت باب القبول میں ہے **ابن الشحنه لم یکن من اهل الاختیار** - کتاب الزکوٰۃ باب صدقۃ الفطر میں ہے **البهنسی لیس من اصحاب التصحیح** کتاب النکاح باب الحضانہ میں ہے **صاحب النهر لیس من اهل الترجیح** بلکہ اکابر ارکین مذہب مثلاً امام کبیر علامہ خصاف، امام اجل علامہ ابو جعفر طحاوی، امام ابو الحسن کرخی، امام شمس الائمہ حلوانی، امام شمس الائمہ سرخسی، امام فخر الاسلام علی بزدوی، امام فخر الدین قاضی خاں، امام ابو بکر رازی، امام ابو الحسن قدوری، امام برہان الدین مرغینانی وغیرہ کے متعلق علامہ ابن کمال پاشا کے حوالہ سے نقل کیا کہ **انهم لا یقدرون علی شیٔ من المخالفة لا فی الاصول ولا فی الفروع** (الفضل الموہبی ص ۱۶/۱۷)

اب تقلید کے مخالفین ہی غور کریں کہ جب ان علوم و فنون کی جامع شخصیتوں کا علم بھی اجتہاد کے باب میں علی فرق مراتب ناکافی ہے تو وہ افراد جو ان عظیم فقہاء کے شاگردانِ شاگرد کی شاگردی اور کفش برداری کی بھی اہلیت نہیں رکھتے وہ کس طرح مجتہد ہونے کا دعویٰ کرتے اور امت کے اجماعی موقف سے انحراف کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امت کے جن فقہاء و محدثین و مفسرین نے تقلید کو اختیار کیا اور امام معین کی پیروی کی وہ اجتہاد کی حقیقت اور اس راہ کی دشواریوں سے واقف تھے۔ خشیت الٰہی سے ان کا دل لبریز تھا اس لیے انہوں نے اپنے علم پر غرور کرنے کی بجائے اجتہاد سے اپنے عجز کا اعتراف کیا اور تقلید کی طرف راجع ہو گئے، جیسا کہ علامہ ابن خلدون کے حوالہ سے گزرا۔ اس سلسلے میں ایک اور حوالہ امام شعرانی کی کتاب ''میزان الشریعۃ الکبریٰ'' سے ملاحظہ کریں۔ غیر مقلدین کے پیشوا میاں نذیر حسین دہلوی نے اپنے ایک فتویٰ میں حضرت امام شعرانی کے بارے میں لکھا ہے کہ ''بے شک جو منصف مزاج ہے وہ امام شعرانی کے منصب کامل اجتہاد میں شک نہیں کر سکتا'' وہی علامہ شعرانی خود تقلید کے تعلق سے اپنا نظریہ واضح کرتے ہوئے میزان الشریعۃ الکبریٰ میں فرماتے ہیں

یجب علی المقلد العمل بالارجح من القولین فی مذهبه مادام لم یصل الیٰ معرفة هذا المیزان من طریق الذوق والکشف کما علیه عمل الناس فی کل عصر یعنی مقلد پر واجب ہے کہ خاص اسی بات پر عمل کرے جو اس کے مذہب میں راجح ٹھہری ہو۔ ہر زمانے میں علماء کا اسی پر عمل رہا ہے۔ (النہی الاکید ص ۴۳)

وہی امام شعرانی امام الحرمین، حجۃ الاسلام غزالی و کیاہراسی و ابن سمعانی وغیرہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنے شاگردوں کو ایک امام معین کی تقلید کی تعلیم دی اور یہ بھی فرمایا کہ اگر امام معین کے مذہب سے عدول کرو گے تو خدا کے حضور تمہارے لیے کوئی عذر نہ ہوگا۔ چنانچہ آپ کے الفاظ ہیں:

به صرح امام الحرمین و ابن سمعانی و الغزالی و الکیاهراسی و غیرهم و قالوا لتلامیذهم یجب علیکم التقلید بمذهب امامکم ولا عذر لکم عند الله تعالیٰ فی العدول عنه (الفضل الموہبی ص ۴۱)

اگر تقلید کے تعلق سے دوسری صدی ہجری سے لے کر آج تک عالم اسلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں میں اکثریت مقلدین کی رہی ہے اور آج بھی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمے میں

لکھتے ہیں کہ "حضرت امام ابوحنیفہ کے مقلد اس وقت عراق، ہندوستان، چین، ماوراء النہر اور عجم کے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں" اسی طرح علامہ شکیب ارسلان فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت حضرت امام ابوحنیفہ کی مقلد ہے یعنی سارے ترک اور بلقان کے مسلمان روس اور افغانستان کے مسلمان چین کے مسلمان ہندوستان اور عرب کے اکثر مسلمان شام و عراق کے اکثر مسلمان فقہ میں حنفی مسلک کے حامل ہیں اور شام کے بعض اور حجاز، یمن، حبشہ، جاوا، انڈونیشیا اور کردستان کے مسلمان حضرت امام شافعی کے مقلد ہیں اور مغرب کے مسلمان مغربی اور وسط افریقہ کے مسلمان اور مصر کے کچھ لوگ حضرت امام مالک کے مقلد ہیں اور عرب کے بعض مسلمان اور شام کے بعض باشندے جیسے نابلس اور دومہ کے رہنے والے حضرت امام بن حنبل کے مقلد ہیں"۔ (حاشیہ حسن المساعی)

ان ممالک میں پھیلے ہوئے جلیل القدر مقلد علماء، فقہاء، مفسرین، محدثین، اور مورخین کی فہرست بنائی جائے جن کے تفصیلی حالات طبقات مفسرین، طبقات المحدثین، طبقات الفقہاء، طبقات المورخین، طبقات حنفیہ، طبقات شافعیہ، طبقات حنابلہ، الدیباج المذہب، الجواہر المضیہ اور الفوائد البہیہ میں مذکور ہیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ تحقیق کے لئے ان کتابوں سے رجوع کیا جائے۔

نظریہ تقلید اور ہندوستانی علماء و مشائخ - عالم اسلام میں تقلید کی عہد بہ عہد تاریخ اس کی ضرورت مصلحت اور دیگر تفصیلات سے قطع نظر جہاں تک ہندوستان کے فقہاء، صوفیہ، علماء اور مفسرین و محدثین کے تقلیدی نظریات کی بات ہے تو اس سلسلے میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں یہ حقیقت صاف دیکھی جا سکتی ہے کہ انگریزوں کے دور استعمار سے قبل ہندوستان میں غیر مقلدیت کا وجود تک نہ تھا۔ یہ وبا انگریزوں کے ساتھ ہی ہندوستان میں داخل ہوئی۔ یہاں اس تعلق سے اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف چند اشارے ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حوالے سے مختلف عبارتیں اس سے پہلے گزر چکیں کہ وہ تقلید کے حامی تھے اور محض علم نہیں کشف کے ذریعہ انہیں اطمینان کرا دیا گیا تھا کہ مذہب حنفی عمدہ طریقہ اور سنت صحیحہ کے موافق ہے چنانچہ شاہ صاحب اپنی کتاب فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں۔

عرفنی رسول الله ﷺ ان فی المذهب الحنفی طريقة انيقة هی اوفق الطرق بالسنة المعروفة التی جمعت وتنقحت فی زمان البخاری واصحابه. یعنی مجھے رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ مذہب حنفی عمدہ طریقہ ہے جو تمام سنت کے موافق ہے اور جسے امام بخاری وغیرہ کے زمانے میں وضاحت سے پیش کیا گیا یہی وجہ تھی کہ آپ نے حنفی مذہب کی حمایت کی اور لوگوں کو اس پر عامل ہونے کی تعلیم بھی دی اور غیر مقلدیت کے فتنے سے لوگوں کو آگاہ بھی کیا۔ چنانچہ آپ اپنی کتاب عقد الجید ص ۳۶ پر لکھتے ہیں

فی الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة وفی الاعراض عنها مفسدة كبيرة. یعنی ان چاروں مذاہب کے اختیار کرنے میں ایک عظیم مصلحت اور غیر مقلدیت میں بڑا فساد ہے۔

ہندوستان کے ایک جلیل القدر عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی ایک تحریر میں شاہ صاحب کے بیان کردہ اس فساد کی پوری تفصیل موجود ہے چنانچہ مولانا فرنگی محلی اپنی کتاب الآثار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ میں لکھتے ہیں

ولعمری افساد هولاء الملاحدة وافساد اخوانهم الاصاغر المشهورين بغير المقلدين الذين سموا انفسهم باهل الحديث وشتان مابينهم وبين اهل الحديث قد شاع فی جميع بلاد الهند وبعض بلاد غير الهند وخربت به البلاد ووقع النزاع والعناد فالی الله المشتكی واليه المتضرع والملتجئ بدأ الاسلام غريبا وسيعود غريبا فطوبیٰ للغربا ولقد كان حدوث مثل هولاء المفسدين والملحدين فی الازمنة السابقة فی ازمنة السلطنة الاسلاميه غير مرة فقابلتهم اساطين الملة وسلاطين الامة بالصوارم الملكيه واجروا عليهم الجوازم المنفية فاندفعت فتنتهم بهلاكهم ولما لم تبق فی بلاد هند فی اعصارنا سلطنة اسلاميه ذات شوكة وقوة عمت الفتن واوقعت عباد الله فی المحن انا لله وانا اليه راجعون - یعنی مجھے اپنی زندگی کی خلاق کی قسم غیر مقلدین کا فساد برپا کرنا مشہور ہے جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہلاتے ہیں۔ انہیں محدثین سے کیا تعلق؟ یہ لوگ پورے ہندوستان اور بعض دیگر ممالک میں پھیل چکے ہیں اور ان کی فسادی ذہنیت کی وجہ سے ان ممالک میں فساد و نزاع واقع ہو چکا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف شکوہ اور عاجزی واجب ہے۔

اسلام کی ابتدا بھی غربت میں ہوئی اور یہ غربت کی طرف ہی لوٹے گا پس غربا کے لیے خوشخبری ہے۔ بے شک ایسے مفسد ولحد زمانہ گذشتہ میں بھی ظاہر ہوئے لیکن اکابر ملت اور امت کے بادشاہوں نے ان سے قتال کیا اور اس فتنہ کو نابود کر دیا مگر ہمارے زمانے میں جبکہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت ہی باقی نہ رہی تو یہ فتنے عام ہو گئے اور ان کے فتنوں نے اللہ کے بندوں کو مشقتوں میں ڈال دیا۔

خود غیر مقلدین کے مشہور عالم محمد حسین بٹالوی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ جو لوگ مجتہد مطلق ہونے کا دعویٰ کرتے اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر میں بے دین ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔ کفر وارتداد اور فسق کے اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں مگر دینداروں کے بے دین ہو جانے کے لئے بے علمی کے ساتھ ترک تقلید بڑا بھاری سبب ہے۔ (خیر التنقید ص ٦)

ہندوستان کی اسلامی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ عہد برطانوی عدم تقلید کے حامل علماء کی مسلسل کاوشوں کا عہد ہے اور اس فرقے نے انگریزی حکومت ہی کے سہارے ہندوستان میں اپنے اثرات بد قائم کرنے شروع کئے، جس کے توڑ کے لئے قدرت نے اس عہد میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا جیسی شخصیت کو پیدا فرمایا، جنہوں نے اپنی ۶۴/ سالہ زندگی میں دیگر علمی، ملی اور مذہبی خدمات کے ساتھ، علمی وعقلی محاذ پر نظریہ تقلید کی بھی مدافعت کا حق ادا کر دیا اور اپنی تحریری کاوشوں سے پوری اسلامی دنیا میں بیداری کی لہر پیدا فرمادی۔ اس سلسلے میں آپ کا مجموعہ فتاویٰ (فتاویٰ رضویہ) اور بعض رسائل مثلاً

(۱) الفضل الموهبي في معنى اذا صح الحديث فهو مذهبي
(۲) النهي الاكيد عن الصلاة وراء عدى التقليد
(۳) النير الشهابي على تدليس الوهابي
(۴) السهم الشهابي على خداع الوهابي
(۵) البارقة الشارقة على معركة المشارقة
(۶) سيف المصطفىٰ على اديان الافتراء
(۷) نشاط السكين على حلق البقر السمين
(۸) المقالة المسفرة عن احكام البدعة المكفرة

اہل تحقیق وطالب حق کے لئے خصوصیت سے قابل توجہ ہیں۔ آپ کے بعد آپ کے جلیل القدر تلامذہ وخلفاء نے آپ کے مشن کو آگے بڑھایا، اہل توہب کی سازشوں کی نقاب کشائی کی فتنۂ غیر مقلدیت کے استیصال کے لئے تحریری وتقریری ہر طرح کی جد وجہد کی جس کا حسین ثمرہ ہے کہ آج بھی اس ملک میں مقلدین کی غالب اکثریت ہے۔ غیر مقلدین حضرات عصبیت سے خالی الذہن ہو کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے امام ابن تیمیہ کے قول: اما اجماع الامة فهو في نفسه حق لاتجتمع الامة على الضلالة پر غور کریں تو یقیناً انہیں قبولیت حق میں مدد ملے گی اور امت مسلمہ کے درمیان سے ایک بڑا فساد ختم ہو جائے گا۔

☆☆☆

محمد سلمان رضا ازہری☆

تقلید کی مخالفت

ایک علمی وتحقیقی جائزہ

کائنات خلقت کی بوقلمونی: -اس عالم رنگ وبو میں مختلف الخلقت اشیاء پائی جاتی ہیں، خدائے قدوس نے انہیں حسن وجمال سے آراستہ فرمایا ہے-ان کے اندر مراتب ودرجات کی کارفرمائی ہے-پہلا درجہ جمادات کا ہے، جن کے اندر نمو کی قوت پائی جاتی ہے نہ ہی احساس وادراک کی صلاحیت، اس کے بعد نباتات کا مرتبہ ہے، جو بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت تو ضرور رکھتے ہیں، مگر احساس کی قوتوں سے محروم ہوتے ہیں، ان کے اندر ادراک کی قوت نہیں پائی جاتی ہے، وہ ارادی طور پر حرکت کرنے سے عاجز ہوتے ہیں، اس کے بعد حیوانات کا درجہ ہے، جو حساس اور متحرک بالارادہ ہوتے ہیں، اس کے بعد انسان کا مرتبہ ومقام ہے جو احساس وادراک کی قوتوں سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ فکر وتدبر کی صلاحیتوں سے بھی سرفراز ہوتے ہیں، جو مجہولات کو ترتیب دے کر معلومات کی بلندیوں پر کمند ڈالنے کی استطاعت رکھتے ہیں-

لیکن اس موقع پر ایک سوال ذہن وفکر کی دہلیز پر دستک دیتا ہے کہ کیا ہر انسان کی قوت فکر ایک درجہ کی ہوتی ہے یا پھر ان میں تفاوت ہوتا ہے؟ کیا ہر انسان مجہولات سے معلومات تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ یا پھر ان میں ایک دوسرے کے دست نگر ومحتاج ہوتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انسان مختلف الاذہان ہوتے ہیں، بعض اپنی فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر چاند کی بلندیوں پر پہنچ کر عیش وراحت کے لیے محل تعمیر کرنے کی سعی پیہم کر رہے ہیں اور بعض اس ہموار زمین پر چلنے کی بھی طاقت نہیں رکھتے-انسان کے افراد میں بعض ذہانت وفطانت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوکر دوسروں کے لیے رشد وہدایت کی شمعیں فروزاں کرتے ہیں اور بعض غباوت وسفاہت کی تیرگی میں رہ کر نہ صرف اپنی تباہی کے سامان پیدا کرتے ہیں بلکہ دوسروں کی بھی ہلاکت وبربادی کے اسباب فراہم کرتے ہیں- کچھ اپنی ذکاوت وذہانت کے باعث گردش لیل ونہار، کواکب ونجوم کی انجمن آرائی اور بزم کہکشاں کا مشاہدہ کر کے خالق کائنات کا پتہ لگا لیتے ہیں، اور بعض ایسے یتیم العقل ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے دلائل وبراہین کے انبار بھی بے سود ہوتے ہیں-اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر انسان میں یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ وہ علوم ومعارف کے بحر موج میں غوطہ زن ہوکر اس کی پنہائیوں سے حکمت ومعرفت کے آبدار موتیوں کو برآمد کر سکے، بہ لفظ دیگر ہر انسان قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے مسائل شرعیہ کے استنباط واستخراج کی صلاحیت وقدرت نہیں رکھتا ہے، ہر شخص اجتہاد کے مرتبہ عظمیٰ پر فائز ہونے کی طاقت وقوت نہیں رکھتا ہے- یہی وجہ ہے کہ جمہور علمائے کرام مسائل فرعیہ میں ہر شخص پر نظر واجتہاد کو واجب ولازم نہیں کرتے ہیں- لیکن اسی ربع مسکون پر مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی پایا جاتا ہے، جو عامۂ ناس کو اجتہاد کا مکلف بنانے پر اصرار کیے جا رہا ہے- اس کا خیال خام یہ ہے کہ ہر مسلمان کے اندر قرآن وحدیث کے فہم وادراک کی صلاحیتیں موجود ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے وہ ائمہ کرام کے محتاج نہیں ہیں، اس کا کہنا ہے کہ جس طرح صحابہ کرام اور تابعین عظام ایک دوسرے کی تقلید نہیں کیا کرتے تھے- اسی طرح اس دور کے مسلمانوں کو بھی کسی کی تقلید نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ تقلید ناجائز وحرام ہے- گویا کہ یہ گروہ عوام الناس کو ''شتر بے مہار'' جیسی زندگی گزارنے کا تصور دے رہا ہے- رہ گیا اس کا یہ دعویٰ کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام ایک دوسرے کی تقلید نہیں کیا کرتے تھے- تو یہ بے مقدار کاتب الحروف- ان شاء اللہ- آئندہ صفحات پر اس کے رخ سے نقاب اٹھانے کی پوری کوشش کرے گا اور انہیں کی تحریر سے ثابت کرے گا-

تقلید کی تعریف اور مکاتب فکر -اس گروہ کی خدمت لاشی اور اس کے نظریہ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لینے سے قبل اصطلاح کے اعتبار سے تقلید کی تعریف سے آگاہ ہونا از حد ضروری ہے، ساتھ ہی یہ بھی جاننا لازم ہے کہ تقلید کا مجال کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں اب تک کتنے مکاتب

☆Jamia Azhar Islamic Foreign Students City,Al-Abbasia Cairo, Egypt

فکر عالم وجود میں آتے ہیں؟ تا کہ اس نو پید فرقہ کی حقیقت آفتاب نصف النہار کے مانند روشن و آشکار ہو جائے۔ تقلید کی تعریف کرتے ہوئے علمائے اصولیین فرماتے ہیں: ''هو أخذ قول الغير من غير معرفة دليله'' (اصول الفقہ الاسلامی ۲/۴۰۱، الاحکام للآمدی ۳/۱۶۶ وغیرہما) یعنی تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ غیر کے قول کو اس کی دلیل کی معرفت کے بغیر اپنانا اور اس پر عمل کرنا۔ جمہور علمائے کرام کے نزدیک عقائد اور ان مسائل میں تقلید جائز نہیں ہے، جن کا ثبوت دلائل قطعیہ سے ہے۔ البتہ بعض گمراہ فرقے ان میں بھی تقلید کو جائز قرار دیتے ہیں اور بعض تو واجب کہتے ہیں اور نظر و اجتہاد کو ناجائز و حرام ٹھہراتے ہیں (المستصفی ۲/۱۲۳، الاحکام للآمدی ۳/۱۶۷)۔ رہ گئے وہ مسائل فرعیہ جن کا ثبوت دلائل ظنیہ سے ہوتا ہے تو ان میں تقلید کے سلسلہ میں علماء تین گروہ میں منقسم نظر آتے ہیں اور یہی تقلید ہمارے مقالہ کا محور ہے۔

(۱) پہلا گروہ ظاہریہ، معتزلہ بغداد اور اکثر امامیہ کا ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص پر اجتہاد لازم و ضروری ہے اور تقلید ناجائز و حرام ہے۔ چنانچہ ابن حزم ظاہری تحریر کرتے ہیں ''التقليد كله حرام في جميع الشرائع، أولها عن آخرها، من التوحيد والنبوة، والقدر والايمان والوعيد والامامة والمفاضلة وجميع العبادات والأحكام'' (الاحکام فی اصول الاحکام ۶/۸۶۱)

(۲) اور دوسرا گروہ حشویہ اور تعلیمیہ کا ہے، جو عدم جواز کا قائل ہے، اس کا کہنا ہے کہ ائمہ مجتہدین کے زمانہ کے بعد اب کسی کے لیے اجتہاد جائز نہیں ہے، بلکہ سب پر تقلید واجب ہے (اصول الفقہ الاسلامی ۲/۱۴۰۷، المستصفی ۲/۱۲۳)۔

(۳) اور تیسرا گروہ اعتدال پسندوں کا ہے، بہ لفظ دیگر علمائے اہل سنت و جماعت کا ہے، جن کا نظریہ یہ ہے کہ اجتہاد ناجائز و حرام نہیں ہے کہ جو اجتہاد کی استطاعت و قدرت رکھتے ہوں ان کو بھی اس سے محروم کر کے ان پر تقلید کو واجب و ضروری قرار دے دیا جائے۔ ہاں! جو اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے خواہ وہ عالم ہی کیوں نہ ہوں، ان پر تقلید واجب ہے (اصول الفقہ الاسلامی ۲/۱۴۰۷، الاحکام للآمدی ۳/۱۷۰، المستصفی ۲/۱۲۳ وغیرہما)۔

تقلید کے بارے میں شیخ ابن تیمیہ کی رائے:- ان تینوں مکاتب فکر کے آراء و نظریات کو ملاحظہ کرنے کے بعد شاید ہی کوئی عاقل یہ قول کرنے میں تردد کا شکار ہو کہ پہلا اور دوسرا گروہ افراط و تفریط سے خالی نہیں اور تیسرا گروہ اعتدال کی راہ پر گامزن ہے، اس نے ہر انسان کو اجتہاد کا مکلف بنا کر تکلیف مالا یطاق نہیں دیا ہے اور نہ ہی ہر شخص کے لیے تقلید کو واجب و لازم گردان کر اجتہاد کی اہلیت و صلاحیت رکھنے والوں کو اس سے محروم کیا ہے۔ اس لیے جو حضرات اجتہاد کی استطاعت نہیں رکھتے ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مجتہدین عظام کی تقلید کریں۔ البتہ جو صاحب استطاعت ہیں ان پر تقلید حرام ہے۔ شیخ ابن تیمیہ جمہور علمائے اہل سنت کے نظریہ کو اجاگر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''والذي عليه جماهير الأمة، أن الاجتهاد جائز في الجملة، والتقليد جائز في الجملة، لا يوجبون الاجتهاد على كل أحد ويحرمون التقليد، ولا يوجبون التقليد على كل أحد ويحرمون الاجتهاد، وأن الاجتهاد جائز للقادر على الاجتهاد، والتقليد جائز للعاجز عن الاجتهاد، فأما القادر على الاجتهاد فهل يجوز له التقليد؟ هذا فيه خلاف، والصحيح أنه يجوز حيث عجز عن الاجتهاد'' (مجموعة الفتاوى ۱۰/۲۰/۱۱۲)

یعنی جمہور امت کے نزدیک اجتہاد بھی جائز ہے اور تقلید بھی، وہ نہ تو ہر شخص پر اجتہاد کو واجب اور تقلید کو حرام کرتے ہیں، اور نہ ہی ہر شخص پر تقلید کو واجب اور اجتہاد کو حرام کرتے ہیں، جو اجتہاد کی قدرت و استطاعت رکھتا ہے، اس کے لیے اجتہاد جائز ہے اور جو اجتہاد سے عاجز ہے، اس کے لیے تقلید جائز ہے، لیکن جو شخص اجتہاد پر قادر ہے، اس کے لیے تقلید جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، مگر صحیح یہ کہ جہاں وہ اجتہاد سے عاجز ہو وہاں اس کے لیے بھی تقلید جائز ہے۔

تقلید کی جھوٹی تاریخ اور اس پر تعقب:- شمس و امس کی طرح واضح ہو گیا کہ جمہور جس راہ پر چل رہے ہیں وہی صراط مستقیم ہے، لیکن کچھ لوگ ظاہریہ، معتزلہ بغداد اور امامیہ کے افکار و نظریات سے متاثر ہو کر ہر کس و ناکس کو مجتہد بنانے کی مہم چلا رہے ہیں، انہیں کے آراء و نظریات کو عام کرنے کی سعی لا حاصل کر رہے ہیں اور انہیں کے پر فریب دلائل کا سہارا لے کر بہ الفاظ دیگر نہیں کی تقلید کا پٹہ گلے میں ڈال کر عوام کو خواہشات نفس کا بندۂ بے دام بنانے کی ناپاک کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہم اسلاف کے طریقہ پر عمل پیرا ہیں، جس طرح

وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے، اسی طرح ہم بھی کسی کی تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ تقلید کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں شروع ہوتے۔ چنانچہ سلفی مذہب کے متحرک و فعال اور سرگرم رکن قاضی شوکانی صاحب تحریر کرتے ہیں ان التقليد لم يحدث الا انقراض خير القرون، ثم الذين يلونهم ، ،ثم الذين يلونهم، وان حدوث التمذهب بمذاهب الأئمة الأربعة، انما كان بعد انقراض عصر الأئمة الأربعة، وانهم كانو اعلى نمط من تقدمهم من السلف فی هجر التقليد، وعدم الاعتداد به، وان هذه المذاهب انما أحدثها عوام المقلدة لانفسهم من دون أن يأذن بها امام من الأئمة المجتهدين "۔ (القول المفید فی ادلۃ الاجتہاد والتقلید ص:/۱۰۸)

یعنی تقلید کا سلسلہ ائمہ اربعہ کے زمانہ کے بعد شروع ہوا، جبکہ ائمہ اربعہ سلف کے طریقہ پر تھے یعنی تقلید نہیں کرتے تھے اور ان مذاہب کو عوام مقلدوں نے اپنے لیے ائمہ مجتہدین کی اجازت کے بغیر اختیار کر لیا ہے۔

شوکانی صاحب کی یہ بات کہ "تقلید کا سلسلہ ائمہ اربعہ کے بعد شروع ہوا ہے" ان کے نظریہ کے مطابق قابل عمل تو درکنار، قابل توجہ بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کے قول کو دلائل کی پشت پناہی حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے قول کو بلا دلیل مان لینا گویا ان کی تقلید کرنا ہے جو ان کی نگاہ میں سراسر ناجائز و حرام ہے۔ اس لیے ان کی یہ بات نہ صرف یہ کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک غیر معتبر ہے بلکہ خود ان کے "مقلدین" کو بھی اس پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں دلائل و شواہد اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ چنانچہ شوکانی صاحب کے ہمنوا و ہم خیال ابن قیم صاحب اپنی کتاب میں کچھ ایسے واقعات صحابہ کرام و تابعین عظام کے ذکر کیے ہیں، جو خود ان کے اور شوکانی صاحب کے نظریہ پر بجلی بن کر گرتے ہیں اور طرفہ تو یہ ہے کہ ابن قیم صاحب نے اس پر اپنا تعقب بھی نہیں پیش کیا ہے، جس سے ان کی عاجزی و درماندگی نمایاں ہے

ابن قیم کا اعتراف حقیقت کہ صحابہ تقلید کرتے تھے - چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں: "ولما كان على رضى الله عنه باليمن أتاه ثلاثة نفر يختصمون فی غلام، فقال كل منهم: هو ابنی، فاقرع علی بينهم، فجعل الولد للقارع وجعل للرجلين ثلثی الدية، فبلغ النبی صلى الله تعالى عليه وسلم فضحك حتى بدت نواجذه من قضاء على رضى الله عنه" (اعلام الموقعین ۱/۱۶۴ فصل: الصحابة مجتهدون و يقيسون)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ جب یمن میں تھے، تو ان کی بارگاہ میں تین اشخاص ایک بچے کے سلسلہ میں اختلاف کر کے حاضر ہوئے اور ہر شخص اسے اپنا بیٹا کہہ رہا تھا تو آپ نے ان کے درمیان قرعہ اندازی کی اور جس کا نام نکلا بچہ کو اسی کے حوالہ کر دیا، البتہ اس سے دیت کا ثلث حصہ لیا اور ان لوگوں کو دے دیا، جب اس فیصلہ کی خبر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

ابن قیم صاحب کی اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس مسئلہ میں کوئی آیت ملی ورنہ کوئی حدیث، اسی لیے انہوں نے اجتہاد فرمایا اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا اور جب اس کی خبر نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کو ملی تو آپ نے انکار نہیں فرمایا۔ بلکہ رضا کا اظہار فرمایا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ زمانہ رسالت میں صحابہ کرام اجتہاد فرمایا کرتے تھے اور جو حضرات اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے وہ دوسروں کی تقلید کیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہ تو اجتہاد سے منع فرماتے اور نہ ہی تقلید کو حرام قرار دیتے۔

اور ابن قیم صاحب رقم طراز ہیں: "واجتهد سعد بن معاذ فی بنی قريظة، وحكم فيهم باجتهاده فصوبه النبی صلى الله عليه وسلم وقال: "لقد حكمت فيهم بحكم الله من فوق السموات والارض" (اعلام الموقعين ۱/۱۶۴ فصل: الصحابة مجتهدون و يقيسون)

یعنی حضرت سعد بن معاذ نے بنو قریظہ کے اندر اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی تصویب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔

اس روایت سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجتہاد فرماتے تھے اور جن کے اندر اجتہاد کی استطاعت نہیں ہوتی تھی وہ ان کی تقلید کیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس کی خبر تھی مگر آپ نے اجتہاد و تقلید سے منع نہیں فرمایا۔ ابن قیم صاحب نے شوکانی صاحب کے ہم خیال ہونے کے باوجود ان کے علاوہ اور بہت سی روایات کو سپرد قرطاس کیا ہے، جن سے اہل سنت و جماعت کے موقف

کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو اعلام الموقعین ۱/۱۶۳،۱۶۴ فصل الصحابۃ یجتہدون ویقیسون) لہذا شوکانی صاحب کا یہ دعویٰ کہ "تقلید کا آغاز ائمہ اربعہ کے بعد ہوا" ہباء منثورا ہو گیا۔

ابن قیم کی تلوار شوکانی صاحب کی گردن پر:۔ سلفی مذہب کی نشر و اشاعت میں شوکانی صاحب کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے، انہوں نے "کشت غیر مقلدیت" کو اپنے خون پسینہ سے سیراب کیا ہے اور اس کی سرسبزی و شادابی کے لئے اپنی حیات مستعار کو صرف کر دیا، اور تقلید کی مخالفت کے جذبات کی رو میں بہکراتنے حواس باختہ ہو گئے کہ جو آیات کریمہ کفار و مشرکین کی مذمت میں وارد ہوئی تھیں، ان کو بڑی بے باکی کے ساتھ ائمہ مجتہدین کی تقلید کرنے والے مسلمانوں پر چسپاں کر دیا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(۱) **واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ماالفینا علیہ آباء نا او لو کان آباؤ ھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون**"۔ (سورۃ البقرۃ ۱۷۰) ترجمہ: اور جب ان سے کہا جائے، اللہ کے اتارے پر چلو، تو کہیں، بلکہ ہم تو اس پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا، کیا اگر چہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں نہ ہدایت (کنزالایمان)

(۲) "**وکذلک ماأرسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الاقال مترفو ھا انا وجدنا أباء نا علی أمۃ و انا علی آثارھم مقتدون، قال أو لو جئتکم باھدی مماو جدتم علیہ اباء کم**"(سورۃ الزخرف ۲۳،۲۴) ترجمہ:۔ اور ایسے ہی ہم نے تم سے پہلے جب کسی شہر میں کوئی ڈر سنانے والا بھیجا، وہاں کے آسودوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم ان کی لکیر کے پیچھے ہیں، نبی نے فرمایا اور کیا جب بھی کہ میں تمہارے پاس وہ لاؤں جو سیدھی راہ ہو اس سے جس پر تمہارے باپ دادا تھے۔ (کنزالایمان)

(۳) **واذا قیل لھم تعالوا الی ماأنزل اللہ والی الرسول قالوا حسبنا ما وجدنا علیہ آباء نا**" (سورۃ المائدۃ ۱۰۴) ترجمہ: اور جب ان سے کہا جائے آؤ اس طرف جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف، کہیں ہمیں وہ بہت ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا (کنزالایمان)

ان آیات کو شوکانی صاحب نے تقلید کی مذمت پر استدلال کرتے ہوئے پیش کیا ہے اور تقلید کے رد و ابطال میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔ مگر انہیں کے ہم خیال ابن قیم صاحب عدل و انصاف کے گلے پر چلتی ہوئی چھری دیکھ کر برداشت نہ کر سکے اور ان کی ساری کد و کاوش پر پانی پھیرتے ہوئے صاف لفظوں میں لکھا کہ ان آیات کریمہ میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو احکام خداوندی پر عمل نہ کر کے اپنے آباء و اجداد کی پیروی کیا کرتے تھے، جو نہ کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید کرتے ہیں، کیونکہ یہ تقلید تو اجر و ثواب کا باعث ہے۔ چنانچہ وہ ان آیات کو نقل کرکے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: **انہ سبحانہ ذم من أعرض عما أنزلہ الی تقلید الآباء، وھذا القدر من التقلید ھو ما اتفق السلف والأئمۃ الأربعۃ علی ذمہ وتحریمہ، واما تقلید من بذل جھدہ فی اتباع ما انزل اللہ وخفی علیہ بعضہ فقلد فیہ من ھو أعلم منہ فھذا محمود غیر مذموم مأجور غیر مازور**"۔ (اعلام الموقعین ۲/۲۳۸)

یعنی اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ خدائے قدوس نے اس شخص کی مذمت کی ہے، جس نے اپنے آباء و اجداد کی تقلید کی اور اس کے نازل کردہ احکامات سے روگردانی کی۔ اسی تقلید کی حرمت و مذمت پر ائمہ کرام و سلف صالحین متفق ہیں۔ البتہ جس نے احکام خداوندی کی تحقیق و تلاش میں پوری کوشش صرف کر دی اور صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکا اور اس نے اپنے اس اعلم و افضل کی تقلید کر لی تو یہ محمود ہے، مذموم نہیں۔ اس پر وہ اجر و ثواب کا مستحق ہوگا نہ کی گناہ کا۔

ابن قیم صاحب کی اس عبارت سے واضح ہوا کہ سلف صالحین اور ائمہ کرام نے جس تقلید کی مذمت و حرمت پر اتفاق و اجماع کیا ہے وہ انسان کا خدائے قدیر کے احکام سے چشم پوشی کر کے اپنے آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے نہ کی مجتہدین عظام کی پیروی کرنا ہے۔ لہذا شوکانی صاحب نے سلفی ہونے کے باوجود ان آیات کو تقلید ائمہ پر چسپاں کر کے اسلاف کے اجماع و اتفاق سے اختلاف کیا اور خرق اجماع کے جرم کا ارتکاب کیا جو بہر حال ایک سنگین جرم ہے۔

شوکانی صاحب کا قابل دید اضطراب:۔ علمائے اہل سنت و جماعت نے اپنے نظریہ کو دلائل و براہین سے آراستہ کیا ہے، جو منصف مزاج اور اعتدال پسند حضرات کے دل و دماغ میں اترتے چلے جاتے ہیں اور انہیں صراط مستقیم کی ہدایت و رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر جو حاہر یہ

معتزلہ بغداد اور امامیہ کے زلفوں کے اسیر ہو چکے ہیں، اور ان کی تقلید کا پٹہ اپنے گلے میں ڈال کر انہیں کو اپنا ماوی و ملجا تسلیم کر لیے ہیں، وہ ان دلائل واضحہ کی ایسی "پولیوزدہ تاویل" کرتے ہیں کہ ادنی ذہن و فکر کا، لکہ ان کی عقل و دانش کا مذاق اڑانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر علماے اہل سنت و جماعت تقلید کے وجوب پر استدلال کرتے ہوئے قرآن کریم کی یہ آیت شریفہ پیش کرتے ہیں۔ **قال تعالی: "فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون"** (سورۃ النحل ۴۳) ترجمہ: تو اے لوگو! علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں۔ (کنز الایمان)

اس آیت مبارکہ میں خدائے قدیر نے اپنے ان بندوں کو اہل علم سے دریافت کرنے کا حکم دیا ہے جو زیور علم سے مزین نہیں ہیں، اس سے تقلید کا ثبوت ہوتا ہے، اس لیے غیر مقلدوں کے پیر مغاں قاضی شوکانی صاحب نے اپنے اجتہاد کی ساری قوتوں کو سمیٹ کر بحر توجیہ و تاویل میں کود پڑے اور کشتی غیر مقلدیت کو غرق ہونے سے بچانے کے لیے اپنی سی کوشش کر ڈالی۔ وہ لکھتے ہیں "اس آیت کا نزول خاص سوال کے بارے میں ہوا ہے، جیسا کہ آیت کا سیاق دلالت کر رہا ہے، ابن جریر، بغوی اور اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ ان مشرکین کے رد میں نازل ہوئی ہے، جو حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرتے تھے اور اگر بالفرض ہم یہاں پر سوال عام مراد لے لیتے ہیں، تب بھی (مقلدین کو) مقصود حاصل نہیں ہوگا، کیوں کہ اللہ تعالی نے "اہل الذکر" سے سوال کرنے کا حکم دیا ہے اور "ذکر" سے مراد صرف قرآن کریم اور احادیث نبویہ ہیں۔ لہذا صرف اہل قرآن و حدیث سے سوال جائز ہوگا۔ (ترجمہ ملخصا القول المفید فی ادلۃ الاجتہاد والتقلید ص: ۷)

شوکانی صاحب کی یہ تاویل کتنی مضحکہ خیز ہے وہ محتاج بیان نہیں، کیونکہ اصول میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خصوصی سبب کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، بلکہ عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے، مگر آں جناب جذبات کی رو میں اس قدر بہہ گئے کہ اصول و ضوابط کے بندھنوں کو توڑ دیا تاکہ کسی طرح غیر مقلدیت کی کشتی کو ڈوبنے سے بچا سکیں، لیکن ناکامی مقدر تھی، اس لیے کامیاب نہ ہو سکے، اور یہاں پر تو کہہ دیا کہ سوال خاص ہے، بہ لفظ دیگر خصوص سبب کا اعتبار ہے نہ کی عموم لفظ کا، لیکن جب تقلید کے رد پر قرآن سے استدلال کیے تو چونکہ ان آیات کا نزول کفار کے بارے میں ہوا تھا اس لیے انہوں نے ان آیات میں عموم لفظ کا اعتبار کیا اور خصوص سبب سے نگاہیں موڑ لیں، گویا کہ وہ اپنے بنائے ہوئے اصول کی زنجیر میں اس طرح جکڑ گئے کہ اس سے چھٹکارا پانا ان کے لیے محال ہو گیا، چنانچہ وہ آیات جو کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئی تھیں، ان کو مسلمانوں پر منطبق کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: **"وهى وان كان تنزيلها فى الكفار، لكنه قد صح تأويلها فى المقلدين لا تحاد العلة، وقد تقرر فى الأصول آن الاعتبار بعموم اللفظ لا بخصوص السبب، وأن الحكم يدور مع العلة وجوداً وعدماً،،** (القول المفيد ۲۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ائمہ کرام کے بنائے ہوئے اصولوں کی تقلید نہ کرنے کی وجہ سے عالم کہلانے والے بلکہ مجتہد گردانے جانے والے اضطراب کا شکار ہو کر ٹھوکریں کھا کھا کر گر رہے ہیں تو عام لوگوں کو اگر مطلق العنان بنا دیا جائے تو پھر ان کا کیا حال ہوگا؟

قاضی شوکانی صاحب زبردست ٹھوکر کھانے کے بعد کہتے ہیں کہ: اگر بالفرض سوال کو عام مان لیا جائے، تب بھی مقصود حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ "اہل الذکر" سے مراد اہل قرآن و اہل حدیث ہیں"۔ خدا جانے شوکانی صاحب نے اہل قرآن اور اہل حدیث سے کیا مراد لیا ہے؟ یہ تو ان کے "مقلدین" ہی بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے اس سے ان خاص فرقوں کو مراد لیا ہے جو "اہل قرآن" اور "اہل حدیث" کے نام سے مشہور ہیں یا پھر وہ لوگ مراد ہیں جو قرآن و حدیث کا علم رکھتے ہیں؟

اور ان سے مسائل کے استخراج و استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ بہر حال اگر پہلی شق کو اختیار کرتے ہیں تو اس کا واضح مفہوم یہ ہوگا کہ غیر مقلدین سے سوال کرو، اور اس پر عمل کر کے ان کی تقلید کرو، گویا شوکانی صاحب ائمہ کرام کی تقلید سے روک کر لوگوں کو اپنا مقلد بنانے کی سعی و کوشش کر رہے ہیں اور اگر شق ثانی دیتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ائمہ کرام و مجتہدین عظام قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتے تھے؟ کتاب اللہ کو سمجھنے کی صلاحیت ان کے اندر نہیں تھی؟ حدیث نبویہ کے فہم و ادراک کی قوتوں سے خالی تھے؟ بہ لفظ دیگر احادیث کی روایت و درایت سے نابلد تھے؟ میرے خیال میں ابتدائی درجات کا ایک غبی طالب علم بھی یہ قول کرتے ہوئے شرمائے گا۔ لہذا روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ "أهل الذكر" سے مراد وہ علمائے ربانیین ہیں جو مرتبہ اجتہاد پر فائز ہوئے اور انہیں کی تقلید کی جائے گی نہ کہ، ان ہلاکت زدہ

معتزلہ بغداد اور امامیہ کے زلفوں کے اسیر ہو چکے ہیں، اور ان کی تقلید کا پٹہ اپنے گلے میں ڈال کر انہیں کو اپنا مادی و ملجا تسلیم کرتے ہیں، وہ ان دلائل واضحہ کی ایسی "پولیوزدہ تاویل" کرتے ہیں کہ ادنیٰ ذہن وفکر کا مالک ان کی عقل و دانش کا مذاق اڑانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر علماے اہل سنت و جماعت تقلید کے وجوب پر استدلال کرتے ہوئے قرآن کریم کی یہ آیت شریفہ پیش کرتے ہیں۔ قال تعالیٰ: **"فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون"** (سورۃ النحل ۴۳) ترجمہ: تو اے لوگو! علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں۔ (کنزالایمان)

اس آیت مبارکہ میں خدائے قدیر نے اپنے ان بندوں کو اہل علم سے دریافت کرنے کا حکم دیا ہے جو زیور علم سے مزین نہیں ہیں، اس سے تقلید کا ثبوت ہوتا ہے، اس لیے غیر مقلدوں کے پیر مغاں قاضی شوکانی صاحب نے اپنے اجتہاد کی ساری قوتوں کو سمیٹ کر بحر توجیہ و تاویل میں کود پڑے اور کشتی غیر مقلدیت کو غرق ہونے سے بچانے کے لیے اپنی سی کوشش کر ڈالی۔ وہ لکھتے ہیں "اس آیت کا نزول خاص سوال کے بارے میں ہوا ہے، جیسا کہ آیت کا سیاق دلالت کر رہا ہے، ابن جریر، بغوی اور اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ ان مشرکین کے رد میں نازل ہوئی ہے، جو حضور رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرتے تھے اور اگر بالفرض ہم یہاں پر سوال عام مراد لے لیتے ہیں، تب بھی (مقلدین کو) مقصود حاصل نہیں ہوگا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے "اہل الذکر" سے سوال کرنے کا حکم دیا ہے اور "ذکر" سے مراد صرف قرآن کریم اور احادیث نبویہ ہیں۔ لہٰذا صرف اہل قرآن و حدیث سے سوال جائز ہوگا۔ (ترجمہ ملخصا القول المفید فی ادلۃ الاجتہاد والتقلید ص: ۷)

شوکانی صاحب کی یہ تاویل کتنی مضحکہ خیز ہے وہ محتاج بیان نہیں، کیونکہ اصول میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ خصوصی سبب کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، بلکہ عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے، مگر آں جناب جذبات کی رو میں اس قدر بہہ گئے کہ اصول و ضوابط کے بندھنوں کو توڑ دیا تاکہ کسی طرح غیر مقلدیت کی کشتی کو ڈوبنے سے بچا سکیں، لیکن ناکامی مقدر تھی، اس لیے کامیاب نہ ہو سکے، اور یہاں پر تو کہہ دیا کہ سوال خاص ہے، بہ لفظ دیگر خصوص سبب کا اعتبار ہے نہ کی عموم لفظ کا، لیکن جب تقلید کے رد پر قرآن سے ستدلال کیے تو چونکہ ان آیات کا نزول کفار کے بارے میں ہوا تھا، اس لیے انہوں نے ان آیات میں عموم لفظ کا اعتبار کیا اور خصوص سبب سے نگاہیں موڑ لیں، گویا کہ وہ اپنے بنائے ہوئے اصول کی زنجیر میں اس طرح جکڑ گئے کہ اس سے چھٹکارا پانا ان کے لیے محال ہو گیا، چنانچہ وہ آیت جو کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئی تھیں، ان کو مسلمانوں پر منطبق کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: **"وهي وان كان تنزيلها في الكفار، لكنه قد صح تاويلها في المقلدين لاتحاد العلة، وقد تقرر في الأصول أن الاعتبار بعموم اللفظ لا بخصوص السبب، وأن الحكم يدور مع العلة وجوداً وعدماً"** (القول المفید ۲۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ائمہ کرام کے بنائے ہوئے اصولوں کی تقلید نہ کرنے کی وجہ سے عالم کہلانے والے بلکہ مجتہد کہلانے جانے والے اضطراب کا شکار ہو کر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں تو عام لوگوں کو اگر مطلق العنان بنا دیا جائے تو پھر ان کا کیا حال ہوگا؟

قاضی شوکانی صاحب زبردست ٹھوکر کھانے کے بعد کہتے ہیں کہ اگر بالغرض سوال کو عام مان لیا جائے، تب بھی مقصود حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ "اہل الذکر" سے مراد اہل قرآن و اہل حدیث ہیں"۔ خدا جانے شوکانی صاحب نے اہل قرآن اور اہل حدیث سے کیا مراد لیا ہے؟ یہ تو ان کے "مقلدین" ہی بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے اس سے ان خاص فرقوں کو مراد لیا ہے جو "اہل قرآن" اور "اہل حدیث" کے نام سے مشہور ہیں یا پھر وہ لوگ مراد ہیں جو قرآن و حدیث کا علم رکھتے ہیں؟

اور ان سے مسائل کے استخراج و استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ بہر حال اگر پہلی شق کو اختیار کرتے ہیں تو اس کا واضح مفہوم یہ ہوگا کہ غیر مقلدین سے سوال کرو، اور اس پر عمل کر کے ان کی تقلید کرو، گویا شوکانی صاحب ائمہ کرام کی تقلید سے روک کر لوگوں کو اپنا مقلد بنانے کی سعی و کوشش کر رہے ہیں اور اگر شق ثانی کو اپناتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ائمہ کرام و مجتہدین عظام قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتے تھے؟ کتاب اللہ کو سمجھنے کی صلاحیت ان کے اندر نہیں تھی؟ احادیث نبویہ کے فہم و ادراک کی قوتوں سے خالی تھے؟ بہ لفظ دیگر احادیث کی روایت و درایت سے نابلد تھے؟ میرے خیال میں ابتدائی درجات کا ایک غبی طالب علم بھی یہ قول کرتے ہوئے شرمائے گا۔ لہٰذا روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ "أهل الذکر" سے مراد وہ علمائے ربانیین ہیں جو مرتبہ اجتہاد پر فائز ہوئے اور انہیں کی تقلید کی جائے گی نہ کہ ان ہلاکت زدہ

-أنها عامة في كل أولي الأمر من الأمراء والعلماء كما تقدم"(تفسیر ابن کثیر ۱ ۵۱۸)

یعنی علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ "اولوالامر" سے فقہاء اور ائمہ دین مراد ہیں اور یہی مجاہد، عطا، حسن بصری اور ابو العالیہ کا قول ہے اور ظاہر یہ ہے- واللہ اعلم- کہ یہ امراء وعلماء دونوں کو شامل ہے جیسا کہ گزر چکا ہے-

شیخ ابن تیمیہ کی رائے -اور ابن قیم کے استاذ گرامی شیخ ابن تیمیہ رقم طراز ہیں: **قد أوجب الله طاعة الرسول على جميع الناس في قريب من أربعين موضعا من القرآن، وطاعته طاعة الله، وهي عبادة الله وحده لاشريك له، وذلك هو دين الله وهو الاسلام، وكل من امر الله بطاعته من عالم وامير ووالد وزوج، فلأن طاعته طاعة الله"**

(مجموعة الفتاوى ۱۰/۱۹/۱۳۱)

یعنی بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں تقریباً چالیس مقامات پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت وفرماں برداری کو تمام لوگوں پر واجب قرار دیا ہے اور ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اللہ کی اطاعت اس وحدہ لاشریک کی عبادت وبندگی ہے اور یہی دین اسلام ہے اور ہر اس شخص کی پیروی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے جس کی اطاعت کا خدائے قدیر نے حکم دیا ہے، خواہ وہ عالم ہو یا امیر، والد ہو یا شوہر-

شوکانی صاحب زبردست تناقض کے شکار -شیخ ابن تیمیہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ کرام ومجتہدین عظام کی تقلید درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے حبیب علیہ التحیۃ والثناء ہی کی اطاعت وفرمانبرداری ہے، کوئی الگ شئی نہیں ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ شوکانی صاحب نے "اولوالامر" کی تفسیر میں جابر بن عبد اللہ اور مجاہد کے قول کو راجح قرار دیا ہے، جنہوں نے اس سے علماء مراد لیا ہے- ساتھ ہی اس عبارت سے ان کا منہج تفسیر بھی اجاگر ہوتا ہے وہ یہ کہ "چند اقوال میں جو ان کے نزدیک راجح ہوتا ہے، اس کو وہ مقدم رکھتے ہیں" جیسا کہ انہوں نے "أولي الأمر" کی تفسیر میں "ائمہ" کو مقدم کر کے اسی کو راجح بتایا ہے- لیکن حیرت ہے کہ جب وہ تقلید کے رد وابطال پر کمربستہ ہوئے ہیں تو وہ جسے "فتح القدیر" میں راجح قرار دے چکے تھے، اسی کو "القول المفید" میں مرجوح بتانے کی کوشش کر رہے ہیں- چنانچہ وہ مقلدین کا رد کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں "ومن جملة ما استدلوا به قوله تعالى " اطيعوا الله و اطيعو الرسول واولي الأمر منكم" وقالوا: وأولو الأمر، هم العلماء، اطاعتهم تقليد هم فيما يفتو به، والجواب: أن للمفسرين في تفسير " أولي الأمر" قولين احدهما: أنهم الأمراء والثاني: أنهم العلماء ولاتمنع ارادة الطائفتين من الآية الكريمة، ولكن أين هذا من الدلالة على مراد المقلدين، فانه لاطاعة للعلماء ولا للأمراء الا إذا أمروا بطاعة الله على وفق شريعته، والا فقد ثبت عنه صلى الله تعالىٰ عليه وسلم انه قال: لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"(القول المفيد ص ۲۸)

یعنی جواز تقلید کے قائلین اس آیت کریمہ (اطیعو اللہ....) سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اولوالامر" سے علماء مراد ہیں اور ان کی اطاعت ان کی تقلید ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ "اولوالامر" کے سلسلہ میں مفسرین کرام کے دو قول ہیں- ایک یہ کہ اس سے امراء مراد ہیں، اور دوسرا یہ کہ اس سے علماء مراد ہیں اور آیت کریمہ میں دونوں گروہوں کو مراد لیا جا سکتا ہے- مگر مقلدین کو اس سے ان کا مقصد کہاں حاصل ہو رہا ہے؟ کیونکہ علماء اور رؤساء کی تقلید واطاعت اسی صورت میں ہے- جبکہ وہ شریعت کے مطابق خدائے قدوس کی طاعت کا حکم دیں، اس لیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ حدیث ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت ونافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت وفرمانبرداری جائز نہیں ہے-

شوکانی صاحب کی اس عبارت سے دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں:-

(1) آیت کریمہ میں "اولی الامر" سے امراء وسلاطین کا مراد لینا راجح ہے اور علماء وائمہ کا مراد لینا مرجوح ہے، کیونکہ انہوں نے یہاں پر مفسرین کرام کے اقوال کو ذکر کرتے ہوئے، اسی کو مقدم رکھا ہے، اور "فتح القدیر" کے حوالے سے ان کا منہج ظاہر ہو چکا ہے کہ ان کے نزدیک جو بات راجح ہوتی ہے، اس کو مقدم کرتے ہیں، جیسا کہ "فتح القدیر" میں انہوں نے "ائمہ" کو مقدم کر کے کہا تھا کہ یہی راجح ہے- ظاہر ہے شوکانی صاحب "اولی الامر" کی تفسیر میں راجح اور مرجوح کے تعین میں زبردست تناقض وتضاد کے شکار ہو گئے ہیں، اس کو ان کا کوئی "نیازمند مقلد" ہی دور کر سکتا ہے-

(۲) شوکانی صاحب نے کھلے لفظوں میں اعتراف کرلیا کہ ائمہ کرام اگر شریعت غراء کی روشنی میں مسئلہ بتائیں تو ان کی تقلید جائز ہوگی اور اگر اسلام کے خلاف کوئی فکر سنائیں، جس سے معصیت لازم آئے تو تقلید ناجائز وحرام ہوگی۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ائمہ کرام و مجتہدین عظام شریعت کے خلاف احکام بیان کرتے تھے؟ کیا خدائے وحدہ لاشریک کی معصیت و نافرمانی کا حکم دیتے تھے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو یہ شوکانی صاحب کی طرف سے فقہائے اسلام پر افترا پردازی اور بہتان تراشی ہے، جو کم از کم ان کے شایان شان نہیں، کیونکہ وہ اپنے ''ملدقہ'' میں مجتہد گماں کیے جاتے ہیں، علاوہ ازیں ابن قیم کے بارے میں آپ کون سا فتویٰ صادر کریں گے؟ جو ائمہ کرام کی تقلید کو ماں باپ کی اطاعت سے فضل بتا رہے ہیں۔ اور اگر نفی میں جواب دیتے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ آپ نے تقلید کے ردو ابطال کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:۔ اس موقع پر شوکانی صاحب کا کوئی گرویدہ اور نادیدہ عاشق ان کی تقلید کے جذبے سے سرشار ہو کر یہ کہے کہ مجتہد سے کبھی کبھار اجتہاد میں غلطی بھی ہوتی تھی۔ لہٰذا جو شخص ان کی تقلید اس مسئلہ میں کرے، جس میں خطا واقع ہوئی ہے، جو شریعت کے خلاف ہے تو گویا کہ وہ معصیت میں تقلید کر رہا ہے، جو ناجائز وحرام ہے۔

اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ تعصب و تنگ نظری کی ''وادی تیہہ'' سے باہر نکل کر عدل و انصاف کا عینک لگا کر شیخ ابن تیمیہ کی مندرجہ ذیل عبارت کا گہری نظر سے مطالعہ کریں، حقیقت چمچماتی دھوپ کی طرح آشکارا ہو جائے گی، وہ تحریر کرتے ہیں **واجتهاد العلماء فی الأحکام کاجتهاد المستدلین علی جهة الکعبة، فاذا صلی اربعة انفس کل واحد منهم بطائفة الی اربع جهات لاعتقادهم ان القبلة هناک، فان صلاة الاربعة صحیحة، والذی صلی الی جهة الکعبة واحد، وهو المصیب الذی له اجران**''۔ (مجموعۃ الفتاویٰ ۱۰/۲۰/۱۲۵)

یعنی احکام شرعیہ میں علمائے کرام کا اجتہاد جہت کعبہ کے سلسلہ میں اجتہاد کرنے والوں کی طرح ہے۔ اگر چار افراد نے چار مختلف جہتوں میں ایک ایک جماعت کے ساتھ نماز ادا کی، اس اعتقاد کے ساتھ کہ قبلہ ادھر ہی ہے تو سب کی نماز صحیح ہوگی، حالاں کہ جہت کعبہ میں ایک ہی نماز ادا کر رہا ہے جو مصیب ہے جس کے لیے دو اجر ہیں۔

اور ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں: **والعالم اذا أفتی المستفتی بمالم یعلم المستفتی انه مخالف لامر الله، فلا یکون المطیع له عاصیاً، واما اذا علم انه مخالف لامر الله فطاعته فی ذلک معصیة الله**'' (مجموعۃ الفتاویٰ ۱۰/۱۹/۱۳۱)

یعنی جب عالم نے استفتاء کرنے والے کو ایسا فتویٰ دیا جس کے بارے میں سائل یہ نہیں جانتا ہے کہ یہ احکام خدا کے مخالف ہے، تو اس عالم کی تقلید کرنے والا گنہگار نہیں ہوگا۔ البتہ مستفتی کو اگر اس بات کا علم ہے کہ یہ شریعت کے مخالف ہے تو ایسی صورت میں اس عالم کی تقلید کرنے والا گنہگار ہوگا۔

شیخ ابن تیمیہ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مقلد کو اگر اس بات کا علم ہے کہ مجتہد سے اس مسئلہ میں غلطی واقع ہوگئی ہے، اس کے باوجود وہ تقلید کر رہا ہے تو وہ گنہگار ہوگا، ہاں اگر وہ اس کے بارے میں نہیں جانتا ہے اور تقلید کر رہا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، بلکہ وہ اجر وثواب کا مستحق ہوگا۔

خلاصہ بحث۔ غیر مقلدین اس کے علاوہ چند اور لایعنی دلائل کا سہارا لیتے ہیں اور عوام الناس کو ورغلانے کی حاصل حد جہد کرتے ہیں، اگر ان سب کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا جائے تو ان کی حقیقت صدائے بازگشت کے سوا کچھ نہ ہوگی، مگر راقم احروف اسی پر اکتفا کرتا ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عامہ ناس پر تقلید واجب وضروری ہے اور ساتھ ہی وہ علمائے کرام جو درجہ اجتہاد تک نہیں پہنچ سکے، ان کے لیے بھی تقلید ضروری ہے، البتہ جو صاحب اجتہاد ہیں، ان کے لیے تقلید حرام ہے، انہیں لوگوں کو ائمہ کرام نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے نہ کہ عوام الناس کو تقلید سے روکا ہے، جیسا کہ ابن قیم اور شوکانی اور ان کے مقلدین گمان کرتے ہیں اور تقلید کے بطلان پر ان کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ زرکشی صاحب تحریر فرماتے ہیں: **هذا الذی قاله ممنوع، وانما منعوا المجتهد خاصة عن تقلید هم دون من لم یبلغ هذه الرتبة**''(البحر المحیط ۶/ ۲۸۰)

یعنی جو یہ کہا گیا ہے کہ ائمہ کرام نے اپنی تقلید سے عوام الناس کو روکا ہے، یہ صحیح نہیں، بلکہ انہوں نے خاص مجتہدین کو منع فرمایا ہے۔

☆☆☆

زیشان احمد مصباحی☆

تقلید سے اجتہاد تک

اگر میں خود کو مقلد کہوں تو مجھے اندر سے اچھا نہیں لگے گا کہ عقل و شعور ہوتے ہوئے میں دوسرے کا متبع بن جاؤں؟ اور اگر یہ کہوں کہ مجتہد ہوں تو میرا ضمیر میرے جھوٹ پر مجھے ملامت کرے گا- موجودہ دنیا میں تقلید واجتہاد کی ساری لڑائی دراصل انہی دو احساسات کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے- جنہیں ضمیر کی ملامت پسند نہیں وہ بخوشی اس کمتر احساس کو قبول کر لیتے ہیں کہ میں دوسرے کا متبع ہوں، اور جن کی انا مـا تحتیت کے لیے کسی طور پر راضی نہیں ہوتی انہیں ناچار ضمیر کی ملامت برداشت کرنی پڑتی ہے-

تقلید واجتہاد کی بحث بار بار چھڑنے کی ایک بنیادی وجہ ان کے صحیح مفہوم سے ناواقفی بھی ہے- یہ ناواقفی عموماً مقلدین وغیر مقلدین دونوں میں پائی جاتی ہے- مقلدین مسئلہ تقلید کے تعلق سے بسا اوقات یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین کا قد فقہ اور تدبر میں ہم سے بہت بلند تھا، اتنا بلند کہ ان کی ہر بات ہمارے لیے حرف آخر ہے اور اب ہمیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ تقلید جامد ہے جو غلط ہے، گویا جس مقصد کے لیے فقہ کی تدوین ہوئی تھی (بدلتے حالات میں شریعت کی تطبیق اور نو پید ا مسائل کا اصولی حل) اب وہ اسی کے منکر ہو جاتے ہیں- غیر مقلدین تقلید کو قرآن وحدیث کے مقابل ایک الگ مصدر شریعت سمجھتے ہیں، اسی لیے مقلدین کے حوالے سے ان کی لن ترانیاں اشراک فی الدین تک پہنچ جاتی ہیں-

اجتہاد کا مفہوم بھی عموماً ذہنوں میں گڈمڈ ہو جاتا ہے، اجتہاد کے لغوی معنی کوشش کرنے کے ہیں- دین کے حوالے سے اس کا مفہوم مسائل شریعت معلوم کرنے کے لیے قرآن وسنت میں گہرا تدبر اور غور و فکر کرنا ہے- اس معنی میں تمام محدثین ومفسرین اور طالبین علوم شریعت مجتہد ہیں، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے طور پر قرآن وحدیث میں غور وفکر کرتا ہے، اجتہاد کا ایک تیسرا مفہوم بھی ہے اور وہ ہے غیر منصوص مسائل کا حکم جاننے کے لیے کتاب وسنت میں غور کرنا اور کتاب و سنت سے ان کی نظیر تلاش کر کے فیصلہ صادر کرنا- حضرت معاذ ابن جبل کا مشہور **اجتهد برائي** جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا، اسی معنی میں ہے- چوں کہ نئے مسائل ہر دور میں اور ہر خطے میں پیدا ہوتے رہیں گے اس لیے اجتہاد کا یہ تسلسل بھی ہمیشہ قائم رہے گا، فقہا اور اہل علم نے مختلف الفاظ میں اسی اجتہاد کی تعریف کی ہے- اجتہاد کا ایک چوتھا معنی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی سب سے زیادہ متنازع ہے اور وہ ہے کتاب وسنت کے اسلوب ومزاج، مقاصد شریعت اور احوال امت کو پیش نظر رکھ کر ایسے اصول وضع کرنا، جن کی روشنی میں کتاب و سنت سے مسائل کا استخراج ہو سکے- مثال کے طور پر کتاب وسنت میں بے شمار احکام ہیں- لیکن کون حکم فرض ہے، کون واجب ہے اور کون مستحب؟ ان مسائل کے ادراک کے لیے ایسے اصول کی ضرورت ہے، جن سے صاف طور پر موقف علمی واضح ہو جائے- اجتہاد کو ثابت کرنے والے اور اجتہاد کا انکار کرنے والے عموماً اجتہاد کے ان مختلف مفاہیم کو مد نظر رکھے بغیر ہی بحث طوالت میں الجھ جاتے ہیں- مثلاً کوئی ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کو ثابت کرنے کے لیے حضرت معاذ بن جبل کا قول **اجتهد برائي** پیش کرتا ہے اور کوئی ان کے اجتہاد کو رد کرنے کے لیے حضرت عمر کا قول **اياكم واصحاب الرای** پیش کرتا ہے، جب کہ دونوں کا یہ مناظرہ **أنا في و ادو أنت في واد** کے مصداق ہے-

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ **فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة** اور **فاسئلوا أهل الذكر ان كنتم لا تعلمون** جیسی قرآنی آیات اور **اجتهد برائي** جیسے کلمات احادیث سے نہ اجتہاد وتقلید کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فقہ واجتہاد یا قیاس وتقلید کو کتاب وسنت سے الگ کوئی چیز بتا کر انہیں مسترد کیا جا سکتا ہے- اس طرح کی دلائل سے جو لوگ اپنا موقف ثابت کرتے ہیں، وہ اپنے ضمیر کو اپنی ہی زبان کے خلاف صف آرا پاتے ہیں اور انہیں اس بات کا خوب احساس ہوتا ہے کہ ان کی رائے اپنی ہی رائے کے خلاف ہے-

"اسلام دین فطرت ہے" جس مسلمان کو اس حقیقت کا عرفان

☆z_almasmisbah@yahoo com

حاصل ہو چکا ہے، اسے اس بات کا اعتراف ہے کہ اسلام میں فطرت کے جبری تقاضوں کی تکمیل کے سامان موجود ہیں- اور اسلام کی یہ خوبی نزول وحی الٰہی کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر زمانے اور ہر علاقے میں اسلام کا یہ وصف ہمہ گیریت موجود ہے- قرآن نے خود قرآن کو قرآن (جو ہمارے سامنے موجود ہے) کی شکل میں جمع و مرتب کرنے کا حکم نہیں دیا- نہ کتاب وسنت میں بخاری ومسلم کی تدوین وترتیب اور ان کے احترام و توقیر کا حکم ہے- وقت کے جبر نے تقاضا کیا اور اسلام کی فطرت نے اسے قبول کر لیا- اب یہ بڑی احمقانہ بات ہوگی کہ کوئی یہ کہے کہ ہم اس قرآن کے متبع ہیں جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اس قرآن کے نہیں، جس کو حضرت عثمان نے مرتب کیا- اسی طرح سفاک حجاج ابن یوسف نے قرآن میں اعراب (زبر زیر پیش) لگا کر قرآن کو ایک نئی طرز میں پیش لیا، اب اگر آج کوئی قرآن سے اعراب مٹانے کا مطالبہ کرے اور یہ کہے کہ کتاب وسنت میں حجاج بن یوسف کے ذریعے لگائے گئے اعراب کے ساتھ قرآن چھاپنے اور پڑھنے کا حکم کہیں بھی موجود نہیں ہے تو اس کی سادگی پر دعا ہی دی جاسکتی ہے-

اجتہاد (اسلامی قانون سازی) اور تقلید (کسی خاص مسلک فقہی کے قوانین کی پیری) بھی اس ذیل میں آتے ہیں- میرا ناقص مطالعہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان چیزوں کو براہ راست کتاب وسنت سے ثابت نہیں کیا جا سکتا اور نہ کتاب وسنت سے الگ بتا کر انہیں رد کیا جا سکتا ہے، حالات کے جبر نے اجتہاد کا پرزور مطالبہ کیا اور امت کے سرخیل ماہر اور عبقری افراد نے آگے بڑھ کر اس مطالبے کو پورا کیا- جو جنتی بندے یہ قسم کھا چکے ہیں کہ جو باتیں کتاب وسنت میں صراحت کے ساتھ ملیں گی، انہیں کا اتباع لازم ہے، ان کے علاوہ ہر بات مسترد کر دینے کے لائق ہے— خواہ وہ امت کا معمول ہو، علما کا اجماع ہو یا اسلاف کا طرز عمل ہو— ایسے افراد ہوش کے ناخن لیں کہ ان کے لیے نہ تو کتاب پر عمل ممکن ہے اور نہ احادیث پر- اسلام میں مسلمانوں کے ساتھ حسن ظن کو بڑی اہمیت دی گئی ہے- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظنوا المومنین خیراً- مسلمانوں کے ساتھ اچھا گمان رکھو- یہ بڑا بنیادی فلسفہ اور اسلامی ضرورت ہے- اگر اسلاف واکابر مشکوک قرار پاگئے تو کتاب وسنت کے نام پر جو کچھ سرمایہ ہے، سب شک کے دائرہ میں آجائے گا اور حقیقی اسلام کے متلاشی باب اسلام سے باہر نکلتے ہوئے نظر آئیں گے-

اس تمہیدی گفتگو کے بعد صحابہ کس کی تقلید کرتے تھے؟ کتاب وسنت میں تقلید کا کہاں حکم ہے؟ مجتہدین کس کی تقلید کرتے تھے؟ کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے ائمہ کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟ اور ان جیسے سوالات کی بے معنویت واضح ہو جاتی ہے- ہاں! یہ سوال اپنی جگہ ضرور رہتا ہے کہ کیا واقعی اجتہاد کرنا حالات کا تقاضا تھا اور اس کے بعد تقلید امت کی مجبوری بن گئی؟ یہ سوال اپنے اندر کافی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنا مشکل بھی ہے اور ضروری بھی- ضروری اس لیے تاکہ حقیقت روشن ہو اور مشکل اس لیے کہ جس طرح منکرین حدیث کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے، جس نے حدیث کے بغیر اسلام پر گامزن رہنے کو ممکن مان لیا ہے، اسی طرح ایک طبقہ کتاب وسنت کو بہر صورت اپنے لیے کافی سمجھتا ہے- اس لیے صرف اجتہاد وتقلید کو پرزور الفاظ میں ثابت کر دینے سے بحث کی تشنگی ختم نہیں ہو سکتی، جب تک منکرین کے شکوک وشبہات کی بنیادیں نہ تلاش کر لی جائیں-

اجتہاد کی ضرورت کیوں پڑی؟:- اس معنی میں اجتہاد کہ احکام خدا ورسول میں غور وفکر کر کے ان کے منشا ومطلوب معلوم کیے جائیں یا اس معنی میں اجتہاد کہ منصوص مسائل پر قیاس کر کے یا مزاج شریعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے غیر منصوص مسائل کے احکام معلوم کیے جائیں، اتنا ہی قدیم ہے جتنا اسلام، اور جو لوگ اس کی اہلیت نہیں رکھتے، ان کا اہل لوگوں کا اتباع/تقلید کرنا اتنا ہی قدیم ہے، جتنا اسلام- ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ عہد صحابہ میں حضرت علی یا حضرت معاذ بن جبل یا کسی دوسرے ذی علم وتدبر صحابی نے کوئی رائے قائم کی اور دوسرے صحابہ نے ان کا اتباع کیا- مثال کے طور پر قرآن نے شراب کو حرام کر دیا- لیکن حکم حرمت کے باوجود اگر کوئی شراب پیتا ہے تو اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ کتاب اللہ میں موجود نہیں ہے- حضرت عمر نے اپنے زمانہ خلافت میں مشورہ کیا تو حضرت عبد الرحمن بن عوف نے اس کی سزا أخف الحدود رکھی -- یعنی شریعت میں جتنی حدود ہیں ان میں اقل مقدار حد قذف (اسی کوڑے) ہے- حضرت عبد الرحمن نے کتاب اللہ میں حد کے نظیر تلاش کی اور سب سے خفیف قذف میں پایا، اس لیے اسی کو شراب نوشی کی حد بھی قرار دیا، کیوں کہ اس سے کم کتاب وسنت میں کوئی حد ہی نہیں- صحابہ نے اس رائے کو تسلیم کر لیا- تو عمومی معنی میں

اسے حضرت عبدالرحمٰن کا اجتہاد اور صحابہ کی تقلید کہہ سکتے ہیں- کیوں کہ سب کو حضرت عمر نے مقرر مان لیا اور اپنے سارے گورنروں کو لکھ بھیجا کہ شرابی کو اسی کوڑے لگائے جائیں-

اجتہاد کا وہ معنی جس میں فقہ القرآن والسنۃ کو ایک علمی و اصولی فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے یہ نہ تو زمانہ رسالت میں تھا اور نہ عہد صحابہ میں- اس کا آغاز امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا- بعد میں دوسرے درجنوں ذی علم و ذی تدبر حضرات نے بھی اس معنی میں اجتہاد کیا- فقہ الکتاب والسنۃ کے لیے باضابطہ اصول وضع کیے گئے اور ان اصول کی روشنی میں کتاب و سنت سے غیر منصوص مسائل کا حکم معلوم کرنے کا طریقہ بھی واضح ہوگیا اور خود منصوص مسائل کو بھی نص سے علمی انداز سے ثابت کرنا آسان ہوگیا-

حضرت امام ابوحنیفہ کی ولادت ۸۰ھ میں اور وفات ۱۵۰ ہجری میں ہوئی- اس سے فن اجتہاد کا آغاز کس صدی میں ہوا واضح ہو جاتا ہے- جب امام ابوحنیفہ نے یہ کام شروع کیا تو جو لوگ حدیث کی تلاش و جستجو میں مصروف تھے، ان میں بعض نے اپنے طور پر اسے بہت زیادہ پسند نہیں کیا- اس لیے کہ عام طور پر جو آدمی جو کام کرتا ہے، اسی کو سب سے اہم کام سمجھتا ہے- ایک دوسری وجہ یہ بھی رہی ہو کہ بعض حضرات نے اس اجتہاد کو فقہ القرآن والسنۃ کے علمی اصول کی بجائے کتاب و سنت کے مقابل کوئی اور چیز سمجھا ہو- بہر حال باوجود اس کے بہت سے جلیل القدر ذی علم، ماہرین کتاب و سنت اور واقفین رموز شریعت نے اس میدان میں قدم رکھا- فنی طور پر ان میں اختلاف ہوا اور مختلف مکاتب فقہ وجود میں آئے-

چار مکاتب آج بھی موجود ہیں- حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی- اور امام اوزاعی وغیرہ کے مسالک باقی نہیں رہ سکے- کیوں کہ وہ مدون نہ ہو سکے ورمدون نہ ہونے کی وجہ غالباً یہ ہو کہ ان کے اصول بعد کے اہل علم میں مقبول نہیں ہو سکے- جن کے اصول متاخرین میں سے جتنے زیادہ اور جتنے بڑے اصحاب علم و دانش نے پسند کیا، ان کا مسلک فقہی اسی اعتبار سے پروان چڑھتا رہا- یہیں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تقلید شخصی کا مفہوم یہ نہیں کہ کتاب و سنت کو چھوڑ کر کسی امام کو مصدر شریعت مان لیا جائے یا کتاب و سنت کی طرح قول امام کو بھی مصدر شریعت کا درجہ دے دیا جائے- اس طرح کی تقلید یقیناً تقلید جامد بلکہ اشراک فی الدین ہے-

اہل علم و بصیرت کے لیے تقلید کا فقہا یہ معنی ہے کہ انہیں کسی امام کے اصول پسند ہیں اور وہ ان اصولوں کی پیروی کرتا ہے- اس مفہوم میں غیر مقلدین حضرات بھی اپنے ان بڑوں کے مقلد ہیں جنہوں نے اپنے طور پر علم و استدلال کی روشنی میں تقلید کو غلط قرار دیا- اس کے لیے انہوں نے جو دلائل پیش کیے وہ دلائل ان کے تمام متبعین کے ذہن و فکر میں بھی اتر گئے- اس لیے یہ حضرات بھی اپنے بڑوں کی بات دہرانے لگے- مقلدین اہل علم کا بھی یہی حال ہے وہ اپنے امام کو اس لیے نہیں مانتے کہ خدا اور رسول کی طرح ان کے ارشادات بھی مستند ہیں- بلکہ اس لیے کہ امام نے جو بات کہی ہے وہ منشا کتاب و سنت کو پوری کر رہی ہے- رہے عوام یا جنہیں دین کا شعور نہیں، وہ تو اهل الذكر سے معلوم کریں گے ہی- انہیں اہل علم کے اتباع، تقلید سے بہر حال چارہ کار نہیں- اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مخصوص معنی (اصول سازی) میں اجتہاد کی ضرورت کیوں پڑی؟ اس سوال کا جواب ہمیں دو مثالوں سے سمجھنے میں آسانی ہوگی- ہمارے سامنے اس وقت ایک مثال بدھ مذہب کی دو شاخوں مہایان اور ہنایان میں تفریق ہے اور دوسری مثال ہے علم شریعت کی ذیلی علوم علم تفسیر، علم حدیث، علم اصول، علم کلام وغیرہ کی تقسیم-

(۱) گوتم بدھ ۵۶۳ ق م میں ایک چھتری حکمراں خانوادے کے اندر نیپال میں پیدا ہوئے- ۲۹ سال کی عمر میں تلاش حق کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں میں گم ہو گئے، ۳۵ سال کی عمر میں بدھ مت کے مطابق انہیں نروان (نجات) حاصل ہوئی اور بقیہ زندگی کے ۴۵ سال اپنی فکر کی تبلیغ و اشاعت میں گزار دیے- گوتم بدھ کی وفات کے ۱۰۰ سال بعد بنارس میں ان کے متبعین (بھکشوؤں) کا ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں باضابطہ بدھ مت کو ایک مذہب کی شکل دے دی گئی اور اس کے ساتھ ہی بدھ بھکشوؤں میں روایت و جدت کے حوالے سے اختلاف ہوگیا- ایک وہ طبقہ تھا جو گوتم بدھ کے الفاظ پر عمل کرنے کا مطالبہ کرتا تھا اور ذرہ برابر اس سے ہٹنے کو بدھ مت سے ارتداد کہتا تھا، جبکہ دوسرا طبقہ گوتم بدھ کے مقاصد، ان کے ارشادات کے معانی و مفاہیم اور نئے دور اور نئے مسائل میں ان کے ارشادات کی توضیح و تطبیق کا قائل تھا- روایت پرستوں کا نمائندہ ہنایان اور آزاد خیالوں کا نمائندہ مہایان کی شکل میں آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہیں-

اس تناظر میں مسلمانوں کے اندر مقلدین و غیر مقلدین کے

اختلافات پر نظر ڈالیے تو ان کا سرا اصحاب اجتہاد اور اصحاب ظواہر پر ختم ہوتا ہے -- یعنی اصل اختلاف یہ نہیں ہے کہ اہل علم کی بات مانی جائے یا نہ مانی جائے - اہل علم سے دریافت کرنا اور ان کی رہنمائی پر عمل کرنا یہ تو قرآن سے ثابت ہے - اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی کلمہ خواں کو اس مسئلہ میں اختلاف ہوگا - اصل اختلاف یہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ کتاب وسنت کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے اب تک جو سمجھا ہے وہ یہی ہے کہ مذہب سے ماننے والوں کی طرح بنیادی طور پر یہی نقطہ اختلاف مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا - کچھ اہل علم کی رائے یہ بنی کہ قرآن وحدیث کو کافی سمجھا جائے اور جتنی باتیں ان میں ہیں انہیں پر عمل کیا جائے - جبکہ دوسرے طبقے کو نئے دور اور نئے مسائل کا اندازہ تھا اور اس نے یہ سمجھا کہ نئے مسائل اتنے زیادہ اور اتنے مختلف النوع پیدا ہو رہے ہیں کہ ان کے لیے حل مسائل کا علاحدہ اور مخصوص شعبہ قائم کرنا ضروری ہے - ان کے نزدیک باضابطہ اصول وقوانین وضع کیے بغیر اسلام نئے چیلنجیز کا نہ تو جواب دے سکتا ہے اور نہ ہی مسائل شریعت کو جدید عالمی تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے - یہ بنیادی اختلاف ہے جس پر سب کی نظر نہیں ہوتی - اس حوالے سے میں اپنے محدود ومختصر مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان دونوں نظریات میں صحیح کیا ہے؟ اس میں ہمارا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں نظریات نیک نیتی پر مبنی ہیں - اگر ان نظریات کے متبعین بھی نیک نیتی پر گامزن ہوں تو عند اللہ وہ ضرور ماجور یا معذور ٹھہریں گے -

(۲) عہد رسالت میں ایک منبع علم تھا، سرچشمۂ رسالت - اس سے جو جتنا سیراب ہوتا وہ اتنا ہی بڑا عالم شریعت ہوتا - اس زمانہ میں نہ کوئی مکتب تھا، نہ مدرسہ، نہ علم حدیث نہ علم تفسیر، نہ قرآن الگ، نہ حدیث الگ - سب شہر علم وحکمت کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور علم وفن کے موتی اپنے دامن میں سمیٹے واپس ہوتے - علم دین میں تھوڑی سی تفریق بس یہ تھی کہ تاجدار اقلیم رسالت صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کی نشاندہی فرماتے اور کاتب بلوا کر اسے لکھوا دیتے - لیکن مجموعی طور پر صحابہ کے پاس ایک علم تھا اور وہ تھا علم شریعت - یہ اور بات ہے کے وہی تمام علوم وفنون کو جامع تھا - ایک ہی صحابی حافظ وقاری بھی تھا، محدث و فقیہ بھی اور مجتہد ومتکلم بھی - علمی اعتبار سے صحابہ میں کمی وبیشی ضرور تھی - لیکن ان میں اسپیشلائزیشن کا کوئی باضابطہ تصور نہیں تھا -

خلافت راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا عہد آیا اور رسالت کا زمانہ کافی پیچھے چھوٹ گیا، مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست روشنی حاصل کرنے والے ایک ایک کر کے کم ہونے لگے تو اب علم شریعت کو مدون کرنے کا رجحان اور تدوین کے لیے، تخصص، تفنن اور ترتیب کا شعور پیدا ہوا - کچھ نفوس قدسیہ نے جمع حدیث کا کام کیا، کچھ نے نقد حدیث کا کام کیا، بعض محسنین امت نے ماثور تفسیریں لکھیں، کچھ نے رجال حدیث کے احوال جمع کیے - اسی زمانے میں قانون اسلامی ایک علاحدہ فن کی حیثیت سے سامنے آیا اور علم فقہ واصول کی وضع ہوئی - یہ ساری چیزیں بدعت تھیں، لیکن بدعت ہوتے ہوئے یہ امت کی ضرورت تھیں اس لیے امت کی نمائندہ شخصیتوں نے پورے انہماک اور لگن سے یہ کام انجام دیا - لیکن اگر ہم کہیں کہ کتاب وسنت کے بعد ساری چیزیں بدعت ہیں جن کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے - تو یہ سوال صرف فقہ واجتہاد پر نہیں ہوگا بلکہ اس سوال سے دین کا سارا سرمایہ خطرے کی زد میں آ جائے گا -

اس گفتگو سے اس طرح کے شبہات ختم ہو جاتے ہیں کہ کیا امام بخاری مجتہد نہیں تھے؟ اور کیا امام ابوحنیفہ محدث نہیں تھے؟ اس طرح کے شبہات انہی ذہنوں میں آ سکتے ہیں جن میں تخصص اور اسپیشلائزیشن کا مفہوم واضح نہیں ہے - اس طرح کے شبہات میں ڈوب کر جو فکری ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں، انہیں دور جدید میں علوم میں اسپیشلائزیشن کا مفہوم کیا ہے؟ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، جسے بدقسمتی سے مغرب کی دین سمجھ لیا گیا ہے - اگر کوئی سیاسیات کا اسپیشلسٹ ہے تو اس کا بالکل یہ معنی نہیں کہ وہ سماجیات، عمرانیات اور تاریخ سے نابلد ہے اور نہ کوئی تاریخ کا ماہر سیاسیات سے نابلد ہو سکتا ہے - لیکن اس کے باوجود خصوصی موضوع کے خصوصی مطالعہ کے سبب اس موضوع کے حوالے سے جو وسعت علم ہوتی ہے وہ دوسرے موضوع کے حوالے سے نہیں ہوتی -

اسپیشلائزیشن کے مفہوم کو سمجھنے کے بعد یہ بات بھی سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ امام بخاری یا دوسرے ائمہ حدیث کا میدان فکر وعمل کچھ اور ہے اور امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ اجتہاد کا میدان عمل کچھ اور -

از روئے تخصص علم حدیث وعلم فقہ کا معنی جب تک ذہنوں میں واضح نہیں ہو جاتا، اس وقت تک امام بخاری وامام ابوحنیفہ میں تفضیل، علمائے حدیث اور علمائے فقہ میں تفضیل، علمائے حدیث کی تقلید کرنے کا مطالبہ اور اس طرح کے شکوک وشبہات ختم نہیں ہو سکتے - جو لوگ تخصص

کا مفہوم نہیں سمجھتے ہم انہیں معتوب کرنے کی بجائے دعا دینے کے خواہاں ہیں- کیوں کہ وہ یقینی طور پر دعاؤں کے مستحق ہیں-

کیا آج ائمہ مجتہدین کی تقلید کرنی چاہیے؟ -عہد حاضر کے نامور فقیہ علامہ غلام رسول سعیدی (پاکستان) فرماتے ہیں:

"آج کل ہمارے زمانے میں دو قسم کے مقلد ہیں، ایک تو عوام ہیں جو امام کے محض مقلد ہوتے ہیں اور ایک وہ علماء ہیں جو فقہی مسائل اور ان کے دلائل پر بصیرت رکھتے ہیں اور مسائل عصریہ کا حل کتاب وسنت اور اصول کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں- پہلی قسم کے مقلد صرف تقلید کرتے ہیں اور دوسری قسم کے مقلد امام کی اتباع کرتے ہیں- تقلید کے معنی ہیں دلائل سے قطع نظر کرکے کسی امام کے قول پر عمل کرنا اور اتباع سے یہ مراد ہے کہ کسی امام کے قول کو کتاب وسنت کے موافق پاکر اور دلائل شرعیہ سے ثابت جان کر اس قول کو اختیار کر لینا- سو تقلید صرف عوام کے لیے ہے جو دلائل شرعیہ سے بے خبر ہوتے ہیں اور اہل علم اور اہل فتویٰ حضرات کے لیے تقلید محض جائز نہیں ہے-" (شرح صحیح مسلم ۵/۶۳)

الفاظ کے اختلاف کے ساتھ عوام بلا شبہ مقلد یا متبع ہیں- اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے- اصل اختلاف اہل علم کے تقلید کرنے یا نہ کرنے میں ہے- پھر یہ کہ تقلید فروع میں کریں؟ یا اصول میں کریں؟ یا دونوں میں کریں؟ علامہ سعیدی کے مذکورہ خیال کہ "علماء امام کی اتباع کرتے ہیں" کا تجزیہ کرنے اور اس کے مضمرات پر گہرائی سے سوچنے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی عالم کے حنفی یا شافعی ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کو امام شافعی یا امام ابوحنیفہ کے اجتہاد کردہ مسائل کتاب وسنت کے موافق نظر آرہے ہیں-

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ کسی حنفی کو امام ابوحنیفہ کے ہی تمام مسائل کتاب وسنت کے موافق نظر آتے ہیں اور کسی شافعی کو صرف امام شافعی کے تحقیق کردہ مسائل ہی کتاب وسنت کے موافق نظر آتے ہیں؟ جہاں تک دلائل کی بنیاد پر علماء کے اتباع کرنے کی بات ہے تو ہونا تو یہ چاہیے کہ انہیں بعض دلائل امام ابوحنیفہ کے مستحکم نظر آئیں اور بعض امام شافعی کے اور اگر بات ایسی ہو تو پھر تقلید شخصی کا قصہ افسانہ بن جائے-

مزید غور کرنے کے بعد یہ عقدہ کھلتا ہے کہ مقلدین علماء، اصول میں اپنے ائمہ کی تقلید کرتے ہیں اور فروع میں اتباع کرتے ہیں- اصول میں تقلید کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ذہن فطری طور پر ایسا واقع ہوا ہے کہ اسے کسی ایک امام کے اصول ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ مسائل میں وقت ضرورت دوسرے مسلک فقہی پر فتویٰ دینے کے باوجود وہ کسی ایک ہی مسلک کے پابند سمجھے جاتے ہیں-

واقعہ در اصل یہ ہے کہ دنیا میں اصولی ذہن بہت کم ہوتے ہیں اس کی واضح مثال یہ ہے کہ شیخ ابن حزم (۴۵۶ھ) پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے باضابطہ طور پر تقلید کا رد کیا- آج تک جتنے غیر مقلدین ہیں تقریباً سب کے سب معمولی اختلاف کے ساتھ انہی کے اصول واسلوب کی پیروی کرتے ہیں- اس طرح یہ سب کے سب "اصول نقد تقلید" میں ابن حزم کے مقلد ہو گئے- اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر مقلدہ معنی یہ نہیں رہا کہ وہ ہر مسئلہ میں تمام علماء کے اقوال واختلافات کا تجزیہ کرکے اپنی راے قائم کرے- بلکہ غیر مقلدیت ایک مستقل فقہی مسلک کی شکل اختیار کر گئی- آج جتنے غیر مقلدین ہیں ان کے ذہن میں جہاں تقلید کی مخالفت کا سودا سمایا ہے وہیں داود ظاہری، شیخ ابن حزم، شیخ ابن تیمیہ، ابن قیم اور اصبہانی کی عظمت علم اور سطوت قلم کا جنون بھی- اس طرح جیسے سارے مقلدین فقہی سطح پر ایک نکتے پر جمع تھے غیر مقلدین بھی تقلید کی مخالفت کرتے ہوئے ایک تقلیدی پلیٹ فارم پر آگئے- اب جو سوال مقلد علماء پر تھا بعینہ وہی سوال غیر مقلد علماء پر ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ان کو ابن حزم، ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تحقیقات ہی کتاب وسنت سے موافق نظر آتی ہیں- اگر وہ غیر مقلد ہیں تو ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ بعض مسائل میں شیخ ابن تیمیہ کے ساتھ رہیں اور بعض دوسرے مسائل میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ اور یہ کہ ایک غیر مقلد ایک ہی مسئلہ میں شیخ ابن تیمیہ کی موافقت کرے اور دوسرا غیر مقلد عالم اسی مسئلہ میں اس کی مخالفت کرے-

اس پوری گفتگو سے معلوم یہ ہوا کہ اہل علم نے اصول میں ائمہ اربعہ کی تقلید کی اور یہ اس لیے نہیں کہ انہوں نے نعوذ باللہ ان کے فرمان کو کتاب وسنت کی طرح تسلیم کر لیا- بلکہ اس لیے کہ ان کی ذہنی ساخت ہی کچھ ایسی تھی جسے کسی ایک امام کے اصول ہی پسند آئے- اصول اور اصولی ذہن کی قلت کوئی حیرت انگیز چیز نہیں- اسے گہرائی میں اتر کر سمجھا جا سکتا ہے-

عصر حاضر میں اجتہاد کی صورت: -جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں معلومات کے دریا کے ساتھ مسائل کا سمندر بھی جاری کر دیا جس کا تموج ہر اگلے عشرے میں دگنا یا اس سے

بھی زیادہ ہوتا چلا گیا، اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ دنیا کا سیاسی اور سماجی منظرنامہ بڑی تیزی سے بدلنے لگا، آج ہر آن ایک نقش ڈوبتا ہے تو دوسرا ابھرتا ہے- اس کی ایک محسوس مثال یہ ہے کہ جو حضرات پچھلے پچاس سالوں سے تصویر سازی اور ویڈیوگرافی کی شدید مذمت کرتے آرہے تھے، آج اچانک ایسے تصویری سحر کا شکار ہو گئے کہ وہ خود کو وسط سمندر میں تصور کر رہے ہیں جہاں سے دونوں کناروں کی مسافت برابر ہے- ایسے میں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ رخ کس کا کریں- اسی اضطراب کا نتیجہ ہے کہ ابھی میڈیا، صحافت اور تصویر کی تباہ کاریوں پر لیکچر دیتے ہیں اور چند لمحے بعد ہی میڈیا کی اہمیت وضرورت کا احساس انہیں کیمرے کے سامنے کھینچ لاتا ہے- یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیجیے تو اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں- اس گومگو کی کیفیت کے سبب عوام وخواص، عالم و جاہل، ہر کس و ناکس تقلید و اجتہاد کے موضوع پر مہذب یا غیر مہذب الفاظ میں اظہار خیالات کرنے کی جرأت و جسارت کرنے لگا ہے- یہ بحث غلو کی شکل اس وقت اختیار کر لیتی ہے جب کمزور دماغ مغلوبیت میں اباحیت پسندی کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کے نزدیک ہر مسئلہ میں اجتہاد ضروری ہے اور اجتہاد کا صرف یہ معنی ہے کہ ماضی کے علمانے جتنی باتوں کو ناجائز وحرام لکھا ہے ان سب کو بیک جنبش قلم مباح قرار دے دیا جائے-

اس افراط کے برعکس تفریط کا یہ عالم ہے کہ کسی مسئلہ پر عصری تناظر میں نظر ثانی کو ارتدادفکری، نفس پرستی اور آزادروی بمعنی الحاد و لادینی کے مرادف سمجھا جاتا ہے- تقلید جامد کا یہ عالم کہ کسی کو بھی یہ جرأت نہیں کہ وہ کسی مسئلے میں اپنے سابق عالم سے علم و استدلال کی روشنی میں اختلاف کرے، یا بوجہ ضرورت اصل حکم کا اعتراف کرتے ہوئے اس میں دوسرا حکم صادر کرے- اس کا ایک شدید نقصان یہ ہے کہ نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں، عوام ان میں علما کی رہنمائی کا انتظار کرتے کرتے تھک ہار کر اپنی مرضی کی راہ نکال لیتے ہیں، جبکہ اہل علم تحت السوال جواب دینے کے لیے ان کے استفتے کا انتظار کرتے رہتے ہیں- اجتہادی جمود اور تقلیدی مزاج کی انتہا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب میں نے ایک عالم دین کے سامنے شہری زندگی گزار رہے مسلمانوں کے کچھ مسائل کا ذکر کیا تو انہوں نے صاف طور پر فرما دیا کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد گاؤں اور دیہاتوں میں بستی ہے اور حکم ہمیشہ اکثریت کے حالات کو مد نظر رکھ کر لگایا جاتا ہے، اس لیے ہم شہری زندگی کی مشکلات کا اعتبار نہیں کر سکتے-

اجتہاد اپنے آپ میں ایک متعدد المفاہیم لفظ ہے، جس کی وضاحت ہم پیچھے کر چکے ہیں، اس کی وجہ سے ہوتا یہ ہے کہ جب عصر حاضر کے تناظر میں اجتہاد پر گفتگو کی جاتی ہے تو کسی ایک معنی کے تعین کیے بغیر ہی معرکہ بحث و نظر گرم ہو جاتا ہے- جس کا اختتام بلا نتیجہ ہوتا ہے- ہمارے خیال میں ممکنہ طور پر عصر حاضر میں اجتہاد کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں (آپ چاہیں تو اسے اجتہاد کی بجائے کسی اور لفظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں) (۱) نو پید امسائل میں اجتہاد (۲) علمائے متقدمین کے مجتہد فیہ مسائل میں نئے حالات کے پیش نظر از سر نو تدبر (۳) فقہی اصول میں اجتہاد- ہم ذیل میں ہر ایک کے تعلق سے مختصراً عرض کیے دیتے ہیں، خدا! ہوار قلم کو جادۂ مستقیم پر گامزن رکھے- بصورت دیگر اہل علم اس کی نشاندہی کریں ہم دل و جان سے ان کے شکر گزار ہوں گے-

نو پید امسائل میں اجتہاد - یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ کتاب و سنت نے ضروری اور بنیادی احکام بیان کر دیے- یہ ممکن ہی نہیں کہ ان میں قیامت تک آنے والے ہر مسئلہ کا علاحدہ حکم بیان کر دیا جاتا، ہاں تمام مسائل کے لیے اصول پیش کر دیے گئے اور انہی اصول کی روشنی میں مسائل کو حل کرنے کا حکم دے دیا گیا، اس کے لیے قرآن و حدیث میں بے شمار دلائل موجود ہیں اور میری دانست کی حد تک کسی ذی علم نے بھی اس اجتہاد کا انکار نہیں کیا ہے- اس معنیٰ میں اجتہاد عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین میں بھی ہوا، بعد کے ادوار میں بھی ہوا، چوں کہ نئے مسائل ہر دور میں پیش آتے رہے، آج بھی نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اس لیے لازمی طور پر آج میں بھی اجتہاد کیا جائے گا، مجھے نہیں لگتا کہ کوئی ذہنی سالم الحواس کا مدعی اس مفہوم میں اجتہاد کا منکر ہو سکتا ہے- یہ اجتہاد نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے- تمام علماء پر فرض کفایہ ہے کہ وہ نئے مسائل کا حکم بتا کر امت کی رہنمائی کریں، اور یہ فرض کفایہ اس وقت فرض عین ہو جاتا ہے جب کسی خاص عالم دین (جو اجتہاد کی ہیئت رکھتا ہو) کے سامنے اس کے تعلق سے استفسار کر دیا جائے-

نئے مسائل کا جواب دینے میں عموماً عہد حاضر کے ارباب علم و فتویٰ مسائل کے الفاظ کو سامنے رکھ کر ''اگر مگر'' کے ساتھ جواب دیتے ہیں، جب کہ جدید مسائل کا حل بتانے کا یہ مجتہدانہ طریقہ نہیں ہے- کیوں کہ نئے مسائل میں سائل ایک ہو سکتا ہے پر وہ مسئلہ عمومی طور پر سب کے

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد☆

تقلید شوق یا ضرورت؟

(۱) **تقلید** ہر انسان کی ضرورت ہے، ہر مسلمان کی بھی ضرورت ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں...... تعلیم و تہذیب اور تمدن میں ہر قسم کی ترقیاں اسی کی مرہون منت ہیں، تقلید کی ضرورت نہ ہوتی تو قرآن حکیم کافی تھا، حیات پاک کا عملی نمونہ تقلید کی اہمیت پر گواہ ہے، تقلید کا حکم تو قرآن میں بھی ہے(۱) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑیں، ایک اللہ کی کتاب دوسری اس کے رسول کی سنت، جب تک ان دونوں کو تھامے رہو گے ہرگز ہرگز گمراہ نہ ہوگے(۲)

(۲) قرآن حکیم عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہو گیا تھا، عہد صدیقی میں کتاب ہوا، عہد عثمانی میں مختلف علاقوں میں پھیلا دیا گیا(۴) بلکہ عہد فاروقی ہی میں دور دراز علاقوں میں پھیل چکا تھا(۵)

(۳) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم اور اس اختیار کی روشنی میں جو قرآن حکیم ہی نے آپ کو عطا فرمایا تھا(۶) مختلف علاقوں میں دستاویزی صورت میں احکام ارسال فرمائے(۷) صحابہ کرام نے ان کو محفوظ رکھا اور ذاتی طور پر احادیث شریفہ کی حفاظت فرمائی، کیوں حفاظت نہ فرماتے کہ محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے۔ اس قسم کے بہت سے صحائف (مجموعے) موجود تھے، مثلاً صحیفہ صدیقی، صحیفہ علوی، صحیفہ سمرہ، صحیفہ صادقہ، صحیفہ صحیحہ(قبل ۵۸ھ) وغیرہ وغیرہ۔

(۴) ہر صحابی کا یہ منصب نہ تھا کہ وہ از خود قرآن و حدیث کی روشنی میں فتوے دیتا یا فیصلے کرتا، کبار صحابہ نے یہ فرض ادا کیا، خلفائے راشدین اور صحابہ کے فیصلے اور فتوے بھی جمع کیے گئے، چاروں خلفاء کے فیصلے شائع ہو چکے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے فتوے بیس ۲۰ جلدوں میں مرتب ہوئے تھے۔(۹)

(۵) قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف دین کی سمجھ رکھنے والے ہی قرآن کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں(۱۱) ہر کس و ناکس یہ سمجھ نہیں رکھتا کہ قرآن و حدیث سے مسائل نکالے اور فیصلے دے، اسی لیے قرآن کریم میں علم اور علم والوں کا ذکر کیا گیا ہے(۱۲) اور حکمت و فقاہت والوں کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے(۱۲) تاکہ دین سے بیگانہ کوئی پڑھا لکھا دین میں مداخلت نہ کرے اور یہ بات قرآن حکیم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر کتاب کو سمجھنے کے لیے اس کے اہل کی ضرورت ہوتی ہے، ہر زباں داں اس کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، کتاب سمجھنے کے لیے صرف زبان ہی کافی نہیں، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہیے۔

(۶) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد کبار صحابہ کی تقلید کی، انہیں کی تقلید تابعین نے بھی کی، پھر تبع تابعین نے کبار تابعین کی تقلید کی، اس کے بعد ائمہ اربعہ کی تقلید کا سلسلہ شروع ہوا اور تسلسل برقرار رہا، حتیٰ کہ تقلید کا یہ عمل اپنی انتہا کو پہنچا۔ یہ حقیقت بھی قابل توجہ ہے کہ ائمہ حدیث بھی مقلد تھے، چنانچہ امام بخاری، شافعی تھے، ابن ماجہ، مالکی تھے، امام طحاوی، حنفی تھے، ابن تیمیہ و ابن قیم حنبلی تھے، شاہ ولی اللہ، حنفی تھے وغیرہ وغیرہ۔ اور ائمہ اربعہ کی یہ تقلید بھی اس لیے کی گئی کہ وہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب اور بہت قریب ہیں، قریب کا مشاہدہ دور والے سے ہمیشہ زیادہ بہتر اور صحیح ہوتا ہے، کوئی معقول انسان قریب والوں کو چھوڑ کر دور والوں کی بات نہیں مانتا۔

(۷) جن ائمہ اربعہ کی عالم اسلام تقلید کرتا ہے ان کا مبارک عہد پہلی صدی ہجری سے لے کر تیسری صدی ہجری تک ہے، امام ابو حنیفہ ۸۰ھ سے قبل یا ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔ امام مالک نے ۱۷۹ھ میں انتقال فرمایا۔ امام شافعی نے ۲۰۴ھ میں انتقال فرمایا۔ امام احمد بن حنبل نے ۲۹۱ھ میں انتقال فرمایا۔ گویا ائمہ اربعہ کا تعلق اس مقدس زمانے سے تھا، جس کو "خیر القرون" کہا جاتا ہے اور جس کی فضیلت حدیث شریف میں آئی ہے(۱۳) اس فضیلت سے کسی کو انکار نہیں۔

(۸) ائمہ اربعہ نے قرآن کریم، حدیث کے ذخیروں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتووں اور فیصلوں کو سامنے رکھا اور اس دانائی حکمت سے

☆E-5-6/2, Nazimabad, Karachi, Pakistan

کام لیا، جس کا قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے اور اس سلیقے سے سب کچھ سیکھا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سکھایا (۱۵) یہ سمجھنا کہ ائمہ اربعہ احادیث سے غافل تھے اور من مانی پر عمل کیا کرتے تھے، غیر مؤرخانہ اور طفلانہ خیال ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر مسئلے پر غور کیا جاتا ہے، جبھی حل سامنے آتا ہے۔ ائمہ اربعہ و مجتہدین نے بھی قرآن و حدیث میں غور و فکر فرمایا اور ہمارے ہزاروں مسائل حل فرمائے، اب اس غور و فکر کو ''من مانی رائے'' سے تعبیر کرنا ایک ایسا ظلم ہے، علم و دانش کی تاریخ میں جس کی مثال نہیں ملتی اور ایک ایسا الزام و بہتان ہے، عقل و دانائی کی تاریخ میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔

(۹) بعض صحابہ صرف محدث تھے، بعض محدث بھی تھے اور فقیہ بھی، بعض تابعین صرف محدث تھے، بعض محدث بھی تھے اور فقیہ بھی، بعض تبع تابعین صرف محدث تھے، بعض محدث بھی تھے اور فقیہ بھی۔ محدث کا فقیہ ہونا ضروری نہیں، فقیہ کا محدث ہونا ضروری ہے، محدثین، نقد و جرح کے بعد احادیث جمع کرتے ہیں، مجتہدین و فقہاء انہیں احادیث سے مسائل کا استنباط و استخراج کرتے ہیں۔ ائمہ مجتہدین سے انکار کرنا ایک روشن حقیقت سے انکار کرنا ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے جو بات ذہن نشین کرنے کے لیے پیش کی جارہی ہے۔ اس کا قرآن و حدیث کی عظمتوں سے کوئی تقابل نہیں۔ غور فرمائیں! امراض جسمانیہ کے علاج کے لیے جڑی بوٹیاں جمع کرنے والی ایک جماعت ہے، ان کے خواص دریافت کرنے والی دوسری جماعت ہے، ان سے مختلف شکلوں میں ادویات بنانے والی تیسری جماعت ہے، امراض کی تشخیص اور ادویات کو تجویز کرنے والی چوتھی جماعت ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ سوائے پہلی جماعت کے جڑی بوٹیوں کو سب نے چھوڑ دیا، اس لیے ہم سب کو چھوڑ کر وادیوں اور صحراؤں میں خود جڑی بوٹیاں تلاش کریں گے، خود ہی خواص دریافت کریں گے، خود ہی ادویات بنائیں گے، خود ہی تشخیص کریں گے، خود ہی تجویز کریں گے، خود ہی آپ اپنا علاج کریں گے تو ایسے شخص کے بارے میں آپ کیا فیصلہ کریں گے؟ کیا اس طرز عمل کو معقولیت سے تعبیر کریں گے؟ ۔ عہد نبوی سے احادیث کا تحریری سرمایہ مسلسل منتقل ہوتا چلا آیا، ہاں کتابی صورت میں مدون نہ ہوا تھا، پھر یہ اہم کام بھی ہو گیا، غالباً سب سے پہلے امام ابو حنیفہ کا مجموعہ احادیث کتابی صورت میں مدون ہوا، جس کا نام ''کتاب الآثار'' رکھا گیا (۱۶) پھر امام مالک نے موطا (۱۷) مرتب کی، اس کے بعد امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد (م-۱۸۹ھ) نے موطا مرتب کی، پھر ائمہ حدیث، حدیث کے تحریری سرمایہ کو مسلسل مرتب کرتے رہے۔ چناں چہ امام احمد بن حنبل (م-۲۴۱ھ) نے مسند مرتب کی۔ (۱۸) امام بخاری (م-۲۵۶ھ) نے صحیح بخاری، امام مسلم (م-۲۶۱ھ) نے صحیح مسلم، ابن ماجہ (م-۲۷۳ھ) نے سنن ابن ماجہ، امام ترمذی (م-۲۷۹ھ) نے جامع ترمذی، امام نسائی (م-۳۰۳ھ) نے سنن نسائی، امام طحاوی (م-۳۲۱ھ) نے شرح معانی الآثار وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہنا کہ حدیث کا سرمایہ دو تین سو برس کے بعد وجود میں آیا، تاریخی نقطہ نظر سے سراسر غلط ہے، ہر کام ابتدائی مدارج طے کرکے اپنے عروج کو پہنچتا ہے، یہ ایک فطری عمل ہے، جس کو نظر میں رکھنا چاہیے، محدثین نے جو احادیث جمع فرمائیں، یہ وہی احادیث تھیں، جن کو سامنے رکھ کر ائمہ مجتہدین نے مسائل کا استخراج و استنباط کیا۔

(۱۰) امام ابو حنیفہ، ائمہ اربعہ اور تابعین میں بعض خصوصیت کی وجہ سے نہایت ممتاز تھے، آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت فرمائی، کبار صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے فیض یافتگان سے آپ نے فیض حاصل کیا (۱۹) صحابی رسول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (م-۹۳ھ) حضرت عبد اللہ بن حارث رضی اللہ عنہ (م-۹۷ھ) حضرت عبد اللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ (م-۸۹ھ) آپ کے استاد تھے (۲۰) آپ کے اساتذہ ہزار سے زیادہ ہیں۔

(۱۱) اسلامی حکومت کا دائرہ جس سرعت سے پھیل رہا تھا اور جس سرعت سے نئے نئے مسائل سامنے آرہے تھے، اسی سرعت سے مجتہدین کرام نے فقہ کی تدوین کی اور عالم اسلام کی ایک بڑی مشکل حل کردی، امام ابو حنیفہ نے ایک بورڈ تشکیل دیا، جس میں ہر فن کے ماہرین موجود تھے، کیوں کہ قرآن و حدیث فہمی کے لیے صرف زبان عربی جاننا کافی نہیں مختلف موجودہ اور آئندہ آنے والے مسائل پر بحث و مباحثہ اور غور و فکر ہوا اور اس غور و فکر کے نتیجے میں تراسی ہزار مسائل کا حل قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کیا گیا (۲۲) قانون شریعت کا یہ عظیم مجموعہ ۱۱۲ھ سے قبل مرتب ہو گیا تھا۔ امام ابو حنیفہ کا یہ عظیم علمی کارنامہ ہے اور امت مسلمہ پر عظیم احسان ہے۔ تراسی ہزار مسائل پر مشتمل قانون شریعت کے مرتب ہونے کے بعد امام ابو حنیفہ نے بورڈ

کے اراکین اور ایک ہزار مخصوص طلبہ کے سامنے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس کے مندرجہ ذیل نکات عالم اسلام کے ججوں، منصفوں، قاضیوں، مفتیوں کے لیے مشعل راہ ہیں، ان نکات میں مومنانہ فراست بھی ہے اور مدبرانہ وحکیمانہ بصیرت بھی، ملاحظہ فرمائیں۔

( ) میں تم کو اللہ کی قسم دے اس علم کا واسطہ دیتا ہوں کہ اس علم کو کبھی رسوا نہ کرنا

(ب) قضا کا عہدہ (جج یا منصفی کا عہدہ) اس وقت تک درست ہے جب تک قاضی (جج یا منصف) کا ظاہر وباطن پاک ہو۔

(ج) تم میں جو اس عہدے کو قبول کرے وہ اپنے اور عوام کے درمیان رکاوٹیں پیدا نہ کرے۔

(د) ہر حاجت مند کی تم تک رسائی ہو۔

(ہ) امیر وحاکم اگر مخلوق خدا کے سامنے غلط رویہ اختیار کرے تو قاضی (جج یا منصف) اس سے باز پرس کرے (۲۳)

(۱۲) اس میں شک نہیں کہ امام ابوحنیفہ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم معجزہ تھے۔ قرآن کریم میں سورہ جمعہ کی آیات نمبر ۲،۳ جب نازل ہوئی، جس میں فرمایا گیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ''مستقبل میں آنے والوں کو بھی پاک کرتے اور علم عطا فرماتے ہیں''، تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان آنے والوں کے بارے میں دریافت کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہ دیا، پھر عرض کیا، جواب نہ ملا، پھر عرض کیا، جواب نہ ملا، پھر عرض کیا تو راز سے پردہ اٹھایا اور امام ابوحنیفہ کی طرف واضح اشارہ فرمایا (۲۴)

ان شاء اللہ اس کی تفصیل بسیط مقالے میں پیش کی جائے گی، محدثین میں جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ (م-۹۱۱ھ) اور شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ (۲۵) (م-۱۱۷۶ھ) نے اس حدیث شریف کا مصداق امام ابوحنیفہ کو قرار دیا ہے، امام طحاوی (۲۶) (م-۳۲۱ھ) اور ابن حجر ہیثمی (۲۷) (م-۹۷۳ھ) نے امام ابوحنیفہ کو تاجدار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا ہے، قرآن حکیم میں لفظ ''حنیف'' آیا ہے (۲۸) دین حنیف (۲۹) مسلم حنیف (۳۰) اور حنفا، (۳۱) بھی آیا ہے۔

(۱۳) ابن خلدون نے چھ سو برس پہلے (۳۲) امیر خسرو نے سات سو برس پہلے، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے چار سو برس (۳۳) پہلے، عالم اسلام بالخصوص برصغیر میں اہل سنت وجماعت اور حنفیوں کی اکثریت کا ذکر کیا ہے، دور جدید کے فاضل ڈاکٹر صبحی محمصانی نے احناف کو روئے زمین کے مسلمانوں کا دو تہائی قرار دیا ہے (۳۴) یعنی تاریخی طور پر احناف کو ملت اسلامیہ کا سواد اعظم تسلیم کیا ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دعا کی کہ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہو، اللہ نے دعا قبول فرمائی (۳۵) میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہ ہوگی (۳۶) آپ نے فرمایا جماعت کی پیروی کرو (۳۷) اور فرمایا، سواد اعظم (جماعت کثیر) کی پیروی کرو (۳۸) یہ بھی فرمایا، جماعت اور عام مومنین کی پیروی کرو (۳۹) یہ بھی فرمایا، جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے (۴۰) امیر شکیب ارسلان نے حسن المساعی کے حاشیے میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ابوحنیفہ کی پیرو ہے، خود غیر مقلد حضرات میں نواب صدیق حسن خاں، مولوی ثناء اللہ امرتسری نے بھی یہی لکھا ہے اور غیر مقلد عالم مولوی محمد حسین بٹالوی نے غیر مقلدین کو ''آٹے میں نمک کے برابر'' قرار دیا ہے (۴۱) اللہ تعالیٰ نے امام ابوحنیفہ کو جو قبولیت عامہ عطا فرمائی وہ وہی مقبولیت ومحبوبیت ہے، جو وہ اپنے خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے اور جس کا حدیث شریف میں بھی ذکر ہے ۴۲...... جو ان مقبول ومحبوب بندوں سے لڑائی مول لیتا ہے ان سے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

وہ مجھ سے جنگ کے لیے تیار ہو جائے (۴۳)

کون ایسا بدنصیب انسان ہوگا جو اللہ سے جنگ کے لیے تیار ہو؟

(۱۴) جماعتی شکل میں ائمہ اربعہ سے بیزاری اور تقلید سے فرار کا رجحان دور غلامی کی یادگار ہے اور یہ انکار و بیزاری بھی مخصوص نفوس قدسیہ سے ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بیزاری اور فرار کی اصل وجہ سیاسی ہے، مذہبی نہیں۔ اس قیاس وگمان کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لاہور میں اہل حدیث کے ہیڈ کوارٹر سے اہل قرآن کی تحریک نے جنم لیا۔ یہ انکشاف اہل حدیث عالم مولوی محمد حسین بٹالوی نے فرمایا ہے: (اشاعۃ السنہ، ج ۱۹، شمارہ ۸، ص ۲۵۲) آپ خود غور فرمائیں کہاں اہل حدیث اور کہاں اہل قرآن! ان دونوں تحریکوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو متاثر کیا، اس لیے بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے یہ ایک سازش ہے، نابلس کے جج اور محکمہ انصاف کے وزیر یوسف اسماعیل نے اس اندیشہ کا اظہار کیا ہے۔ (شواہد الحق، لاہور ۱۹۸۸ء، ص ۴۹) جیسا کہ عرض کیا گیا تقلید کے بغیر چارہ نہیں، کیوں کہ وہ انسان کی ضرورت ہے، غیر مقلدین بھی

تقلید کے لیے مجبور ہیں، خود غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں صاحب اپنے مسلکی ساتھیوں سے پوچھتے ہیں:

''ہمارے اہل حدیث بھائیوں نے ابن تیمیہ اور ابن قیم اور شوکانی اور شاہ ولی اللہ اور مولوی اسماعیل کو دین کا ٹھیکیدار بنا رکھا ہے۔ بھائیو! ذرا غور کرو اور انصاف کرو، جب تم نے ابوحنیفہ، شافعی کی تقلید چھوڑی تو ابن تیمیہ یا ابن قیم اور شوکانی، جو ان سے بہت متاخر ہیں، ان کی تقلید کی کیا ضرورت''؟ (۴۴)

(۱۵) تاریخ اسلام میں ''اہل حدیث'' نام کا کوئی فرقہ نہیں ملتا، یہ لفظ صرف اور صرف ماہرین حدیث کے لیے مخصوص تھا۔ چوں کہ غیر مقلدین نے یا تو انگریزوں کی امداد و اعانت سے اپنی حکومت قائم کی (۴۵) یا برصغیر میں انگریزوں کی حکومت قائم کرنے میں ان کی پوری پوری مدد کی (۴۶) اس لیے عام اسلام بالخصوص برصغیر کے مسلمان ان سے نفرت کرتے تھے (۴۷) اور ان کو ''وہابی'' کہتے تھے۔ یہ حضرات مسلم حکومت کے مقابلے میں انگریزی حکومت کو رحمت سمجھتے تھے، (۴۸) انہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حاکموں کو اپنی وفاداریوں کی یاد دلاتے ہوئے درخواست کی کہ ان کو ''وہابی'' کے بجائے ''اہل حدیث'' کہا جائے (۴۹) اور اس سلسلے میں نوٹیفکیشن جاری کیا جائے۔ چناں چہ درخواست منظور ہوگئی اور نوٹیفکیشن جاری کر دیا گیا (۵۰) ان حقائق کی تائید اہل حدیث عالم مولوی محمد حسین بٹالوی کے بیانات سے ہوتی ہے، ورنہ ایسے بیانات ناقابل اعتبار سمجھے جاتے اور شاید شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ مگر اب تاریخی حقائق کی روشنی میں روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا کہ غیر مقلدین کو ''اہل حدیث'' نام انگریزوں نے دیا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اس نام کا مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہ تھا۔

(۱۶) ہم نے علمی اور تاریخی حقائق غیر جانبداری کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں، اب آپ خود اپنی عقل اور ضمیر سے یہ بات پوچھیں۔

- جو فرقہ انتہائی اقلیت میں ہو
- جس نے انگریزوں کی حمایت کی ہو
- جو مسلمانوں کی حکومت سے انگریزوں کی حکومت کو اچھا سمجھتا ہو
- جس کا نام ہی انگریزوں نے رکھا ہو
- جو سواد اعظم سے بیر رکھتا ہو، جس کی پیروی کا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور اس کو مشرک کہنے سے بھی دریغ نہ کرتا ہو

(۵۱) وہ حق پر ہے یا وہ جماعت حق پر ہے؟

- جو انتہائی اکثریت میں ہو
- جس نے کبھی انگریزوں کی حمایت نہ کی ہو
- جو انگریزوں کی حکومت سے مسلمانوں کی حکومت کو اچھا سمجھتی ہو
- جس کا نام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اہل السنۃ الجماعۃ'' رکھا ہو۔
- جو خود ملت اسلامیہ کا سواد اعظم ہو

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ سے محبت کا تقاضا تو یہی ہے کہ آپ کا ہر ہر حکم مانیں۔ آپ نے فرمایا اگر کسی مسئلے میں الجھ جاؤ تو دل سے فیصلہ طلب کیا کرو (۵۲) ہاں، دل کیا کہتا ہے؟ دل کی سنیں اور اسی پر عمل کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن و حدیث سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حواشی و حوالہ جات

(۱) قرآن حکیم، سورۂ نساء، آیت نمبر ۱۲۵، سورہ نحل ۱۶، آیت نمبر ۱۲۳

(۲) مشکوۃ شریف، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ج ۱، ص ۸۳ (۳۰۱، مصر)

(۳) محمد بن اسماعیل بخاری، بخاری شریف، ج ۳، ص ۱۳۳، ابن حجر عسقلانی، فتح الباری ج ۹

(۴) جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص: ۹-۱۳۵، مطبوعہ کراچی

(۵) ابن حزم، کتاب الفصل والملل والاہواء والنحل، قاہرہ، ج ۲، ص ۷۸

(۶) قرآن حکیم، سورۂ حشر، آیت نمبر ۷

(۷) ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ، ج ۱، ص ۷۱، ابن حجر عسقلانی، الاستیعاب لاسماء الصحابہ، ج ۳، ص ۳۳۷

نوٹ:- (۱) ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مقیم پیرس) نے اپنی تالیف، الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ (مطبوعہ مصر) میں دو سو ۲۰۰ سے زیادہ دستاویزات نقل کی ہیں، پھر نئے اڈیشن میں چالیس ۴۰ دستاویزات کا اور اضافہ کیا ہے (۲) محمد بن فرج المعروف با بن الطلاع اندلسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''اقضیۃ الرسول'' مرتب کیا، جس کے اردو ترجمہ کو مدینہ یونیورسٹی، مدینہ منورہ کے ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی نے مدون کیا ہے اور دائرہ معارف اسلامیہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ ۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مسعود

(۸) مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر ۶۵۱، ۶۹۲، ۶۹۳، جامع البیان ج ۱، ص ۴۷

نوٹ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگرد حضرت ہمام بن منبہ بن کامل بن شیخ

السجانی الصنعانی الاباوی کے لیے مرتب فرمایا تھا جو "صحیفہ ہمام بن منبہ" کے نام سے حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مقیم پیرس) نے اس کو مدون کیا اور اس پر فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا۔ صحیفہ صحیحہ کو محدثین نے اپنی اپنی مسانید، جوامع اور صحاح میں شامل کیا ہے۔ مسعود

(۹) حافظ ابن قیم، الوابل الصیب ص:۷۸

(۱۰) قرآن حکیم، سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۳، سورۂ نساء آیت نمبر ۸۳

(۱۱) قرآن حکیم، سورۂ عنکبوت، آیت نمبر ۴۳، سورۂ شعراء آیت نمبر ۱۹۷، سورۂ فاطر، آیت نمبر ۲۸

(۱۲) قرآن حکیم، سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۵۹، بخاری شریف، ج:۱، ص ۴۴

(۱۳) مشکوٰۃ شریف، کتاب المناقب، باب مناقب صحابہ، حدیث نمبر ۴

(۱۴) قرآن حکیم، سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۶۹، ۱۵۱، سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۶۴، سورہ نساء آیت نمبر ۱۳، سورہ نحل، آیت نمبر ۱۲۵

(۱۵) سنن ابوداؤد، لاہور، پارہ نمبر ۲۳، باب نمبر ۱، حدیث نمبر ۱۹۶

(۱۶) کتاب الآثار (بروایت امام ابویوسف)، کتاب الآثار (بروایت حسن بن زیاد) کتاب الآثار (بروایت امام محمد)، کتاب الآثار (بروایت زفر بن ہذیل)

(۱۷) دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ج ۱۸، ص:۳۷۳

(۱۸) مسند امام احمد بن حنبل، (۱۸ مسانید کا مجموعہ جس کو از سرِ نو مرتب کر کے مصر سے بیس جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے)

(۱۹) علامہ بیاضی، اشارات المرام ص:۲۰، ابوزہرہ مصری، حیات امام ابوحنیفہ ص. ۲۷۵

(۲۰) حافظ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ص:۷۶-۷۹

(۲۱) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۲۲، ص:۱۰۸

(۲۲) ذیل الجواہر، ج ۲، ص ۴۷۲

(۲۳) معجم المصنفین ج ۲، ص:۵۵

(۲۴) بخاری شریف، ج ۲، ص:۳۰۹۷، حدیث نمبر ۸۸۹، مطبوعہ لاہور ۱۹۹۱ء

(۲۵) مکتوبات شاہ ولی اللہ، ص ۱۹۸

(۲۶) درمختار، مطبوعہ دہلی، ص:۳۵

(۲۷) ابن حجر ہیثمی، الخیرات الحسان، ص ۶

(۲۸) حنیف کے معنی سیدھا، اسلامی احکام پر عمل پیرا (المنجد، ص ۲۳۳) نیز مائل بہ حق، دین کا سچا، باطل سے مڑ کر حق کی طرف آنے والا (لغات کشوری، لکھنؤ، ص:۱۹۰)

(۲۹) قرآن حکیم، سورہ روم، آیت نمبر ۳۰

(۳۰) قرآن حکیم، سورہ آل عمران، آیت نمبر ۹۵

(۳۱) قرآن حکیم، سورہ بینہ، آیت نمبر ۵

(۳۲) مقدمہ ابن خلدون، ص ۴۲۹

(۳۳) احمد سرہندی، رد روافض، لاہور ۱۹۹۲ء، ص ۹، مکتوبات شریف، دفتر دوم، مکتوب نمبر ۵۵

(۳۴) ڈاکٹر صبحی محمصانی، فلسفہ شریعت اسلام ص:۴۸

(۳۵) مسند احمد بن حنبل ج ۲، ص ۳۹۶، علی ہیثمی مجمع الزوائد، باب اجماع، ج ۱، ص ۱۷۷

(۳۶) مشکوٰۃ شریف، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنہ ج ۱، ص:۸۰

(۳۷) ایضاً، ج ۱، ص ۸۴

(۳۸) ایضاً، ج ۱، ص ۸۴، سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب السواد الاعظم، ص:۳۰۳

(۳۹) مشکوٰۃ شریف، کتاب الایمان، باب الاعتصام ج ۱، ص:۸۴

(۴۰) ایضاً، ج ۱، ص ۸۰

(۴۱) ترجمان وہابیہ، ص ۱۰، شیخ توحید ۳۰، اشاعۃ السنۃ، ج ۷، شمارہ ۱۲، ص ۳۰۷

(۴۲) (۱) بخاری شریف، کتاب الادب، ج ۲، ص:۸۹۲ (ب) مسلم شریف، کتاب البر والصلہ، ج ۲، ص ۳۳۱

(۴۳) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری شریف، باب علامات حب اللہ تعالیٰ العبد

(۴۴) محمد حلیم چشتی، حیات وحید الزماں، کراچی، ص:۱۰۲

(۴۵) زمیندار (لاہور) شمارہ ۶ فروری ۱۹۲۲ء

زمیندار (لاہور)، شمارہ ۷ فروری ۱۹۲۲ء

زمیندار (لاہور) شمارہ ۱۰ فروری ۱۹۲۲ء

زمیندار (لاہور) شمارہ ۱۱ فروری ۱۹۲۲ء

(۴۶) اشاعۃ السنۃ لاہور، شمارہ ۹، ج ۸، ص:۲۶۳

(۴۷) سیاست (لاہور) شمارہ ۱۹ فروری ۱۹۲۵ء

(۴۸) مقالات سرسید (مرتبہ اسماعیل پانی پتی)، حصہ نہم، ص:۱۲-۲۱۱، لاہور ۱۹۶۱ء

(۴۹) اشاعۃ السنۃ، ج ۱۱، شمارہ ۲، ص ۶۹

(۵۰) (۱) بحوالہ خط نمبر ۱۲۷، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۸۸ء (حکومت مدراس کو ارسال کیا گیا) (ب) بحوالہ خط نمبر ۱۵۶، مورخہ ۳ مارچ ۱۸۹۰ء (حکومت بنگال کو ارسال کیا گیا) (ج) بحوالہ خط نمبر ۳۸۶، مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء (حکومت یوپی کو ارسال کیا گیا) (د) بحوالہ خط نمبر ۳۰۷، مورخہ ۱۴ جولائی ۱۸۸۸ء (حکومت سی پی کو ارسال کیا گیا) (ہ) بحوالہ خط نمبر ۳۲، مورخہ ۴ اگست ۱۸۸۸ء (حکومت بمبئی کو ارسال کیا گیا) وغیرہ وغیرہ

(۵۱) A Glossary of the Tribes, Lahore, 1978, Vol. II, P. 8

(۵۲) (۱) سنن الدارمی، ج ۲، ص ۲۳۶، بیروت (ب) مسند الامام احمد، ج ۴، ص:۲۲۸، مکہ مکرمہ (ج) مبین العلم، ص ۲۱، پشاور ۱۲۷۹ء

باب

۲

بحث ونظر

انٹرویو

انٹرویو

اجتہاد و تقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات

مسئلہ اجتہاد و تقلید انہی مسائل میں ہے، جن کو سمجھے بغیر ہر کوئی اظہار خیال کرنا اپنا فطری حق سمجھتا ہے۔ اگر اس مسئلے میں ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم اور البانی جیسے افراد امت کے اجماعی موقف سے الگ راہ نکالنے کی کوشش کریں، تو ان کے ذاتی دینی مطالعے کے پیش نظر انہیں نظر انداز بھی کر دیا جائے لیکن حیرت تو یہ ہے کہ آج ہر بالشتیہ جسے نہ فقہ و حدیث کے معنی معلوم ہیں اور نہ قیاس و اجتہاد کا مفہوم، آستین چڑھائے منصب اجتہاد پر براجمان ہونے کے لیے بے قرار نظر آتا ہے، جس کے نتیجے میں ۹۵ رفی صد یا اس سے زائد افراد مقلدین و غیر مقلدین کے اصل اختلاف سے ناواقف ہیں۔ اسی ناواقفی کو ختم کرنے اور معلومات و حقائق عام کرنے کے لیے ہم نے مختلف مکاتب و مسالک کی سرکردہ ذی علم و فہم شخصیات کے انٹرویوز شامل کیے تاکہ اجتہاد و تقلید پر پڑے جہالت کے دبیز پردے چاک ہوں اور حقیقت عوام کے حضور بے نقاب ہو جائے۔ عصر حاضر کے اس متنازع ترین موضوع کے تعلق سے ۱۵ رسوالات پر ترتیب وار جن چار شخصیات کے جوابات حاضر ہیں وہ یقیناً معاصر مذہبی و علمی حلقے میں محتاج تعارف نہیں ہیں اور ان کی باتوں کا بہر حال اپنے اپنے حلقوں میں وزن اور اعتبار ہے۔ یہ چار نام یہ ہیں (۱) **مولانا محمد احمد مصباحی** صدر المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور (۲) **مولانا عبد الوہاب خلجی** سابق ناظم عمومی مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، دہلی (۳) **مولانا وحید الدین خاں** صدر اسلامی مرکز دہلی (۴) اور **مولانا عبد الحمید نعمانی** سکریٹری و ترجمان جمعیۃ العلماء ہند، دہلی۔ یہ یقینی بات ہے کہ ہر شخص بیک وقت ان کی تمام باتوں سے اتفاق نہیں کر سکتا، لیکن ہمارا وجدان ہے کہ طالب حق کی نیت اگر درست ہو تو اسے حقیقت کا سراغ مل ہی جاتا ہے۔ (ادارہ)

سوال (۱):۔ قیاس و اجتہاد کی حقیقت کیا ہے؟ اور کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت کیوں پڑی؟

مولانا محمد احمد مصباحی:۔ قیاس کا لغوی معنی اندازہ کرنا اور برابری دکھانا اور فقہا کی اصطلاح میں قیاس یہ ہے کہ جو حکم کسی امر کے لیے کسی علت کی بنیاد پر نص سے ثابت ہے وہی حکم اسی علت کی بنیاد پر دوسرے ایسے امر کے لیے ثابت کرنا جس کے بارے میں نص وارد نہیں۔

اجتہاد کے لغوی معنی کوشش و محنت صرف کرنا اور فقہا کی اصطلاح میں فقیہ کا کسی حکم شرعی نظری کے استخراج کے لیے پوری طاقت صرف کرنا۔

کتاب و سنت سے بے واسطۂ قیاس استخراج احکام پر بھی اجتہاد کا اطلاق ہوتا ہے اور منصوص کی روشنی میں علت کی بنیاد پر قیاس کے ذریعہ غیر منصوص کا حکم نکالنے کو بھی قیاس کہا جاتا ہے۔

قیاس کے ارکان و شرائط کی تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، یہاں خاص طور سے بتانے کی بات یہ ہے کہ قیاس کسی ایسے ہی معاملہ میں ہو سکتا ہے، جس کا حکم کتاب و سنت میں صراحۃً بیان نہ ہوا ہو، ائمہ کرام نے قیاس سے اسی وقت کام لیا ہے، جب کتاب و سنت، اجماع امت یا فقہائے صحابہ کے اقوال سے مسئلہ کا حل دست یاب نہ ہوا ہو۔

کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے قیاس و اجتہاد کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف اصول و کلیات اور بعض جزئیات صراحۃً بیان ہوئے ہیں، اصول کی روشنی میں فروع کا بیان اور جزئیات کی تفصیل قرآن نے بیان رسول اور فکر مجتہدین کے سپرد کر دی ہے، ارشاد ہے، **وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون** (سورہ نحل آیت ۴۴) "اور اے رسول ہم نے تم پر یہ ذکر نازل فرمایا تاکہ لوگوں کے سامنے تم اسے واضح کرو جو ان کی طرف اتارا گیا اور کہیں وہ خود بھی فکر کریں"۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ احادیث کریمہ میں اگرچہ بے شمار احکام اور اصول و فروع کا ذکر ہوا، پھر بھی عہد صحابہ سے ہی روز بروز ایسے مسائل پیش آتے رہے، جن کا جواب صحابہ کرام کو بھی حدیث نبوی میں نہ ملا اور قیاس و اجتہاد کا سلسلہ جاری ہوا، یعنی منصوص کی روشنی میں غیر منصوص امور کے احکام کا استخراج ہونے لگا۔

مولانا عبدالوہاب خلجی: -**قیاس:** ادلہ شرعیہ میں چوتھے نمبر کی دلیل ہے۔ فرع، اصل، علت اور حکم اس کے ارکان اربعہ ہیں۔ جب کسی مسئلہ میں کتاب اللہ، سنت مصطفےٰ ﷺ اور اجماع سے دلیل ثابت نہ ہو تو قیاس حجت شرعی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ قیاس کسی نص یا اجماع سے متصادم نہ ہو نیز جس اصل پر فرع کو محمول کیا جارہا ہے وہ اصل، نص یا اجماع سے ثابت ہو۔ قیاس پر قیاس صحیح نہیں ہے۔ نیز علت اور حکم کے درمیان شرعی طور پر معتبر اور مناسب معنی پایا جاتا ہو۔ اسود اور ابیض جیسے طردی اوصاف علت نہیں ہوسکتے۔ تفصیل کے لیے کتب اصول کا مراجعہ کیا جائے۔

اجتہاد: کسی حکم شرعی کو معلوم کرنے کے لیے، غایت درجہ کوشش صرف کرنے کا نام ہے۔ اور اس قسم کے جُہد صرف کرنے والے کو مجتہد کہا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے اجتہاد کے لیے ضروری حد تک ادلہ شرعیہ سے واقف ہو، مثلاً آیات احکام، احکام سے متعلق احادیث اور ان کی صحت وضعف کا تحقیقی علم رکھتا ہو، ناسخ ومنسوخ اور مواقع اجماع واختلاف پر پوری طرح مطلع ہو اور عربی زبان ولغت اور اصول فقہ واستنباط سے بھی بخوبی واقف ہو۔ ایسا شخص اگر معرفت حق کے لیے کوشش کرتا ہے اور جو رائے اس کے سامنے حق ہوکر ظاہر ہوتی ہے وہ کتاب وسنت کے دلائل اور معانی شرعیہ کی روشنی میں درست ثابت ہوتی ہے تو وہ دوہرے اجر کا مستحق ہوتا ہے ورنہ اکہرے اجر کا، جیسا کہ حاکم وقت کے اجتہاد کے متعلق صحیحین میں عبداللہ بن عمرو اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت آئی ہے۔

قیاس واجتہاد کی ضرورت: یقیناً کتاب وسنت کے دلائل سے جو شخص جس قدر زیادہ واقف ہوگا اس کو اجتہاد وقیاس کی اتنی ہی کم ضرورت پڑے گی، تاہم مسائل متجددہ ومتنوعہ کے پیش نظر اجتہاد کی ضرورت واہمیت سے انکار ممکن نہیں، بشرطیکہ مجتہدین امت اجتہاد کی بنیادی اور لازمی شرطوں سے متصف ہوں۔

مولانا وحید الدین خاں: -فقہا چار مصادر شریعت مانتے ہیں، قرآن، سنت، اجماع اور قیاس- میرے نزدیک مصادر شریعت تین ہیں، کتاب، سنت اور اجتہاد۔ میرے نزدیک قیاس اور اجماع دونوں اجتہاد کے دو درجے ہیں- اجماع کے بغیر جو اجتہاد ہو وہ قیاس ہے اور جس اجتہاد پر عمومی اتفاق ہوجائے وہ اجماع ہے-

اجتہاد دین کی ایک فطری ضرورت ہے، کیوں کہ ساری باتیں نص میں نہیں ہوسکتیں، نص میں صرف بنیادی باتیں ہی ہوتی ہیں- نئے حالات میں ضرورت ہوتی ہے کہ منصوص احکام کا انطباق نئے حالات میں تلاش کیا جائے- اسی کا نام اجتہاد ہے- یہ اجتہاد ہمیشہ جاری رہتا ہے، اسی لیے بخاری میں یہ روایت ہے کہ صحیح مجتہد پر دگنا ثواب ہے اور اجتہادی خطا پر ایک ثواب، بشرطیکہ نیت درست ہو-

مولانا عبدالحمید نعمانی: -قرآن نے دین کے تعلق سے کہا ہے **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً** دین مکمل ہے اور جب دین مکمل ہے تو کسی بھی شرعی مسئلے میں جس کا تعلق سماج سے ہو یا انسانی ضروریات سے ہو تو اس کا جواب نفیاً یا اثباتاً ہاں یا نہیں میں ملنا چاہیے- بعد کے دور میں امت کے سامنے جو مسائل پیدا ہوئے یا درپیش ہوں گے، مثال کے طور پر انشورنس کا مسئلہ ہے، شیئر کا ہے، اعضاء کی پیوندکاری کا ہے، بین الاقوامی حالات کے پیش نظر جو خارجی و داخلی سطح پر مسائل پیدا ہوئے، دوسرے فرقے سے ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہونے چاہیے، شرعی نقطۂ نظر سے ہم دوسروں سے کہاں تک قریب ہوسکتے ہیں اور دوسروں کو کہاں تک قریب لاسکتے ہیں، اسی طرح ملک وسماج کے مشترک مسائل، اب ان مسائل کے تعلق سے اگر پوچھا جائے کہ بتایئے قرآن میں یا حدیث میں ان کے تعلق سے کیا حکم ہے؟ تو ظاہر ہے کتاب وسنت کے اندر ان کی صراحت نہیں ہے، تو جب نفی یا اثبات میں ان مسائل کے تعلق سے کتاب وسنت سے جواب نہیں ملا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین مکمل کیسے ہوا؟ مکمل کا مطلب ظاہراً تو یہی ہے کہ اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہ ہو- حالاں کہ یہاں ضرورت پڑ رہی ہے- تو اب یہیں سے ہمیں سمجھنا ہوگا کہ دین کے مکمل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں سارے مسائل صراحت سے مذکور ہیں- دین کے مکمل ہونے کا معنی یہ ہے کہ اصولی طور پر قرآن نے تمام مسائل کا حل پیش کردیا ہے، مثال کے طور پر کسی فرد یا قوم سے مقابلے کی بات، قرآن نے بتایا کہ اس کے لیے ایسی تیاری ہو کہ وہ مرعوب ہوجائے- اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کے اسلحہ یا وسائل جنگ مدمقابل کے پاس ہوں اس نوعیت کے اسلحے آپ کے پاس بھی ہونے چاہیے، اب اگر آپ کے مقابل کے پاس ایٹم بم ہے یا لیزر بم ہے تو آپ تلوار سے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ تو

اب اگر کوئی کہے کہ قرآن نے ایٹم بم رکھنے کا حکم تو نہیں دیا ہے، اس لیے مسلم ممالک کو اس کی کیا ضرورت؟ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ قرآن نے اصول بتا دیا ہے، اس اصول کی روشنی میں علم دین کے ماہرین جزئیات کی تحقیق کرتے ہیں اور اس کے مطابق حکم دیتے ہیں۔ قرآن نے ایک اصول دے دیا کہ ایسی تیاری ہو کہ مد مقابل مرعوب ہو سکے اور ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں اس کے لیے ایٹم بم کی ضرورت ہے۔

اس طرح کے جدید مسائل جو سامنے آتے ہیں ان میں بہر حال رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے حل کی ضرورت ہوتی ہے۔ حل مسائل کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں۔ کبھی مجتہدین امت اس نئے مسئلے میں متفق ہو جاتے ہیں اور کبھی ان کے آپس میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ پہلی صورت کو اصطلاح شریعت میں اجماع کہتے ہیں اور دوسری صورت کو قیاس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اتفاق و راجماع والی صورت میں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، وہ حکم واجب الاتباع ہوگا۔ ہاں! اختلاف کی صورت میں یہ ہوگا کہ سارے مجتہدین کا اور ان کی آراء کا احترام کیا جائے گا، لیکن ایک شخص اتباع ان میں سے کسی ایک ہی کا کر سکتا ہے۔ ایک وقت میں سب کی بات مان لے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

جس طرح انبیائے کرام بہت سے ہیں اور ہم پر ہر ایک کا احترام واجب ہے، لیکن جہاں تک ماننے کی بات ہے تو ہم اپنے ہی نبی کو مانیں گے، دوسرے کو نہیں۔ ائمہ کی پیروی کا بھی یہی حال ہے کہ ہم احترام تو سب کا کریں گے، لیکن مانیں گے اپنے ہی امام کی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ تقلید غیر منصوص مسائل میں ہی ہوتی ہے، جو مسائل کتاب وسنت میں منصوص ہیں، جیسے خدا ایک ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ تو ان میں ہم کسی کی تقلید نہیں کریں گے، یہ حکم تو صراحت کے ساتھ موجود ہے ہی۔ اسی طرح ایسے مسائل جن کی صراحت تو قرآن میں ہے لیکن الفاظ کے معنی کے تعین میں اختلاف ہو گیا، قروء ایک ہی لفظ ہے جس کا معنی کسی امام نے حیض بتایا جب کہ دوسرے نے طہر بتایا، نکاح کا اصلی معنی وطی ہے لیکن عقد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، تو تعین معنی میں علماء کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ اب ان میں ہر ایک کی بات تو مان نہیں سکتے، کیوں کہ یہ ناممکن ہے، اس لیے کسی ایک پر اعتماد کرنا ہوگا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ لوگ حضور کے زمانہ سے قریب رہے، پھر دین کو ہم سے زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا، یہی تقلید ہے جو صرف دین ہی میں نہیں دوسری صنعت وحرفت مثلاً خیاطی، معماری وغیرہ میں کی جاتی ہے۔ تقلید کے حوالے سے ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مقلدین کتاب وسنت کے حکم کی بجائے مجتہد کے حکم کی پیروی کرتے ہیں، حالاں کہ یہ بہت بڑی چوک ہے، کیوں کہ کوئی بھی مجتہد اپنی طرف سے حکم صادر نہیں کرتا، وہ تو نص کے اندر جو پوشیدگی ہوتی ہے، اس کو ختم کر کے کتاب وسنت کے حکم کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اس کی حیثیت اس شخص کی ہے جو بادام کا چھلکا توڑ کر مغز نکالتا ہے، وہ بادام پیدا نہیں کرتا، صرف چھلکا ہٹا دیتا ہے، اسی لیے اصول فقہ کی کتاب میں مجتہد کی تعریف میں آیا ہے هو مظهر للحكم الشرعي وہ حکم ظاہر کرتا ہے، صادر نہیں کرتا۔

قرآن نے خدا اور رسول کے بعد ایک ایسے طبقے کا ذکر کیا ہے، جس کی طرف لوگ رجوع کرتے ہیں اور اس کی تعبیر استنباط سے کی ہے اور مستنبط مسائل ہی دراصل اجتہاد ہے، استنباط لغت میں پانی نکالنے کو کہتے ہیں اور پانی نکالنے والا پانی پیدا نہیں کرتا، بلکہ زمین کے اندر پانی موجود ہوتا ہے۔ بس وہ مٹی کھود کر اس پانی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، مجتہد کا عمل بھی درحقیقت اسی نوعیت کا ہے۔

سوال (۲):۔ مجتہدین کے مختلف طبقات کے کیا معنی ہیں؟ اور کیا آج بھی مجتہدین کا کوئی طبقہ موجود ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:۔ ہر فقیہ کی علمی وسعت اور اجتہادی قوت یکساں نہیں، علمی صلاحیت اور احکام کے استخراج وبیان کے لحاظ سے فقہا میں فرق مراتب ہے، فقہا کے طبقات اور ان کی مثال میں فقہا کے نام ذکر کرتے ہوئے، اسی فرق مراتب کو واضح کیا گیا ہے، یہ ہمارے فقہائے کرام کی دیانت وامانت ہے کہ جو فقیہ جس درجے کا تھا، اسی حد پر رہ کر اس نے اپنا کام کیا اور بعد کے فقہا نے اس فقیہ کے کام کی نوعیت اور اس کا دائرۂ عمل دیکھ کر اس کے مرتبے کا تعین کیا، لیکن اگر کوئی شخص اپنے مرتبہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر بہت اونچا دور کر چکا ہو تو ممکن ہے اسے یہ تعین مراتب اور تفریق درجات پسند نہ آتی ہو اور اپنے کو امام اعظم کا ہم پلہ جتانے اور بالکل مساوی وہم قامت جتانے کی راہ میں اسے بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا ہو۔ مگر حق یہی ہے کہ سب فقہا ومجتہدین ہم پلہ اور ہم رتبہ نہیں۔

علامہ محمد امین بن عابدین شامی نے شرح عقود رسم المفتی میں فقہا

کے سات طبقات ابن کمال پاشا کے حوالے سے بیان کیے ہیں۔

اول مجتہدین فی الشرع، جیسے ائمہ اربعہ اور ان کے امثال جنہوں نے اصولی قواعد وضع کیے اور ادلہ اربعہ (کتاب، سنت، اجماع قیاس) سے احکام نکالنے کے اصول مقرر کیے اور اصول وفروع میں کسی مجتہد کی تقلید نہ کی۔

دوم: مجتہدین فی المذہب جیسے امام ابو یوسف، امام محمد اور دیگر تلامذہ امام اعظم یہ اپنے استاذ کے مقررہ قواعد کے مطابق ادلہ اربعہ سے استخراج احکام پر قادر ہوتے ہیں، یہ اصولی قواعد میں اپنے استاذ کے مقلد ہوتے ہیں اگر چہ بعض فروع میں استاذ سے اختلاف کرتے ہیں۔

سوم: مجتہدین فی المسائل، یہ اصول وفروع کسی میں امام کی مخالفت کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن جن مسائل میں امام سے کوئی روایت نہ آئی ہو، ان کے احکام اپنے امام کے مقررہ اصول وقواعد کے مطابق استنباط کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جیسے امام ابو جعفر طحاوی، امام کرخی، فخر الاسلام بزدوی وغیرہم۔

چہارم: اصحاب تخریج، جیسے ابوبکر جصاص رازی وغیرہ، یہ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے، لیکن اصول سے پوری آگاہی اور مآخذ سے کامل آشنائی رکھتے ہیں، اس لیے امام یا ان کے اصحاب سے منقول کسی مجمل قول کی تفصیل یا کسی محتمل حکم کی توضیح اپنی رائے اور وسعت نظر کی بنیاد پر کرسکتے ہیں۔

پنجم: اصحاب ترجیح جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ، ان کا کام بعض روایات کو بعض دیگر روایات پر ترجیح دینا ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ اس طرح کے الفاظ لاتے ہیں: هذا اولى، هذا اصح رواية، هذا أوضح، هذا أوفق للقياس، هذا أرفق للناس۔

ششم: اصحاب تمیز، یہ اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اقوی، قوی، ضعیف، ظاہر الروایہ، ظاہر المذہب اور روایت نادرہ میں امتیاز کرلیں۔ جیسے صاحب کنز الدقائق، صاحب مختار، صاحب وقایہ وغیرہم مصنفین متون معتبرہ، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی کتابوں میں نامقبول اقوال اور ضعیف روایات نقل نہ کریں۔

ہفتم: مقلدین، جو تمیز کی بھی قدرت نہیں رکھتے اور جو پاگئے حاطب اللیل کی طرح کتاب میں جمع کردیتے ہیں، فالويل لمن قلدهم كل الويل -انتہی-

ہوسکتا ہے کلی نہیں تو جزوی اصحاب تمیز آج بھی موجود ہوں، اور آئندہ بھی ہوتے رہیں۔

مولانا عبدالوہاب خلجی: -علمائے فقہ واصول نے مجتہدین کے متعدد طبقات ذکر کیے ہیں۔ کوئی مجتہد فی المذہب ہوتا ہے، کوئی مجتہد منتسب (اصولی طور پر کسی مجتہد سے متفق اور فروعات میں کلی طور پر متفق نہ ہو) اور کوئی مجتہد مطلق ہوتا ہے۔ الحمد للہ "كل يعمل على شاكلته" کے تحت مجتہدین کا ہر طبقہ نہیں تو کہیں پایا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل مجتہدین اور فقہاء کا سیلاب امڈ آیا ہے اور شیخ الاسلام اور فقیہ العصر کے بھاری بھرکم القاب سے ملقب حضرات کی بہتات نظر آتی ہے۔ واللہ المستعان۔

مولانا وحید الدین خاں: -فقہا نے مجتہدین کے کئی طبقے بنائے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ غیر ضروری تطویل ہے حقیقی معنوں میں مجتہدین کی دو قسمیں ہیں

(۱) جزئی مجتہد اور (۲) کلی مجتہد، مثلاً طبی انجکشن کا طریقہ قدیم زمانے میں موجود نہ تھا، اب جو شخص انجکشن کے معاملے میں اجتہاد کرکے اس کا شرعی حکم بتائے، وہ جزئی مجتہد ہے، اسی طرح سیکولرزم قدیم زمانے میں موجود نہیں تھا۔ اب سیکولرزم پر اجتہاد کرے جو اس کا شرعی حکم بتائے وہ کلی مجتہد ہے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: -اجتہاد دراصل نو پیدا غیر منصوص مسائل کو کتاب وسنت کے اصول احکام کی روشنی میں حل کرنے کا نام ہے، نئے نئے مسائل زمانہ گزرنے کے ساتھ پیدا ہوتے رہتے ہیں تو ظاہر ہے اجتہاد کا تسلسل بھی برقرار رہے گا، اسی لیے علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے کہ اجتہاد قیامت تک ہوتا رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بنیادی بات یہ ہے کہ دین کے جو عمومی مسائل ہیں، ائمہ اربعہ نے تمام مسائل کا حل پیش کردیا ہے۔ ائمہ اربعہ کے علاوہ بھی امام اوزاعی وغیرہ دوسرے ائمہ ہوئے لیکن ان کی فقہ مدون نہیں ہوسکی، ائمہ اربعہ کی فقہ مدون شکل میں موجود ہے، جو دین کے عمومی مسائل کے تمام جزئیات کا حل بتاتی ہے، تو یہ حضرات مجتہد مطلق ہیں اور آج کے زمانے میں نہ تو اجتہاد مطلق کی ضرورت ہے، اور نہ ہی اس کے لیے جس قسم کی صلاحیت درکار ہے، وہ کسی میں موجود ہے، ہمیں خدا کی قدرت سے انکار نہیں، آج بھی ایسی صلاحیت کا انسان پیدا ہو

سکتا ہے، لیکن موجودین میں اس کی مثال ناپید ہے- خلاصہ یہ کہ دین کے عموی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے، رہے وہ مسائل جو حالات کے بطن سے آج پیدا ہو رہے ہیں، ان میں غور وفکر اور تحقیق و اجتہاد کا سلسلہ تو بہر حال برقرار رہے گا، لیکن چوں کہ آج دین کی کامل بصیرت اور نصوص پر گہری نظر رکھنے والے لوگ عنقا ہیں اس لیے یہ کام انفرادی کی بجائے اجتماعی سطح پر ہو رہا ہے- دنیا بھر میں جو فقہی اکیڈمیاں ہیں وہ یہ کام بخوبی کر رہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ انفرادی طریقہ سے زیادہ بہتر ہے-

رہی اجتہاد کے مختلف درجات کی بات تو اس کے لیے آپ کو سب سے پہلے مجتہد مطلق اور مقلد مطلق کو سمجھنا ہوگا- جو کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر اصول بناتا ہے اور مسائل کا استخراج واستنباط کرتا ہے، وہ کسی اور عالم کی پیروی نہیں کرتا- مجتہد مطلق کی مثال ائمہ اربعہ ہیں، وہ اصول وفروع کسی میں بھی کسی دوسرے کی پیروی نہیں کرتے- مقلد مطلق وہ ہے جس کو شریعت کا کچھ بھی علم نہیں- اس نے اہل علم سے مسئلہ سنا اور اس پر آنکھ بند کر کے عمل کر رہا ہے، یہ مسئلہ کیسے ثابت ہوا اور کون سی دلیل ہے اس کے لیے نہ تو وہ جانتا ہے اور نہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتا ہے- ان دونوں طبقات کے بیچ میں بھی کئی طبقات ہیں جو بعض مسائل میں تو خود اپنی رائے رکھتے ہیں مگر بعض دوسرے میں وہ امام اعظم کی تقلید کرتے ہیں- بعد کے ادوار میں امام طحاوی، ابن ہمام وغیرہ خود مجتہد ہیں لیکن وہ اصول میں امام اعظم کی اور مسائل میں امام محمد اور امام ابو یوسف کی پیروی کرتے ہیں- خلاصہ یہ کہ اہل علم کو بھی اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے کا اتباع کرنا پڑتا ہے- اسی سے اجتہاد کے اور مجتہدین کے مختلف طبقات سامنے آتے ہیں-

سوال (۳):- امام اعظم ابو حنیفہ اور دوسرے تینوں ائمہ کا اصل علمی کارنامہ کیا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ پوری امت انہی چاروں کی تقلید پر متفق ہوگئی؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- عہد رسالت اور عہد صحابہ میں لوگ قرآن وسنت کی عام ہدایات اور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے کاربند تھے- خلوت و جلوت میں خوف خدا، عدل، امانت، عام نصیحت وخیر خواہی، دعوت خیر، منع شر، کار خیر میں تعاون، کار شر سے کنارہ کشی وغیرہ عام اصول تھے جس پر ہدایت قرآنی مشتمل تھی، اور رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی فضائل ومحاسن پر صحابہ کرام کی تربیت فرمائی، جزئی امور میں صحابہ کرام کو اگر کوئی اشکال پیش آتا تو سرکار کی بارگاہ میں رجوع کرتے یا اکابر صحابہ سے معلوم کرتے، تمدن کی وسعت اور اسلامی رقبہ کے پھیلاؤ کے بعد واقعات ومعاملات کی بے پناہ کثرت ہوتی گئی اور افراد بھی اچھے برے، حق کوش، ناحق کوش، عدل پرور، ظلم شیوہ ہر طرح کے پیدا ہونے لگے، ایسے ماحول میں اقامت خیر اور دفع شر کے لیے مبسوط اصول وقوانین اور مفصل جزئیات مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ ان قوانین کی روشنی میں افراد اپنے معاملات کی صحت وسقم کو سمجھ سکیں اور جہاں حکومت کی مداخلت کی ضرورت ہو وہاں حکومت ان قوانین کے تحت رعایا کے معاملات حل کر سکے-

اس طرف باضابطہ اور ہمہ گیر توجہ سب سے پہلے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مبذول فرمائی اور یک فقہی مجلس کی شکل میں اپنے تلامذہ کو جمع کر کے مسلسل جد وجہد کی، اسی روش پر دیگر ائمہ بھی چلے اور اصول فقہ اور فقہ کی شکل میں دو مستقل فن وجود میں آئے، ان سب پر مفصل گفتگو اور مستقل تبصرہ کا موقع نہیں، مگر چند باتوں کی جانب اشارہ ہو سکتا ہے، مثلاً

(۱) ان حضرات نے کتاب وسنت اور آثار صحابہ میں نظر کر کے یہ واضح فرمایا کہ احکام کی شریعت کا ہدف پانچ چیزوں (نفس، دین، عقل، مال، نسب) کا تحفظ ہے- اور سارے احکام اسی امور پر گردش کرتے ہیں-

(۲) طلب اور ممانعت کے مدارج ومقاصد اور دلالت کے احوال ومراتب پر غور کیا، یعنی کس چیز کا مطالبہ لازمی طور پر اور شدت کے ساتھ ہے، پھر اس مطالبہ سے کون سا اہم امر مقصود ہے، جس آیت سے یہ مطالبہ مفہوم ہو رہا ہے، اس کی دلالت، اس پر بہت واضح اور نمایاں ہے یا دقیق اور مبہم یا محتمل ہے، بلفظ دیگر قطعی وجزئی ہے یا ظنی و احتمالی؟ اگر حدیث سے کسی فعل کا مطالبہ سمجھ میں آ رہا ہے تو خود اس حدیث کا ثبوت کس درجہ کا ہے- وہ حدیث متواتر ہے یا مشہور یا آحاد ہے؟ صحیح ہے یا حسن یا ضعیف وغیرہ؟ پھر طلب واضح ہے یا مبہم؟ ان امور پر نظر کے نتیجے میں احکام کے بھی درجات واقسام طے ہوئے- مثلاً فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، مستحب، حرام، مکروہ،

تحریمی، اساءت، مکروہ، تنزیہی، خلاف اولیٰ، مباح۔

(۳) اصول وقواعد کی تاسیس کے بعد جزئیات کی تفریع وتدوین کا مرحلہ آتا ہے، اس سلسلے میں فقہاے امت کی جانکاہی وعرق ریزی جاننے کے لیے فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر اس کی فہرست پر نظر ڈالیے آپ کو معلوم ہوگا کہ طہارت اور عبادات سے لے کر نکاح ومعاملات، وقف، میراث، حدود وتعزیرات وغیرہ تمام ابواب سے متعلق احکام کا ذخیرہ نہایت خوش اسلوبی سے مرتب کر دیا گیا ہے، دنیا کے بڑے بڑے ماہرین قانون بھی ایسے جامع اور مستند مجموعے پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

ائمہ اربعہ کے مذاہب پر اتفاق امت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر باب کے احکام مدون کر دیے اور بعد کے اہل نظر متبعین حالات کے مطابق ان کی تنقیح اور ان میں اضافہ کرتے رہے۔ عام آدمی جو خود اجتہاد واستنباط کی صلاحیت نہیں رکھتا، شرعی زندگی گزارنے کے لیے کوئی ایسا ہی مذہب اپنا سکتا ہے، جس میں ضرورت کے تمام مسائل مدون اور مرتب شکل میں موجود ہوں، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد، امام ابن جریر طبری وغیرہم کے مذاہب مدون اور محفوظ ومنقول نہ ہوئے، اس لیے امت انہیں اپنانے بلکہ جاننے سے بھی قاصر رہی۔

مولانا عبدالوہاب خلجی: -امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ ثلاثہ وغیرہم رحمہم اللہ مجتہدین امت ہیں اور ان کی کوششیں قابل ستائش، لائق استفادہ اور ان شاء اللہ باعث اجر وثواب ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے لیے عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ امام دار الہجرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے "**کل منا مأخوذ منه ومردود عليه الا صاحب هذا القبر**" (یہ قول اصلاً مجاہد اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے) یعنی نبی ﷺ کے علاوہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کی بات لی اور چھوڑی نہ جا سکتی ہو۔ لہٰذا امت کے کسی امام وفقیہ کے ہر قول وفتویٰ کو لائق اتباع سمجھنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ بلکہ مخالف دلیل صحیح اور نص صریح قول وعمل کا ترک کرنا واجب ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس پر علماء امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ ائمہ اربعہ کی تقلید پر کبھی کسی دور میں اجماع منعقد نہیں ہوا۔ خود ائمہ اربعہ رحمہم اللہ نے اپنے متبعین اور تلامذہ کو سختی سے کتاب اللہ اور صحیح سنت مصطفیٰ ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ بھلا ایک غلط چیز یعنی جامد تقلید پر امت کے علماء مجتہدین کیوں کر متفق ہو سکتے ہیں (بعض فقہاء اجماع کا دعویٰ اپنے مخالف کو مرعوب کرنے کے لیے بطور ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہیں جب کہ تحقیق کے بعد اختلافی مسائل خلافیہ میں ایسے مزعومہ اجماعات کی پول کھل جاتی ہے۔ لہٰذا اجماع کا دعویٰ کرنے میں کمال احتیاط سے کام لینا چاہیے)

مولانا وحید الدین خاں میرے نزدیک فقہ میں کوئی نہ امام اعظم ہے، اور نہ کوئی امام اصغر، سارے فقہا برابر ہیں۔ میرے نزدیک انہی چاروں کی تقلید پر اتفاق کر لینا درست نہیں۔ یوں کہ چاروں فقہا نے اپنے زمانے کے لحاظ سے فقہی خدمت انجام دی۔ نئے دور میں نئے فقہا مطلوب ہیں، جو دوبارہ حالات کے لحاظ سے فقہی خدمت انجام دیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: -ابھی میں نے کہا کہ قرآن میں جو باتیں صراحت کے ساتھ نہیں ہوتی ہیں ان میں اجتہاد کیا جاتا ہے، بلاشبہ ائمہ اربعہ کے علاوہ بھی کئی ایک مجتہد پیدا ہوئے اور انہوں نے اجتہاد کیا۔ لیکن جن حضرات کی اجتہادی کاوشیں مدون شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں، وہ یہی چاروں ائمہ ہیں: امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل۔ اس لیے امت کی مجبوری ہے کہ وہ انہی میں سے کسی ایک کی تقلید کرے، کسی اور امام کے اجتہادات مدون ہی نہیں ہیں تو ان کی تقلید کیوں کر ممکن ہے؟ اس کے ساتھ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ قرآن کے جو احکامات ہیں، جو احادیث ہیں، جو صحابہ کے معمولات ہیں، وہ سب کے سب انہی چاروں میں موجود ہیں، کوئی حکم یا عمل ان سے الگ نہیں مل سکتا۔ اس لیے وہ حضرات بھی جو اجتہاد کا دعویٰ کرتے ہوئے آج تقلید کا انکار کرتے ہیں وہ جو کچھ بھی اجتہاد کرتے ہیں، ان کا وہ اجتہاد ائمہ اربعہ میں سے کسی کے یہاں ضرور موجود ہوتا ہے تو شرعی مسائل میں اختلافات توسع کے لیے ہیں اور یہ توسع ائمہ اربعہ کی تقلید سے حاصل ہو جاتا ہے، اب ہمیں کسی بھی قول یا عمل پر عمل کرنے کے لیے الگ جانے کی ضرورت نہیں، ائمہ اربعہ کے یہاں سب کچھ موجود ہے۔ زور سے آمین کہنے کا مسئلہ ہو، یا قراءت خلف الامام کا مسئلہ ہو، ان مسائل میں آج کچھ لوگ اختلاف کرتے ہیں اور اجتہاد کرتے ہیں، حالاں کہ وہ جو تحقیق بھی لے کر آتے ہیں وہ کسی نہ کسی امام کے یہاں موجود ہے، ان کا اجتہاد کوئی الگ سے نہیں ہوتا۔

اب کچھ لوگ آج یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ ان ہی چاروں میں سے کسی ایک کی تقلید کرو؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے ہمیں ان میں سے کسی ایک کی تقلید کا حکم نہیں دیا۔ لیکن بعد میں جو حالات سامنے آئے یہ حالات وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی صورت حال ایسی ہی ہے کہ انہیں میں سے کسی ایک کا اتباع کرنا آپ کی مجبوری ہے۔ آپ نہ تو بیک وقت ان چاروں کی پیروی کر سکتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہے اور نہ ان سے ہٹ کر کسی اور کی تقلید کر سکتے ہیں کہ یہ بھی ممکن نہیں ہے، کیوں کہ ان سے ہٹ کر کوئی اجتہاد سامنے ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے علما نے کہا ہے کہ "حالات" کے پیش نظر ان چاروں میں سے کسی ایک کی پیروی واجب ہے اور اس سے انکار سخت گمراہی ہے، رہا یہ کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، امام طحاوی، رحمۃ اللہ علیہ اور صاحب فتح القدیر وغیرہ نے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے، یہ ان کے تفردات ہیں اور تفردات بھی ایسے کہ وہ کسی نہ کسی امام متبوع کے یہاں ضرور موجود ہیں، اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ امت کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی، اس لیے امت کا جو عمل ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے امام ترمذی وغیرہ نے کہا کہ عمل امت سے ضعیف حدیث صحیح کی منزل میں آجاتی ہے، اور اسی وجہ سے صحیح حدیث کے مقابل اگر ضعیف حدیث معمول بہ ہے تو وہ زیادہ لائق اتباع ہے، سنت کہتے ہی اسی کو ہیں جو معمول ہو، مثال کے طور پر بخاری شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تھے اور اپنی زوجہ کو بوسہ لیتے تھے، یہ جوتا پہن کر نماز پڑھتے تھے، تو یہ چیزیں اگرچہ حدیث صحیح سے ثابت ہیں لیکن چوں کہ ان پر عمل نہیں رہا، اس لیے یہ سنت نہیں ہیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی حالت میں ان کے نواسے ان پر چڑھ جاتے تھے، یہ حدیث موجود ہے، لیکن یہ امت میں معمول اور جاری نہیں ہوا، اس لیے اس حدیث کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی نواسہ تلاش کرنے جائے اور نماز کی حالت میں اپنے اوپر سوار کر لے۔ تو خلاصہ یہ کہ حدیث صحیح کا موجود ہونا ہی کافی نہیں ہے، ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ اس سے متعلق صحابہ کا عمل کیسا رہا، تابعین کا عمل کیسا رہا، تبع تابعین کا عمل کیسا رہا وغیرہ۔

سوال (۴):- کیا حضرات محدثین و مفسرین بھی مقلد تھے؟ اگر ہاں تو کیوں؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- محدثین و مفسرین سے مراد صحاح ستہ وغیرہ کے مصنفین اور مشہور کتب تفسیر کے مرتبین ہیں تو بلاشبہ وہ مقلد تھے، جس کی وجہ یہ ہے کہ استخراج احکام کے لیے صرف حفظ حدیث کافی نہیں اور بھی بہت سے لوازم ہیں، جن کے بغیر کار اجتہاد کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ان لوازم کا فقدان ان خدا ترس حضرات کے لیے اجتہاد سے مانع اور تقلید کا باعث ہوا۔

مولانا عبدالوہاب خلجی:- بعض محدثین و مفسرین اصولی طور پر ائمہ اربعہ کی طرف انتساب کرتے تھے، لیکن فروعات میں ان کے پابند نہ تھے جیسا کہ آج کل کے اکثر متبعین مذاہب علماء کا وطیرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے بعض اجلہ تلامذہ نے ایک تہائی سے دو تہائی تک مسائل فرعیہ کے اندر اپنے اساتذہ کا ساتھ نہیں دیا۔ بہذا اگر مقصود اصلی اتباع دلیل ہو تو میرے خیال میں انتساب اگر مستحسن امر نہیں تو حرام و مکروہ بھی نہیں ہے بلکہ جواز اور مباح کے دائرہ میں آتا ہے۔

مولانا وحید الدین خاں:- مفسرین کا لفظ میرے نزدیک اس بحث میں مبہم ہے۔ کیوں کہ مفسرین چودہ سو سال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ البتہ طبقہ اول کے محدثین کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، میرے مطالعے کے مطابق محدثین کا کوئی فقہی مسلک نہ تھا۔ اس معاملے میں میری رائے وہی ہے جو ابن رجب حنبلی کی رائے ہے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- وہ اسی لیے کہ اجتہاد خصوصی ذہن اور عمل کا نام ہے اور یہ سب کے بس کی چیز نہیں ہے، چاہے وہ محدث ہو، مفسر ہو یا اور کوئی۔ میں نے کہا کہ امت میں ہمیشہ دو ہی طبقے رہے ہیں، ایک وہ جو بات مانتا ہے اور دوسرا وہ جس کی بات مانی جاتی ہے، جس کی بات مانی جائے گی وہ مجتہد ہوگا اور جو بات مان رہا ہے وہ مقلد ہے۔ سمجھ بوجھ اس کے اندر بھی موجود ہے لیکن اس درجے کی نہیں کہ وہ خود اجتہاد کر سکے۔ اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ کتب احادیث پڑھنے کے دوران یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ یہ لوگ کس کے مقلد تھے، امام مسلم کس کی تقلید کرتے تھے، فقہی امور میں امام نسائی کس کا اتباع کرتے تھے۔ اہل علم میں اس تعلق سے اختلاف بھی ہوتا ہے۔ کچھ حضرات انہیں شافعی بتاتے ہیں، کچھ حنفی بتاتے ہیں، کچھ حنبلی بتاتے ہیں تو یہ بحث کیوں ہے؟ اسی لیے کہ یہ حضرات محدث ہونے کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انہوں نے احادیث کی تلاش و جستجو کی، تحقیق کی، دوسروں سے حدیثیں

سکیں اور خود انہیں بیان کیا، ان کا مشغلہ یہی تھا، انہوں نے احادیث سے مسائل کے استنباط و تخریج کا عمل نہیں کیا۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ بعض محدثین نے اجتہاد بھی کیا لیکن ان کا اجتہاد باضابطہ نہیں ہے اور نہ وہ مدون ہے۔ مثلاً میں اگر سوال کروں کہ تراویح کے بارے میں امام بخاری کا کیا مسلک ہے؟ وہ بیس پڑھتے تھے، یا آٹھ پڑھتے تھے، یا بارہ پڑھتے تھے؟ تین طلاق کے بارے میں ان کا کیا نظریہ تھا؟ یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ انور کی زیارت کو جانا کیسا ہے؟ اس طرح کے سیکڑوں مسائل ہیں، جن کے تعلق سے اگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک دریافت کیا جائے تو اس کا جواب نہیں مل سکتا۔

آپ کا سوال محدثین اور مفسرین کے طبقے سے ہے اور ان کے حوالے سے ہاں اور نہیں میں جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ محدث ہونا، مفسر ہونا ایک خاص وصف ہے، ہو سکتا ہے کہ محدث یا مفسر ہونے کے ساتھ کوئی مجتہد بھی ہو، یہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مجتہد نہ ہو مقلد ہو، تو مجتہد یا مقلد ہونے کا سوال اگر کسی فرد کے متعلق سے کیا جائے تب تو صحیح ہے لیکن طبقات کے تعلق سے کر لیا جائے تو ہاں یا نہ میں اس کا جواب نہیں مل سکتا۔ بہت سے محدثین اور مفسرین مقلد تھے اور بعض مجتہد تھے، لیکن ائمہ اربعہ جو محدث و مفسر بھی تھے، کے علاوہ کسی اور کی فقہ باضابطہ مدون نہ ہو سکی۔

سوال (۵) ۔اس الزام کی کیا حقیقت ہے کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر ان عبقری علمائے مقلدین کی علمی خدمات کو کیا نام دیں گے جن پر آج بجا طور پر امت کو فخر کرنے کا حق ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی: ۔اولاً ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ تقلید نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے۔ تحقیق کا عمل برابر جاری ہے اور جیسا کہ آپ نے اشارہ کیا فقہائے مقلدین کی حیرت انگیز علمی، تحقیقی خدمات اس پر شاہد عدل ہیں اور اگر یہ کہیں کہ تقلید نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا تو یہ بھی ہمیں تسلیم نہیں۔ جو شخص اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے، اس کے لیے تقلید جائز نہیں، اسی لیے ائمہ کرام نے اجتہادی صلاحیت رکھنے والے اپنے تلامذہ سے یہ فرمایا کہ ''ہم نے جس ماخذ سے احکام اخذ کیے ہیں، اسی سے تم بھی اخذ کرو''

یا یہ فرمایا کہ ''ہمارے بیان کردہ احکام پر تمہارے لیے عمل جائز نہیں، جب تک یہ نہ جان لو کہ ہم نے یہ احکام کہاں سے اخذ کیے''۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کے ارشادات کے مخاطب کوفہ و بغداد اور مدینہ و مصر کے وہ دوکاندار اور کاشت کار یا صنعت کار نہیں جو کتاب و سنت اور اخبار و آثار کی تصریحات، اشارات، دلالات اور اقتضاءات سے نابلد اور اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، وہ فوجی اور ملازمت پیشہ بھی نہیں جو تذوت و قرأت سے زیادہ کی صلاحیت نہیں رکھتے، اہل اجتہاد کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے اور نا اہل کے لیے شروع ہی سے بند ہے۔

ثانیاً اگر کوئی طبقہ یہ چاہتا ہے کہ اہلیت اجتہاد ہو یا نہ ہو اجتہاد کا دروازہ ہر شخص کے لیے چوپٹ کھلا رہنا چاہیے تو بہت صفائی کے ساتھ عرض ہے کہ جو دروازہ صرف اہل حضرات کے داخلے کے لیے کھلا اگر اس سے صرف نا اہلوں کی آمد و رفت ہونے لگے تو اسے سختی کے ساتھ بند کر دینا ہی عقل و دانش اور ایمان و حکمت ہر ایک کا تقاضا ہے، اسی میں متاع گراں مایہ کی حفاظت ہے اور خلاف ورزی میں کھلی ہوئی بربادی۔

تجربہ شاہد ہے کہ آج اہلیت اجتہاد تو درکنار ارشادات ائمہ کے مصادر و مآخذ سے کامل آشنائی بھی مفقود ہے، اہلیت کے بغیر منصب اجتہاد پر تمکن کا شوق اور اس کی جسارت نا روا ایسے ہی دلوں میں ہوتی ہے جو خوف الٰہی سے عاری ہوں۔

مولانا عبدالوہاب خلجی: ۔یقیناً تقلید جامد نے علم و تحقیق کے دروازے بند کر دیے، کیونکہ جب آدمی کسی ایک امام کے تمام اقوال کو ہی دین سمجھنے لگتا ہے اور اسی کی پیروی کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتا ہے اور دیگر ائمہ کے اقوال اور ادلہ پر نظر نہیں کرتا یا ان کے درمیاں جمع و تطبیق اور ترجیح کی صورتوں کو بروئے کار نہیں لاتا تو بلاشبہ علم و تحقیق اور اجتہاد و ترجیح کی راہ بند ہو جاتی ہے۔ اور اگر حضرات مقلدین تقلید کے بجائے تحقیق و اتباع کی راہ اختیار کرتے تو اصحاب مذاہب ائمہ کرام کی خدمات علمیہ و فقہیہ کو مزید فروغ حاصل ہوتا اور ان سے استفادہ بھی عام ہوتا اور جو لوگ مذہب اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کے تقلیدی فقہی مذاہب اور ان کے فکری و علمی جمود اور آپسی اختلاف و انتشار کے باعث تردد کا شکار ہو کر دولت اسلام سے محروم نہ ہوتے۔ لہٰذا علماء امت کی خدمات جلیلہ سے استفادہ کرتے ہوئے ہمیں ادلہ صحیحہ اور نصوص شرعیہ کی پیروی کرنی چاہیے اور ''**اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء**'' (الاعراف:۳) تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے

تمھارے پاس آئی ہے۔اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کا اتباع نہ کرو۔اور " **اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أرباباً من دون الله** " (التوبہ:۳۱) ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے کی تفسیر ماثور جو عدی بن حاتم سے بسند صحیح مسند احمد و سنن ترمذی میں منقول ہے، اگر سامنے رکھی جائے تو تقلید جامد کی قباحت وشناعت کھل کر سامنے آجائے گی اور امت تقلید پر فخر کرنے کے بجائے شرم وندامت کے آنسو بہائے گی۔

مولانا وحید الدین خاں:- میرے نزدیک یہ الزام نہیں بلکہ ایک درست بات ہے۔تقلید ہمیشہ تخلیقی فکر کا دروازہ بند کرتی ہے اور مسلمانوں میں ایسے ہی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہزار سال کی مسلم تاریخ میں صرف ایک تخلیقی مفکر پیدا ہوا۔ اور وہ تھے علامہ ابن خلدون۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تقلید نے علم وتحقیق کے دروازے بند کردیے ہیں وہ مسائل کا صحیح شعور نہیں رکھتے۔ ان کو پتہ ہی نہیں کہ تقلید کیا چیز ہے، مجتہد امام کی رہنمائی میں صحیح جگہ پہنچنا تقلید کہلاتا ہے۔تقلید کا مطلب نہ تو آوارگی ہے اور نہ ایسی غلامی ہے کہ آدمی سو فیصد اندھا ہو جائے۔ بلکہ امام سے حسن ظن رکھتے ہوئے شریعت کا جو منشا ہے، جو مطلوب ہے اسی کی پیروی کرنے کا نام تقلید ہے۔تقلید اور اتباع میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور اتباع کرنا اپنے سے بڑے کا یہ فطرت ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ تقلید نے لوگوں کو اندھا کردیا ہے یا غلام بنادیا ہے، تقلید کے مفہوم سے ناواقفی کا نتیجہ ہے، اگر تقلید کا مطلب آنکھ بند کر کے دوسروں کی پیروی لے لیا جائے تو پھر سوال ہوگا کہ مقلدین نے اتنے سارے علمی وتحقیقی کام کیوں کیے؟ آپ نظر اٹھا کر دیکھ لیجیے کل سے آج تک سارے بڑے بڑے علمی و تحقیقی کارنامے انہوں نے انجام دیے جو خود مقلد تھے۔ ان کے علاوہ کسی نے نہیں کیا۔ حدیث کی خدمت ہو، فقہ کی ہو، قرآن کی ہو، سب انہی لوگوں نے کی ہے، حدیث، تفسیر، فقہ کسی بھی فن میں علماء کے طبقات آپ دیکھ لیجیے، طبقات حنفیہ، طبقات شافعیہ، طبقات مالکیہ، طبقات حنابلہ تو ملیں گے لیکن کہیں بھی آپ کو طبقات غیر مقلدین نام کی کتاب نہیں مل سکتی تو اہل علم ومجتہدین کے طبقات بھی چاروں ہیں، کوئی پانچواں طبقہ موجود نہیں ہے۔ آج جو لوگ ان چاروں سے ہٹ کر راہ نکالنے کی کوشش میں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی روش بھی کمتر لوگوں کی متشددانہ تقلید ہی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جو لوگ ائمہ اربعہ کی تقلید کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں وہ کہیں، اس سے زیادہ شدت سے امام ابن تیمیہ کی تقلید کرتے ہیں۔ ابن قیم کی تقلید کرتے ہیں تو جو لوگ آج مقلد کہلانے کی بجائے اپنے کو اہل حدیث کہہ رہے ہیں وہ بھی اپنے بڑوں کی تقلید ہی کر رہے ہیں۔

سوال (۲) :- امام اعظم ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شرعی احکام کی تخریج واستنباط کے لیے اصول وضع کیے، دوسرے ائمہ مجتہدین بھی کسی نہ کسی طور سے ان کے فیض یافتہ ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ غیر مقلدین حضرات سب سے زیادہ انہیں کے خلاف صف آرا رہتے ہیں؟

مولانا محمد احمد مصباحی :- امام اعظم سے عداوت کوئی نئی چیز نہیں خود ان کے زمانے کا واقعہ ہے، جسے خطیب نے بھی بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے بیروت میں حضرت عبد اللہ بن مبارک شاگرد امام ابوحنیفہ کی ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا یہ کوفہ میں ابوحنیفہ کنیت رکھنے والا کون مبتدع پیدا ہوا ہے؟ حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں، میں اپنے گھر واپس آیا **فاقبلت علی کتب ابی حنیفہ** امام ابوحنیفہ کی کتابیں دیکھنی شروع کیں (اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی لکھی ہوئی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں) ان سے کچھ مسائل منتخب کر کے لکھے اور سرخی یہ ڈالی **قال النعمان بن ثابت**، پھر امام اوزاعی کے پاس گیا، مجھ سے وہ اوراق انہوں نے لے لیے اور مطالعہ کے بعد پوچھا یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ ابن مبارک نے کہا ایک شیخ ہیں، جن سے عراق میں میری ملاقات ہوئی، فرمایا **هذا نبيل من المشائخ**، ابن مبارک نے بتایا یہ وہی ابوحنیفہ ہیں، جن کا آپ نے ذکر کیا تھا۔ بعد میں امام اوزاعی کی ملاقات امام ابوحنیفہ سے مکہ میں ہوئی اور عبد اللہ بن مبارک کے پیش کردہ مسائل اور دیگر مسائل پر گفتگو کے بعد انہوں نے امام اعظم کے تبحر علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے قول سے استغفار کیا اور عبد اللہ بن مبارک سے فرمایا، ابوحنیفہ کے بارے میں مجھے جو بتایا گیا تھا، میں نے انہیں اس کے برخلاف پایا، تم ان کی بارگاہ فیض سے وابستہ رہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عصر ہی میں وہ حاسدین کی عداوتوں اور غلط پروپیگنڈوں کا نشانہ تھے۔

مگر اس تاریخی حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے استنباط کے اصول وقواعد وضع کیے اور فقہی احکام کی تدوین کی۔ دیگر ائمہ نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ امام ابن حجر مکی شافعی نے الخیرات الحسان میں یزید بن ہارون کی روایت نقل کی ہے کہ امام سفیان ثوری نے کسی حیلے سے امام ابوحنیفہ کی کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اس سے استفادہ کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم کی ایک تصنیف کتاب الرہن بھی تھی۔

بالفرض امام اعظم نے خود کوئی کتاب نہ لکھی، یا لکھی اور ناپید ہو گئی، ان کا مذہب ان کے تلامذہ نے قلم بند کیا یا ثقات نے زبانی طور پر اس کی روایت کی تو اس سے امام اعظم کی فقہی خدمات اور علمی جلالت پر حرف نہیں آتا۔ اجلۂ صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کوئی کتاب نہ آج دستیاب ہے نہ پہلے کسی زمانے میں تھی لیکن تفسیر وحدیث اور فقہ میں ان حضرات کی عظمت شان سے کسی باخبر منصف مزاج کو انکار نہیں۔ آخر امام شافعی نے سارے لوگوں کو امام ابوحنیفہ کی عیال کیوں بتایا؟ خود اپنے یا اپنے استاذ امام محمد یا امام مالک رحمہم اللہ کی عیال نہیں بتایا؟ کیا امام شافعی بھی امام ابوحنیفہ کی تقلید جامد یا اندھی عقیدت میں مبتلا تھے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اہل انصاف جس امر کو امام اعظم کی اولیت اور عظمت شان کی دلیل سمجھتے ہیں، وہی اہل عناد کی عداوت ومخالفت کی بنیاد ہے، امام اعظم نے آزادانہ اجتہاد سے کام نہ لیا۔ بلکہ پہلے اجتہاد کے اصول وضوابط مقرر کیے، دلائل کے مراتب اور ان کی حیثیتوں کا تعین کیا، پھر دلائل اور قواعد کی روشنی میں فروع واحکام کی تخریج فرمائی۔ دیگر ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ نے بھی اس عادلانہ روش کی پیروی کی۔ مگر جب کسی کے سر میں آزادانہ اجتہاد یا ہوائے نفس کے مطابق انتخاب احکام کا سودا سماتا ہے تو یہ اصول وضوابط اس کی آزادی طبع اور غلط روی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے دل کا بخار اسی پر اترتا ہے، جس نے اس طریقے کی بنا ڈالی۔

امام اعظم کے خلاف علم حدیث میں کم مائیگی کا پروپیگنڈا بھی کوئی نیا نہیں مگر امام ابویوسف جو امام اعظم کے شاگرد اور ان کی مجلس فقہ کے رکن تھے، علم حدیث میں ان کے تبحر اور مہارت کا اعتراف بڑے بڑے ائمہ نے کیا ہے، جس کے باعث اعدائے زمانہ کے لیے بھی مجال انکار نہیں، یہ امام ابویوسف بیان کرتے ہیں کہ بعض اوقات امام ابوحنیفہ سے میرا اختلاف ہوتا اور کوئی فیصلہ نہ ہو پاتا، پھر میں محدثین کوفہ کے یہاں جاتا کہ میرے یا میرے شیخ کے قول کی تائید میں کوئی حدیث مل جائے، جس کے ذریعہ اختلاف کا تصفیہ ہو۔

مجھے امام کے قول کی تائید میں ایک دو حدیثیں مل جاتیں، میں آکر امام کو سناتا وہ قبول نہ کرتے میں عرض کرتا یہ تو آپ کے قول کے موافق ہے، اسے آپ کیوں نہیں لیتے؟ وہ فرماتے اس میں فلاں فلاں علت قادحہ ہے۔ اہل کوفہ کا علم حدیث مجھ سے مخفی نہیں، غور کیجیے جس شیخ کی نظر اتنے جلیل القدر ائمہ حدیث سے فزوں تر ہو، خود اس کی حدیث دانی کا پایہ کتنا بلند ہوگا؟ مگر تعصب وعناد کی بیماری کا کوئی علاج نہیں۔

محدث کا کام سونا جمع کرنا ہے، اور ناقد کا کام یہ پرکھ کر بتانا کہ کون سونا کتنا کھرا ہے کتنا کھوٹا؟ اسی طرح محدث کا کام شفا بخش دواؤں کا ذخیرہ کرنا ہے اور فقیہ کا کام امراض اور مریضوں کی تشخیص کے ساتھ ان دواؤں کا استعمال کرانا ہے، امام اعظم کے استاذ امام اعمش نے کچھ مسائل دریافت کیے کہ وہ نہ بتا سکے۔ امام ابوحنیفہ سے پوچھا انہوں نے بتا دیا۔ استاذ نے پوچھا تم نے یہ جو بات کہاں سے اخذ کی؟ عرض کیا فلاں فلاں حدیثوں سے، جو آپ نے ہی اس سند سے مجھ سے بیان فرمائیں۔ فرمایا اے فقہا تم لوگ طبیب ہو اور ہم محدثین عطار ہیں، اور ابوحنیفہ تم تو دونوں ہو۔ میں نے سو دن میں جو حدیثیں تم سے بیان کیں وہ ایک ساعت میں تم مجھے سنا گئے اور سنا رہے ہو۔

دونوں واقعے الخیرات الحسان لابن حجر الہیتمی الشافعی میں ہیں۔

پھر فقہ واجتہاد کا کمال علم حدیث میں رسوخ کے بغیر متصور بھی نہیں، حدیث کے تمام مراحل اور شعبوں کو عبور کیے بغیر پایہ اجتہاد تک رسائی ناممکن ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی - امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جانب کسی کتاب کی نسبت خواہ وہ اصول میں لکھی گئی ہو یا فروع میں صحیح نہیں ہے۔ فقہ حنفی کا سارا ذخیرہ امام محمد بن حسن شیبانی کی علمی کاوشوں کا مرہون منت ہے۔ جب کہ قاضی ابویوسف کا منصب قضا اس کی نشر واشاعت کا مؤثر ذریعہ ہے۔ جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشہور تالیف حجۃ اللہ البالغہ میں اسباب اختلاف الفقہاء فی الفروع کے تحت اس موضوع کا خلاصہ پیش کیا ہے

اور اصول فقہ کے باب میں امام شافعیؒ کی تالیف شہیر "الرسالۃ" کو اول تالیف گردانا ہے اور یہی درست ہے۔ بہر حال امام ابوحنیفہ ایک بزرگ عالم وفقیہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ علم حدیث میں عدم رسوخ کے سبب ان کی فقہ مسائل شرعیہ میں دیگر ائمہ کرام کی فقہ کے مقابلے میں صحت وصواب سے بعید ہے۔ بایں ہمہ ذاتی طور پر ان سے بغض وعناد رکھنا یا ان کے خلاف صف آرا ہونا کسی حال میں درست نہیں ہے۔ البتہ مسائل کی تحقیق وتنقیح میں مخالف ادلہ شرعیہ صحیحہ اقوال پر رد کرنا علماء کا دینی فریضہ ہے اور حق کی توضیح وتبیین میں کسی قسم کی مداہنت جائز نہیں ہے بشرطیکہ ادب واحترام ملحوظ خاطر ہو۔

مولانا وحید الدین خاں: -میرے نزدیک امام ابو حنیفہ نے جو اصول وضع کیے وہ کلی معنی میں درست نہ تھے- ان کی اصول سازی میں یک ایسی چیز شامل ہوگئی جو روح شریعت کے مطابق نہ تھی اور وہ ہے فقیت- مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ کا یہ اصول کہ الحق لا یتعدد سب سے بڑی وجہ ہے کہ مسالک فقہی کا اختلاف شدید بن گیا- حالاں کہ یہ شدت ایک ایسا غلو تھا جو اسلام میں ممنوع ہے-

مولانا عبدالحمید نعمانی: -یہ تنگ نظری اور ایک طرح کی معاندت کا معاملہ ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو منہج تحقیق ہے اور استنباط کے جو اصول وضابطے ہیں، ان میں بہت گہرائی ہے، بہت بلندی ہے، جیسا کہ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے میزان الشریعۃ الکبری میں یہ بات لکھی ہے کہ جب یہ لوگ اپنی کم فہمی کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں پاتے تو مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں- حضرت امام اعظم سے خصوصی معاندت کی کچھ خاص وجوہات ہیں- ایک یہ کہ وہ ائمہ میں مقدم ہیں- بہت سی روایتوں کے مطابق انہوں نے کئی ایک صحابہ کو دیکھا ہے اور ان سے مستفید ہوا ہے- دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی فقہ عملی شکل میں مدون ہوگئی- حکمرانوں نے باب قضاء میں اس کو نافذ کیا- ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مقلدین میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ ۹۵؍ فی صد مقلدین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرتے ہیں تو اب مخالفین تقلید نے یہ دیکھا کہ ہم جہاں جاتے ہیں، دنیا کے جس خطے میں پہنچتے ہیں وہاں حنفی پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کا مقابلہ بھی زیادہ تر احناف سے ہی ہوتا ہے، اور جواب دینے والے بھی یہی ہوتے ہیں، ان کی کاٹ کرنے والے بھی زیادہ احناف ہی ہوتے ہیں، اس لیے فطری طور پر ان کو عداوت بھی سب سے زیادہ امام ابوحنیفہ اور فقہ حنفی سے ہوتی ہے-

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو لگتا ہے کہ کتاب وسنت کا نعرہ تو ہم لگاتے ہیں مگر جب عوام کو رجوع کرنا ہوتا ہے تو وہ حنفی مفتیوں سے رجوع کرتے ہیں کہ دنیا میں زیادہ وہی ہیں- خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جو ان کی مخالفتیں ہوئیں وہ اسی لیے ہوئیں کہ لوگ دیکھتے تھے کہ حدیث کی خدمت تو ہم کر رہے ہیں لیکن عوام کا رجوع امام ابوحنیفہ کی طرف ہوتا ہے- حالاں کہ یہ واضح سی بات ہے کہ کوئی مریض دواخانہ نہیں جاتا، جہاں ہزاروں طرح کی دوائیں ہوتی ہیں، ہر کوئی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے- تو محدثین کی مثال دواخانے والے کی ہے، جن کے پاس دوائیں تو بہت سی ہیں، لیکن نہیں یہ نہیں معلوم کہ کون سی دوا کس مرض میں کام آئے گی- یہ کام مجتہد کرے گا، جس کی دواؤں کی ساخت پر، ان کے اثرات پر اور مریض کی حالت پر گہری نظر ہے- تو عوام کا فقہ حنفی کی طرف رجوع کرنا بھی امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ایک بہت بڑی وجہ ہے- اور اس کا سلسلہ بہت دراز ہے- چوں کہ فقہ حنفی کی عمر سب سے لمبی ہے، اس لیے ان کی مخالفت کا تسلسل بھی سب سے زیادہ دراز ہے-

سوال (۷) تقلید شخصی کا مفہوم کیا ہے اور امت کو اس کی ضرورت کیوں ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی: -جو شخص اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا مگر مجتہدین کے اقوال تک اس کی رسائی ہے اور بے شمار متفقہ مسائل کے علاوہ بڑی تعداد میں ایسے مسائل بھی ہیں جن میں مجتہدین کے نتائج فکر مختلف ہیں، ایسی حالت میں وہ کسی ایک ہی مجتہد کی پیروی کر سکتا ہے، اسی کا نام تقلید شخصی ہے، اس کے لیے بھی اس مجتہد کے اصول وفروع کو جاننا، سیکھنا، پوچھنا، سمجھنا ضروری ہے اگر وہ بیک وقت دو مجتہد کے قول مثلاً جواز وعدم جواز دونوں پر عمل کرنا چاہے تو یہ جمع نقیضین کی آرزو ہوگی جس کا وقوع محال ہے اور اگر یہ چاہے کہ جس وقت جو آسان معلوم ہوا سے اپنا لیا کرے تو یہ شریعت کی نہیں ہوائے نفس کی پیروی ہوگی اور اگر اسے یہ تکلیف دی جائے کہ تمام مذاہب کی تحقیق کرو، ہر قول کو کتاب وسنت اور قیاس واجتہاد کی روشنی میں پرکھو جو زیادہ درست اور مطابق دلائل نظر آئے اسے لے لو، دوسرے کو چھوڑ دو تو

یہ ایک عامی کی قوت وصلاحیت سے باہر ہے، جس کا وہ مکلف نہیں، وہ ساری عمر کھپا کر بھی اتنی اہلیت پیدا کرنے سے عاجز ہے پھر عمل کب کرے گا؟ قبر میں جانے کے بعد یا میدان قیامت میں؟ اور اگر کوئی عالم بے قید تیار ہو جائے کہ تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے تمام ائمہ کے اقوال و دلائل کی تحقیق تام فرمانے کے بعد ایک بے نظیر معجون مذاہب تیار کیا ہے، تم اسے لے لو اور حسب ضرورت استعمال کرتے رہو، اس میں ساری مشکلات سے نجات ہے اور یہ ساری آسانیوں کا انتخاب لا جواب ہے- اب وہ شخص وہ نسخہ کیمیا ہاتھ میں لے اور آنکھ بند کر کے اس پر عمل کرتا ہے تو یہ بارہ سو سال پہلے کے کسی امام کو چھوڑ کر پندرہویں صدی کے ایک عالم بے قید کی تقلید شخصی ہوگی اور آج اسی پر پوری دنیا کے غیر مقلدین سختی سے کاربند ہیں-

مگر بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ابتدائی دو صدیوں کے بعد سے ہی پوری دنیائے اسلام ایک امام مجتہد کی پابندی پر کاربند ہے، پھر فرق کیا رہا؟ صرف یہ کہ قدیم امام جو علم و تقویٰ، فقاہت و اجتہاد، عہد رسالت سے قرب وغیرہ ہر لحاظ سے اعلیٰ و اعظم تھا اسے چھوڑ کر آج کے ہر لحاظ سے اسفل و پست شخص کی پیروی ہو-

ایک امام معین کی پیروی بھی اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ خدا اور رسول کے احکام سے ہمیں باخبر کرتا ہے اور جہاں جہاں اس نے خود اجتہاد کیا ہے تو اپنی طرف سے اس نے کوئی چیز حلال یا حرام نہیں ٹھہرائی ہے بلکہ نصوص کتاب وسنت میں نظر غائر کے نتیجے میں جس چیز کو اس نے خدا و رسول کے یہاں حلال جانا ہے، اسے حلال بتایا ہے، جسے حرام جانا ہے، اسے حرام بتایا ہے اور ہم نے اس کی دیانت و تقویٰ کا مشاہدہ اور اس کے رسوخ علم کا تجربہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کر لینے کے بعد اس پر اعتماد کیا ہے اور اس کے اقوال کو قبول کیا ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- تقلید شخصی، یعنی غیر نبی ﷺ کا مطلق التزام اور تمام امور میں کسی ایک عالم و فقیہ کی مکمل اقتداء ایک حرام، منکر اور اجماع کے خلاف امر ہے۔ بعض حالات میں اور کچھ ضروری قیود و حدود کے ساتھ بعض علماء نے تقلید کو جائز قرار دیا ہے جس کے لیے کتب اصول کا مراجعہ کرنا چاہیے- یقیناً امت مسلمہ کی بھلائی اسی راستہ کی پیروی میں ہے جس کی پیروی سلف صالحین صحابہ و تابعین نے کی۔ چنانچہ امام احمد کا مشہور قول ہے "**لا تقلدونی ولا تقلدوا مالکاً ولا الشافعی ولا الاوزاعی ولا الثوری وخذوا الاحکام من حیث اخذوا**" نہ میری تقلید کرو اور نہ مالک، نہ شافعی، نہ اوزاعی اور نہ ثوری کی تقلید کرو بلکہ احکام وہاں سے لو جہاں سے یہ حضرات اخذ کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اپنے شاگرد خاص امام ابویوسف کو نصیحت فرماتے ہیں "**انما بشر نقول القول الیوم ونرجع عنه غداً**" یعنی مجھ سے سنی ہوئی ہر بات مت لکھ لیا کرو کیونکہ ہم بشر ہیں آج ایک بات کہتے ہیں اور کل اس سے پلٹ جاتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ کا مشہور قول ہے "**اذا صح الحدیث فهو مذهبی**" یعنی جب صحیح حدیث مل جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو۔ اور امام مالک کا فرمان "**لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها**" یعنی امت کا آخری دور اس وقت اصلاح و درستگی کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اوائل امت کی راہ اختیار نہ کرے۔ (یعنی منہج صحابہ پر کتاب وسنت کی کامل پیروی کے بغیر امت کی اصلاح ممکن نہیں) (**ایقاظ الهمم للفلانی واعلام الموقعین لابن القیم والمیزان للشعرانی** وغیرہ)

تقلید شخصی کے وجوب کے قائلین کے پاس مغالطات کے سوا کوئی معتبر دلیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف اور کتاب اللہ وسنت صحیحہ کی پیروی کا جذبہ خالص ہی انسان کو اباحیت اور فکری وعملی انارکی سے نجات دے سکتے ہیں۔ ورنہ بعض فقہاء (سامحہم اللہ، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے) کی حلت و حرمت کے باب میں حیلہ سازیاں اہل علم و تحقیق سے مخفی نہیں۔ لہٰذا امت کو نہ صرف یہ کہ تقلید کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اتحاد امت کے لیے یہ زہر ہلاہل ہے۔ تقلید شخصی کے رواج سے پہلے کی ابتدائی چار صدیوں میں امت مسلمہ کے متعلق مقلدین یہ رائے قائم کریں گے جو کسی ایک متعین شخص کی تقلید پر متفق نہ تھی؟ جب کہ قرون مفضلہ، بہترین ادوار میں اسلام نے نمایاں ترقی کی ہے اور یہ ترقی صرف اتباع کتاب وسنت کا ثمرہ تھی۔

مولانا وحید الدین خاں:- میرے نزدیک تقلید شخصی اصولاً ایک نادرست چیز ہے- وہ صرف ضرورت شرعی کی بنا پر درست قرار پا سکتی ہے- اور وہ یہ کہ جو آدمی براہ راست عربی ماخذ سے مسئلہ دریافت کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو وہ کسی ایسے شخص کا مقلد بن جائے، جس کے علم اور نیت پر اس کو اعتماد ہو-

مولانا عبدالحمید نعمانی :- ابھی جیسا کہ میں نے بتایا کہ منصوص مسائل میں تقلید کی ضرورت نہیں ہے اور ایسے ہی جو مسائل اجماعی ہیں، متفق علیہ ہیں، ان میں بھی تقلید کا کوئی سوال نہیں اٹھتا- ہاں! جو غیر منصوص مسائل ہیں اور ان میں مجتہدین کے مابین اختلاف ہوگیا ہے، اب ان مسائل میں ہم سب کی باتیں کیسے مان سکتے ہیں یہ تو ممکن ہی نہیں- تو اب یہیں پر تقلید کی ضرورت پڑتی ہے- کیوں کہ کوئی عمل جب بھی کرے گا تو کسی ایک ہی پر کرے گا-

تقلید شخصی دراصل اتباع ہوا سے روکنے کے لیے ہے، تقلید شخصی نہیں ہوگی تو جس کو جو مسئلہ جہاں آسان نظر آئے گا اس کا اتباع کرے گا تو گویا یہ شریعت کی نہیں اپنی طبیعت کی پیروی ہوگی-

اب مثال کے طور پر ایک شخص نے وضو کیا اور مس ذکر کر لیا تو ایک امام کے نزدیک تو اس کا وضو ٹوٹا دوسرے کے نزدیک نہیں ٹوٹا- پھر وضو کے بعد اس کے جسم سے خون نکل آیا تو ایک کے نزدیک تو وضو ٹوٹ گیا دوسرے کے نزدیک نہیں ٹوٹا- تو ایک ہی وقت میں اس نے مس ذکر بھی کر لیا اور اس کے بدن سے خون بھی نکل آیا تو اس کا وضو تو دونوں اماموں کے نزدیک ٹوٹ گیا- اب گویا اس نے بغیر وضو کے ہی نماز پڑھی- اب وہ کہے کہ مس ذکر کے مسئلہ میں ہم نے امام ابوحنیفہ کی پیروی کی اور خون کے مسئلہ میں امام شافعی کی پیروی کی- اس طرح میری نماز درست ہوگئی، کیوں کہ دونوں امام برحق ہیں- تو اس کا یہ فریب دراصل اماموں کی تقلید نہیں، ہوائے نفس کی تقلید ہے- اسی لیے تقلید شخصی ضروری ہے- ایک ساتھ دو چار ائمہ کی تقلید نہیں کی جا سکتی- اسی لیے منطق کا مسئلہ ہے کہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف فکر کا انتقال بھی محال ہے، اور عمل بھی بہ یک وقت محال ہے-

علاوہ ازیں تقلید مطلق تو سب کے نزدیک جائز ہے، قرآن کا حکم ہے کہ فاسئلوا أهل الذكر ان كنتم لا تعلمون- اس کو سب مانتے ہیں اور یہ اصول ہے کہ جو چیز کلیات میں جائز ہوگی وہ جزئیات میں بھی جائز ہوگی تو جب تقلید مطلق جائز تو شخصی طور پر تقلید شخصی جو تقلید مطلق کی ہی فرع ہے ضرور جائز ہونی چاہیے-

اس کے ساتھ ایسا بھی نہیں کہ حالات و ضروریات سے آنکھیں موند کر تقلید کی جاتی ہو- تقلید شخصی کے اندر بھی اس بات کی وسعت ہے کہ اگر ضرورت ہو، مجبوری ہو تو ہم توسع کے لیے دوسرے امام کے قول پر عمل کر سکتے ہیں- جیسے مفقود الخبر شوہر کے بارے میں اب ہمارے یہاں امام مالک کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے- تقلید شخصی کا معنی ہرگز تقلید جامد نہیں ہے

سوال (۸) -تقلید کی مخالفت کے پیچھے کیا واقعی "دعوۃ الی الکتاب والسنۃ" کا جذبہ کارفرما ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی غیر مقلدین نے پہلے تو بہت شد و مد کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ کتاب و سنت کی پیروی کرو، ائمہ کی پیروی شرک جلی ہے اور تمام مقلدین مشرک مباح الدم ہیں، وہ "اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله" کے مصداق ہیں، وہ ائمہ کی تحلیل و تحریم کو مان کر ان کے پجاری ٹھہرے اس لیے چھ سو سال کی پوری امت شرک خالص پر گزری-

اس دعوے کا تقاضا یہ تھا کہ غیر مقلدین ایک مجموعہ احکام منظر عام پر لاتے جو صرف کتاب و سنت کی تصریحات پر مشتمل ہو اور کسی امام کے قیاس و اجتہاد اور تحلیل و تحریم سے یکسر خالی ہو، مگر یہ کام غیر مقلدین سے آج تک نہ ہو سکا- جیسے چکڑالوی فرقے نے صرف کتاب اللہ کے اتباع کا نعرہ بلند کیا مگر کوئی ایسا نظام عمل پیش کرنے سے عاجز رہے جو صرف قرآن مجید کی تصریحات پر مشتمل اور تمام شعبہائے زندگی پر حاوی ہو-

غیر مقلدین کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہ پیش کر سکے جو کتاب و سنت میں ان کے اجتہاد کا ثمرہ ہو- ان کا کارنامہ بس یہ رہا کہ بزعم خویش "تقلید جامد" سے ہٹ کر "تقلید سیال" پر آگئے یعنی کسی ایک امام کا پورا مذہب اختیار کرنے کے بجائے اپنی راحت بدن اور ہوائے نفس کے مطابق مختلف ائمہ کے مذاہب سے پسندیدہ مسائل چھانٹ کر ایک معجون مرکب تیار کر لیا- اب وہ خود ہی بتائیں کہ ایک امام کی تحلیل و تحریم کو ماننے والا "واتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله" کا مصداق ہو تو چند اماموں کی تحلیل و تحریم کو ماننے والا اس کا مصداق کیوں نہیں ہوا؟ وہ تو کسی ایک حبر و راہب نہیں بلکہ بقول آپ کے واتخذ چند احبار و رہبان کو اربابا من دون اللہ بنانے والا ہے، وہی تو اس کا سچا اور پورا پورا مصداق ہے'

اگر یہ کہیں کہ ہم نے چند احبار کو اپنی تحقیق اور اتباع کتاب و سنت کے تحت مانا ہے تو ایک امام کا مقلد بھی یہی کہتا ہے کہ ہم نے اپنے امام کو خدا یا رسول نہیں مانا ہے، بلکہ خدا کا بندہ، رسول کا امتی، ان کے

ارشادات کا غواص اور ان کے احکام کا مبلغ اور مظہر ہی مانا ہے اور ہمیں بھی تحقیق سے معلوم ہے کہ انہوں نے نہایت اخلاص وامانت، کمال علم و ادراک اور وفور آلات اجتہاد کے ساتھ کتاب وسنت کے سمندر میں غواصی کر کے احکام شریعت کے تابناک گوہر نکالے ہیں اور ہم نے ہاتھوں ہاتھ لیے ہیں تاکہ خدا اور رسول کی اطاعت اور زندگی کے ہر شعبے میں شریعت حقہ کی پیروی ہو سکے۔

الحاصل تقلید کی مخالفت کے پیچھے اتباع کتاب وسنت کا جذبہ کار فرما نہیں، بلکہ اتباع نفس کا جذبہ کار فرما ہے۔ یا ان ہی کے الفاظ میں ''تقلید جامد'' سے ہٹ کر ''تقلید سیال'' کا راحت بخش داعیہ کار فرما ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی :-تقلید کی ضد اتباع ہے اور تقلید کا لفظ اپنے عرفی معنی میں ایک محدث لفظ ہے۔ لہٰذا مقصود اصلی بنیادی طور پر اتباع کتاب وسنت ہونا چاہیے اور تقلید جامد کی مخالفت کرنے والوں کا مطمح نظر بھی یہی ہے۔

مولانا وحید الدین خاں :-تقلید کی موجودہ مخالفت میرے نزدیک صرف کٹرپن یا گروہی عصبیت کی بنا پر ہے۔ میں تقلید کا جزوی مخالف ہوں۔ یعنی عوام کے لیے تو میں تقلید کو درست مانتا ہوں۔ لیکن خواص اہل علم کے لیے نہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی :-ممکن ہے، بہت سے لوگوں کی نیت صالح ہو، لیکن بیشتر لوگ نیک جذبات کے تحت کتاب و سنت کی دعوت نہیں دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکثر لوگوں کے نزدیک اصل مسئلہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ میں یہ قطعی طور پر نہیں مان سکتا کہ ان کے سینوں میں ائمہ، صالحین، اسلاف اور اولیاء اللہ سے زیادہ اتباع شریعت کا جذبہ موجود ہے۔ جتنے اولیائے کرام اور بزرگان دین ہوئے ہیں سب کا مطالعہ کر جائیے، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ تک، یا دوسرے اولیائے کرام ہیں، مثلاً خواجہ غریب نواز، حضرت صابر کلیری، شہاب الدین سہروردی یا آج بھی جتنے صالح لوگ ہیں، سب کسی نہ کسی امام کے مقلد ہیں تو کیا آج جو لوگ کتاب وسنت کے نام پر تقلید کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کے اندر ان حضرات سے زیادہ جذبہ اتباع شریعت ہے؟ جی نہیں! کتاب وسنت کی دعوت کا آخر معنی ہے کیا؟ کیا ائمہ نے کتاب وسنت سے ہٹ کر کوئی قانون بنایا؟ کتاب وسنت کے منشا تک پہنچنے کے لیے اور پورے طور پر شریعت کا اتباع کرنے کے لیے ہی انہوں نے اجتہاد کیے ہیں۔ تو اجتہاد کتاب وسنت کی دعوت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ ہم یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ ائمہ اور مجتہدین کا جو فہم ہے، وہ عام لوگوں کے فہم سے بڑھ کر ہے۔ اس میں نسبتہً یہ احتیاط ہے کہ ہم اپنے سے بہتر فہم والے کے اوپر اعتماد کر کے قرآن وسنت کا اتباع کریں۔ یہ کتاب وسنت کی حقیقی پیروی ہے، مخالفت نہیں۔ پھر کتاب وسنت کی دعوت دینے والے کوئی نمونہ بھی تو پیش کریں، جس کو ہم کہیں کہ یہ کتاب وسنت کی دعوت ہے۔ اور اس سے ہٹ کر کتاب وسنت کی مخالفت ہے۔ کسی نے اب تک کوئی نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔

سوال (۹) :-غیر مقلدیت کا وجود کب سے اور کیوں ہوا؟

مولانا محمد احمد مصباحی :-ہندوستان میں شاہ اسماعیل دہلوی نے اس کی تخم ریزی کی اور میاں جی نذیر حسین دہلوی نے اس کی کاشت تیار کی، یعنی یہ پودا تیرہویں صدی کے ربع دوم میں لگا اور ربع سوم وچہارم میں پیداوار مارکیٹ میں فروخت ہونے لگی۔

مولانا عبدالوہاب خلجی :-مقلدیت اور غیر مقلدیت جیسا کہ عرض کیا گیا اصطلاح حادث ہے۔ اصل دین، اتباع کا نام ہے ''**اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم**'' لہٰذا اتباع کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اسلام کی تاریخ۔ **وللہ الحمد**۔ اگر کوئی ائمہ اربعہ کی تقلید کو حرام اور بعد کے کسی عالم کی تقلید کو واجب گردانتا ہے تو اس کی مثال ''**فر من المطر وقام تحت المیزاب**'' یعنی بارش سے بچنے کے لیے پرنالہ کے نیچے کھڑے ہونے کی ہے۔ ہر حال میں دینیوں کی پیروی اور حق کا اتباع واجب ہے۔ کسی عالم وفقیہ کی وہی بات لائق اخذ واعتناء ہے جو دلیل سے مبرہن ہے اور ایسی صورت میں اصل اتباع، دلیل کا ہے نہ کہ کسی عالم کا۔ یہی وجہ ہے کہ خلاف از دلیل یا مخالف دلیل قول کا متبعین کتاب وسنت کی دنیا میں کوئی اعتبار نہیں۔ چاہے اس کا قائل وقت کا بڑے سے بڑا امام کیوں نہ ہو۔ لہٰذا سوال تو یہ مناسب تھا کہ ''مقلدیت کا وجود کب سے ہوا؟'' کیونکہ اتباع اصل شی ہے اور تقلید شئ حادث یعنی چوتھی صدی ہجری کی پیداوار۔ (سوال نمبر ۹، اور ۱۰ کا جواب اسی میں ہے)

مولانا وحید الدین خاں :-غیر مقلدیت کے آغاز کی قطعی تاریخ بتانا، شاید ممکن نہیں ہے۔ لیکن عام طور پر اس کا آغاز غالباً

امام ابن تیمیہ سے شروع ہوتا ہے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- اس طرح کے کچھ لوگ ہمیشہ رہے ہیں جو امت کی عام روش سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں آپ شرذمہ قلیلہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ امت کا عام رویہ نہیں ہے، اسے آپ امت کے Main stream سے کٹے ہوئے انحرافی نظریے کی پیداوار کہہ سکتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ غیر مقلدیت کا تو کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا طبقہ نہیں، جسے ہم صحیح معنی میں غیر مقلد کہہ سکتے ہیں۔

سوال (۱۰):- غیر مقلدیت نے امت کو ائمہ اربعہ کی تقلید سے آزاد کرایا ہے یا کسی دوسری تقلید میں الجھادیا ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- ایک نئی تقلید میں الجھادیا ہے، آزادی تو جب ہوتی کہ ہر غیر مقلد مجتہد ہوتا اور الگ الگ اجتہاد سامنے آتا۔ یا کم از کم یہی ہوتا کہ مثلاً رفع یدین یا آمین بالجہر، قرأت خلف الامام اور دوسرے صدہا مسائل میں کسی کو امام ابوحنیفہ کی دلیل وزنی معلوم ہوتی، کسی کو امام مالک کی، کسی کو امام شافعی یا امام احمد بن حنبل کی، اور ہر ایک اپنی تحقیق کے مطابق آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک عمل کرتا۔

مگر صورت حال یہ ہے کہ ہزاروں غیر مقلد جنگلی اور گنوار ہیں جن کے لیے صحیح طور سے سورۂ فاتحہ پڑھنا یا اردو میں لکھا ہوا ترجمہ قرآن سمجھنا بھی دشوار ہے، وہ اجتہاد یا تحقیق کیا کریں گے۔ کچھ غیر مقلد اگر عالم ہیں تو سب کا مذہب وہی ہے جو میاں جی اور ان کے معاصر و موافق رفقانے ثبت قرطاس فرمادیا۔ کوئی شخص اس سے سرمو انحراف کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ نتیجہ سامنے ہے کہ نہ آزادانہ اجتہاد رہا، نہ آزادانہ تحقیق اور فکر وجستجو، ایک طے شدہ، مقررہ اور احبار ورہبان کے ہاتھوں نئی کتابوں میں درج شدہ مذہب کی "تقلید جامد" رہ گئی۔ اجتہاد تو ان کے یہاں کچھ تھا نہیں "تقلید سیال" بھی رخصت ہوگئی۔

مولانا وحید الدین خاں:- بطور واقعہ اس معاملے میں جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی وجہ سے امت تقلید سے آزاد نہیں ہوسکی، بلکہ وہ ایک نئی تقلید میں مبتلا ہوگئی ہے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- آپ کسی حدیث کو کہہ رہے ہیں کہ ضعیف ہے کیوں کہہ رہے ہیں، اس لیے کہ اسے ذہبی نے بیہقی نے یا ابن کثیر نے ضعیف کہا۔ تو آپ کا اس حدیث کو ضعیف کہنا یہ تقلید ہوئی۔ تو جس طرح فن کے اندر آپ مقلد ہیں تقلید کر رہے ہیں تو پھر احکام شریعت کے لیے جو فقہی اصول ہیں ان میں بھی آپ کو تقلید سے انکار کا حق نہیں پہنچتا۔ وہاں آپ کسی صاحب بصیرت کی ہی تقلید کر رہے ہیں جس نے کتاب وسنت سے احکام استخراج کیے ہیں۔

سوال (۱۱):- جماعت سلفیہ اور جماعت اہل حدیث میں کچھ فرق بھی ہے یا اختلاف صرف ناموں کا ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- اصل میں غیر مقلدین کا جب وجود ہوا اور ابن عبدالوہاب کا اعتقادی مذہب انہوں نے اپنایا اور عمل میں مذہب ائمہ سے آزادی کا نعرہ بلند کیا تو مقلدین نے انہیں وہابی یا لامذہب یا غیر مقلد کا نام دیا۔ کوئی نام انہیں پسند نہ آیا۔ انہوں نے ماضی کی صدیوں کا مطالعہ کیا، ماضی میں سلفی و محدث یا اہل حدیث نام کے گروہ انہیں نظر آئے، یہ نام انہیں اچھے لگے اور نہیں سے اپنی تشہیر گوارا کرلی۔ کبھی اپنے کو محمدی یا اثری بھی کہتے ہیں، شاید اور زیادہ اچھے نام کی تلاش ابھی جاری ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی:- جماعت سلفیہ، جماعت اہل حدیث اور انصار السنہ، وغیرہ میں کوئی فرق نہیں، یہ صحیح صحابہ وتابعین یعنی مطلق کتاب وسنت، ثابت اجماع اور قیاس شرعی کو حسب ضرورت قبول کرنے والی جماعت کے مختلف نام ہیں۔ اور جب مقصود ومنشور ایک ہو تو ناموں کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ "**لا مشاحة فی الاصطلاح**"

مولانا وحید الدین خاں- جہاں تک میں جانتا ہوں دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے، ضمنی نوعیت کا فرق پایا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، دونوں کے درمیان حقیقی نوعیت کا کوئی فرق موجود نہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی:- دیکھیے! جب آدمی کے سامنے کوئی مضبوط بنیاد نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید حاصل نہ ہو تو اسی طرح انتشار پیدا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مامون کے زمانہ میں خلق قرآن کا مسئلہ سامنے آیا اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے یہ پوچھا گیا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ اور ان پر جبر کیا گیا تو انہوں نے صاف صاف یہی کہا کہ ہم نے کتاب وسنت میں

کہیں ایسا نہیں پایا اور نہ اپنے اسلاف سے سنا کہ یہ مخلوق ہے- اس لیے ہم اسے مخلوق نہیں کہہ سکتے- بعد میں اسی بنیاد پر امام احمد ابن حنبل کو ماننے والے اپنے آپ کو سلفی بھی کہنے لگے تو عالم عرب میں دراصل حنابلہ کو سلفی کہا جاتا ہے، جو امام احمد ابن حنبل کے مقلد ہیں- اور آج بھی عالم عرب میں وہی سلفی ہے جو حنبلی ہے، غیر مقلدیت کا تعلق سلفیت سے کچھ بھی نہیں ہے- غیر مقلدیت درحقیقت کتاب وسنت کی بابصیرت رہنمائی سے انحراف کا نام ہے اور جہاں تک اہل حدیث کا معاملہ ہے تو یہ بھی عجیب وغریب ہے- پہلے یہ محمدی تھی اور پھر اہل حدیث ہو گئے، پھر اپنے آپ کو سلفی کہنے لگے- یہ اس وقت ہوا جب عالم عرب میں پڑول نکلنا شروع ہوا اور یہاں کے اہل حدیث کے رابطے وہاں سے ہو گئے- اس سے قبل آپ کسی بھی اہل حدیث کے ساتھ سلفی لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے تو اس کو ہم کیا کہیں کہ کل تک تو اہل حدیث رہے اور آج اچانک سلفی ہو گئے- اسی لیے ہمیں یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ جن کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی وہ اسی طرح سے اپنا نام بدلتے رہتے ہیں-

مولانا محمد حسین بٹالوی نے برٹش حکومت کے زمانہ میں اپنے طبقہ کا نام اہل حدیث رجسٹرڈ کرایا تھا- اس سے پہلے وہ محمدی کہلاتے تھے، تو بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے آدمی ہر طرف لڑھکتا رہتا ہے-

اب رہا ہندوستانی اہل حدیث اور عالم عرب کی جماعت سلفیہ کے بیچ تقابل کی بات تو عالم عرب میں جتنے بھی سلفی ہیں، تقریباً سب کے سب مقلد ہیں، ہندوستانیوں کی طرح مخالف تقلید نہیں، پھر عموماً وہ حنبلی ہیں اور تھوڑے بہت شافعی اور مالکی بھی ہیں- لیکن ہندوستان کے اندر اہل حدیث کا جو نظریہ ہے اور مخالفت تقلید کی جو لہر ہے، اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے- ہاں! اس کے باوجود اب ہندوستانی اہل حدیث ان کے ساتھ روابط کو بڑھانے کے لیے ان سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرور کوشش کر رہے ہیں-

علامہ شوکانی یمن کے ایک زیدی شیعہ تھے، انہوں نے تقلید کی مخالفت کا آغاز کیا اور ایک نئی روش پیدا کی تو ان کے بعد سے ہی یہ انحرافی رویہ چلا ہے- رہا علامہ ابن تیمیہ یا علامہ ابن قیم کا ذکر، جن کا یہ حضرات بہت چرچا کرتے ہیں تو خود وہ بھی غیر مقلد نہیں تھے، وہ سب کے سب مقلد تھے، حضرت غوث اعظم بھی مقلد تھے، اب یہ کہ بعض مسائل میں انہوں نے اختلاف کیا تو یہ ان کے اپنے تفردات ہیں، جیسے حنفیوں میں علامہ ابن ہمام کے تفردات ہیں، شاہ ولی اللہ کے تفردات ہیں، وغیرہ وغیرہ- علامہ ابن تیمیہ کے جتنے تفردات ہیں سب کی تعداد ۷/۲۰ ہے اور باقی مسائل میں وہ خود بھی مقلد ہیں، ان کو اہل حدیث غیر مقلد کہنا بالکل غلط ہے-

سوال (۱۲):- جماعت اہل حدیث کا اختلاف صرف فقہی ہے یا نظری و اعتقادی بھی ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی:- غیر مقلدین اعتقاداً کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے پابند ہیں اور عملاً ایک نئی تشکیل اور جدید تدوین کے، دونوں کی کچھ تفصیل جامع الشواہد میں محدث سورتی مولانا وصی احمد علیہ الرحمہ نے دی ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی:- جماعت اہل حدیث پورے اسلام کی نمائندہ جماعت ہے، اور وہ مخالف کتاب وسنت واجماع صحیح کسی عقیدہ وعمل یا فکر ونظر کو قبول نہیں کرتی- ویسے ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے عقائد کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں اور بنیادی طور پر ان کے درمیان عقیدہ کے باب میں کوئی قابل ذکر ولحاظ اختلاف نہیں ہے- صوفیاء اور خانقاہیوں کے درمیان مروجہ عقائد میری مراد نہیں ہیں- کیونکہ ائمہ اربعہ میں سے بعض کی طرف انتساب کرنے والے بہت سے لوگ عقائد کے اعتبار سے اشعری اور ماتریدی ہیں- اور تصوف کے متعلق مزید چار سلسلے رائج اور مشہور ہیں- جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں-

مولانا وحید الدین خاں:- جہاں تک میں جانتا ہوں، جماعت اہل حدیث کا اختلاف دونوں نوعیت کا ہے- فقہی مسائل کے اعتبار سے بھی اور اعتقادی مسائل کے اعتبار سے بھی-

مولانا عبدالحمید نعمانی:- غیر مقلدین کے زیادہ تر اختلافات فقہی ہیں، لیکن کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو نظریاتی ہیں، یہ نظریاتی اختلافات ان لوگوں نے شیخ ابن تیمیہ کے اتباع میں اپنائے ہیں، مثلاً یہ کہ اللہ فوق میں ہے اور یہ کہ انسانوں کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں بھی ہیں، تو اس طرح کے نظریاتی اختلاف کے اندر اگر ہم احتیاط کریں اور ان کی تکفیر نہ کریں تو کم از کم وہ گم راہ تو ہیں ہی- ان کی گمرہی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا-

سوال (۱۳):- غیر مقلدیت نے "دعوۃ الی الکتاب والسنۃ" کے نام پر امت کو متحد کیا یا اس کے انتشار کے مزید سامان بہم پہنچائے؟

مولانا محمد احمد مصباحی :-امت ائمہ اربعہ کو برحق مانتے ہوئے اپنے اپنے امام کی تقلید پر مطمئن تھی غیر مقلدیت کے وجود میں آتے ہی انتشار اور جنگ وجدال کا ماحول برپا ہو گیا- فوجداری، مقدمہ، کورٹ، کچہری سب کی نوبت آئی اور سلسلہ اب بھی جاری ہے-

مولانا عبدالوہاب خلجی :-اہل حدیث اور انصار السنۃ، امت کو یقیناً کتاب وسنت اور اعتصام بحبل اللہ کے پلیٹ فارم پر متحد کرنے کے آرزو مند ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کی تعداد میں اضافہ فرمائے اور کوششوں کو بارآور کرے۔جماعت اہل حدیث نے ہمیشہ امت کو انتشار سے بچانے اور شاہراہ قرآن وحدیث پر متحد کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔پہلے بھی امت کا اتحاد کتاب وسنت پر قائم تھا اور آج بھی اسی متحدہ پلیٹ فارم پر اتحاد قائم اور راسخ ہو سکتا ہے۔کاش! لوگ غور وفکر سے کام لیتے۔

مولانا وحید الدین خاں :-اس سوال کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کوشش کا عملی نتیجہ منفی صورت میں نکلا ہے- اور اس کا سبب غلو ہے۔جب بھی غلو کا طریقہ اختیار کیا جائے گا ہمیشہ اس کا نتیجہ منفی صورت میں برآمد ہوگا-

مولانا عبدالحمید نعمانی :-ہر باطل تحریک ایک خوشنما نام کے ساتھ سامنے آتی ہے-معتزلہ کی تحریک اصحاب العدل والتوحید کے نام سے اٹھی تھی-لیکن ظاہر ہے کہ وہ گمراہی تھی، قادیانیت کی تحریک کو دیکھیے وہ تحفظ ختم نبوت کی تحریک، خدا کی نعمت کی تحریک بتاتے ہیں، تو اس طرح کی جتنی تحریکیں ہوتی ہیں، کسی خوب صورت نام کے ساتھ ہی سامنے آتی ہیں اور یہ باطل کی کمزوری ہے کہ وہ کبھی بھی اپنی اصلیت کو واضح کر کے سامنے نہیں آ سکتی-شیطان اپنی ہر شیطانی کو خوب صورت بنا کر پیش کرتا ہے،اس طرح کی تمام انحرافی تحریکوں کا یہی حال ہے، ان کا کتاب وسنت کی دعوت یا اتباع شریعت کے جذبے سے اصلا کوئی تعلق نہیں ہوتا، آج بھی وہ لوگ جو اسلاف کے حقیقی معنی میں اتباع کرتے ہیں، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین اور اولیاء اللہ کا احترام کرتے ہیں، ان کے اندر اتباع شریعت کا جذبہ ان سے بہت زیادہ ہوتا ہے جو صرف کتاب وسنت کے نام سے اپنا کام چلانا چاہتے ہیں، کون کتاب وسنت کی پیروی کو اولین اور بنیادی فریضہ نہیں سمجھتا؟ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کتاب وسنت کے مطالبات پر زیادہ سے زیادہ عمل کرے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کتاب وسنت کی دعوت نے لوگوں کو اتباع شریعت کی طرف متوجہ نہیں کیا ہے، بلکہ دین کے اتباع پر جو سماج قائم تھا، اس میں انتشار وخلفشار پیدا کر دیا ہے اور عوام ذہنی طور پر سخت الجھن کا شکار ہو گئے ہیں-

سوال (۱۴) :-عالمی تناظر میں مسلمانوں کے حوالے سے سعودی عرب کے منفی کردار میں اس کی غیر مقلدیت کا کیا کردار ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی :-سعودی عرب میں رہنے والے شیوخ نجد کو غیر مقلدیت سے زیادہ عقیدۂ وہابیت سے دلچسپی ہے اور اس کو وہ طاقت، دولت، افراد وغیرہ کے ذریعہ پھیلانے میں منہمک ہیں، وہ حنبلیت کے مدعی ہیں مگر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد دیگر مذاہب کے مصلے مسجد حرام سے ختم کر دیے-تعظیم واحترام کو عبادت اور شرک کہتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے آثار و مقابر کو انہدام کر دیے اور ان کی شان و عظمت کو بت شکنی سمجھتے ہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی :-سعودی عرب کے کردار پر لوگوں کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں۔میرا حسن ظن ہے کہ سعودی عرب کی اسلامی حکومت امت مسلمہ کے مفاد میں کام کر رہی ہے اور ''رموز مملکت خویش خسرواں دانند'' کے تحت وہ جو بھی قدم اٹھا رہی ہے اس کے پیچھے دوررس مقاصد کارفرما ہیں۔دور دراز علاقوں میں بیٹھے اور جھوٹ وبے سروپا باتوں کی اشاعت کرنے والی میڈیا کے دام فریب میں مبتلا حضرات کو خواہ مخواہ اس مملکت سے بدگمانیاں اور خدا را بیر ہیں۔ جب کہ یہ حکومت بفضلہ تعالیٰ شدت پسندی کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہی ہے اور آج بھی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی دہشت گردی سے نبرد آزما رہے گی۔حکومت کا منشور اتباع کتاب وسنت اور رد بدعت کے ساتھ امت مسلمہ کی خیر خواہی ہے۔اور شاید ان ہی اصولوں پر کاربند ہونے کے سبب مسلمانوں کے بعض طبقات کو اس حکومت سے بلا وجہ ردوکد ہے۔ویسے میرا یہ بھی دعویٰ نہیں کہ حکومت اپنے ہر فیصلہ اور اقدام میں درست ہے۔لیکن بہر حال اس کے محاسن، معائب پر غالب ہیں اور اگر کسی کو کوئی خامی وخرابی نظر آتی ہو تو دین خیر خواہی کا نام ہے۔اس کو چاہیے کہ حکومت یا اس کے سفارت خانے سے رجوع کرے۔

مولانا وحید الدین خاں :-جہاں تک میں جانتا ہوں مسلمانوں کے حوالے سے سعودی عرب کا کوئی منفی کردار نہیں ہے اور اگر

ہے تو مجھے اس کا علم نہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی: -دیکھیے! ہم لوگوں نے جو دیکھا ہے، جو سمجھا ہے اور رابطہ ہونے کے بعد جب بات چیت ہوئی ہے تو اس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سعودی حکومت اور وہاں کے ذمہ داران کا غیر مقلدیت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، چاہے محمد بن عبدالوہاب ہوں چاہے آج کے دوسرے ذمہ داران ہوں، آل شیخ وغیرہ-ان کا تحریری بیان موجود ہے کہ ہم ائمہ اربعہ کی توہین کے خلاف ہیں، ہم چاروں ائمہ کا احترام کرتے ہیں اور ہم لوگ حنبلی ہیں اور ہمارا عقیدہ وہی ہے جو ہمارے اسلاف کا رہا ہے-لیکن یہ لوگ جو ہندوستان میں اہل حدیث اور غیر مقلد کے نام سے جانے جاتے ہیں، یہ اپنے آپ کو وہاں کی سلفیت سے جوڑ کر ایک طرح کی غلط فہمی اور مغالطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، ورنہ سعودی حکومت کا وہاں بالکل ایسا کردار نہیں ہے کہ وہ غیر مقلدیت کو اہمیت دے- جب جمعیۃ العلماء نے تحفظ سنت کانفرنس میں یہ سوال اٹھایا تھا تو وہاں کے ذمہ داروں نے باضابطہ کہا کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے-لیکن ہاں! کچھ لوگ وہاں اس طرح کے نظریات کے حامل ضرور ہیں، جو بااثر بھی ہیں-

سعودی کے اندر چوں کہ دو طبقات ہیں، ایک حکومت کا طبقہ ہے جسے آل سعود کہا جاتا ہے اور دوسرا مذہبی طبقہ ہے جسے آل شیخ کہا جاتا ہے- آل شیخ کے اندر کچھ لوگ ایسے ضرور رہے ہیں، جن کے اندر آزادی کا پہلو ابھرا ہوا ہے-لیکن ان کو آپ برصغیر میں جو معروف معنی میں اہل حدیث اور غیر مقلد کی اصطلاح ہے، اس معنی میں انہیں اہل حدیث یا غیر مقلد نہیں کہہ سکتے-لیکن وہاں پر جو حکومتی طبقہ ہے، ان کا جو مزاج ہے، اس سے بالکل ایسے آزادروی کی تائید نہیں ہوتی ہے-حکومتی افراد تقریباً سب کے سب مسلکاً حنبلی ہیں-اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حکومت کی وجہ سے غیر مقلدیت کو فروغ ہو رہا ہے-ہاں! لیکن یہ جو میں نے کہا کہ یہ لوگ کنفیوژن پیدا کرتے ہیں، تو یہ اپنے اس حربے سے کہ وہاں پر اپنے کو ان کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور یہاں پر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ سعودی میں ہمارے ہی نظریات کے لوگ ہیں-اس حربے سے ان کو ضرور فائدہ حاصل ہوتا ہے اور یہ اپنا فروغ کرتے ہیں-

سوال (۱۵) -کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے؟ اگر ہاں! تو کیوں؟ اور اگر نہیں تو عصر حاضر میں تحقیق واجتہاد کی کون سی صورت ممکن یا واجب ہے؟

مولانا محمد احمد مصباحی: -اجتہاد کی اجازت اہلیت سے مشروط ہے اور وہ صدیوں سے مفقود ہے مگر ائمہ نے جامع اصولوں کی روشنی میں فروع کا جو ذخیرہ ہمیں دیا ہے، اس میں پیدا ہونے والے اکثر مسائل کا حل بعینہٖ مل جاتا ہے اور کچھ کے لیے نظر وفکر اور الحاق کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ کام انفرادی واجتماعی طور پر ہر دور میں ہوتا آیا ہے اور آج بھی جاری ہے-اسی لیے مقلدین کے یہاں ہر نئے مسئلے کا حل مل جاتا ہے اور غیر مقلدین کے یہاں بے شمار پرانے مسائل بھی تشنہ ہیں-

مولانا عبدالوہاب خلجی: -اجتہاد کا دروازہ کس نے اور کب بند کیا کہ آج اس کے کھولنے کی ضرورت پیش آئی؟ مسائل لامتناہی ہیں اور شرعی اصول کے اندر ان کے حل کی پوری صلاحیت موجود ہے اور ماشاء اللہ متجددہ مسائل کے اندر امت کی رہنمائی کرنے والے علماء راسخین سے بھی یہ دنیا خالی نہیں ہے-ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ قیاس واجتہاد کے اصول کو نظر انداز نہ کیا جائے اور اس بحر کی شناوری وہی لوگ کریں جو اس کے اہل ہیں ؎ ..... ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

مولانا وحید الدین خاں: -کچھ علماء کا یہ کہنا ہے کہ فقہائے اربعہ کے بعد کے زمانہ میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے-اس رائے کی واحد بنیاد یہ ہے کہ ان کے نزدیک بعد کے زمانے میں علم کا رسوخ کم ہو گیا-یہ سبب اس ضمن میں بلاشبہ بے اصل ہے-کیوں کہ حدیث میں واضح طور پر موجود ہے کہ اجتہاد کی خطا پر بھی آدمی کو ایک ثواب ملتا ہے-میرے نزدیک اجتہاد کا دروازہ نہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ کبھی بند ہو سکتا ہے-میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اجتہاد ایک عبادت ہے اور عبادت کبھی بند نہیں ہوتی، اس سلسلے میں جو اصل بات ہے وہ یہ ہے کہ اگر عالم کی نیت درست ہے تو اس کو اپنے اجتہاد کا ثواب ملے گا اور اگر اس کی نیت درست نہیں ہے تو اس کو اس کا ثواب نہیں ملے گا-

عصر حاضر میں اجتہاد کی ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ عالم علم شریعت کے ساتھ علم زمانہ سے بھی بخوبی طور پر آگاہ ہو-مثال کے طور پر وہ عربی زبان کے علاوہ انگریزی زبان کی اچھی استعداد رکھتا ہو تاکہ اس کی پہنچ جدید مصادر تک ہو سکے-اس دوطرفہ علم کے بغیر کوئی شخص مجتہد

زمانہ میں کامیاب مجتہد نہیں بن سکتا۔

مولانا عبدالحمید نعمانی :- اجتہاد کا دروازہ دور رسالت سے کھلا ہوا ہے، یہ دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے اور قیامت تک مسائل میں اجتہاد ہوتا رہے گا۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محققین نے یہی لکھا ہے۔ اگر اجتہاد کا دروازہ بند کردیا جائے تو عصری مسائل جو پیش آتے ہیں، ان کا حل کیسے پیش کیا جاسکے گا۔ اصل مقصد مسائل کا حل ہے۔ خواہ یہ اجتماعی سطح پر ہو خواہ انفرادی سطح پر، آج اجتہاد کا عمل اجتماعی سطح پر بہتر انداز میں ہو رہا ہے۔ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے اور نہ بند کرنے کا کسی کو حق ہے، آج چوں کہ مسائل بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور ہر مسئلے میں جدید وقدیم کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سے پہلو پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر اجتہاد کے لیے جس طرح کی صلاحیت اہل علم میں چاہیے تھی تقریباً مفقود ہے، کوئی ایک آدمی ایسا نظر نہیں ہوتا جو خود ہی سارے مسائل کو حل کردے، ایسی صورت میں اجتماعی اجتہاد بہت ہی بہتر اور قابل تعریف عمل ہے۔

سوال (۱۶) - ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے پیغام؟

مولانا محمد احمد مصباحی - ''جام نور'' خوب سے خوب تر، مفید سے مفید تر کی جستجو میں جادہ پیما ہے، اسی بنیاد پر قارئین بھی اس کے دل دادہ ہیں۔ دونوں کا سفر استقامت اور روز بروز ترقی کے ساتھ جاری رہے، یہی آرزو اور یہی پیغام ہے۔

مولانا عبدالوہاب خلجی - ماہنامہ جام نور کے مدیران اور مقالہ نگاران سے یہی گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کریں، اسلام کے اصل الاصول کتاب اللہ اور سنت مصطفےٰ ﷺ کی بالا دستی کے لیے اشہب قلم کو مہمیز لگائیں اور بدعات وخرافات نیز جذبات وعواطف سے پرہیز کریں۔ اور قارئین کرام حق وصواب کی جستجو میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں، اپنے آپ کو بدعقیدگی اور عملی انحطاط سے محفوظ رکھیں، زور بیان وقلم اور عدم سوکی ان ترانیوں سے متاثر نہ ہوں بلکہ قرآن وسنت پر مبنی دلائل تلاش کریں اور انھیں کو حرز جاں بنائیں کیوں کہ معاملہ دین کا ہے اور الحمد للہ اللہ کا دین دلائل صحیحہ پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ حق کے کاموں پر ہم تمام لوگوں کا حامی وناصر ہو۔ والصلاۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین۔

مولانا وحید الدین خاں :- ماہنامہ جام نور میرے پاس آتا ہے، میں اس کو ایک اچھا رسالہ سمجھتا ہوں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میری دعا ہے کہ ماہنامہ جام نور ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔ اور مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ نفع کا باعث بنے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی :- ہمارا پیغام یہی ہے کہ کتاب وسنت سے ہماری وابستگی مضبوط سے مضبوط تر ہو اور جو صحابہ اور اکابر اور اولیاء اللہ اور بزرگان دین کا عمل ہے، جو توارث ہے، اس سے ہمارا رشتہ نہ ٹوٹنے پائے۔ اگر ہمارا رشتہ ان چیزوں سے چھوٹ جائے گا تو کتاب وسنت پر عمل کا دعویٰ مشکوک ہو جائے گا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے جذبات کو صحابہ وتابعین، بزرگان دین وصالحین سے کم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ جب تک ان لوگوں سے ہماری وابستگی، عقیدت مندی مستحکم نہیں ہوگی، عمل میں وہ جذبہ صداقت نہیں آسکے گا۔

ہمارا بنیادی مقصد تو بلاشبہ کتاب وسنت پر عمل کرنا ہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کو بیگانہ سمجھیں، ہاں اگر کسی مسئلے میں کسی سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہو تو ہم انہیں مطعون کرنے کی بجائے معذور سمجھیں گے۔ انہیں مطعون کرنا قطعی طور پر غلط ہے۔ انہیں معذور سمجھتے ہوئے کتاب وسنت کا جو صحیح منشا ہے اور جس پر امت عامل رہی ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو کتاب وسنت، اجماع امت اور اکابر کے توارث کے خلاف ہو اور نہ کسی طرح اپنے اندر اسلاف سے غلط فہمی پیدا ہونے دیں۔ ٭٭٭

تقلید رحمت یا زحمت؟

نوٹ: -ماہنامہ" جام نور" اپنے اس کالم میں عصر حاضر کے کسی بھی مسئلہ کے تحت ہندوستان کے نامور علمائے کرام ودانشوران قوم وملت سے ان کی تحریری رائے لیتا ہے۔ موصول ہونے والی آراء خواہ وہ مثبت یا منفی پہلو پر ہوں، شائع کی جاتی ہیں تاکہ متعلقہ مسئلے کے دونوں پہلو ارباب علم ونظر اور عام قارئین تک پہنچ سکیں اور متعلقہ مسئلہ پر علمائے کرام ودانشوران قوم کی تحقیقی وتجزیاتی رائے کی روشنی میں مسئلے کے صحیح نتائج برآمد ہو سکیں، علماء ودانشوران کی سہولت کے پیش نظر مندرجہ بالا سوال سے متعلق چند ذیلی نکات بھی دیے گئے تھے، تاکہ مندرجہ ذیل خطوط پر دلائل و براہین کے ساتھ وہ اپنا تحقیقی جواب دے سکیں
(ادارہ)

نکات

{❶} تقلید کی حقیقت کیا ہے؟
{❷} قرآن وسنت کے ہوتے ہوئے ائمہ کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟
{❸} کیا حضرات مفسرین ومحدثین بھی مقلد تھے؟ اگر ہاں تو کیوں؟
{❹} تقلید اتحاد امت کی ضامن ہے یا انتشار امت کی؟
{❺} امت کو تقلید سے کیا فوائد ملے اور کیا نقصانات؟

> **''ابن تیمیہ نے اہل تصوف کے خلاف بھی جنگ کی اور اہل تقلید کے خلاف بھی، ان کے تفردات سے پورے عالم اسلام میں بحث ومناظرہ اور جنگ وجدال کا آغاز ہو گیا۔ تو بتایئے! زحمت کیا ہے؟ تقلید یا مخالفت تقلید؟''**
>
> **مفتی عبد المنان اعظمی**☆

(۱) **تقلید** کی تعریف کی گئی ہے کہ تسلیم القول بلا دلیل - یہ عام انسان کا فطری تقاضا ہے کہ وہ عمل کے لئے کوئی اسوہ اور نمونہ چاہتا ہے اور یہ عام مسلمانوں کی مجبوری ہے کہ وہ خود قرآن وحدیث سے احکام کو اخذ نہیں کر سکتے اس لئے اہل علم سے ہی پوچھ پوچھ کر عمل کرتے ہیں اور یہی اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے، ارشاد ربانی ہے فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون (اگر تم خود نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو)

اور تاریخ کا مشاہدہ ہے کہ عام اہل اسلام عہد رسالت سے ہی اسی روش پر قائم رہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی جو ہندوستان کے غیر مقلدین کے مستند ہیں اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں وہ شخص جو صرف نبی کے فرمان پر چلتا ہے اور جس کو اللہ ورسول نے حلال یا حلال سمجھتا ہے۔ البتہ جب اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا علم نہ ہو، نہ ہی وہ مختلف حدیثوں کے جمع کرنے کا طریقہ جانتا ہے اور نہ حدیث سے استنباط کر سکتا ہے، اس وقت کسی عالم رشید کا اتباع کرے اور یہ گمان کرے کہ یہ اپنے قول میں سچا ہے اور سنت رسول کے ماتحت فتویٰ دیتا ہے اور اگر وہ اس کے خلاف کرے تو وہ فوراً اس سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

اس اتباع کا کون انکار کر سکتا ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ عہد رسالت سے ہی مسلمانوں میں فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا رواج چلا آرہا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک (آدمی) سے ہی ہمیشہ مسائل پوچھے یا کبھی دوسرے سے بھی پوچھ لے اس میں کچھ فرق نہیں۔ (حجۃ، جلد اص:۳۷۶)

وہ مزید فرماتے ہیں ایک شبہ یہ ہے کہ چاروں مذاہب فقہی جو مدون ہو چکے ہیں اور احاطہ تحریر میں آچکے ہیں، اس پر امت کا اجماع

ہو چکا ہے یا معتد بہ لوگوں کا اجماع ہو چکا ہے کہ ان کی تقلید جائز ہے اور اس میں بہت سی مصلحتیں بھی ہیں جو مخفی نہیں، خصوصا اس زمانے میں تقلید ضروری اور درست ہے کہ جس میں لوگوں کی ہمتیں پست ہوگئی ہیں اور خواہشات نفسانی کا غلبہ ہوگیا ہے اور ہر آدمی اپنی رائے پر ناز کرنے لگا ہے۔(حجۃ، جلد ا،ص ۳۷۲)

ائمہ اربعہ کے مقلدین جو آج موجود ہیں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے ان کی تقلید کا صحیح نقشہ اپنی تحریر میں بیان کیا اور اس کی تصحیح وتائید فرمائی ہے۔اس قسم کی تقلید کی حرمت کا قول ابن حزم ظاہری نے کیا ہے جو اہل سنت وجماعت کے طبقے سے خارج ہے۔ بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ آج کل کے غیر مقلدین حضرات بھی اس قسم کی تقلید کرنے پر مجبور ہیں۔البتہ یہ اپنے اپنے ذوق اور مقدر کی بات ہے کہ ہم کو امام اعظم کی تقلید راس آئی اور ان کو نواب صدیق حسن خاں اور ثناء اللہ صاحب امرتسری اور محمد جونا گڑھی کی تقلید پسند۔ ہوئی افسوس زمانے کیسی سستی دے گئے ہیں

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا   ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا

(۲) تمام گمراہیوں کی گمراہیوں اور بددینیوں کا نقطہ آغاز یہی نقطہ نظر ہے۔

(الف) غیر مقلد حضرات یہی کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی موجودگی میں تقلید اور پیروی کی کیا ضرورت ہے یہ پہلی سیڑھی ہوئی۔

(ب) اہل قرآن کہتے ہیں کہ حدیث کی تدوین حضور ﷺ کے سو سال بعد ہوئی، معلوم نہیں کہ کیا غلط ہے کیا صحیح؟ ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے، حدیث کی ہم کو حاجت نہیں، بلکہ بعض دریدہ دہن کو یہ بھی کہتے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کی بھی ہم کو ضرورت نہیں، انھوں نے کلام الہی ہم تک پہنچا دیا ان کا کام پورا ہوگیا اور اب قرآن سمجھنا اور عمل کرنا ہمارا کام ہے۔

(ج) یورپ کے دہریے کہتے ہیں ہماری عقل اور ہمارا علم ہمارے لیے کافی ہے، ہم کو دنیا چلانے کے لیے نہ خدا کی ضرورت ہے نہ اس کے احکام کی، یہ تیسری اور آخری منزل ہے۔تو کیا مسلمانوں کو بھی اجتہاد اور آزادی رائے کے درجہ بدرجہ بلند ہوتے ہوئے زینوں کی آخری منزل تک پہنچنا چاہیے؟ اور مادر پدر آزادی کے بعد تن بدن اور دین وایمان سے آزادی بھی مسلمان کا مقدر تو نہیں ع

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

یہ سوال جو آپ نے کیا ہے ہندوستان میں سب سے پہلے مولوی اسماعیل صاحب دہلوی نے آواز اٹھائی تھی، انھوں نے اپنی کتاب تقویۃ الایمان صفحہ ۳ پر لکھا "عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ ورسول کا کلام سمجھنا سخت مشکل ہے، اس کی سمجھ کو بڑا علم چاہیے، ہم کو یہ سمجھ کہاں کہ ان کا کلام سمجھیں اور اس پر چلنا بڑے بزرگوں کا کام ہے ہم کو یہ طاقت کہاں کہ اس کے موافق چلیں، ہم کو تو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں، سو یہ بات غلط ہے، اس واسطے کہ اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں باتیں بہت صاف اور صریح ہیں، ان کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔اور اللہ رسول کے کلام کو سمجھنے کے لئے بہت علم نہیں چاہیے کہ پیغمبر تو نادانوں کو راہ بتانے اور جاہلوں کو سمجھانے اور بے علم کو علم سکھانے آئے تھے۔

حالانکہ جب نمبر اول میں یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن وحدیث سے براہ راست سمجھنا اور تخریج جزئیات مسائل، مجتہدین کا منصب ہے، اور جو لوگ اس کی استعداد نہیں رکھتے ان کا فرض تو مجتہدین سے پوچھ پوچھ کر عمل کرنا ہے تو پھر اس سوال کی کیا گنجائش کہ قرآن وحدیث کے ہوتے ہوئے ائمہ کی تقلید کی کیا ضرورت؟۔

استعداد استنباط اور تخریج مسائل کا شعور نہ رکھنے والوں کا براہ راست قرآن سے استخراج واستنباط اور اخذ مسائل تو زہر ہلاہل ہے، ارشاد رسول ﷺ ہے من قال فی القران برائه فليتبوا مقعده فی النار– من قال فی القرآن برائه فان اصاب فقد اخطا

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالیا۔جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا تو اگرچہ صحیح بھی ہو تو غلطی پر ہے۔(مشکوۃ شریف، ص:۳۵)

تھہ ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں   آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

عن عمر ابن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ قال سالت عن ربی عن اختلاف اصحابی من بعدی فاوحی الی

يا محمد ان اصحابك عندي بمنزلة النجوم في السماء بعضها اقوى من بعض و لكل نور فمن اخذ بشيء مما هم عليه من اختلافهم فهو عندي على الهدى۔

"میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رب تبارک وتعالیٰ سے اپنے بعد اپنے صحابہ کے اختلاف کے بارے میں پوچھا تو رب نے فرمایا اے محمد ﷺ آپ کے صحابہ میرے نزدیک آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں۔ بعض بعض سے نورانیت میں کم وبیش ہیں پر سب نوری تو ہیں تو جو ان کے اختلافات میں جس کی بھی اقتداء کرے میرے نزدیک ہدایت پر ہے"۔ (مشکوٰۃ شریف، ص ۵۵۴)

سبحان اللہ! قرآن موجود ہے، حدیث موجود ہے، خود صاحب قرآن ﷺ نے پردہ فرمایا ہے، اور آسمان ہدایت کے ثوابت وسیارے تو موجود ہیں تو ربانی ہدایت ہوتی ہے بايهم اقتديتم اهتديتم اور آپ پوچھتے ہیں کہ کسی کی تقلید کی کیا ضرورت؟ کیا سمجھتے ہیں؟ اب میں آپ کو کیا بتاؤں شفیق جونپوری مرحوم نے کیا خوب فرمایا ۔

خبیث روحیں اندھیرے جنگل میں سرخ شعلوں سے کھیلتی ہیں　　چلا ہے بھٹکا ہوا مسافر کہ اس طرف روشنی ملے گی

انما اشكوا بثي و حزني الى الله

(۳) ایک روایت سنیے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ امام حدیث سلیمان اعمش کے پاس تھے ان سے کسی نے چند مسئلے پوچھے، انھوں نے امام صاحب سے کہا، ان مسائل کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ آپ نے تمام مسئلوں کا جواب دے دیا، امام اعمش نے پوچھا کہاں سے آپ نے جواب دیا؟ آپ نے انہیں حدیثوں کو پڑھا جو اس سے پہلے امام اعمش سے سن چکے تھے کہ فلاں حدیث سے میں مسئلہ اخذ کیا ہے اور فلاں سے فلاں۔ حضرت اعمش بے اختیار بول اٹھے كفاك ماحدثتني في مائة يوم حدثتني في ساعة ايها الفقهاء انتم الاطباء و نحن الصيادلة۔ بس بس ابوحنیفہ جتنی حدیثیں میں نے تم سے سو دن میں بیان کی تھیں تم نے ان سب کو ایک گھنٹہ میں سنادیا۔ اے فقیہو تم طبیب ہو اور ہم محدثین عطار ہیں۔

اس سے آپ کو فقہاء ومحدثین ومفسرین کا فرق واضح ہو گیا ہوگا، مجتہدین کو حدیث کی مہارت اور تفسیر کی معرفت کے ساتھ ساتھ استنباط وقیاس و تخریج میں بھی ماہر ہونا چاہیے، مفسرین ومحدثین کو اس کی ضرورت نہیں۔

مفسرین ومحدثین کی حالت کا اس بات سے اندازہ لگایئے کہ قرآن عظیم میں طلاق کی عدت کا بیان ان الفاظ میں ہے والمطلقت يتربصن بانفسهن ثلثة قروء جن عورتوں کو طلاق دی گئیں وہ اپنی مدت تین قروء تک گزاریں۔

لغت میں قرء کا معنی حیض بھی ہے اور طہر بھی، امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت میں قروء کے معنی حیض قرار دیے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے قروء کے معنی طہر مقرر کیے، مفسرین چاہے حنفی ہوں یا شافعی، انھوں نے اس سلسلے میں کوئی تحقیق نہیں پیش کی۔ شافعی مفسر نے امام شافعی کا قول طہر لکھ دیا اور حنفی مفسر نے اپنے امام کا مذہب حیض لکھ دیا، وجہ یہی ہے کہ ان کے پاس مدد اجتہاد نہیں تھا، اور ان مذاہب کے پھیلنے کے لیے کسی قسم کی کونسنگ اور پروپیگنڈہ کی ضرورت نہیں ہوئی، مفسرین نے اور محدثین نے اپنی پسند اور ذاتی ترجیح پر ان مذاہب کو اختیار کیا، امام عبداللہ ابن مبارک جو امیر المومنین فی الحدیث کہے جاتے ہیں حضرت امام اعظم کے مقلد تھے اور انہی کے موافق فتوی دیتے تھے، آپ کی مدح میں فرماتے ہیں

لقد زان البلاد و من عليها　　امام المسلمين ابو حنيفه
باحكام و آثار و فقه　　كآيات الزبور على الصحيفة
فمافي المشرقين له نظير　　ولا في المغربين و لا بكوفة

ترجمہ: شہر اور اس کے بسنے والوں کو زینت دی مسلمانوں کے امام ابوحنیفہ نے، احکام اور آثار اور فقہ سے، جیسے کہ زبور کی آیتیں کتاب کے صفحہ پر، تو مشرقین میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، نہ مغربین میں نہ کوفہ میں۔

حضرت مسعر ابن کدام جو مشہور عارف باللہ ہیں فرماتے ہیں:

حسبی من الخیرات ما اعددته. یوم القیامة فی رضا الرحمن
دین النبی محمد خیر الوریٰ. ثم اعتقادی بمذھب النعمان

ترجمہ: جن نیکیوں کو میں نے جمع کیا ہے قیامت کے دن خدا کی رضا کے لئے وہ مجھے کافی ہیں، محمد خیر الوریٰ ﷺ کا دین اور اس کے بعد امام ابوحنیفہ کے مذہب کا اعتقاد۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی شہادت سنیے "اصحاب تخریج جو تھے وہ تخریج کرتے اور اجتہاد فی المذہب کرتے، اور یہ حضرات ان میں سے کسی ایک کے مذہب کی طرف منسوب ہوتے۔ چنانچہ کہا جاتا فلاں شافعی ہیں اور فلاں حنفی۔ اور گاہے ایک محدث بھی کسی ایک مذہب کی طرف منسوب ہوتا، اس لیے کہ وہ کثیر مسائل میں اس کی موافقت کرتا مثلاً امام نسائی اور بیہقی کو شافعی کی طرف منسوب کیا جاتا اور میں کہتا ہوں کہ امام طحاوی رضی اللہ عنہ جو امام مزنی شاگرد شافعی کے بھانجے تھے، امام صاحب کی طرف نسبت کر کے حنفی کہتے ہیں، اسی طرح سے مفسرین میں قاضی بیضاوی اور خازن وغیرہ شافعی کہے جاتے ہیں اور امام نسفی اور زمخشری حنفی، اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ اب کسی سوال وجواب کے لئے باقی نہیں رہ گیا، یہ تو اسلام کی ایک محقق تاریخ ہے کہ محدثین اور مفسرین اپنے موضوع میں ماہر ہونے کے بعد بھی ائمہ کی تقلید کرتے تھے۔

(۴) تقلید اور اجتہاد کو اتحاد اور افتراق سے بالذات کوئی علاقہ نہیں، اس کے اسباب وعوامل ہی کچھ دوسرے ہوتے ہیں۔ دیکھیے شاہ ولی اللہ صاحب کی تحقیق میں چوتھی صدی ہجری تک امت میں تقلید کا رواج نہیں تھا، آپ تحریر فرماتے ہیں۔

واضح رہے کہ چوتھی صدی ہجری کے پہلے تک ایک خاص مذہب اور ایک خاص مذہب کی تقلید پر لوگوں کا اجماع نہیں تھا۔ قوت القلوب میں ابوطالب مکی فرماتے ہیں کہ کتب اور مجموعے بعد کی پیداوار ہیں، لوگوں کے اقوال پر حکم دینا اور لوگوں میں سے کسی ایک کے مذہب پر فتوی دینا، ایک قول کا پابند ہونا، اور ہر چیز میں اُسے ہی نقل کرنا اور ایک مذہب پر تحقیق وتفقہ کرنا قدیم لوگوں یعنی قرن اول اور قرن ثانی میں نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں قرن اول اور قرن ثانی کے بعد کچھ تخریجات شروع ہوئیں۔ مگر چوتھی صدی کے لوگ ایک مذہب کی تقلید خالص اور اس کی تحقیق و تفقہ پر متفق نہیں ہوئے تھے، جیسا کہ تتبع سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

جی چاہے صاحب قوت القلوب کی وضاحت کے موافق دو صدی کی مقدار مقرر کریں چاہے شاہ ولی اللہ صاحب کے تتبع کے موافق چار صدی ہجری تک طول دیں، اس زمانے میں قابل اعتراض تقلید کا وجود ہی نہیں تھا، براہ راست قرآن وحدیث سے ہی اکتساب فیض ہوتا تھا، تو ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ اس دوران میں کسی قسم کا افتراق نہ ہو لیکن اگر آپ دو ہجری تک ہی اس کی مدت مانیں تب بھی مندرجہ ذیل عالم آشوب، ہنگامہ خیز، طوفان انگیز، خون ریز، عرصہ رستاخیز قائم ہوئے اور گروپ اور گروہ وجود میں آئے جس میں طرفین مسلمان ہی تھے۔

(۱) فتنہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ (۲) جنگ جمل وجنگ صفین (۳) مقابلہ نہروان (۴) عالم آشوب کربلا (۵) بنوامیہ وبنوعباس کی جنگیں، پورا عالم اسلام وقفہ وقفہ سے فتنہ وفساد کی چکی میں پستا رہا، تقلید تو اس وقت تک شائع وذائع ہی نہیں ہوئی تھی کہ اس کو ان خونریزیوں اور بردہ سازیوں کی علت قرار دی جائے، تو کہیں ہر کس وناکس کے قرآن وحدیث سے براہ راست ہدایت طلبی کے آزار نے اسلام اور مسلمانوں کو اس نوبت تک تو نہیں پہنچایا، اگر آپ چاہیں تو اس براہ راست ہدایت طلبی کی دو ایک مثالیں پیش کروں

"میدان کربلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آرا ہونے کا استدلال اس حدیث سے تھا اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخرۃ جب دو خلیفوں کے لئے بیعت کر لی جائے تو آخری والے کو قتل کر دو"۔ (مشکوۃ شریف، ص ۳۲۰)

اور نہروان کے خارجی حضرت مولی المسلمین علی کرم اللہ وجہہ کو قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر کافر کہتے اور ان کے ساتھ جہاد جائز قرار دیتے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان الحکم الا للہ حکم تو خدا ہی کے لئے ہے اور مولی نے انسانوں کو اپنے معاملہ کا حکم بنایا۔ پس فرمایئے کہ یہ افتراق تقلید کا تو نتیجہ ہے نہیں، کہیں براہ راست ہر خاص وعام کے قرآن سے ہدایت کا خمیازہ تو نہیں؟

یہ کیسا امتحان جذب دل الٹا نکل آیا ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

اس کے بعد تقلید کا دور آیا اور تمام عالم اسلام میں ائمہ کی تقلید کرنے والے ہی رہ گئے۔ حجاز، یمن، مصر، شام، عراق، حلب، عرب و عجم میں امام شافعی کے مقلدین کی کثرت ہوئی۔ مغربی ممالک مراکش اندلس میں امام مالک کے مقلدین کی کثرت ہوئی اور روم، سندھ، ماوراء النہر اور افغان وغیرہ میں امام اعظم کے مقلدین کی کثرت ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ ان مختلف مذاہب میں باہم بحث و مناظرہ، حجت و تکرار اور تقریر و تحریر میں ایک دوسرے کے خلاف زور آزمائی ہوتی رہی مگر اس کا اثر جو دنیا کے سامنے ہے یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ابن تیمیہ حرانی ظہور پذیر ہوئے اور انھوں نے تقلید کو شرک قرار دیا اور ندائے غیر اللہ کو غیر خدا کی پوجا بتایا۔ اہل تصوف کے خلاف ان کے زاویوں اور خانقاہوں میں جا کر جہاد بالسیف بھی کیا اور مختلف مسائل فرعیہ میں ان کے تفردات سے پورے عالم اسلام میں ایک ہلچل مچ گئی۔ تو بادشاہ وقت نے مناظرہ کی مجلسیں مقرر کیں، صورتحال یہ ہوئی کہ سارے مقلدین کا ایک کامن پلیٹ فارم بنا اور تنہا ابن تیمیہ صاحب ان کی مخالفت میں صف آرا رہے۔

ایک مناظرہ کا حال سنیے جس کو مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب ''نظام تعلیم و تربیت'' میں بیان کیا۔ مقلدین کی طرف سے حضرت شیخ سراج ہندی مناظر مقرر ہوئے اور شیخ ابن تیمیہ سے کلام شروع ہوا، آخر میں شیخ ابن تیمیہ کی یہ حالت ہوئی کہ شیخ سراج ہندی کو کہنا پڑا: ابن تیمیہ **مااراک کالعصفور اذا اردت ان آخذک ترتد من غصن الی غصن آخر۔** اے ابن تیمیہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم پھدکنے والے گوریا ہو گئے ہو جب میں ایک ڈال پر پکڑنا چاہتا ہوں تو تم دوسری ڈال پر پھدک جاتے ہو۔ آخر کار بادشاہ نے جس کے دربار میں مناظرہ ہوا تھا انہیں قید میں نظر بند کر دیا اور فتوی دینے سے روک دیا، بار بار ایسے ہی ہوا، آپ کی تحریک اینٹی تقلید ناکام ہوئی اور آپ نامراد زندگی گزار کر قید میں ہی انتقال کر گئے۔

اب مجھے بتایا جائے تقلید کی برکت سے سارے مذاہب اربعہ کے مقلدین تو یک موقف پر قائم ہوئے تو فرقہ کون ہوا؟ پورے عالم اسلام میں ان سب سے الگ ہٹ کر ایک نیا من ذوق کس نے دیا؟ یہ تقلید ہی کی برکت تھی کہ تمام بحث و مباحثہ اور اختلاف و تکرار کے باوجود تمام مقلدین نے خاص حرم کعبہ میں اپنے اپنے مصلے بچھائے اور اپنے طور پر نمازیں پڑھیں اور دنیا کو ایک شعور دیتے رہے کہ مسلمان ظاہری اختلاف کے باوجود ایک قوم اور ایک گروہ ہیں۔

ابن تیمیہ نے اپنی تحریک توسل اور استمداد بغیر اللہ کے خلاف بھی جاری رکھی تھی، اس پر جامع ازہر کے شیخ جاد الحق نے ایک تبصرہ فرمایا

وان کان المراد بسبب ذاته او بسبب منزلته من الله و جاهه عنده فهذا هو الذی اصطدم الخلاف حوله بین العلماء ففریق ینکره لان مجرد الجاه لا یعطی شفاعته و علی راس هذا الفریق ابن تیمیه و قد الف فی ذالک رسالة حاول فیها ان یرد ما جاء عن الصحابة فی جوازه اما بالطعن فی السند بالضعف او الوقف علی الصحابة او علی من لیس قوله و فعله حجة و اما بالتاویل (بیان للناس، ص ۸۲)

ترجمہ اگر مراد یہ ہے کہ رسول اللہ کی ذات اور ان کے مرتبے اور ان کی قدر کی وجہ سے جو خدا کے نزدیک ہے شفاعت ہو سکتی ہے کہ نہیں تو یہ مسئلہ وہ ہے کہ جس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک فریق اس کا انکار کرتا ہے کیوں کہ اس کے نزدیک صرف مرتبہ شفاعت کا سبب نہیں اور اس جماعت کے سرے پر ابن تیمیہ حضرات ہیں، اس نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جس میں اس بات کا رد کرنا چاہا جو صحابہ کرام سے اس کے جواز میں منقول ہے تو کسی سند پر ضعف کا اعتراض کیا، کسی کو صحابہ پر موقوف کیا یا ایسی ذات پر موقوف مانا جس کا قول و فعل حجت نہیں یا اس میں کوئی تاویل کی۔

(۱) میری گزارش ہے کہ جب عہد رسالت سے ہی فتوی پوچھنے والوں اور بتانے والوں دونوں کی جماعت کا وجود رہا اور یہ تسلسل پیہم قائم رہا تو سات صدیوں کے بعد کسی ایک فرد کو کیسے یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ فتوی پوچھ کر عمل کرنے والوں کو مشرک قرار دے۔

(۲) صحابہ کرام سے شفاعت بالوجاہت کا جواز ثابت، اور اس پر سات صدیوں تک امت اجابت مضبوطی سے قائم رہی تو جناب ابن تیمیہ کو سات سو سال کے بعد کیسے یہ حق مل گیا کہ اسلاف اکمل سے ان روایتوں کا انکار کریں۔

"علماء کی ذمہ داری ہے کہ ہر مسئلہ کو قرآن وحدیث کے معیار پر پرکھیں، اگر کسی امام یا جید عالم دین کا قول بھی قرآن وسنت سے متصادم ہو تو اس کو چھوڑ دیں اور اسی حکم پر عمل کریں جو قرآن وسنت کے عین موافق ہو"

مولانا ظل الرحمن تیمی☆

تقلید کی حقیقت کو جاننے کے لیے اس کی لغوی واصطلاحی تعریف اور تاریخی تناظر میں اس کے فروغ اور رائج ہونے کے تعلق کو جاننا ضروری ہے۔

تقلید کے لغوی معنی: لغت میں تقلید کا معنی گلے میں کسی چیز کا لٹکانا ہے۔ لیکن جب اس کا صلہ لفظ دین کے ساتھ آئے یا دین کے مفہوم میں ہو تو اس وقت اس کا معنی کسی بات کو بغیر دلیل اور غور وفکر کے قبول کرنا ہے۔ صاحب المنجد نے لکھا ہے "قلده في كذا أي تبعهٔ من غير تامل و لا نظر" (المنجد عربی ص ۶۵۹) یعنی تقلید اس پیروی کا نام ہے جو غور وخوض سے خالی ہو۔

اصطلاحی تعریف: علامہ حسین احمد الخطیب مصری نے تقلید کی تعریف یوں کی ہے۔ "دلیل کے بغیر کسی قول کو تسلیم کیا جائے اور دوسرے کے مسلک کو اس کی دلیل معلوم کیے بغیر اختیار کیا جائے۔" (فقہ الاسلام ص ۵۰۷)

علامہ حسن شرنبلالی حقیقت تقلید کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں العمل بقول من ليس قوله احدى الحجج الاربعة الشرعية بلا حجة فليس الرجوع الى النبي صلى الله عليه وسلم والاجماع من التقليد لأن كلا منهما، حجة شرعية من الحجج الشرعية و على هذا اقتصد الكمال في تحريره وقال ابن امير الحاج و على هذا عمل العامي بقول المفتي وعمل القاضي بقول العدول لأن كلا منها وان لم يكن احدى الحجج فليس العمل به بلا حجة شرعية لا يجاب النظر أحد العامي بقول المفتي واحد القاضي بقول العدول (جمع الجوامع ص ۲۵۱)

یعنی تقلید کا اصل ایسے شخص کی بات پر عمل کرنا ہے، جس کا قول چاروں شرعی حجتوں (کتاب وسنت، اجتہاد اور قیاس) پر مبنی نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع کی طرف رجوع کرنا تقلید نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں حجت شرعیہ میں سے ہیں۔ علامہ کمال نے اپنی کتاب "تحریر" میں اور ابن امیر الحاج نے فرمایا کہ جاہل کا مفتی کے قول اور قاضی کا ثقہ کے قول پر عمل کرنا تقلید نہیں، کیوں کہ اگر یہ شرعی حجت میں سے نہ ہو تو اس پر عمل کرنا درست نہیں"۔

معلوم یہ ہوا کہ اگر ہم قرآن وحدیث کے مطابق زندگی گزاریں یا کوئی ایسا مسئلہ درپیش آ گیا، جس کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی واضح نص موجود نہیں ہے اور ہم اس سلسلے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اجتہاد وقیاس کریں تو یہ اتباع ہے، تقلید نہیں۔ یہی شریعت اسلامی میں ہم سے مطلوب ہے۔ جبکہ تقلید یہ ہے کہ ہم کسی ایک امام کے اقوال وآراء کے مابین اپنے آپ کو محدود کر لیں، انہوں نے شریعت کو جس انداز سے سمجھا ہے، ہم بھی من وعن اسی طرح سمجھیں۔ ان کے اقوال وافعال کو قرآن وسنت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی کوشش کی جائے گرچہ باطل تاویلات کا ہی سہارا کیوں نہ لینا پڑے، حالانکہ تمام ائمہ کرام اور سلف صالحین نے ایسی تقلید سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ امام اعظم حضرت ابوحنیفہ سے کسی شاگرد نے پوچھا کہ اگر آپ کا فتویٰ کتاب اللہ یا سنت رسول کے خلاف ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ تو آپ نے جواب فرمایا

اذا قلت قولا و كتاب الله يخالفهٔ قال اتر كو اقولي لكتاب الله فقيل اذا كان خبر رسول الله صلى الله عليه وسلم يخالفهٔ قال اتر كو اقولي لخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم فقيل اذا كان قول الصحابة يخالفهٔ قال اتر كوا قولي لقول الصحابة (المختصر المؤمل ص:۳۸)

یعنی جب میرا قول کتاب اللہ، سنت رسول یا قول صحابہ کے خلاف ہو تو میرے فتوے کو چھوڑ دو اور کتاب وسنت اور قول صحابہ پر عمل کرو۔

اسی طرح حضرت امام مالک سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں:

انما انا بشر اخطئ واصيب فانظروا في قولي فكل ما وافق الكتاب والسنة فخذوا به وما لا يوافق الكتاب والسنة فاتركوه (اعلام الموقعين ص ۶۳) یعنی میں بشر ہوں، مجھ سے غلطی اور درستی دونوں کا احتمال ہے، میری ہر ایک بات کی تحقیق کیا کرو، جو

☆Editor Tooba Monthly, Kucha Chelan Darya Ganj New Delhi

کتاب وسنت کے موافق ہواس پر عمل کرلیا کرو اور جو مخالف ہو اس کو رد کردیا کرو۔

گویا ہماری امت کے علماء کی ذمہ داری ہے کہ ہر مسئلہ کو قرآن وحدیث کے معیار پر پرکھیں۔ اگر کسی امام یا جید عالم دین کا قول بھی قرآن و سنت سے متصادم ہو تو اس کو چھوڑ دیں اور اسی حکم پر عمل کریں جو قرآن وسنت کے عین موافق ہو۔ جہاں تک اس امت کے کم پڑھے لکھے اور جاہل حضرات کا تعلق ہے تو انہیں (فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون) کے مطابق علماء کرام سے رجوع کرنا چاہیے اور علماء کرام انہیں خاص ایک امام کی فقہ اور فتاویٰ سے مسائل بتانے کے بجائے قرآن وحدیث کی روشنی میں تمام مسائل کا حل بتائیں۔ تقریباً چوتھی صدی عیسوی کے آغاز تک یہی طریقہ رائج تھا۔ اس وقت تک کسی ایک امام کی پیروی کا چلن نہیں ہوا تھا اور ہر شخص کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی خاص ایک امام کی تقلید کی بجائے قرآن وحدیث کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔

● جب ہم تاریخ اسلامی کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام، تابعین عظام، تبع تابعین اور محدثین و مفسرین مقلد نہیں تھے، بلکہ وہ لوگ قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس کی روشنی میں زندگی گزارتے تھے (۲)۔ یعنی جب کوئی مسئلہ پیش آجاتا تھا تو سب سے پہلے قرآن مجید میں اس کا حل تلاش کرتے تھے، اگر وہاں مل جاتا تو اس پر عمل کرتے ورنہ پھر احادیث نبویہ میں اس کا حکم ڈھونڈتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے اور وہاں بھی اس کا حل نہیں ملتا تھا تو پھر اجماع کی طرف رجوع کرتے تھے اور اگر اس مسئلہ میں کوئی اجماع بھی موجود نہیں ہوتا تھا تو پھر اجتہاد اور قیاس کا سہارا لے کر اس سلسلے میں حکم تلاش کرتے تھے۔

تاریخ اسلامی ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کرام سرور کائنات علیہ التحیات والصلوٰت کو جیسے کرتے دیکھتے یا آپ کسی معاملے میں فتویٰ یا کسی سوال کا جواب دیتے تو اسے حضرت کے اصحاب سنتے اور یاد رکھتے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ جب آنحضرت ﷺ کا زمانہ گزر گیا اور صحابہ کرام کا دور آیا، تب انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں اپنی دیکھی ہوئی سنی ہوئی باتوں پر خود عمل کیا اور اگر کوئی نیا مسئلہ کسی صحابی کو پیش آگیا تو اوروں سے پوچھ لیا، اگر کسی بات میں کوئی حکم صریح کتاب وسنت سے نہ ملا تو منصوصات کتاب وسنت پر غور کیا اور اس کی علت کو دریافت کر کے اسی پر پیش آئے ہوئے معاملے کو قیاس کیا اور اگر کوئی مسئلہ مشکل ہوا تو آپس میں صلاح ومشورہ کر کے اس کو طے کریں۔

صحابہ کے زمانہ میں جو لوگ نئے پیدا ہوئے یا نئے ایمان لائے انہوں نے صحابہ سے اسی طور پر علم دین حاصل کیا، جس طرح صحابہ نے آنحضرت سے سیکھا تھا۔ یعنی جس صحابی کو پایا اور اسے فقیہ جانا، اس سے مسائل شریعت کو اخذ کیا اور احادیث نبوی کو سیکھا، تابعین کے بعد تبع تابعین کا دور آیا وہ بھی اسی طور سے اپنے شہر کے مشہور اور نامی فقیہ سے مسائل دریافت کرتے۔ وہ انہیں قرآن وحدیث کے مطابق مسائل کا حل بتاتے تھے۔ اس دور میں ہر شہر کا ایک علیحدہ امام اور ہر مقام کا ایک خاص عالم اور فقیہ تھا، جو لوگ اس کی باتوں کو مانتے یا اس کے فتووں پر عمل کرتے یا اس کی سند سے احادیث کو روایت کرتے وہ اس کی طرف منسوب ہوتے اور اس عالم کے مذہب پر چلنے والے کہلاتے۔

جب ہم صحابۂ کرام، تابعین وتبع تابعین اور محدثین ومفسرین کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے سختی کے ساتھ تقلید کی مخالفت کی اور کسی ایک امام کی پیروی کے بجائے کتاب وسنت کو گلے لگائے رکھنے کی تلقین کی۔

حضرت ابوبکر صدیق فرماتے ہیں ان اطعت الله ورسوله فاطيعوني وان عصيت الله ورسوله فاقيموني "(تاریخ الخلفاء ص ۱۸۰) یعنی اگر میں اللہ ورسول اللہ کی اطاعت کروں تو میری پیروی کرو، ورنہ میری صلاح کردیا کرو۔ اسی طرح کے اقوال حضرت عمر بن الخطاب (اعلام الموقعین ۳۵) حضرت عبداللہ ابن مسعود (اعلام الموقعین ۱۷۴) حضرت عبداللہ بن عباس (دارمی ص ۵۳) حضرت معاذ بن جبل (اعلام الموقعین ۴۹،۱) حضرت علی بن ابی طالب (اعلام، ج ۱ ص ۵۰) حضرت عروۃ بن زبیر (دارمی ج ص ۴۷) حضرت مسروق بن اجدع (ایقاظ ص ۱۴) محمد بن سیرین (ایقاظ ص ۱۵) قاضی شریح (اعلام ج ۱ ص ۲۲۳) امام زہری (اعلام ص ۱ ۲۵) امام حسن بصری، امام شعبی، حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام اوزاعی، حضرت ابووائل شقیق وغیرہ سے مروی ہیں۔ جو اس امت کے اجلہ محدثین، مفسرین اور فقہاء میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان حضرات نے کسی خاص ایک امام کی تقلید سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے "مقلدین ائمہ کی عدالت میں"

مؤلف ابوانس محمد یحییٰ گوندلوی ص:۳۷ تا ص:۴۷)

● کتاب وسنت کے رہتے ہوئے تقلید کی کوئی ضرورت نہیں ہے- پیش آمدہ تمام مسائل میں کتاب وسنت سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے- اللہ رب العالمین کا ارشاد گرامی ہے یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول - یعنی اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اللہ کے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو- اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو- اس آیت میں اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اولی الامر کی اطاعت کو اللہ اور رسول کے تابع کر کے بیان کیا گیا ہے- یعنی جب تک اولی الامر کتاب وسنت کے دامن کو مضبوطی سے تھام کر اس کی روشنی میں کوئی حکم صادر فرمائیں تو اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہے- اس کے بعد بتایا گیا کہ اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا جائے-

صحابہ کرام میں جب کسی معاملہ میں اختلاف ہو جاتا تو وہ کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے اور جب انہیں کتاب وسنت کی دلیل مل جاتی تو کسی ایک کو بھی اختلاف نہ رہتا- سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کا معاملہ نیز مدفن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور وراثت نبوی کا معاملہ بھی اس وقت ختم ہوئے، جب صدیق الامۃ حضرت ابوبکر نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان فرمائیں-

جہاں تک جاہل اور ان پڑھ لوگوں یا ایسے کم پڑھے لکھے لوگوں کا معاملہ ہے جو قرآن وحدیث سے استفادہ کی قدرت نہیں رکھتے تو ان کو چاہیے کہ وہ "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" کے تحت علماء کرام سے رجوع کریں اور علماء انہیں قرآن وحدیث کے مطابق رہنمائی فرمائیں- بعض حضرات بڑے شد ومد کے ساتھ یہ بات اٹھاتے ہیں کہ ایسے کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے" تو کیا یہ حضرات تقلید کے لیے فقہ کی کتابوں اور ائمہ کرام کی تحریروں کو سمجھنے کے لائق ہیں؟ اگر نہیں؟ اور اس صورت میں بھی انہیں علماء ہی سے رجوع کرنا ہوگا تو وہ علماء سے یہ یوں نہ کہیں کہ انہیں قرآن وحدیث کے مطابق رہنمائی کی جائے تاکہ اگر صاحب سے کوئی اجتہادی غلطی ہوگئی ہو تو وہ اس کو دہرانے سے بچ جائیں- ☆☆

> **"امت کا بنیادی مرض عدم اتحاد ہے، لیکن اسے مسئلہ تقلید سے جوڑنا درست نہیں، جو لوگ تقلید کو انتشار امت کا باعث سمجھتے ہیں وہ بتائیں کہ جب تقلید کا باضابطہ تصور نہیں تھا اس وقت امت منتشر کیوں ہوئی؟"**
>
> **مولانا وارث مظہری☆**

اجتہاد وتقلید کی بحث قدیم ہے اور پچھلے ہزار سالوں میں اکابر علماء نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس کے تمام اہم اور اصولی وعلمی پہلوؤں کا حاطہ کیا ہے- بنیادی طور پر ان پر نگاہ ڈالنی چاہیے- موجودہ تقاضوں کے نام پر اجتہاد کے حوالے سے تقلید کو جن پہلوؤں سے موضوع بحث یا مورد عتاب بنایا گیا ہے، اس میں دخل اس فکری آزادی کا زیادہ ہے، جو مذہب کی فکری تحریکات کے زیر اثر اسلام کی متوارث فکر میں نقب لگانا چاہتی ہے، اگرچہ ہمارے علمی حلقوں کی کوتاہی فکر وعمل بھی ایک حد تک اس کی ذمہ دار ہے-

قرآن وحدیث میں تقلید کی بنیادیں موجود ہیں فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون اور اللہ کے رسول نے فرمایا "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین من بعدی" نیز اقتدوا باللذین من بعدیابی بکر و عمر-" صحابہ میں بعض مفتی تھے اور بعض مستفتی، یہ ایک معلوم حقیقت ہے- حضرت عمر سے ثابت ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ "اے ابوبکر! ہماری رائے آپ کی رائے کے تابع" (رأینا تبع لرأیک) کلالہ کے معاملے میں حضرت عمر نے فرمایا کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں ابوبکر کے قول کی مخالفت کروں (انی لا ستحیی من اللہ ان أخالف أبابکر) عہد نبوت سے تیسری صدی تک تقلید مختلف شکلوں میں جاری رہی- تیسری صدی میں تقلید شخصی کی شکل میں تقلید کی عملی ونظریاتی تنظیم اسی کا امتداد تھی-

تقلید عامی کی ضرورت، درعام کی مصلحت میں شامل ہے- وہ نہ تو واجب ہے اور نہ فرض، تقلید یقیناً صرف قرآن وسنت کی ہی مطلوب

ہے۔ متعین امام کی تقلید اسی معنی میں ہے یا ہونی چاہیے کہ وہ کتاب وسنت کے صحیح احکام تک رسائی کا ذریعہ ہیں، اس لیے اگر کوئی فقہی رائے صحیح ومستند حدیث کے خلاف ہو تو ہم اسی لمحے اس رائے کو ترک کر دیں گے۔ خود ائمہ اور دوسرے اہل علم سے اس نوع کے اقوال مروی ہیں۔ تقلید کا یہ رویہ جس کے تحت امام کو آخری حجت قرار دیا جائے بلاشبہ مذموم ہے۔

جو لوگ تقلید کا انکار اور اس کی مذمت کے قائل ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی معروف معنوں میں پورے طور پر تقلید کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اگرچہ متقدمین کی بجائے متاخرین کی تقلید کا۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ وہ ایک پانچویں مسلک کے متبعین ہیں۔ بلا واسطہ قرآن وسنت کی اتباع کا ان کا دعوی دلیل کا محتاج ہے۔ ہر کوئی امام داود ظاہری، ابن حزم اور شوکانی نہیں بن سکتا، ویسے عموماً جن شخصیات کے اقوال وآراء پر وہ اپنے عدم تقلید کے رویے میں اعتماد کرتے ہیں، وہ بجائے خود مقلد تھیں، انہوں نے کبھی اجتہاد وامامت کا دعوی نہیں کیا۔

حضرات مفسرین ومحدثین کی بڑی تعداد یقینا مقلد تھی، مجتہد نہ تھی، حوالوں سے بات طویل ہو جائے گی۔ ان میں سے بعض خواہ مقلد نہ ہوں لیکن استنباط مسائل میں ان کی فہم کی بنیاد بھی خود اختراعی نہ تھی۔ وہ بھی اصولی طور پر فقہاء ومجتہدین کی ہی تشکیل کاوش کا ثمرہ تھی۔ محدثین بنیادی طور پر روایت کے امام تھے نہ تو انہوں نے درایت کو اپنا موضوع بنایا اور نہ ہی یہ بات ان کی مصلحت میں تھی۔ روایت پر ارتکاز درایت میں مانع نہیں لیکن روایت کی اپنی نزاکتوں کے ساتھ درایت اور تفقہ کی تمام تر اصولی نزاکتوں کو نبھانا محال تو نہیں، تاہم مشکل ترین ضرور ہے۔ اس لیے محدثین نے دوسرے معاملے میں یا تو مجتہدین پر اعتماد کیا یا پھر اپنے اجتہاد واستنباط کو خود اپنی حد تک محدود رکھا۔ کیا اس سے محدثین کے پیروکار بھی پیدا نہیں ہوئے۔ لیکن اس سے یقینا ان کی حیثیت کم نہیں ہوتی۔ یہ تقسیم کار ہے، حقیقی فرق نہیں۔ امت ان محدثین ومفسرین کی بھی اسی طرح مرہون احسان ہے، جس طرح ائمہ مجتہدین کی۔ وہ روایت کے معاملے میں محدثین پر اعتماد کرتی ہے اور درایت کے معاملے میں ائمہ مجتہدین پر۔

جہاں تک اتحاد امت کو تقلید وعدم تقلید سے وابستہ کر کے دیکھنے کی بات ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کا باضابطہ تعلق امت کے اتحاد وانتشار کے رویے سے نہیں ہے۔ امت کی تقریباً 99% فی صد آبادی مقلد ہے۔ لیکن پورے طور پر یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ امت کا بنیادی مرض عدم اتحاد ہے اور یہی تمام مسائل کی جڑ ہے۔ دراصل اتحاد یا عدم اتحاد کا تعلق انسان کے خارجی سماجی رویے سے ہے۔ آپ مغرب کے موجودہ اتحاد اور اسلام کے دور اول میں بھی سیاسی وسماجی انتشار کی تاریخی حقیقت کو سامنے رکھ کر اس پر غور کر سکتے ہیں۔ تاہم تقلید اجتماعی تنظیم کی ایک شکل ہے یا ہو سکتی ہے۔ اس کا مقابل عملی نہ کہ اصولی سطح پر، ممکنہ انتشار کا ذریعہ۔ مذکورہ بالا باتوں سے امت کو تقلید سے حاصل ہونے والے فوائد ونقصان کی کسی قدر وضاحت ہو جاتی ہے، تاہم اس حوالے سے میں مزید مختصراً اپنے موقف کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

اقبال نے شاعرانہ انداز میں یہ حقیقت پسندانہ بات کہی ہے کہ

زاجتہاد عالمان کم نظر   اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

تاہم یہ بات بجائے خود دلیل کی محتاج ہے کہ کیا چوتھی صدی کے بعد امت میں، عالمان کم نظر ہی پیدا ہوتے رہے؟ فکر اسلامی کی تاریخ اس کی منکر ہے۔ اقبال نے دوسری جگہ خود اپنے اس نظریے سے تقریباً رجوع کر لیا تھا (دیکھیے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کا چھٹا خطبہ الاجتہاد فی الاسلام) یہ ایک مستقل بحث کا موضوع ہے، جس پر لکھا جا رہا ہے اور لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ میری نظر میں مقاصد شریعت کو سامنے رکھ کر اصول فقہ کو مزید وسعت اور ترقی نہ دیے جانے اور اجتہاد کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کو بہت حد تک نظر انداز کر دیے جانے کی وجہ سے دور متاخر میں فقہ میں ایک قسم کا جمود آ گیا۔ شاہ ولی اللہ جیسی شخصیت اس کی شدید ترین شاکی نظر آتی ہے۔ بلاشبہ اس فقہی جمود سے امت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ کوئی عہد وسطی کے فقہی جزئیات سے بھی انحراف کو دین سے انحراف تصور کیے بیٹھے ہیں۔

میری نظر میں معذرت کے ساتھ علماء ومشائخ کے ایک بڑے طبقے نے شخصیت پرستی کو کتاب وسنت کے اتباع کا نام دے رکھا ہے۔ جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ **ما انزل الله به من سلطان**۔

☆☆☆☆

''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تقلید کی بحث سے امت میں انتشار پیدا ہوگا، ہمارے لیے بہت سے ضروری کام پڑے ہوئے ہیں، جیسے تعلیم، فقر وفاقہ اور غربت کا ازالہ اور مشترک امور و مسائل میں مسلمانوں کو متحد کرنا وغیرہ''

———— مولانا شفیع مونس☆

جناب مولانا خوشتر نورانی صاحب المحترم و مکرم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   آپ کا خط مورخہ ۲۱ فروری ۲۰۰۷ پیش نظر ہے، جس میں آپ نے اپنے رسالہ جام نور کے خاص شمارہ ''اجتہاد و تقلید نمبر'' کے لیے بعض سوالات کے جواب طلب فرمائے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس وقت ملت اسلامیہ داخلی اور خارجی سطح پر جس طرح کے مسائل اور آزمائشوں سے دوچار ہے، اس میں اس نوعیت کے مسائل کو چھیڑنا ان کے وقت کا کوئی صحیح اور بہتر مصرف نہیں ہے۔ اس کے ردعمل میں ایک نامناسب جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے، جو ملت کے مفاد میں نہیں ہوگا———— آپ کے سوالوں کا مختصر جواب درج ذیل ہے

(۱) تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عام مسلمانوں کی ضرورت ہے، جن کی نظر کتاب وسنت اور اسرار و مقاصد شریعت پر نہیں ہے۔ البتہ علما، جن کی کتاب وسنت پر نظر ہو ان کے لیے یہ ضروری نہیں۔ کسی مسئلہ میں کوئی عالم جب شرعی دلائل کا جائزہ لے اور اس کے سامنے فی الواقع حق واضح ہو جائے تو اس صورت میں اس کے خلاف تقلید جائز نہیں، البتہ وہ عالم اس سے مستثنیٰ ہے جو اجتہاد نہ کر سکتا ہو۔

(۲) قرآن وسنت کی موجودگی میں تقلید ائمہ کا جواب اوپر آ چکا ہے، البتہ یہ رجحان امت کے لیے نقصان دہ بلکہ خطرناک ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں ایک امام کی رائے سے امت مشکلات میں مبتلا ہو اور کتاب وسنت میں اس سے ہٹ کر دوسرا نقطہ نظر اختیار کرنے کی پوری گنجائش موجود ہو پھر بھی اس امام کی پیروی کو لازمی سمجھا جائے۔

(۳) حضرات محدثین ومفسرین بہت ذی علم، کشادہ دل اور متواضع تھے اور وہ خود اپنے مسلک سے ہٹ کر دوسرے مسلک کے عالم کی رائے پر عمل کر لیتے تھے، ان کے یہاں تقلید یا عدم تقلید کی بحث نہیں تھی۔ ان کا موقف تھا کہ اذا صح الحدیث فھو مذھبی یعنی زیر بحث مسئلہ میں اگر کوئی صحیح حدیث رہنمائی کر رہی ہے تو وہی میرا مسلک ہے، میری ذاتی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔

خود امام ابوحنیفہ کی متعدد رایوں سے ان کے قابل شاگردوں امام ابویوسف، امام محمد اور امام زفر نے اختلاف کیا اور امام صاحب کی رائے کو حرف آخر نہیں قرار دیا مگر اس کے باوجود ان تمام حضرات کی آرا فقہ حنفی کے جزو کا درجہ رکھتی ہیں۔

(۴) میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تقلید کی بحث سے امت میں انتشار پیدا ہوگا، ہمارے لیے بہت سے ضروری کام پڑے ہوئے ہیں۔ تعلیم، فقر وفاقہ اور غربت کا ازالہ۔ مشترک امور و مسائل میں مسلمانوں کو متحد کرنا اور ان میں ملی شعور بیدار کرنا، مسلمانوں کے اندر سے مضبوط سیاسی قوت بن کر ابھرنا، بدعات وخرافات، رسوم ورواج کو مٹانا جیسے کام ہماری خاص توجہ کے طالب ہیں۔

(۵) ائمہ کرام ومجتہدین نے امت کو مختلف مسائل میں بھٹکنے سے بچانے کے لیے ایک راہ نکالی، ان کے لیے سہولت پیدا کی۔ لیکن بعد کے لوگوں نے ان ائمہ کے اقوال وآرا کو حرف آخر سمجھ کر خود امت کے اندر ناقابل عبور مسلکی دیواریں کھڑی کر دیں۔ کتاب وسنت کی صحیح حالت میں موجودگی اس بات کی ضمانت ہے کہ جب تک مسلمان اس سے چمٹے رہیں گے، گمراہ نہ ہوں گے، اصل یہ ہے کہ تقلید کے معاملہ میں اعتدال وتوازن قائم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے دوسرے مسالک کا احترام لازمی ہے۔

میں یہاں عصر حاضر کے ایک روشن خیال اور دیدہ ور عالم اور رہنما کی بات نقل کرنا مناسب خیال کرتا ہوں

''فقہ کے مذاہب اربعہ جب مشخص ومدون ہو گئے اور تقلید شخصی کا التزام قائم ہو گیا تو سوال پیدا ہوا ان چاروں میں افضل کون ہیں؟ حضرت امام ابوحنیفہ یا امام شافعی؟ اب بحث شروع ہوئی اور بحث نے جنگ وجدال کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ ہلاکو خاں کو اسلامی ممالک پر حملے کی سب سے پہلی ترغیب خراسانیوں کے اسی جھگڑے سے ملی تھی، پھر جب تاتاریوں کی تلوار چل گئی تو اس نے نہ شافعی کو چھوڑا نہ حنفی کو ☆☆☆

☆Markaz Jamate Islami,Dawat Nagar Abul Fazl Enclave Jamia Nagar,New Delhi

> **"ہمارا موقف یہی ہے کہ عامی کے لیے تقلید واجب ہے، خواص کے لیے نہیں، گزشتہ طویل مدت نے ہر طرح واضح کیا ہے کہ تقلید بلاشبہ رحمت اور ملت کے اتحاد کی ضامن ہے"**
>
> **مولانا کوکب نورانی (پاکستان)☆**

اللہ کریم جل شانہٗ نے دین اسلام کو ہمارے لیے پسند کیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ہمیں عطا فرمایا۔ یہ دین ہمیشہ کے لیے ہے اور تمام ادیان پر یہ غالب ہوگا۔ اس کامل و اکمل دین کا ہم تک پہنچنا جن رجال و احوال سے وابستہ ہے، ہم ان پر اعتماد کرتے ہیں، دین اور دینی امور میں ان کا اعتبار ہے اور وہ ہستیاں آج بھی اہل ایمان میں باعث افتخار ہیں۔ ان محسن ہستیوں پر اعتماد نہ کیا جائے تو ہم اپنی شناخت اور تشخص بھی معتبر نہیں کر سکتے۔ جانے وہ کون ہیں جو ان ہستیوں پر اعتراض کر کے اپنی ہی بنیادیں ہلا رہے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ ان کی بے سروپا، بے تکی باتوں سے خود ان کی تضحیک اور دین کی توہین و تحقیر کا "غیروں" کو موقع مل رہا ہے اور اہل ایمان کی اجتماعیت متاثر ہو رہی ہے۔

"تقلید" کوئی ایسا فعل نہیں جو دین سے الگ کوئی راستہ بتاتا یا دین سے دور کرتا ہو بلکہ یہ فعل تو عام شخص کے لیے دین پر عمل کو ممکن اور آسان بناتا ہے۔ دین کے تحفظ کے نام پر اگر ہم علمائے حق اور ائمۂ دین پر زبان اعتراض دراز کریں تو یہ سنگین ظلم ہی شمار ہوگا۔ دین کے محافظ و پاسبان اہل علم ہیں۔ انہوں نے دنیا میں بسنے والے لوگوں کی آسانی کے لیے ایسے مستقل طریقے اور علوم و فنون وضع کیے ہیں جن کے ذریعے فتنوں کا مقابلہ اور دین کے خلاف سازشوں کا سدباب ہو سکے۔ سبھی مانتے ہیں کہ دین اسلام رہتی دنیا تک کے لیے مکمل ضابطہ حیات ہے اور دین سے وابستہ ہر شخص (یعنی عامی) دین سے بہ تمام و کمال واقف نہیں، نہ ہی ہر شخص کا دین سے پوری طرح واقف ہونا ممکن ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں واضح ارشاد ہے۔ فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون "اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھو"۔ یعنی اپنے وہ مسائل جن کا حل تم نہیں جانتے وہ حل ان سے پوچھو جو لوگ جانتے ہیں۔

ایک معین آدمی، جو ماہر استاد، کتاب و سنت کا واقف، قابل اعتماد، قوت اجتہادیہ میں جسے کمال حاصل ہو، جس میں شرائط اجتہاد پوری طرح پائی جائیں۔ اس کے قول کو ماننا اور بغیر دلیل کے عمل کرنا تقلید مطلق کہلاتا ہے۔ ایک شخص کو دین کا سچا وارث، عالم و عامل مانا تو یہ یقین کیا کہ وہ شخص خوف خدا رکھنے والا اور قابل اعتماد ہے، وہ جو بتائے گا دین کے مطابق و موافق ہی بتائے گا، اس لیے اس سے دلیل مانگے بغیر اس کی بات کو ماننا تقلید کہلاتا ہے۔ واضح رہے کہ ہم فروعی مسائل میں تقلید کرتے ہیں اور اصولی مسائل میں اتباع کرتے ہیں اور وہ جب اتباع کا تبع کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے: واتبع سبيل من اناب الى۔

قرآن کریم ہی میں ہے اطيعو الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم — لعلمه الذين يستنبطونه منهم — ويتبع غير سبيل المومنين الخ — ليتفقهوا فى الدين — فاعتبروا يا اولى الابصار — قرآن ہی نے اہل علم کی شان و مرتبت واضح فرمائی۔ والذين اوتوا العلم درجت۔ انما يخشى الله من عباده العلماء قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون۔

اہل ایمان بخوبی جانتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو دین کی تعلیم مقصود تھی۔ انہیں بھیجتے ہوئے طریقہ تعلیم بھی واضح فرمایا اور اہل یمن کو ہر مسئلہ میں اُن سے رجوع کی اجازت دی، یہی تقلید شخصی ہے۔ ترک تقلید تو نفس پرستی سے عبارت ہے۔ عوام میں تدین کہاں؟ ان کی سلامتی اتباع ہی میں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عام نفوس کا طبعی میلان مفاسد کی طرف ہو جاتا ہے انہیں احکامات و تعلیمات کا پابند بنایا جانا اور اصلاح نفس ضروری ہے، یوں تقلید شخصی نہ صرف علاج ہے بلکہ ضروری ہے۔ جب اتباع ہوئی زیادہ ہو اور شریعت کو اپنی طبیعت کے موافق بنانے کی روش اپنائی جا رہی ہو تو ترتیب و تنظیم کیسے ہوگی؟ تقلید کے موضوع پر علمائے حق اہل سنت اور علمائے دیوبند کی طرف سے اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کوئی گوشہ شاید ہی تشنہ رہا ہو۔ تقلید کی تعریف کے لیے ہم اگر دیکھنا چاہیں، دیکھیں تو مختلف ملاحظہ ہو

کتاب التعریفات، کشاف اصطلاحات الفنون میں یہ تعریف درج ہے عبارة عن قبول قول الغير بلا حجة ولا دليل — عبارة

☆ B-54 Sindhi Muslim Housing Society Karachi,Pakistan

عن اتباع الانسان غیره فیما یقول او یفعل معتقد الحقیقه فیه من غیر نظر و تامل فی الدلیل کأن هذا المتبع جعل قول الغیر او فعله، قلادة فی عنقه— اخذ القول من غیر معرفة دلیله

اردو فرہنگ دائرہ معارف اسلامی میں یہ تعریف درج ہے تقلید یہ ہے کہ انسان کسی غیر (حجت) کے قول یا فعل کو صحیح مان کر اس کی دلیل پر غور و تامل کیے بغیر اس کا اتباع کرے، اس معنی میں تقلید، اجتہاد کی ضد ہے۔

جناب اشرف علی تھانوی یہ تعریف لکھتے ہیں "تقلید کہتے ہیں کسی کا قول محض اس حسن ظن پر مان لینا کہ یہ دلیل کے موافق بتا دے گا اور اس سے دلیل کی تحقیق نہ کرنا۔" (تحفۃ العلماء، ص ۲،۴۰۹)

غیر مقلدین بخاری و مسلم کے قائل ہیں، دلیل کے طور پر اسے پیش کرتے ہیں۔ وہ بتائیں کہ امام مسلم خود بخاری سے روایت کیوں نہیں کرتے؟ جب کہ امام بخاری ان کے استاذ ہیں۔ اصول حدیث، صحیح، حسن، ضعیف (معلق، منکر وغیرہ) اقسام، (غریب حسن ترمذی میں ہے، تفرد راوی کی وجہ سے غریب ہے۔ غرابت، صحت کے منافی نہیں)، اصول حدیث کی یہ شرائط کہاں سے لی ہیں؟ ان پر آیت قرآنی پیش کریں؟

اسماء رجال پر بحث کرتے ہیں۔ ثقہ، صدوق، قابل حجت وغیرہ۔ وہ بتائیں کہ اصول حدیث کو مانتے ہو تو اصول فقہ کو کیوں نہیں مانتے؟ وہ اگر اصول حدیث کو جائز سمجھتے ہیں تو ہم پر اصول فقہ ماننے کی وجہ سے اعتراض کیوں کرتے ہیں؟

اسماء رجال پر پہلی کتاب "الکمال" ہے، اس کی تلخیص علامہ مزی نے تہذیب الکمال کے نام سے کی، اس کی مزید تلخیص حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب کے نام سے کی۔ پھر تہذیب التہذیب میں جتنے راوی ہیں ان کے مختصر حالات حافظ نے تقریب التہذیب کے نام سے الگ کتاب میں جمع کر دیے۔ پھر ذہبی کی کتاب میزان الاعتدال میں جن راویوں کا صرف نام ذکر ہے، ان کے حالات ذکر و تعارف کے لیے حافظ ابن حجر نے لسان المیزان مرتب فرمائی۔

غیر مقلدین بتائیں کہ ابن حجر اور ذہبی جو جو راویوں کے بارے میں کہتے ہیں اسے مانتے ہو یا نہیں؟ کیا یہ تقلید شخصی نہیں؟ ان سے سوال ہے کہ بخاری و ذہبی کی اتباع کی کیا دلیل ہے تمہارے پاس؟ تم صحیح مانتے ہو، ہم اہل سنت وجماعت، بخاری سے امام اعظم کو بہت اونچا سمجھتے ہیں۔

واضح رہے کہ بغیر شرائط کے ہم نہیں مانتے۔ ہمارا موقف یہی ہے کہ عامی کے لیے تقلید واجب ہے، جو شخص قابل ہو اور صحیح فہم رکھتا ہو اور مسئلہ نکال سکتا ہو اس کے لیے نہیں۔ میرا ایک اہم سوال ہے غیر مقلدین سے، وہ بتائیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اب تک کتاب وسنّت کا پورا پورا پابند کوئی شخص ہوا ہے یا نہیں؟

جواب اگر نفی میں ہو تو غیر مسلم ضرور معترض ہوں گے کہ اسلام کیسا دین ہے جس کا پورا پابند کوئی نہیں ہوا۔ ان سے عرض کروں کہ اگر ہوئے ایسے شخص ہوئے ہیں اور اُن کے افعال واقوال باسند محفوظ ہوں تو ایسے متبع قرآن وسنّت کی پابندی وپیروی، تقلید واتباع میں کیا خرابی ہے؟ بلاشبہ ان لوگوں کی پیروی قرآن وسنّت ہی کی پیروی ہے۔

اہل ایمان جانتے ہیں کہ ہر حدیث واجب العمل نہیں، ہر سنّت واجب العمل ہے۔ ہر سنّت، حدیث ہے، کیا ہر حدیث، سنّت ہے؟ ابن حزم جیسے شخص نے بھی اعتراف کیا ہے کہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔ گزشتہ طویل مدت نے ہر طرح واضح کیا ہے کہ تقلید بلاشبہ رحمت اور تحفظ امت اور جمعیت ملت کی ضامن ہے۔

ارادہ تھا کہ کچھ واقعات نقل کروں گا اور غیر مقلدین کی کتب سے اپنی تائید بھی پیش کروں گا لیکن عشرۂ محرم کی مجالس اور اس کے بعد بھارت کے سفر اور لوگوں میں گھرے رہنے کے باعث مہلت نہ ملی۔ کچھ حوالے نقل کیے تھے لیکن وہ کاغذ بھی محفوظ نہ رہا۔ یہ قلم برداشتہ مختصر تحریر میں نے دہلی سے ممبئی کی پرواز میں مکمل کی ہے۔ اس کا لہجہ اور انداز میری مستقل تحریروں سے مختلف لگے تو درگزر فرمائیں۔

☆☆☆

ترجمہ: مولانا نعمان احمد ازہری ☆

مذاکرہ

شام کے نامور عالم دین شیخ ڈاکٹر سعید رمضان بوطی کا ایک غیر مقلد عالم سے مناظرہ

ایک متعصب اور غالی غیر مقلد چند حق پسند اور منصف مزاج جوانوں کے ہمراہ میرے پاس آیا، جب سلسلہ کلام شروع ہوا تو میں نے اس سے پوچھا احکام الہیہ کو سمجھنے کے لیے آپ کے پاس کیا طریقہ کار ہے؟ کیا آپ کتاب وسنت سے براہ راست استفادہ کرتے ہیں یا ائمہ مجتہدین کی تحقیقات کا سہارا لیتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: سب سے پہلے میں ائمہ کے اقوال و دلائل کا جائزہ لیتا ہوں، پھر ان کی جو دلیل کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہوتی ہے، اسی پر اعتماد کرتا ہوں۔

میں نے اس سے بطور مثال کہا اگر آپ کے پاس پانچ ہزار روپے ہوں اور اس پر چھ مہینہ گزر گیا ہو اور وہ رقم اس درمیان آپ کے پاس محفوظ بھی رہی ہو، پھر آپ نے اس سے سامان تجارت خریدا اور فروخت کرنا شروع کیا تو آپ اس کی زکوٰۃ کب نکالیں گے؟ دوسرے چھ مہینہ کے بعد یا پورا سال گزرنے کے بعد؟

ذرا غور وفکر کے بعد اس نے جواب دیا آپ کے اس سوال کا مطلب ہے کہ آپ سامان تجارت میں زکوٰۃ واجب سمجھتے ہیں؟

میں نے کہا میں آپ سے پوچھ رہا ہوں اور میری مدعا فقط اتنا ہے کہ آپ اپنے خاص طریقہ سے جواب عنایت فرمائیں، اس کے لیے یہ کتابیں آپ کے سامنے ہیں، کتاب وسنت اور اقوال ائمہ بھی آپ کے پیش نظر ہے۔

تھوڑا تامل کے بعد کہتا ہے: برادر! یہ دین کا معاملہ ہے، کوئی آسان بات نہیں، جس میں بغیر سوچے ذہن و دماغ سے جواب دیا جاسکے، اس کا صحیح جواب جاننے کے لیے کچھ پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز اس کے لیے وقت درکار ہے اور اس وقت ہم کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

میں نے کہا: ٹھیک ہے، تو کیا ہر مسلمان پر یہ واجب ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں ائمہ کے اقوال و دلائل کا جائزہ لے اور جو قرآن وسنت کے زیادہ موافق ہو اس پر عمل شروع کر دے؟

ہاں! اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہر شخص ویسی ہی اجتہاد کی صلاحیت کا مالک ہے جیسی ائمہ مجتہدین کے پاس تھی، بلکہ آپ کے مطابق تو کئی مرتبہ دوسرے لوگ ان سے بڑھ بھی جاتے ہیں، کیوں کہ جو شخص ائمہ کے اقوال و دلائل کا جائزہ لے کر کتاب وسنت سے قریب تر کو ترجیح دینے کی اہلیت رکھتا ہوگا وہ تو بلاشبہ ان سے بڑا قابل اور لائق وفائق ہوگا۔

یہ سن کر اس نے کہا دراصل عوام کی تین قسمیں ہیں

(۱) مقلد (۲) متبع (۳) مجتہد

پس جو شخص اس اہلیت کا مالک ہو کہ مذاہب (مسالک) اربعہ کے دلائل کا تقابلی مطالعہ کر کے کتاب وسنت سے قریب تر کو ترجیح دے وہ "متبع" کہا جاتا ہے، اور یہ تقلید و اجتہاد کا درمیانی مرتبہ ہے۔

اس پر میں نے کہا، پھر مقلد کا کیا کردار ہونا چاہیے؟

جواب میں اس نے کہا، سارے مجتہدین جس مسئلہ میں متفق ہوں اسی میں ان کی تقلید کرنی چاہیے۔

تو میں نے کہا اگر کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید دائمی طور پر کی جائے تو کوئی خرابی لازم آئے گی؟

فوراً اس نے جواب دیا: ہاں! یہ تو حرام ہے۔

میں نے کہا حرام! کیوں کر حرام ہے؟ تقلید کی حرمت پر کیا دلیل ہے؟

اس نے جواب دیا: اس کی دلیل یہ ہے کہ اس شخص نے اپنے اوپر اپنی طرف سے وہ چیز لازم کر لی جو اللہ تعالیٰ نے اس پر لازم نہیں کی تھی۔

اس پر میں نے اس سے سوال کیا: آپ قرأت سبعہ میں سے کس کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں؟

جواب دیا حفص کی قرأت کے مطابق۔

میں نے کہا، اسی ایک قرأت کے مطابق ہمیشہ بالالتزام پڑھتے ہیں یا کسی دن دوسرے قرأت پر بھی عمل کرتے ہوئے دوسری کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں؟

جواب دیا نہیں! اسی قرأت حفص پر ہی مداومت کرتا ہوں۔

میں نے کہا: کیا بات ہے کہ قرأت حفص کو ہی ہمیشہ بالالتزام اپناتے ہیں؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ لازم نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسے تواتر کے ساتھ منقول ہوا، اس کے مطابق پڑھنا چاہیے۔

اس پر اس نے کہا - ایسا اس لیے کہ مجھے دوسری قراتوں کا مطالعہ یا علم نہیں، اس کے علاوہ یہ پڑھنا میرے لیے ممکن نہیں۔

اب میں نے کہا ٹھیک آپ کی طرح ایک شخص نے فقہ شافعی کا مطالعہ اور دوسرے ائمہ کی تحریروں پر مطلع نہیں ہو سکا، اور نہ ہی اس کے لیے یہ ممکن تھا کہ سارے مسالک کے دلائل کا مطالعہ کر سکے، اب اگر آپ ایسے شخص سے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس پر لازم ہے کہ پہلے سارے ائمہ کی اجتہادی تحریروں کا مطالعہ کرے، یہاں تک کہ سب پر عمل کرنے کی کوشش کرے تو سب سے پہلے تو آپ پر لازم ہوا کہ آپ قرأت سبعہ سیکھیں اور ساری قراتوں کے مطابق قرآن کی تلاوت فرمائیں۔ اگر اس مقام پر اپنی عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو میں عرض کروں گا، خدارا اس مسکین مقلد کو بھی اپنی ہی منطق کی رو سے معذور جانیے۔

علاوہ ازیں، ہم یہ بھی آپ سے سوال کرنے کے مجاز ہیں کہ آپ نے یہ کہاں سے لازم کیا کہ مقلد ایک امام کے مسائل نہ لے بلکہ دوسرے امام کے مسائل پر بدل بدل کر عمل کرے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ بھی بندوں پر لازم نہیں کیا۔

یعنی آپ کے مطابق اگر ایک مذہب فقہ پر استمرار کے ساتھ گامزن رہنے کو اللہ تعالیٰ نے لازم نہیں کیا، تو بار بار بدل کر عمل کرنے کو کب لازم فرمایا؟

یہاں شیخ کرانچی ہی پرانی بات میں نیا شوشہ جڑتے ہوئے کہا:

تقلید یوں ہی حرام نہیں، بلکہ اس لیے حرام ہے کہ مقلد کسی کی تقلید کا التزام یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ (جب کہ ایسا نہیں)

میں نے کہا: چلیے آپ کی بات تسلیم کہ ایسا اعتقاد رکھے کہ تقلید رب تعالیٰ کی واجب کردہ اشیاء میں سے ہے تو غلط ہے، آپ کی بات درست ہے۔ لیکن اگر مقلد کو یہ علم ہے کہ اللہ نے اس کا مکلف نہیں بنایا کہ وہ کسی خاص امام کی تقلید کرے تاہم وہ اپنے اختیار سے ایسا کرے تو؟

اس نے جواب دیا- پھر تو ایسی تقلید میں کوئی حرج نہیں۔

اس پر میں نے کہا: جو کتاب آپ پڑھاتے ہیں، اس میں تو آپ کے موقف کے خلاف بات لکھی ہے، اس میں واضح لفظوں میں تحریر ہے کہ کسی خاص امام کی تقلید (بغیر اعتقاد واجب) بھی حرام، بلکہ بعض اوقات کفر ہے۔

اس نے کہا: کہاں؟

میں نے یہ عبارت دکھائی: "**بل من التزم واحدا بعينه في كل مسئلة فهو متعصب مخطئ مقلد تقليدا أعمى وهو ممن فرقوا دينهم وكانو شيعا**"

تو کافی غور وخوض اور تامل کے بعد فرمایا یہاں بھی التزام سے مراد یہی ہے کہ وہ شریعت کی جانب سے واجب کردہ تصور کرے، یہاں عبارت میں تھوڑی کمی رہ گئی ہے۔

میں نے پوچھا صاحب تحریر کی یہی مراد جو آپ فرما رہے ہیں، اس پر کیا دلیل ہے؟ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ صاحب تحریر غلطی پر ہے۔

(لیکن واہ رے جذبہ تقلید وتائید) وہ شخص اسی پر مصر رہا کہ یہ عبارت اپنی جگہ درست ہے اور اس میں کچھ محذوف ہے۔ اس طرح عملاً اس کتاب کے مؤلف کو خطا سے معصوم قرار دیا۔

میں نے کہا اس تقدیر پر بھی اس عبارت کا کوئی مفاد نہیں، کیوں کہ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہیں جو اس بات سے ناواقف ہو کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید شریعت اسلامی نے نہیں واجب قرار دی ہے، بلکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہر مکلف کو اختیار ہے کہ وہ کسی ایک کی فقہی مسائل میں تقلید کرے۔

اس پر کوئی جواب نہ دے سکا تو کہا: میں نے بعض لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ کسی ایک مسلک کی تقلید شرعاً لازم ہے، اس سے انحراف ممکن نہیں۔

میں نے مطالبہ کیا:- کسی ایک صاحب علم کا نام یا اس کی تحریر پیش کیجیے؟

جواب میں مکمل خاموشی رہا، تاہم اس بات کی رٹ لگاتا رہا کہ بعض لوگ ایک مذہب سے دوسرے مذہب کے مطابق احکام پر عمل کو حرام قرار دیتے ہیں۔

میں نے چیلنج کرتے ہوئے اس سے کہا:- آپ ایک بھی فرد ایسا نہیں دکھا سکتے جو ایسا باطل عقیدہ رکھتا ہو، البتہ عثمانیوں کے دور اقتدار کے آخر میں کچھ لوگ مذہب حنبلی سے عدول کو برا جانتے تھے، جس کی

تائید ہم بھی نہیں کرتے، یقیناوہ تعصب پر مبنی تھا۔

پھر میں نے اس سے کہا مقلد اور متبع کے درمیان آپ نے جو یہ فرق کیا ہے، اس کی اصل کیا ہے؟ آیا یہ فرق لغوی ہے یا اصطلاحی؟

جواب دیا: یہ لغوی فرق ہے۔

تو میں نے لغتوں کا حوالہ طلب کیا، تاکہ دونوں لفظوں میں لغوی فرق ثابت ہو سکے، تو یہ بھی آنجناب نہ کر سکے۔

پھر میں نے کہا: بے شک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے اعرابی سے کہا، جس نے مسلمانوں کی تائید شدہ چیزوں پر اعتراض کیا تھا۔ "اذا رضی المهاجرون فانما انتم تبع" اس اثر میں موافقت کو اتباع سے تعبیر کیا گیا، جب کہ اس میں بحث ونظر کی گنجائش نہیں۔

اتنا سن کر اپنی بات بدل دی اور کہا کہ پھر یہ فرق اصطلاحی ہوگا اور کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ کسی چیز کے لیے اصطلاح قائم کروں؟

کیوں نہیں! میں نے کہا: ضرور آپ کو یہ حق حاصل ہے، مگر آپ کی مفروضہ اصطلاح امر واقعہ کو نہیں تبدیل کر سکتی، پس یہی جس کو آپ "متبع" کا نام دیتے ہیں، اگر دلائل کا ادراک کرے اور طریقہ استنباط سے واقف ہوگا تو یہ مجتہد ہوا اگر بعض مسائل میں استنباط کی صلاحیت اور بعض میں دلائل سے جہالت ثابت ہو تب بھی اب ایسا شخص بعض میں مجتہد اور بعض میں مقلد یا اس کے بالعکس قرار پائے گا اور بہر صورت ہمارا مدعا حاصل۔ اور وہ یہ کہ تقسیم صرف دو طرفہ یعنی اجتہاد و تقلید میں منحصر ہے اور ہر ایک کا حکم عیاں ہے۔

اب تک بات کچھ نہ بن سکی تو کہا: متبع وہ شخص ہے جو اقوال اور دلائل کے مابین خط امتیاز کھینچ سکے اور قوی دلائل کو سمجھ کر ضعیف پر ترجیح کی صلاحیت رکھتا ہو اور یہ مرتبہ بہر حال نری تقلید کے علاوہ ہے۔

میں نے کہا: اگر ایسا ہے تو یہ مرتبہ تو اجتہاد میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیا آپ بذات خود ایسے ہیں؟

خوش ہو کر جواب دیا: میں بقدر استطاعت ایسا ہی کرتا ہوں۔

جی ہاں! مجھے معلوم ہے کہ آپ ایک مجلس میں تین طلاق کو ایک تسلیم کرنے والوں میں سرفہرست ہیں تو کیا آپ نے اپنے فتوی صادر کرنے سے پہلے تمام ائمہ کے اقوال و دلائل اور تحریروں کا مطالعہ کر لیا تھا؟ اور اس کے بعد کسی ایک دلیل کی قوت کی بنا پر اسے ترجیح دی؟ اس کے بعد فوراً اس کے سامنے یہ حدیث پاک رکھ دی "ان عویمر العجلانی طلق زوجته ثلاثاً فی مجلس رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد أن لا عن منها فقد قال کذبت علیها یا رسول الله ان امسکتها هی طالق ثلاثاً" اور میں نے پوچھا کہ آپ کا اس حدیث پاک کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جمہور فقہائے اسلام یا ابن تیمیہ کے مذہب پر اس کی دلالت کیا ہے؟

جواب دیا: مجھے یہ حدیث نہیں معلوم۔

میں نے کہا: پھر کیسے آپ نے ایسے مسئلہ میں فتوی صادر کیا، جس میں مذاہب اربعہ کے امام متفق و متحد ہیں اور آپ نے ان کے دلائل کا مطالعہ کیے بغیر ان کے خلاف فتوی دیا؟ گویا خود آپ ہی اپنے اصل موقف سے منحرف ہوئے اور اتباع کا معنی اصطلاحی جسے آپ کے دماغ نے گڑھا ہے ہمارے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔

کہنے لگے: اس وقت میرے پاس مذاہب اربعہ کی فقہ پر مشتمل کوئی مدلل کتاب نہ تھی، جس کی جانب میں رجوع کرتا اور دلائل معلوم کرتا۔

میں نے کہا: پھر آپ کو فتوی دینے میں اتنی عجلت سے کام نہ لینا تھا وہ بھی جمہور علما کی مخالفت میں؟ جب کہ آپ ان کے دلائل سے قطعا ناآشنا تھے۔

کہنے لگے: پھر میں کیا کرتا؟ مجھ سے سوال کیا گیا تھا اور میرے پاس مرجعی کتب نہ تھیں۔

میں نے کہا: کیوں نہیں کہہ دیا "مجھے معلوم نہیں" جب کہ صالح علما اور متواضع ائمہ دین کا طریقہ رہا ہے۔ یا اگر یہ نہ کر سکتے تھے تو کسی کی مخالفت میں فتوی نہ دے کر صرف اتنا کر دیتے کہ مذاہب اربعہ کے امام اور ان کے مخالفین کی آرا نقل کر دیتے، بلکہ مذکورہ صورت حال میں تو آپ پر یہی فرض تھا، کیوں کہ آپ کے اعتراف حقیقت کے مطابق آپ نے ان کے دلائل کا مطالعہ نہیں کیا، اس کے باوجود اپنی رائے سے ان کے خلاف فتوی دیا، مخالفین کی رائے اپنی رائے زنی کے معاون و موید ثابت ہو تو آپ جمہور امت کا خیال ترک کر بیٹھیں، تعصب و عناد میں اس مقام تک پہنچا ہوا آپ جیسا انسان پھر دوسروں کو متعصب ہونے کا طعنہ دے، سخت تعجب ہے!

کہا: میں "سبل السلام" اور "فقہ السنۃ" جیسی کتابوں کا مطالعہ کر چکا تھا۔

میں نے کہا: مسئلہ ذیل میں تو مذکورہ بزرگ ائمہ کے فریق ہیں اور

اس کی پیش کردہ یہیں تصویر کا ایک رخ پیش کرتی ہیں، وہ بھی وہی رخ جس سے ان کے موقف و تقویت ملے، کیا آپ جیسے محقق کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ کسی مختلف فیہ مسئلہ میں صرف اپنے ہمنواؤں کی دلیلیں دیکھ... نہیں کے حق میں فتویٰ صادر کردیں؟

کہا کہ آخر میرے ایسا کرنے میں خرابی کیا ہے؟ مجھ سے جب کسی مسئلہ کی بابت سوال ہوا تو میں صرف اسی کا مکلف ہوں کہ اپنے مطالعہ کی روشنی میں فتویٰ دوں۔

اس پر گرفت کرتے ہوئے میں نے کہا: آپ ہی نے ابھی تسلیم کیا کہ میں متبع ہوں اور دوسروں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے، پھر اتباع کی تشریح آپ نے یوں کی کہ تمام مذاہب کے اقوال و دلائل کا جائزہ لے کر کتاب و سنت کے قریب ترین دلیل کو راجح قرار دینا ہے، جب کہ اس معاملہ میں آپ نے اپنے موقف و منہج سے روگردانی کی، یہ جانتے ہوئے کہ مذاہب اربعہ میں ایک ہی طہر پر ایک مجلس میں تین طلاق دینا میں واقع ہوتی ہے، یہی نہیں بلکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسی ثبوت میں ان کے یہاں ٹھوس دلائل موجود ہیں، اب ان دلیلوں پر مطلع ہوئے بغیر رائے زنی کرتے ہوئے آپ نے خرق اجماع کا ارتکاب کیا، کیا آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس مسئلہ میں ان کی دلیلیں مردود ہیں؟

کہا کہ میں ایسا نہیں سمجھتا تھا، مگر میرے پاس وہ کتابیں دستیاب نہیں تھیں کہ میں ان دلائل کا جائزہ لیتا۔

میں نے پوچھا، پھر آپ نے انتظار کیوں نہ کیا؟ آپ نے جلد بازی سے کیوں کام لیا؟ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہ کیا تھا، انصاف سے کہیے، جمہور ائمہ کی رائے پر مطلع نہ ہونا ہی ابن تیمیہ کی رائے کو قوی تصور کرنا آپ کو روا ٹھہرا تو کیا تعصب اور اندھی تقلید اس کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے؟

اس نے کہا کہ میرے پاس جتنی کتابیں مہیا تھیں، انہیں میں دلائل دیکھ کر میں مطمئن ہوگیا، اور اس سے زیادہ کا میں مکلف نہ تھا۔

میں نے پوچھا، اگر کوئی مسلمان اپنے پاس موجود کتاب میں کوئی دلیل دیکھ کر مذہب جمہور کی مخالفت کرے جب کہ دوسرے ائمہ کی دلیلیں نہ دیکھی ہوں، کیا یہ کرنا ممکن ہے؟

ہاں ممکن ہے، اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا اگر کوئی مسلم، اللہ تعالیٰ کے ارشاد "ولله المشرق والمغرب فاينما تولوا فثم وجه الله ان الله واسع عليم" (سورۃ بقرہ، آیت: ۱۱۵) کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ نماز میں کسی بھی جانب چہرہ کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ آیت کریمہ کا ظاہری لفظ دلالت کرتا ہے، اس کے برخلاف اس کو معلوم ہو کہ ائمہ اربعہ ودیگر ائمہ کرام استقبال قبلہ کو صحت نماز کے لیے شرط کہتے ہیں۔ لیکن ان کی دلیلوں پر مطلع نہیں ہوا، یہ شخص جب نماز کے لیے کھڑا ہو تو کیا کرے؟ آیا اپنی فہم کے مطابق دلیل قطعی پر عمل کرے یا ائمہ کے متفقہ فیصلہ کی اتباع کرے؟ جو اس کے فہم خاص کے برعکس ہے۔

کہنے لگے ہاں اپنی فہم کے مطابق عمل کرے۔

یعنی مشرق کی جانب چہرہ کر کے نماز پڑھے اور اس کی یہ نماز درست ہوگی؟ میں نے پوچھا۔

جواب دیا ہاں درست ہوگی، کیوں کہ وہ اپنے اطمینان قلب کا مکلف ہے۔

تب میں نے کہا، فرض کرو یہی اطمینان قلب اس کو اس بات پہ حاصل ہو جائے کہ زنا کرنے، شراب پینے اور مال حرام کھانے میں کیا حرج اور مضائقہ ہوسکتا ہے؟ تو کیا اللہ اس کے لیے یہ سارے محرمات حلال کردے گا؟

یہ سن کر آنجناب خاموش رہے، پھر کہا کہ بہر حال ایسی صورت حال وہمی اور خیالی ہے اس کا صدور شاذ و نادر ہے۔

میں نے کہا جناب! وہمی اور خیالی نہیں بلکہ یہ امر واقعہ ہے، یہی نہیں! اس سے بھی عجیب وغریب حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں، ایک مسلمان جسے نہ قرآن وحدیث کا علم ہے، نہ علوم اسلامیہ میں مہارت ہے اس نے آیت مذکورہ دیکھ کر ظاہری لفظ سے یہ گمان کر لیا کہ کسی جانب چہرہ کر کے نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں، جب کہ دنیا کے مسلمانوں کو جہت قبلہ میں متوجہ دیکھتا ہے؟ اس کے باوجود آپ اس صورت حال کو وہمی قرار دے رہے ہیں اور اس اطمینان کو قابل معتمد و معتبر گردان رہے ہیں کہ اس کے ہوتے نص قطعی میں اپنی ذہنی پیچ سے تصرف تک روا رکھ رہے ہیں، یاد رہے کہ یہ چیز بھی آپ کی مفروضہ تقسیم سے معارض ہے کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں (۱) مقلد (۲) متبع اور (۳) مجتہد

پھر بات بناتے ہوئے کہا کہ ایسے شخص کو بحث و تفتیش کرنی چاہیے۔

میں نے کہا اس کے پاس تحقیق کے ذرائع مفقود تھے، جیسا کہ آپ کے ساتھ مسئلہ طلاق میں ہوا تھا، تو کیا یہ شخص اپنے دلی اطمینان پر ہی مصر رہے گا اور اجماع امت کو قابل اعتناء نہ سمجھے؟

کہا کہ ہاں! جب خود غور و فکر اور تلاش و جستجو نہیں کر سکتا تو وہ معذور ہے اور وہ اپنی صواب دید کے مطابق عمل کرے۔

میں نے کہا: آپ کی بات بڑی عجیب و غریب ہونے کے ساتھ انتہائی خطرناک بھی ہے، اگر آپ کی طرف منسوب کرکے کسی سے کہہ دوں تو؟

اس نے بڑی جرأت سے جواب دیا، جس سے چاہیں کہہ دیں مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

میں نے کہا: ہاں! جب آپ کو اللہ کا خوف نہیں تو بھلا کس کا خوف ہوگا؟ جب آپ اللہ کا ارشاد "**فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون**" (سورہ نحل، آیت ۴۳) ٹھکرا سکتے ہیں تو پھر کس کی مانیں گے؟

طیش میں آکر کہا: برادر! یہ ائمہ کوئی معصوم نہیں تھے، ہاں رہی قرآنی آیات و نصوص تو یہ ضرور اس ذات پاک کا کلام ہے جو جملہ عیوب و نقائص سے پاک و منزہ ہے، پھر کوئی ذی فہم غیر معصوم کے فیصلے کو لے بے عیب کلام سے کب مستغنی ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا: نادان!" وللہ المشرق والمغرب... الخ " کا معنی معصوم ہے نہ کہ اس جاہل نو مسلم کی فہم، ورنہ میں تو نہیں، دونوں کے بارے میں حتمی فیصلہ چاہتا ہوں، باین طور کہ ائمہ بھی معصوم نہیں اور جاہل نو مسلم بھی معصوم نہیں تاہم اول الذکر علوم اسلامیہ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، جب کہ دوسرا اس سے قطعاً جاہل و بیگانہ اور یکسر ناواقف ہے۔

اس پر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے زیادہ مکلف نہیں کیا۔

میں نے کہا پھر میرے سوال کا جواب دیجیے! ایک شخص کا بچہ بیمار ہوا، تمام حکیموں نے علاج کیا اور سب نے آخر میں متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ خبردار! پنسلین کا انجکشن ہرگز نہ دیا جائے ورنہ بچہ کی موت واقع ہو سکتی ہے، اس کے برخلاف بچے کے باپ نے کہیں کسی طبی جریدے میں پڑھ رکھا تھا کہ پنسلین کا انجکشن فلاں مرض میں مفید ہے۔ اس نے اپنی ذاتی معلومات پر بھروسہ کر کے اطباء کے اجماعی مشورہ کو پس پشت ڈال دیا، بچہ کو پنسلین کا انجکشن دیا اور بچہ موت کی آغوش میں پہنچ گیا۔ بتایا جائے یہ شخص گنہگار ہوا یا نہیں؟

تھوڑی دیر توقف کے بعد آنجناب نے فرمایا یہ تو دوسری بات ہے۔

• میں نے کہا ہرگز نہیں، معاملہ بالکل یکساں ہے، اس شخص نے اطباء کا اجتماعی حتمی فیصلہ سنا، اس کے پیچھے کیا حکمتیں تھیں، اسے نظر انداز کیا اور اس کے مقابلہ میں اپنی ذاتی معلومات پر اعتماد کیا، نتیجہ تمہارے سامنے ہے، بالکل اسی طرح اس نو مسلم نے ائمہ کا اجماع سنا پھر قرآنی آیت کو اپنی ناقص فہم کے مطابق سمجھا اور اس پر عمل کر کے مستقبل قبلہ نہ کیا تو اس کی نماز کب درست ہوئی؟

اس نے کہا: برادر! قرآن نور ہے [illegible] اور یہ نور جس سینے میں ہوتا ہے وہ [illegible] میں حق کی تابع ہوتا ہے؟

میں نے کہا جی ہاں! قرآن کا نور ہی قاری و ناظر کی عقلوں میں منعکس ہوتا ہے، تبھی تو وہ اللہ کی مراد اس سے سمجھ لیتا ہے، مگر اہل علم اور جاہل میں کچھ تو فرق ہوتا؟

میری پیش کردہ دونوں مثالوں میں موزونیت و یکسانیت ہے، اب جواب آپ کے سر ہے کہ دونوں سرگرداں شخص اپنی ذاتی معلومات کی اتباع کریں یا ماہرین فن کی تقلید؟

پھر بھی ازیل اپنی ہٹ پر اڑا رہا [illegible]

تو میں نے پھر وہی مثال دہرائی کہ دلی اطمینان [illegible] اطباء کے مشوروں کو ٹھکرا کر اپنے بچے [illegible] مواخذہ ہے یا نہیں؟

تعصب و عناد اور حماقت کی انتہا کرتے ہوئے [illegible] ہے کہ اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

تب میں نے سوچا [illegible] بصیرت انصاف کریں۔ [illegible] گروہی مذہبی تقلید [illegible] مقدس [illegible] کی روشنی [illegible] مسلمات کا [illegible]!

سبحان اللہ! ایک جاہل اپنی فہم ناقص پر اعتماد کر کے مسلمانوں کے قبلہ سے منحرف ہو کر نماز ادا کرے تو اس کی نماز کی صحت کی ضمانت دی جائے، اور ایک عام انسان اپنے ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر کسی کا علاج کر کے مریض کو موت کے گھاٹ اتار دے تو اس کے بارے میں کہا جائے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں!

اگر دلی اطمینان کا درجہ اس قدر بلند ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہمیں اس کے استعمال پر پابندی عائد کی جائے [illegible] حاصل ہونا چاہیے۔ [illegible] شریعت [illegible] مجتہدین کی تقلید [illegible] ضروری ہے کہ ان کی [illegible] کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے قریب تر ہیں۔ [illegible] فہم سلیم ان کا [illegible]

اظہارِ خیالات

اس کالم میں آپ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور ملی کسی بھی مسئلہ پر اپنی فکر اور اپنے خیال کا برملا اظہار اور بے لاگ تبصرہ کر سکتے ہیں جو ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائے گا، واضح ہو کہ اس سلسلے میں آپ کی تحریر مختصر اور جامع ہونی چاہیے............(ادارہ)

اجتہاد اور تقلید امت کی بنیادی ضرورت

پروفیسر سید محمد امین برکاتی

خانقاہ عالیہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ، ضلع ایٹہ (یوپی)

قرآن و حدیث اسلام کے بنیادی دستور ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونا اور ان سے ہدایت حاصل کرنا ہر مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے۔ لیکن ان کے مطالبات تک رسائی کے لیے صرف قرآن و حدیث کا ترجمہ پڑھ لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے اور بہت سارے علوم اور شرائط کی ضرورت پڑتی ہے۔ حضرات صحابہ کرام اور تابعین عظام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قرآن و حدیث کے سمندر کی غواصی کر کے بے شمار چمکتے موتی نکال کر امت مسلمہ کے سامنے پیش کر دیے ہیں، جن سے قیامت تک دنیا فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ ائمہ مجتہدین کا یہ وہ لازوال کارنامہ اور بالکل احسان ہے، جس کا قیامت تک نہ حق ادا کیا جا سکتا ہے، نہ جواب دیا جا سکتا ہے، اس لیے اجتہاد اور تقلید امت مسلمہ کی بنیادی ضرورت ہے، ان کے بغیر مفاہیم قرآن اور معانی حدیث پر ما حقہ عمل نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے امام اعظم امام الائمہ سراج الامۃ حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر اطہر پر اللہ تعالیٰ بے شمار رحمتوں کے پھول برسائے جنہوں نے اجتہاد کے اصول متعین کیے اور تدوین فقہ کی بنیاد ڈالی اور امت مسلمہ کے لیے ایسی آسانیاں پیدا کر گئے، جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

ادھر پچاس سو سال کے اندر غیر مقلدیت اور وہابیت نے برصغیر میں وبا کی شکل اختیار کر لی ہے، جسے دیکھو قرآن فہمی اور حدیث دانی کا دعویٰ لیے پھرتا ہے اور ایک شتر بے مہار کی طرح حضرات ائمہ اور بزرگان دین پر تبرا بازی کرتا نظر آتا ہے، ایسے ماحول میں ماہنامہ جام نور دہلی نے اجتہاد و تقلید نمبر نکال کر امت مسلمہ کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کا ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے، اس شمارے میں ہندو پاک اور دیگر ممالک کے دل و دماغ کہلائے جانے والے اہل علم کی تحریریں شامل ہیں، تقلید مخالف خیمے کی بھی آراء شامل کی گئی ہیں تاکہ دونوں رخ واضح ہو سکیں، میں عزیز القدر مولانا خوشتر نورانی صاحب کو اس نمبر کی بروقت پیش کش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اہل علم کی یہ کاوشیں مقبول بارگاہ خداوندی ہوں اور امت مسلمہ کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں تاکہ وہ اپنے بزرگوں کی دینی خدمات کے معترف ہو کر ان کے حضور ادب اور نیازمندی کا شعور بیدار رکھیں۔ آمین بجاہ النبی الامین علیہ اکرم الصلوۃ وافضل التسلیم!

مخالفین تقلید نے تقلید کی ایک نئی روایت قائم کی

حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری

زیب سجادہ آستانہ قادریہ، بدایوں شریف (یوپی)

جام نور کے "اجتہاد و تقلید نمبر" کا اعلان پڑھ کر مسرت ہوئی، یہ وقت کی اہم ضرورت ہے، آج جس تیزی سے امت کے سادہ لوح افراد کو ائمہ متقدمین اور مجتہدین کی تقلید سے برگشتہ کر کے سعودی عرب کے بعض شیوخ کی تقلید پر آمادہ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے جماعت اہل سنت کی جانب سے اس پیمانے پر دفاعی اقدامات نہیں کیے جا رہے ہیں جو اس قسم کی منظم تحریک سے نمٹنے کے لیے کافی ہوں۔ ماہنامہ

جام نور اور اس کی مجلس مشاورت وادارت مبارک باد کی مستحق ہے، جس نے اس خلا کو محسوس کرتے ہوئے مسائل اجتہاد و تقلید کی تشریح و تفہیم کے لیے یہ خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے، میں صمیم قلب سے اس اقدام کا خیر مقدم کرتا ہوں، اور دعا گو ہوں کہ رب مقتدر اس وقیع نمبر کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش بنائے، اور اس کو گم گشتگان راہ کے لیے ذریعہ ہدایت و رہنمائی بنائے۔ آمین

تقلید ائمہ کو حرام و شرک قرار دینے والے اور بزعم خود عمل بالحدیث کرنے والے حضرات کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ ان لوگوں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ ائمہ متبوعین کی تقلید کا قلادہ گردن سے اتار کر ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم، شوکانی اور بھوپالی کی اندھی تقلید کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا، مذاہب اربعہ کی مخالفت کی اور اس کے نتیجہ میں ایک پانچویں مسلک کی بنیاد ڈال دی، ائمہ مجتہدین، فقہا بلکہ بعض تابعین و صحابہ کی شانوں میں بے ادبیاں اور گستاخیاں کرنا اپنا شعار بنایا، تشدد اور فکری انحراف کا یہ حال ہے کہ گزشتہ ایک ہزار سالہ اسلامی تاریخ میں گزرے ہوئے لاکھوں مقلدین علما، صلحا، صوفیا، محدثین و مفسرین کو گمراہ اور جادۂ حق سے منحرف کہنے اور لکھنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ہر چھوٹے بڑے کو آپ دیکھیں گے کہ وہ چند مٹھی بھر غیر مقلدین کے علاوہ تمام احناف، شوافع، اشاعرہ، ماتریدیہ اور صوفیا کو کافر، مشرک اور گمراہ کہتا ہوا نظر آئے گا۔ تقلید سے چھٹکارہ اور آزادروی آخر کار انسان کو اتنی پستی میں لے جاتی ہے کہ وہ دین و ایمان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ مشہور غیر مقلد عالم نے اپنا پچیس سالہ تجربہ اس طرح بیان کیا ہے ''پچیس برس کے تجربے سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، ان میں بعض عیسائی اور بعض لامذہب بن جاتے ہیں، جو کسی دین و مذہب کے پابند نہیں رہتے اور احکام شریعت سے فسق و خروج تو اس آزادی کا ادنیٰ نتیجہ ہے''۔ (محمد حسین بٹالوی اشاعۃ السنہ، جلد ۱۱، شمارہ ۲، ص ۵۳) یہ ہے ترک تقلید کا آخری نتیجہ۔ اللہ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور ہمیں اپنے اسلاف کرام صحابہ، تابعین، مجتہدین اور اولیا کاملین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

تقلید کی مخالفت ایک سازش کا نتیجہ ہے

حضرت شاہ سید محمد اکبر مودودی چشتی

زیب سجادہ آستانہ عالیہ صمدیہ، پھپھوند شریف، ضلع اوریا

تقلید کا وجوب آیات قرآنیہ، احادیث صحیحہ، اجماع امت، اور اقوال مفسرین سے ثابت ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم'' اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ صراط مستقیم وہی ہے جس پر اللہ کے انعام یافتہ بندے چلیں۔ اس امت کے اولیا، صلحا، محدثین، مفسرین، فقہا، اور جلیل القدر علماء نے ائمہ مجتہدین کی تقلید فرمائی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہی صراط مستقیم ہے۔ سرکار اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ''لاتجتمع امتی علی الضلالة'' یعنی میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، اگر تقلید کرنا گمراہی ہوتی تو امت اسلامیہ کے یہ جلیل القدر ائمہ، علما، محدثین، مفسرین اور اولیا و صلحا ہرگز تقلید پر اتفاق و اجماع نہ کرتے۔

اجتہاد کا ثبوت بھی احادیث صحیحہ سے ہے، احکام شرعیہ میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا حکم واضح ثبوت صراحتاً کتاب وسنت میں نہیں ہے، ایسے مسائل کے حل کے لئے اجتہاد ناگزیر ہو جاتا ہے، اگر ایسے مسائل میں اجتہاد سے صرف نظر کر لیا جائے تو اس قسم کے مسائل میں حلت و حرمت کا ادراک ایک امر دشوار ہے۔

قرآن کریم میں مسلمانوں کے ایک گروہ کو ''تفقہ'' حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن کریم کی اس ترغیب پر لبیک کہتے ہوئے بعض اہل علم و اجتہاد نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور توانائیں حصول تفقہ میں صرف کر دیں، جس کے نتیجہ میں انہوں نے کتاب وسنت کا گہرا مطالعہ کر کے تمام احکام شریعت کو نہ صرف یہ کہ محکم دلیلوں کے ساتھ مدون کر دیا بلکہ کتاب وسنت سے مسائل کے استخراج و استنباط کے لیے ایسے قواعد کلیہ و محکم اصول وضع فرمادئے جن کی روشنی میں ہر نوپید امسئلہ کا حکم کتاب وسنت سے اخذ کیا جا سکتا ہے، اہل علم کی اسی جماعت کو ہم مجتہدین کہتے ہیں، جب ہم اس امت کے مجتہدین کی فہرست پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں بے شمار اسما زریں حروف سے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر ان میں وہ چار مجتہدین سب

سے نمایاں ہیں جن کی اتباع و تقلید گذشتہ ایک ہزار یا اس سے زیادہ برس سے یہ امت متفقہ طور پر کرتی آرہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ در حقیقت اطاعت و اتباع صرف اللہ جل جلالہ اور اس کے حبیب کریم ﷺ کی ہے، ائمہ کی تقلید صرف ان کے فہم میں کی جاتی ہے، یعنی ایک عام آدمی کے لئے یہ ایک دشوار گذار امر ہے کہ وہ مسائل شریعت کو ان کے تفصیلی ادلہ کے ساتھ کتاب و سنت سے مستنبط کرے۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ فہم کتاب و سنت کے سلسلہ میں ان مجتہدین میں سے کسی پر اعتماد کرے۔

مذاہب اربعہ اپنے اصول و قواعد اور کلیات و فروع کے ساتھ مدون و مرتب ہیں، یہ مرتبہ دیگر ائمہ کے مذاہب کو حاصل نہیں ہوا، لہٰذا اب تقلید انہیں چار میں منحصر ہوگئی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام نامی وہ لوگ بہت استعمال کرتے ہیں جو تقلید کو حرام و شرک قرار دیتے ہیں، ذرا شاہ صاحب کا یہ فرمان ملاحظہ فرمائیں ''**ولما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم والخروج عنها خروجاً عن السواد الاعظم**"۔ (ترجمہ) ''اور جب ان مذاہب اربعہ کے علاوہ باقی سبھی مذاہب کالعدم ہوگئے تو اب انہیں کا اتباع سواد اعظم کا اتباع کہلائے گا، اور ان مذاہب اربعہ سے خروج سواد اعظم سے خروج ہوگا''۔

آج جب کہ اسلام کو مختلف قسم کی سازشوں کا سامنا ہے وہیں سے امت کے خلاف ایک بڑی سازش یہ بھی ہے کہ اس کو اس کے اسلاف کے طریقہ سے الگ کر دیا جائے۔ اور یہ سازش کہیں عمل بالحدیث کے خوشنما نعروں کے ساتھ اور کہیں ترک تقلید کی صورت کے ساتھ رچی جا رہی ہے۔ اس سازش کی جڑیں عالم اسلام میں مضبوط کرنے کے لئے امریکی ڈالر اور سعودی ریال دونوں کی تجوریاں کھول دی گئی ہیں، ہمارے مخالف کی کوشش ہے کہ کسی طرح اس امت کو اس کے اسلاف کے نقش قدم سے منحرف کر دیا جائے۔ ایسے نازک وقت میں اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اس سازش کے خلاف کوئی موثر و مستحکم قدم اٹھا کر احقاق حق اور ابطال باطل کا اہم فریضہ انجام دیا جائے، تا کہ امت کے ایمان و عقیدے کی حفاظت ہو سکے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ماہنامہ جام نور کے مدیر اعلیٰ اور ان کے رفقاء کار کو اس اہم کام کی توفیق مرحمت فرمائی، اور ان حضرات نے وقت کے ایک اہم دینی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے یہ قابل ستائش اقدام کیا۔

میں اس اقدام پر صمیم قلب سے جام نور کے ذمہ داران کو مبارک باد پیش کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس میں آپ کو کامیاب فرمائے اور خالصاً لوجہ اللہ خدمت دین و سنت کی توفیق مرحمت فرمائے۔ (آمین)

تقلید شخصی: دین فطرت کا فطری مطالبہ

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی
سجادہ نشین خانقاہ مظہریہ مسعودیہ، اندرون شاہی مسجد فتح پوری، دہلی

بارگاہ رب کریم میں بندوں کی نیازمندانہ حاضری اور عبادت کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول صورت وہ ہے جو اس برتر و بے نیاز وحدہ لا شریک کی سب سے زیادہ پسندیدہ، سب سے زیادہ مقرب اور سب سے زیادہ مقبول و محبوب مخلوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سکھائی ہوئی ہے، جسے نماز کہا جاتا ہے۔ نماز از اول تا آخر لطائف و معارف، ذکر و عبادات اور محاسن و کمالات قرب و عبدیت کا مجموعہ ہے۔ بالخصوص سبع مثانی کا ہر نماز میں واجب و لازمی قرار دیا جانا (**لا صلوة الا بفاتحة الكتب**) اور وہ بھی ایک بار نہیں بلکہ نماز کی ہر رکعت میں، اس کا علاوہ دیگر بے شمار اسرار و رموز کے اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس مقدس کلام کے ذریعہ بندوں کو جس نعمت کے حصول کی دعا سکھائی گئی ہے، وہ ان نعمتوں میں سے نہیں ہے جن کے حصول کے بعد طلب پوری ہو جاتی ہے، بلکہ اس دعا میں بندوں کو اس نعمت عظمیٰ کا طلب گار بنایا گیا ہے، جس کے حصول کے ساتھ ہی طلب مزید کی توفیق و ترقی سے بھی سرفراز فرمایا جاتا ہے اور اس راہ پر چلنے کی التجا سکھائی گئی ہے، جس کی منزل قرب خداوندی کا حریم قدس ہے، جو لا محدود ہے۔ لہٰذا طالبین کی طلب کو شرف قبول کی جن نعمتوں سے نوازا جاتا ہے وہ حسب استعداد نہ صرف ان کے حوائج زندگی کو محیط ہوتی ہیں، بلکہ عطا و عنایات غیر متناہیہ سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے حضور سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ادوار کے امتیوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تمام ضرورتوں، حاجتوں اور حالتوں کے تقاضوں کے لئے قیامت تک ہر دور میں کافی و حاوی یہ جامع دعا **اهدنا الصراط**

المستقیم الی ولاالضالین ۝ جس میں صراط مستقیم کی ایسی واضح جامع مانع تعریف فرمائی ہے، جس میں نہ اہل علم کے لیے اس کے تعین میں کسی شک وشبہ کی گنجائش اور نہ عوام کے لیے اس کے پہنچانے میں کوئی دقت، سیدھے راستہ کی تعیین کو چلنے والوں سے روشن اور ناقابل انکار، ایسے وہبی نشان اور سعادت خداداد کے ساتھ مشروط ومربوط فرمایا ہے، جسے بزور بازو اور کوشش ومحنت کی بنیاد پر کوئی حاصل نہیں کرسکتا- بلکہ ہر زمانہ میں مقبول اطاعت خدا اور رسول (تعالیٰ وتقدس وصلی اللہ علیہ وسلم) سے نوازے جانے والے، اہل زمانہ ہی منعم علیہم اور انعمت علیہم کے صحیح مصداق ہوتے رہیں گے- (ومن یطع اللہ و الرسول فاولئک مع الذین.....)

قرآن حکیم نے صراط مستقیم کی اس تشریح سے ہر دور کے ان انسانوں کے زعم باطل پر کاری ضرب لگائی ہے، جو عجب اور تکبر کی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہوں اور باطل میں گرفتار ہونے کے باوجود حق پر ہونے کے دعویدار ہوں اور حقیقت میں فتنہ وفساد کے علم بردار ہوتے ہوئے خود کو مصلح گردان کر علم وفضل میں اپنے سے بدرجہا بلند وبرتر شخصیات سے نہ صرف اختلاف اور کج بحثی کریں بلکہ بے جا لعن طعن اور مجادلہ ومکابرہ کی جارحانہ روش اپنائیں، نوع انسانی کے آغاز ہی میں یعنی حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم خاکی میں نفخ روح فرماتے ہی، تمام ملائکہ کو حضرت آدم کے آگے سجدۂ تعظیمی کا حکم تھا، ابلیس یعنی جو اس وقت تک عزرائیل اور تمام فرشتوں میں بڑا عبادت گزار اور جلیل القدر عالم ہی نہیں بلکہ مستجاب الدعوات کی حیثیت سے معزز اور محترم تھا، سوائے حق سبحانہ تعالیٰ کے اس کے دل کا تکبر اور خود پسندی کا خبث کوئی نہیں جانتا تھا، اللہ تعالیٰ شانہ نے سجدے کا حکم فرما کر اسے ظاہر فرمادیا اور ابلیس نے نہ صرف یہ کہ سجدہ نہ کیا بلکہ باز پرس ہونے پر حضرت حق جل مجدہ سے کج بحثی کرتے ہوئے انتہائی بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ یہ بکواس کی کہ میں نے اسے سجدہ اس لیے نہیں کیا کہ میں اس سے بہتر ہوں اور اس کی دلیل یہ پیش کی کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا فرمایا اور آدم کو مٹی سے- ابلیس لعین نے تکبر اور خود پسندی کے گھمنڈ میں اندھا ہوکر، باطل پر ہوتے ہوئے، اپنے کو حق پر دکھانے میں اتنا بھی نہ دیکھا کہ میں کس کے حکم کی خلاف ورزی کررہا ہوں اور کس کے سامنے احمقانہ دلیل پیش کررہا ہوں، اس وقت راندۂ درگاہ ہونے کے بعد اور قیامت تک کی مہلت پانے کے بعد اس نے اپنی بدباطنی کا غبار نکالتے ہوئے اولاد آدم کو انتقاماً گمراہ کرنے کا اعلان اور اظہار کیا کہ میں ان سب ہی کو گمراہ کروں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جو اخلاص سے نوازے گئے ہیں- خدائے ذوالجلال نے بھی فرمادیا کہ میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں، سوائے ان گمراہوں کے جو تیری اتباع کریں- چنانچہ حضرت آدم سے حضور نبی آخر الزماں کی مدت تک ابلیس نے اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہ چھوڑی، تمام پچھلی امتوں میں تفرقہ ڈالا یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں بہتر ۷۲ فرقے ہوئے اور اس آخری امت میں ۷۳ فرقوں کی پیشین گوئی حدیث پاک میں فرمائی گئی جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں اور حضور دانائے سبل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انکشاف فرمادیا کہ میری امت کے ان تہتر فرقوں میں صرف وہ ایک فرقہ ناجی ہوگا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہوگا، باقی ۷۲ فرقے سب ناری (جہنمی) ہوں گے- یہ حدیث تمام امت مسلمہ کے لیے بڑی عبرت خیز اور فکر انگیز ہے- بہتر فرقوں کے ہجوم میں فرقۂ ناجیہ کے امتیاز اور تشخص کا تحفظ تمام اہل ایمان کے لیے ناگزیر ہے- یہ ایسا اہم اور نازک مسئلہ ہے جس پر آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے- افسوس کہ دینی معلومات سے محرومی اور ناواقفیت اور دنیوی علیم کی خوش فہمی نے ۷۲ جہنمی فرقوں سے ایک جنتی فرقہ کی تمیز اور پہچان حاصل کرنے کی بجائے بہت سے لوگوں کو بڑے فخر اور برتری کے انداز میں یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ سب ایک ہیں، سب حق پر ہیں- شیعہ، سنی، قادیانی وغیرہم سب بھائی بھائی اور سب ایک ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں- حالانکہ یہ دھوکہ اور غلط فہمی کے علاوہ کچھ نہیں اور حقیقت کے سراسر خلاف اور مذکورہ حدیث سے بغاوت ہے- اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دینی شعور اور بیداری ودین داری عطا فرمائے- آمین-

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کو متفق اور متحد کرنے پر قادر ہے- لیکن نیکی اور بدی، حق وباطل، ایمان اور کفر کی پہچان، ایک دوسرے سے امتیاز پر موقوف ہے- ابلیس کا واقعہ بنیاد ہے حق وباطل اور ایمان وکفر کے درمیان امتیاز کے لیے اور چونکہ اس نے اپنی تلبیسی سرگرمیوں کی چھوٹ کے لیے قیامت تک کی مہلت حاصل کرلی ہے، اس لیے جادۂ مستقیم سے ہٹ جانے والے فرقوں کا اس کے ساتھ خصوصی رابطہ اور دونوں کے درمیان ہم آہنگی، امتیازی نشان ہے، خواہ کسی بھی شکل میں ہو- مگر تکبر، خود پسندی، اپنے سے برتر کو کمتر دکھانے کی ضد اور اس کی شان میں گستاخی وغیرہ یہ سب ابلیسی صفات تمام فرق ضالہ کو اس سے ورثہ میں ملی ہیں، چنانچہ فرقۂ ناجیہ اہل سنت وجماعت کے مقابل اور حریف فرقوں میں مذکورہ خصلتیں کسی نہ کسی

حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ۱۲۰۹ھ میں پیدا ہونے والے فرقہ وہابیہ کے تعارف میں محدث دیوبند مولانا حسین احمد مدنی اپنی کتاب الشہاب الثاقب میں رقم طراز ہیں ''محمد ابن عبدالوہاب نجدی ابتدائے تیرہویں صدی میں نجد عرب سے ظاہر ہوا اور چونکہ یہ خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ رکھتا تھا، اس لیے اس نے اہل سنت و جماعت سے قتل و قتال کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جملہ اہل عالم اور مسلمانان دیار مشرک و کافر ہیں، ان سے قتل و قتال کرنا وران کے اموال کو ان سے چھین لینا حلال اور جائز بلکہ واجب ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں نے خود اس کے ترجمہ میں ان دونوں باتوں کی تصریح کی ہے''۔ ایسے ہی فرقہ غیر مقلد کے بارے میں شیخ علمائے دیوبند مولانا گنگوہی اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں ''جو شخص تقلید شخصی کو جو مامور و مفروض من اللہ تعالی ہے، شرک یا بدعت کہتا ہے وہ جاہل و گمراہ ہے'' اور جیسا کہ مذکورہ آیت قرآنیہ سے روشن ہے کہ تقلید شخصی ایک ایسی فطری دینی ضرورت ہے، جس کے بغیر اب کسی دور میں بھی امت مسلمہ کے لیے چارہ نہیں ہے۔ نیز مشہور غیر مقلد نواب وحید الزماں لکھتے ہیں ''ہمارے اہل حدیث بھائیوں نے ابن تیمیہ اور ابن قیم اور شوکانی اور شاہ ولی اللہ اور مولوی اسماعیل صاحب کو دین کا ٹھیکہ دار بنا رکھا ہے، جہاں کسی مسلمان نے ان بزرگوں کے خلاف کسی قول کو اختیار کیا، بس اس کے پیچھے پڑ گئے، برا بھلا کہنے لگے، بھائیو ذرا غور کرو اور انصاف کرو کہ جب تم نے ابوحنیفہ اور شافعی کی تقلید چھوڑ دی تو ابن تیمیہ اور ابن قیم اور شوکانی جو ان سے بہت متاخر ہوئے، ان کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟''۔ (حیات وحید الزماں ۱۰۲)

لہٰذا خوب واضح ہو گیا کہ غیر مقلدین کے لیے بھی تقلید شخصی کے بغیر چارہ نہیں ورنہ کتے کے گوشت کی حرمت کا حکم بتائیں کہ کس آیت یا حدیث میں ہے؟

تقلید ایک عظیم نعمت ہے

مولانا محمد الیاس عطار قادری رضوی

امیر سنی دعوت اسلامی، فیضان مدینہ، سبزی منڈی، سوداگران، کراچی (پاکستان)

سگ مدینہ محمد الیاس عطار قادری رضوی عفی عنہ کی جانب سے نبیرۂ حضرت علامہ ارشد القادری علیہ رحمۃ اللہ القوی عزیزی محبی قبلہ مولانا خوشتر نورانی صاحب زید مجدہ مدیر ماہنامہ جام نور کی خدمت عالی میں گنبد خضرا کو چومتا ہوا جھومتا ہوا مشکبار سلام السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جام نور کے خصوصی ایڈیشن تقلید نمبر کی اشاعت پر آپ کو اور آپ کے سارے عملے کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ اللہ عزوجل ماہنامہ جام نور کو دن گیارہویں اور رات بارہویں ترقی عطا فرمائے (امین بجاہ النبی الامین صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم)

الحمدللہ عزوجل میں مقلد ہوں اور مقلد بھی امام اعظم، فقیہ افخم حضرت ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا۔ الحمدللہ اپنے حنفی ہونے پر مجھے ناز ہے اور ناز کیوں نہ ہو کہ اس میں مغفرت کی بشارت جو ہے۔ چنانچہ درمختار وغیرہ میں ہے حضرت سیدنا امام اعظم علیہ رحمۃ اللہ الاکرم نے اپنی زندگی میں 55 حج ادا فرمائے۔ آخری بار خدام حرم محترم کے تعاون سے کعبہ مشرفہ کے اندر داخلہ کی سعادت ملی تو دونوں ستونوں کے درمیان کھڑے ہو کر نماز میں مکمل قرآن پاک ختم کیا اور دیر تک مناجات اور گریہ وزاری میں مشغول رہے۔ بیت اللہ کے ایک گوشہ سے ہاتف غیبی نے آواز دی! اے ابوحنیفہ! تو نے حسن معرفت کے ساتھ ہمیں پہچانا اور ہمارے دین کی خوب خدمت کی، قد غفرنا لک ولمن اتبعک ممن کان علی مذھبک الی یوم القیامۃ یعنی ہم نے تیری اور تا قیامت ہونے والے تیرے پیروکاروں کی مغفرت کر دی ہے۔ (الدر المختار ج ۱ ص ۱۲۶، ۱۲۷ ملخصاً دار المعرفۃ بیروت) اللہ عزوجل کی ان پر رحمت ہو اور ان کے صدقے ہماری مغفرت ہو۔

حنفی ہونے کے ناطے میں نے اپنے امام اعظم علیہ رحمۃ اللہ الاکرم کی توصیف بیان کی، البتہ مذاہب اربعہ برحق ہیں اور ان ہر چہار مذاہب کے سب پیروکار نجات کے حقدار۔ میرے آقا اعلیٰ حضرت، امام اہل سنت، ولی نعمت، عظیم البرکت، عظیم المرتبت، پروانۂ شمع رسالت، مجدد دین وملت، حامی سنت، ماحی بدعت، عالم شریعت، پیر طریقت، باعث خیر وبرکت، آفتاب حقیقت، حضرت علامہ مولینا مفتی الحاج حافظ قاری الشاہ امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمن فتاوی افریقہ صفحہ 59 پر ایک استفتاء کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں ''چاروں مذہب والے حقیقی عینی بھائی ہیں، ان کی ماں شریعت مطہرہ اور ان کا باپ اسلام۔ طحطاوی علی الدر المختار میں ہے نجات پانے والا گروہ چار مذہب حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی میں جمع ہے اب جو ان چاروں سے خارج ہے وہ بدعتی جہنمی ہے''۔ (فتاوی افریقہ ص 59 نوری کتب خانہ مرکز الاولیاء، لاہور) اللہ رب

اللہ رب العزت عزوجل ہمیں ایسی باغیانہ عقل سے پناہ عنایت فرمائے کہ جو تقلید جیسی باعظمت نعمت کے ضیاع کا باعث بن کر جنت سے محروم کردے۔

تقلید مخالفین تقلید کی بھی مجبوری ہے

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی
بڑا گاؤں، کریم الدین پور، گھوسی، ضلع مئو (یوپی)

اسلام کا بنیادی ضابطہ اور مطالبہ تو دراصل اللہ ورسول کے احکام کی اطاعت وفرماں برداری ہے۔ لیکن قرآن وسنت میں چونکہ سارے احکام واضح اور صریح نہیں ہیں، ان میں کہیں اجمال کہیں ابہام اور کہیں بظاہر تعارض ہے۔ ایسی صورت میں قرآن وحدیث سے احکام ومسائل کا استنباط، استخراج بے حد دشوار ہے۔ اس لیے قرین عقل اور اسلم وصائب طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنے ناقص علم اور کوتاہ عقل وفہم سے کام لے کر از خود کوئی فیصلہ نہ کریں، بلکہ یہ دیکھیں کہ قرآن وسنت کے ان ارشادات سے ہمارے جلیل القدر علماء اسلاف نے کیا سمجھا ہے۔ قرون اولی کے جن بزرگوں نے اپنی ساری عمریں صرف کرکے مسائل کا استنباط کیا ہے اور جو علوم قرآن وحدیث کے زبردست ماہر تھے اور فضل وکمال زہد وورع، ذکاوت وحافظہ، دین ودیانت اور فکر وفراست میں درجہ کمال پر فائز تھے اور دور صحابہ وتابعین سے قرب زمانی کے باعث قرآن وسنت کی مراد کو بہتر سمجھتے تھے، ان پر اعتماد کرتے ہوئے، مسائل جزئیہ اجتہادیہ میں ان کے احکام کا اتباع اور تقلید کریں۔

درحقیقت تقلید ائمہ مجتہدین کا اصل مقصد دین کی حفاظت اور قرآن وحدیث پر آسانی عمل کرنا ہے۔ تقلید ائمہ اربعہ درحقیقت عمل بالقرآن والسنۃ ہی ہے۔ دور رسالت میں دوسری صدی کے اواخر تک تقلید شخصی اور غیر شخصی دونوں کا رواج ہو چکا تھا اور پھر چوتھی صدی کے آخر میں تمام مسلمانوں میں تقلید شخصی پر اتفاق واجماع ہوگیا اور آج تک اس کا رواج امت محمدیہ میں بدستور چلا آرہا ہے اور اس سنت قدیمہ متوارثہ سے انکار، جماع امت اور سواد اعظم سے انحراف اور تقلید کو شرک وبدعت قرار دینا، غیر مقلدوں کی ضد،ہٹ دھرمی حقائق سے چشم پوشی اور صریح کمراہی ہے۔

جب ائمہ اربعہ یعنی امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی فقہ کتابی شکل میں مدون ہوکر تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گئی، تقلید شخصی کے سلسلہ میں کوئی بھی اختلاف نہ رہا، بلکہ اس کے خلاف کرنے کو سواد اعظم سے انحراف کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ جو سخت ترین گناہ ہے۔ اس لیے کہ بفرمان رسول گرامی اتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار۔

حق تعالی نے خیر القرون میں بے شمار صحابہ کرام تابعین وتبع تابعین ومن بعدہم کو اس دولت اجتہاد سے نوازا اور خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرتے وقت صاف اور واضح لفظوں میں اجتہاد کی تحسین وتصویب فرمائی، حدیث پاک کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا تو یہ پوچھا کہ اگر کوئی قضیہ پیش آجائے تو کس طرح فیصلہ کروگے؟ عرض کیا کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا، فرمایا اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اس میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا اس وقت اجتہاد واستنباط کرکے اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا اور تلاش میں کوئی کسر اور کمی نہ کروں گا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر (فرط مسرت سے) اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی، جس پر اللہ کا رسول راضی اور خوش ہے۔

اس حدیث پاک سے بہت ہی واضح انداز میں اجتہاد وتقلید کا ثبوت فراہم ہوتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے لیے اپنے فقہائے صحابہ میں سے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا اور انہیں حاکم وقاضی اور معلم ومجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم فرمادیا کہ وہ ان کی اطاعت وتابعداری کریں، نہیں صرف قرآن وسنت ہی نہیں بلکہ قیاس واجتہاد کے مطابق بھی فتوی صادر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ آپ نے اہل یمن کو ان کی تقلید شخصی کی، نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کو لازم بھی قرار دے دیا۔

غور فرمایئے کہ جب ہر علم وفن میں ان علوم وفنون کے ماہرین کی آراء پر اعتناء کیا جاتا ہے، خواہ وہ علوم وفنون، دینی وشرعی ہوں یا دنیاوی تو کوئی وجہ نہیں کہ مسائل شرعیہ میں، ہم ماہرین علوم شرعیہ کے احکام کو قابل عمل اور لائق اعتناء نہ سمجھیں اور ہم اپنے خام ذہن وفکر اور ناقص علم وفہم کی بنیاد پر براہ راست قرآن وحدیث سے استخراج مسائل کا دعویٰ کریں، وہ بھی حرص وہوس، نفس پرستی اور انحطاط عملی کے اس پر آشوب وپرفتن دور میں۔ کیا غیر مقلدوں کے گروہ کا ہر عامی وعالم براہ راست قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط کی اہمیت وصلاحیت رکھتا ہے؟

آخر کوئی بھی غیر مقلد دینی وشرعی مسائل اپنے علماء اور مفتیوں سے ہی تو دریافت کر کے ان پر عمل کرتا ہے، یا جاہل مطلق ہوتے ہوئے بھی خود ہی براہ راست قرآن وسنت سے مسائل معلوم کر کے ان پر عمل کرتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا نہیں ہے تو پھر کوئی غیر مقلد انصاف ودیانت کے ساتھ یہ بتائے کہ وہ جس عالم ومفتی کے بتائے ہوئے فتوی پر عمل کرتا ہے، تو کیا وہ اس مفتی اور عالم کو مطاع حقیقی سمجھ کر ایسا کرتا ہے، یا ان کو شارح شریعت سمجھ کر، بھلی ہوئی بات ہے کہ وہ اس مفتی اور عالم کے حکم اور فتوی کو حکم شرع ہی سمجھ کر عمل کرتا ہے، اس مفتی اور عالم کے حکم وفتوی کو خود ساختہ ذاتی حکم سمجھ کر نہیں عمل کرتا تو پھر تقلید شخصی سے انحراف وگریز اور اسے شرک وبدعت قرار دینے کے باوجود اسی روش کو اختیار کرنا، کہاں کی دانش مندی ہے۔ یہ سوائے خود فریبی، نافہمی اور قہر درویش برجان درویش کے اور کیا ہے؟ اطیعو اللہ واطیعو الرسول و اولی الامر منکم کے علاوہ صلاح وفلاح اور حزم واحتیاط کی کوئی دوسری سبیل ممکن ہی نہیں، اس لیے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون

نئے دور کے جدید مسائل اہل علم کو دعوت فکر وتحقیق دے رہے ہیں

مولانا سید شاہ محمد اشتیاق عالم شہبازی
سجادہ نشین خانقاہ عالیہ شہبازیہ، مولانا چک، بھاگلپور (بہار)

یاد ان نے کیا ہے مجھ کو بھی　　　　بندہ مسکین کیا شمار میں ہے

ماہنامہ جام نور نوع بہ نوع خصوصیت کے اعتبار سے ترقی کے مختلف مدارج اور مقبولیت عامہ کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ حالات کے تقاضوں کو قریب سے دیکھنا اور اسی اعتبار سے اپنے آپ کو سجانا اور سنوارنا اس کی خصوصیت بن چکی ہے۔ اکثر ضروری اور کبھی غیر ضروری مباحث وآراء سے اس کے اوراق بھرے پڑے نظر آتے ہیں۔ عزیزم آپکی جہد پیہم لائق تحسین ہے۔

جام نور کا یہ شمارہ اجتہاد وتقلید نمبر ہے، اس کی خبر آپ کے مرسلہ مکتوب سے معلوم ہوئی اور اس کی اہمیت آپ کے پچھلے ماہ کے اداریہ سے واضح ہوگئی۔ میں بذات خود مذکورہ عنوان کے تعلق سے آپ کے موقف کے ساتھ ہوں اور اس سچائی سے کسی اہل فکر ونظر کو انکار نہیں ہونا چاہیے کہ دور حاضر میں سلفیت کے نام پر غیر مقلدیت کا فتنہ ہمارے ارد گرد بھی اپنی منصوبہ بند حکمت عملی کی بدولت پاؤں پسار رہا ہے اور ہماری نئی نسلیں اس دام ہمرنگ زمیں کا شکار ہوتی چلی جارہی ہیں۔ میں خود اس موضوع پر ایک رسالہ لکھنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا مگر مختلف موضوعات پر پے در پے میری کتابیں شائع ہوتی رہیں اور یہ موضوع اب تک تشنہ تحریر رہا۔

اجتہاد وتقلید کے عنوان سے بحث وتمحیص دور جدید کی دریافت نہیں، اسلاف نے انتہائی شد ومد کے ساتھ کتاب وسنت، اجماع وقیاس کے وسیلے سے اس پر ہزاروں ہزار دلائل اپنی تصانیف کثیرہ میں جمع کر دیے ہیں اور سیکڑوں مباحثے اور مناظرے ہو چکے ہیں مگر افسوس یہ کہ عربی وفارسی زبان تو کجا ہماری نئی نسل اردو زبان سے بھی نا آشنائی کی حد تک دور ہوتی چلی جارہی ہے۔ اسلاف کے وہ علمی ذخیرے یا تو کتب خانوں میں بند ہیں یا معدودے چند علماء ومحققین کے سینوں اور ان کی آنکھوں میں محفوظ ہیں، آپ نے ہم لوگوں کی گوں ناگوں مصروفیات کے پیش نظر مبسوط مقالہ لکھنے کی فرمائش سے آزاد کر دیا ہے، آپ کی اس نوازش پہ سو جان سے قربان۔ مزید کرم افزائی یہ کہ ہماری حقیر رائے کو وقیع رائے کا تمغہ عنایت فرما کر زیادہ سے زیادہ فل اسکیپ سائز کے ایک صفحہ پر محدود کر دیا ہے اور وہی آپ کا مطلوب ہے۔ اب میں کہوں تو کیا کہوں اور لکھوں تو کیا لکھوں، بہر کیف آپ کے پاس ''لکھ پتی'' حضرات کافی ہیں، جو شرق وغرب، شمال وجنوب میں اہل قلم میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کی ایک پہچان ہے، ان کے قیمتی مضامین رسالہ کی زینت بنیں گے ہی۔ اس کا مطالعہ ہماری نئی نسل کو مختلف جہتوں سے اجتہاد وتقلید کی اہمیت اور امت کے اجماعی موقف سے آشنا کرے گا۔ عصر حاضر کا موجودہ منظر نامہ

سیاسی، معاشی، تمدنی حالات اور سائنسی ایجادات وانکشافات کے تناظر میں روز بروز نت نئے مسائل سے ابھرتا چلا جا رہا ہے۔ بعض غیر ضروری مسائل ہیں تو بہت سارے ضروری مسائل بھی ساتھ ساتھ ہیں اور وہ لحہ بہ لحہ محققین کو دعوت غور و فکر دے رہے ہیں۔ آوارگی قلم سے محفوظ رہتے ہوئے اور فقہ اسلامی کے اصول ومبادی کی اہمیت، افادیت اور موزونیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حل طلب بھی ہیں اور عقدہ کشا بھی۔

جی تو یہی چاہ رہا ہے کہ آپ کے دیے گئے عنوان پر جی کھول کر گفتگو کی جائے لیکن ایک طرف زیادہ سے زیادہ ''فل اسکیپ سائز'' کے ایک صفحہ کی شرط اور دوسری جانب اپنی علالت، جو Paralysis کی صورت میں اچانک دو ماہ قبل سامنے آئی (اور بحمد اللہ روبہ صحت ہونے کا سفر تیزی سے جاری ہے) تفصیلی گفتگو کی راہ میں حائل ہے۔ میری بہت ساری دعائیں اور نیک خواہشات آپ کے اور آپ کے رسالہ کے ساتھ ہیں۔ مولائے قدیر اسے ہدایت کا ذریعہ اور قبولیت عامہ کا سبب بنائے...... آمین

غیر مقلدین کے پاس آخر جدید مسائل کے حل کی صورت کیا ہے؟

مفتی عبد المنان کلیمی

مفتی شہر مرادآباد، وصدر مجلس علمائے ہند، مرادآباد

امت مسلمہ کا اجماعی موقف ''ائمہ مجتہدین کی تقلید'' صرف جائز و مستحسن ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے، وہ بھی آج کے سائنسی ایجادات و انکشافات کے ترقی پذیر دور میں جہاں ائمہ مجتہدین کی تقلید اور ان کے فقہی واجتہادی کارناموں سے استفادہ کرنا اور ان کی گراں قدر رایوں سے اتفاق کرتے ہوئے، ان کی تقلید و پیروی کرنا، اس قدر ضروری ہوگیا ہے کہ اس سے مجال انکار کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

غیر مقلدین کا یہ سمجھنا اور کہنا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید شرک و بدعت ہے یہ ان کی کھلی، جہالت اور اصول شرع قرآن وحدیث اور اجماع صحابہ کے آفاقی اور ہمہ گیر مدلول و منطوق سے ناواقفیت کی بین دلیل ہے۔

منکرین تقلید جو اپنے آپ کو سلفی اور اہل حدیث کہتے ہیں ان کے پاس اس سوال کا کیا جواب ہے کہ ان میں جو لوگ عربی داں اور علوم قرآن و حدیث سے واقف ہیں، وہ بزعم خویش قرآن وحدیث پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن ان کے متبعین جو بالکل قرآن وحدیث کے علم سے نابلد ہیں یا ان کے پاس اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ قرآن وحدیث سے مسائل جان سکیں تو آخر وہ کیا کریں گے؟ ایسے لوگ قرآن وحدیث کے مقلد کہلائیں گے یا ان غیر مقلد علما کے پیروکار سمجھے جائیں گے؟

علاوہ ازیں غیر مقلدین کیا یہ بتا سکتے ہیں کہ حضور اقدس تاجدار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ اتنی اور اتنی ہیں اور ہمیں ان تمام حدیثوں کا علم یقین وجامع حاصل ہے۔ اس تعلق سے اگر وہ کچھ بھی موشگافی کی جرأت کرتے ہیں تو اس میں بھی سابقین علمائے حدیث کی تقلید واتباع کی واضح جھلک موجود ہوگی۔

یہی وہ دور رس نکات ہیں جس بنا پر علمائے متبحرین نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ ضلالت وگمرہی اور فکری کج روی سے محفوظ رہنے کا اب صرف یہی ایک راستہ ہے کہ امت مسلمہ چار فقہائے مجتہدین پر اعتماد و بھروسہ کرکے ان کی تقلید کو ضروری سمجھے اور ان کے فقہی اجتہادات پر عمل پیرا ہوکر سعادت اخروی حاصل کرے۔ کیونکہ ان ائمہ مجتہدین کی تقلید فی الحقیقت قرآن وحدیث اور اجماع صحابہ کی پیروی سمجھی جائے گی۔

مجھے حیرت ہے اس ترقی یافتہ دور کے غیر مقلدین پر جو یکسر تقلید واجتہاد کا انکار کردیتے ہیں اور ان سب علمی، فقہی اور اجتہادی کارناموں کو ضلالت وگمراہی کا نام دیتے ہیں۔ کیا یہ غیر مقلدین بتا سکتے ہیں کہ آج کے بہت سارے جدید مسائل جن کا واضح ذکر قرآن وحدیث اور اجماع صحابہ میں نہیں اور امت مسلمہ ان مسائل سے دوچار ہے، آخر ان مسائل کے حل اور تصفیہ کا ان کے نزدیک کیا طریقہ ہے؟ تو لامحالہ کسی نہ کسی اسٹیج پر ان غیر مقلدین علما کو اجتہاد و تقلید ہی کا سہارا لینا پڑے گا۔

اسی وجہ سے شیخی واستاذی، شمس العلماء والفقہا حضرت علامہ قاضی شمس الدین قدس سرہ العزیز درس حدیث کے وقت اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''دیگر فرق باطلہ کے مقابلہ میں غیر مقلدین (نام نہاد اہل حدیث) سے بحث ومناظرہ کرنا نہایت آسان ہے''۔ اور حضرت شمس العلماء اس کی

بہت ساری تمثیلیں دیا کرتے تھے جس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہ غیر مقلدین اپنے دعوی باطلہ میں کہاں تک حق بجانب ہیں وہ سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتاب مستطاب ''الفضل الموہبی'' کا غیر جانب دارانہ وحقیقت پسندانہ مطالعہ فرمائیں یقیناً وہ اپنے نظریات و افکار سے یکسر رجوع پر مجبور ہوں گے اور قبول حق کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

خصوصی شمارے کے موضوعات اقتضائے حال کے مطابق ہوتے ہیں

ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی
پرنسپل کوٹھی، طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی

محترم خوشتر صاحب! اسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ　مؤقر جام نور کی خصوصی پیش کش ''تقلید واجتہاد نمبر'' کی اشاعت پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے، آپ خصوصی شماروں کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں وہ اقتضائے حال کے مطابق ہوتے ہیں، ہمارا المیہ یہ ہے کہ ان موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے لیے جس کھلے ذہن کی ضرورت ہے، اس کا نشان اہل قلم کی نجی مجلسوں میں تو ملتا ہے، کاغذ قرطاس تک آتے آتے اس کا رنگ پھیکا ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی ہیئت بھی بدل جاتی ہے۔ جام نور کا ایک خصوصی شمارہ ''جہاد نمبر'' بھی شائع ہو چکا ہے، جس کی ملک وبیرون ملک میں خوب تعریف وتوصیف ہوئی ہے، یقیناً اس سے آپ بہت زیادہ خوش نہیں ہوئے ہوں گے، کیونکہ تعریف وتوصیف جیسے الفاظ کی مارکیٹ ویوہی کم ہوگئی ہے، اہل قلم نے جہاد کے تعلق سے جتنا زور قلم صرف کیا ہے، اس سے زیادہ مواد بہ مجبوری حالات ان کے بطون دماغ میں محبوس ہو کر رہ گئے ہیں، جس جہاد کے تعلق سے اسلام کی شخصیات مجاہد کے نام سے معروف ہیں، اس جہاد پر کھل کر گفتگو کرنے سے اکثر اہل علم نے غض بصر کیا ہے۔

اب آپ نے ''تقلید واجتہاد نمبر'' کا اعلان کر کے نہایت پر خطر وادی میں قدم رکھ دیا ہے، قیاس واجتہاد کی اہمیت وضرورت پر اہل فکر ونظر کے مضامین کا مجھے بے صبری سے انتظار رہے گا۔ ☆☆☆

باب

۳

اصحاب اجتہاد

مولانا نفیس احمد مصباحی ☆

امام اعظم ابو حنیفہ کا علمی مقام اور اجتہادی خدمات

مقررہ عنوان پر گفتگو سے پہلے میں جام نور کے چیف ایڈیٹر ادیب شہیر محترم مولانا خوشتر نورانی زیدحبہ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ماہ نامہ جام نور کے ''اجتہاد و تقلید نمبر'' میں قلمی شرکت کے لیے مجھ ناچیز کو دعوت دی اور میرے لیے مذکور بالا عنوان کا انتخاب فرما کر سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع عنایت کیا۔

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے علمی مقام اور گونا گوں دینی و علمی خدمات کو اجاگر کرنا اور اقوام عالم کے سامنے رکھنا ہم حنفیوں کی مذہبی اور اخلاقی ذمہ داری ہے اور وقت کا تقاضا بھی۔ کیوں کہ ''اسلاف بے زار مٹھی بھر جماعت'' نے ائمہ مجتہدین خصوصا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے تعلق سے بے سروپا باتیں وضع کر لی ہیں، اور انہیں بنیاد بنا کر شب و روز اس پروپگنڈہ میں مصروف ہے کہ مذہب حنفی کتاب وسنت کے خلاف صرف قیاس اور رائے کی کمزور اور غیر اسلامی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس مٹھی بھر جماعت کے افراد بخاری و مسلم کی چند حدیثیں رٹ کر ''رٹو طوطے'' کی طرح ہر جگہ موقع بے موقع انہیں کو دہراتے ہیں اور ''اہل حدیث'' ہونے کا دم بھرتے ہیں، اور امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر ''مجتہد مطلق'' اور عظیم الشان تابعی امام کی تقلید کو شرک، بدعت اور نہ جانے کیا کیا ٹھہراتے ہیں، جب کہ حضرت امام کے صدیوں بعد پیدا ہونے والے افراد مثلا ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن عبد الوہاب نجدی، میاں نذیر حسین دہلوی، نواب صدیق حسن خاں قنوجی، عبد الرحمن مبارکپوری، ناصر الدین البانی اور عبد اللہ بن باز کی باتیں آنکھ بند کر کے بے چون وچرا مانتے اور ان پر عمل کرتے ہیں اور ہم مقلدوں سے کہیں آگے بڑھ کر ''کورانہ تقلید'' کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ہر ہوش مند انسان یہ جانتا ہے کہ ہم (احناف) اس باعظمت امام کی تقلید کرتے ہیں جن کے زمانے سے عہد رسالت کا فاصلہ ایک صدی سے بھی کم ہے، جن کی دینی اور علمی عظمتوں کا ایک جہان معترف ہے، جن کی علمی رفعتوں کی بشارت اور پیشین گوئی خود حدیث نبوی میں موجود ہے اور جنہوں نے فقہ کے اصول اور فروع کی تدوین فرما کر بعد میں آنے والے علما اور فقہا اور پوری امت مسلمہ پر زبردست احسان فرمایا ہے۔ جب کہ یہ اسلاف بے زار لوگ، ان لوگوں کے مقلد ہیں جن کے زمانے اور عہد رسالت کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے اور سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں جن کی کوئی دینی و علمی حیثیت نہیں۔

اس عنوان کے دو بنیادی جز ہیں (۱) حضرت امام اعظم کا علمی مقام (۲) آپ کی اجتہادی خدمات۔

اب میں حضرت امام کی بارگاہ میں اس امید کے ساتھ محبتوں کی سوغات لیے حاضر ہوں کہ اللہ تعالی اپنے اس نیک اور مقبول بندے کے فیوض و برکات سے مجھ حقیر کو بھی بہرہ ور فرمائے گا اور میرے لیے دنیا و آخرت کی سعادتوں اور فیروز مندیوں کا سامان کرے گا۔

احب الصالحین و لست منهم

لعل الله یرزقنی صلاحا

(میں تو خود نیک نہیں، (مگر) نیکوں سے اس امید پر محبت کرتا ہوں کہ اللہ تعالی (ان کی برکت سے) مجھے بھی نیک بنا دے۔

نام اور نسب:۔ آپ کا اسم گرامی ''نعمان''، کنیت ''ابو حنیفہ''، اور آپ کے والد کا نام ثابت ہے۔ آپ کا خاندان ابتداء کابل میں آباد تھا، آپ کے دادا جن کا نام بعض تذکرہ نگاروں نے زوطی اور بعض نے زوطی لکھا ہے۔ جنگ میں گرفتار ہو کر کوفہ آئے اور مسلمان ہو کر بنی تیم اللہ کی ولاء میں رہ پڑے ان کا پیشہ تجارت تھا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ان کی ملاقات ہوئی اور اس حد تک تعلقات تھے کہ وہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں ہدیے بھیجتے رہتے تھے (**مناقب الامام الاعظم للکردری**، ج ا، ص ۶۵، ۶۶)

ان کے بیٹے ''ثابت'' بھی کوفہ میں تجارت کرتے تھے۔ خود سیدنا امام اعظم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ میں ان کے والد کی روٹیوں

☆ Jamia Ashrafia, Mubarak pur, Azam Garh, U P

کی ایک دوکان تھی (مناقب الامام الاعظم للموفق بن احمد ج ۱ ص ۱۶۲،)

ولادت ووفات:- امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سن ولادت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں (۱) ۶۱ھ میں (۲) ۷۰ھ میں (۳) ۷۷ھ میں (۴) ۸۰ھ میں۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں حزاحم بن داؤد کی روایت سے ۶۱ھ اور ابونعیم کی روایت سے ۸۰ھ سن ولادت لکھا ہے۔
(تاریخ خطیب، ج ۱۳ ص ۳۳۰)

ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں مذکورہ بالا دونوں اقوال کو نقل کر کے ۸۰ھ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔(وفیات الاعیان، ج ۵ ص ۳۱۳/۳۱۴) جب کہ میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ آپ کی ولادت ۷۷ھ میں ہوئی۔اس کی دلیل یہ ہے کہ قاضی ابو عبداللہ حسین بن علی یمری (متوفی ۴۳۶ھ) نے بہ سند متصل احمد بن الصلت سے (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ، ص ۴)، اور امام ابن عبد البر نے بہ سند متصل ابو جعفر محمد بن عمرو، اور عبداللہ بن جعفر رازی، اور محمد بن سماعہ سے، امام اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کے سب سے عظیم شاگرد امام ابو یوسف کی یہ روایت نقل کی ہے

''میں نے ابوحنیفہ (رضی اللہ عنہ) سے سنا کہ میں ۹۳ھ میں اپنے والد کے ساتھ حج کو گیا، اس وقت میری عمر سولہ سال تھی۔ میں نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس کے پاس لوگوں کا زبردست ہجوم تھا۔ میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ یہ بوڑھے بزرگ کون ہیں؟ انہوں نے کہا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، ان کا نام عبداللہ بن حارث بن جزء ہے۔ پھر میں نے دریافت کیا ان کے پاس کیا ہے؟ تو والد صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس وہ حدیثیں ہیں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ مجھے ان کی بارگاہ میں لے چلیں تا کہ میں بھی ان سے حدیث سن لوں۔ یہ سننے کے بعد والد صاحب آگے بڑھے، اور لوگوں کی بھیڑ چیرتے ہوئے چلے، اس طرح میں ان کے قریب پہنچ گیا اور میں نے ان سے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: من تفقہ فی دین اللہ کفاہ اللہ ہمہ و رزقہ من حیث لا یحتسبہ۔

''اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے دین کی بصیرت (سمجھ) حاصل کر لی اللہ تعالیٰ اس کا اور اس کی فکروں کا نگہبان ہو جاتا ہے اور اسے اس طرح روزی دیتا ہے جو اس کے شان وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔''

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ۹۳ھ میں امام اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کی عمر سولہ سال تھی جس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی ولادت ۷۷ھ میں ہوئی۔

ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں آپ کی وفات کے بارے میں اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کی وفات رجب کے مہینہ میں ہوئی، اور کہا گیا ہے کہ شعبان کے مہینہ میں ہوئی۔ اور سال وفات ۱۵۰ھ ہے، اور کہا گیا ہے کہ جمادی الاولیٰ کی گیارہ تاریخ تھی۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ سن وفات ۱۵۳ھ ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔(وفیات الاعیان، ج ۵ ص ۳۱۳، ۳۱۴)

اس طرح وفات کے وقت آپ کی عمر تراسی ۸۳ سال تھی، کیوں کہ آپ کی ولادت ۷۷ھ اور وفات ۱۵۰ھ ہے۔

تحصیل علم:-تعلیم کے متعلق ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ ابتدا میں انہوں نے قراءت، حدیث، نحو، ادب، شعر اور کلام وغیرہ ان تمام علوم کا مطالعہ کیا تھا جو اس زمانے میں رائج اور متداول تھے۔(مناقب الامام الاعظم للموفق بن احمد المکی ج ۱ ص ۵۷، ۵۸) اس کے بعد آپ نے علم کلام میں مہارت پیدا کی اور ایک مدت تک اس میں مصروف رہ کر اتنا کمال پیدا کر لیا کہ اس فن میں ان کی طرف نگاہیں اٹھنے لگیں۔ ان کے مشہور شاگرد زفر بن ہذیل رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ امام اعظم نے ان سے کہا ''پہلے میں علم کلام سے دل چسپی رکھتا تھا اور اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ میری طرف اشارے کیے جاتے تھے۔'' (مصدر سابق، ص ۵۹)

موفق بن احمد مکی نے یحییٰ بن شیبان کے حوالے سے حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے ''میں ایک ایسا شخص تھا جسے علم کلام کی بحثوں میں مہارت حاصل تھی۔ ایک زمانہ ایسا گزرا کہ میں ان ہی بحثوں اور مناظروں میں مشغول رہتا تھا اور چوں کہ مباحثے اور مناظرے کرنے والے لوگ زیادہ تر بصرہ میں تھے اس لیے میں بیس سے زیادہ مرتبہ بصرہ گیا۔ کبھی کبھی سال چھ مہینے بھی وہاں رہ کر خوارج کے مختلف گروہوں اباضیہ، صفریہ، اور حشویہ سے مناظرے کرتا رہا۔ میں علم کلام کو سب سے اعلیٰ علم سمجھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ یہی اصل دین ہے۔ ایک مدت کے بعد دل میں یہ خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سے یہ باتیں پوشیدہ نہیں تھیں جن میں ہم مباحثے کرتے ہیں۔ وہ حضرات ان باتوں کو جانتے ہوئے ان کی طرف راغب نہیں ہوئے، بلکہ ان باتوں سے منع ہی کیا اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ حضرات دین کے مسائل اور ابواب فقہ میں غور وخوض کرتے تھے اسی میں ان کی گفتگو ہوتی تھی، اور اسی میں ان کی مجلسیں ہوا کرتا تھیں، اور وہ اسی کی تعلیم وتربیت دیا کرتے تھے، اسی میں ان کے مناظرے ہوا کرتے تھے۔ اور اسی حالت میں صحابہ کا دور ختم ہوا، اور ان ہی کی پیروی تابعین نے کی ہے۔

جب ہم پر یہ بات عیاں ہوگئی تو ہم نے مناظرے چھوڑ دیے اور علم کلام میں غور وخوض کرنا چھوڑ دیا، سلف صالحین کا طریقہ اختیار کیا اور اصحاب معرفت کی صحبت میں بیٹھے۔ (مصدر سابق، ۵۹)

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ امام اعظم رضی اللہ عنہ نے ابتدا میں علم کلام میں کمال پیدا کیا اور اس علم کے ارباب اختصاص اور اصحاب کمال میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ آپ نے اس وقت فلسفہ ومنطق اور مذاہب کے اختلافات کے متعلق بھی کافی واقفیت حاصل کر لی تھی، کیوں کہ ان علوم پر دسترس حاصل کیے بغیر کوئی انسان علم کلام میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ بعد میں انھوں نے فقہ کی تدوین اور قرآن وحدیث سے شرعی احکام کے استنباط اور مسائل کے استخراج میں منطقی استدلال اور عقلیات کے استعمال کا جو کمال دکھایا اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں جو شہرت حاصل کی وہ اسی ابتدائی ذہنی وفکری تربیت کا نتیجہ تھی۔

ایک مدت تک علم کلام میں مشغول رہنے کے بعد آپ نے اس سے رخ موڑا اور علم فقہ (قانون اسلام) کی تدوین اور قرآن وحدیث کی طرف متوجہ ہوئے اس کے تعلق سے درج ذیل دو روایتیں بھی ملتی ہیں:

(۱) امام اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کے جلیل القدر شاگرد امام زفر بن ہذیل علیہ الرحمہ حضرت امام اعظم سے ان کا بیان نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

''علم کلام میں میری شہرت اتنی بڑھ گئی کہ میری طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جانے لگا۔ میری مجلس حضرت حماد کے حلقۂ درس کے پاس ہی تھی۔ ایک دن ایک عورت نے آکر مجھ سے سوال کیا کہ ایک شخص کی بیوی ایک باندی ہے، وہ شخص چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کو صحیح طریقہ سے طلاق دے، وہ کتنی طلاقیں دے؟ میں نے اس خاتون سے کہا تم جاکر حماد سے پوچھو، پھر وہ جو جواب دیں مجھے باخبر کرو۔ عورت حماد کے پاس گئی، پھر یہ جواب لائی کہ جب عورت حیض سے پاک ہو جائے خاوند اس سے ہم بستری نہ کرے، اور اس کو ایک طلاق دے دے اور بیوی سے الگ رہے۔ جب عورت کو دوسری مرتبہ حیض آجائے اور وہ اس سے پاک ہو جائے تو پھر بھی شوہر اس سے الگ رہے، ہم بستری نہ کرے اور دوسری طلاق دے دے اور عورت سے علاحدہ رہے پھر جب اس کو تیسرا حیض آجائے اور اس سے پاک ہو جائے وہ اپنے شوہر کے نکاح سے نکل گئی۔ اب اس کو اختیار ہے جس سے چاہے نکاح کرے۔ عورت سے یہ جواب سن کر میں نے اپنی جوتیاں اٹھائیں اور حضرت حماد کے حلقۂ درس میں جاکر بیٹھ گیا۔ پھر جو کچھ ان سے سنتا یاد کر لیتا۔ حضرت حماد کا معمول تھا کہ وہ دوسرے دن اپنے شاگردوں سے پڑھے ہوئے اسباق کے متعلق سوال کرتے تھے۔ ان کے شاگرد جواب میں غلطیاں کرتے تھے، لیکن مجھے بالکل صحیح صحیح یاد ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا حضرت حماد نے مجھ کو اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ عنایت فرمائی۔''

(تاریخ بغداد للخطیب، ج ۱۳/ص ۳۳۳، مناقب الامام الاعظم للموفق المکی، ج ۱/ص ۵۵)

حضرت امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ امام اعظم (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا گیا کہ آپ کو علم فقہ کی طرف کس طرح رغبت ہوئی؟ تو فرمایا ''میں نے جب علم میں رسوخ حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو تمام علوم پر نظر ڈالی۔ علم کلام اور عقائد کے متعلق خیال آیا کہ اس میں فائدہ کم ہے اور عاقبت کا کھٹکا ساتھ لگا ہوا ہے۔ اور علم نحو وادب کے متعلق خیال آیا کہ میرا مشغلہ بچوں کو پڑھانا بن جائے گا۔ اور شعر وشاعری میں بے جا تعریف وتوصیف اور غلط بیانی کے سوا کچھ نہیں۔ اور علم قرائت میں دوسروں کو پڑھا دینے کے سوا کچھ نہیں۔ اور تفسیر میں کلام لمبی سے بحث ہے، اور یہ نازک مرحلہ ہے۔ اور میں نے جب فقہ پر نظر ڈالی تو مجھ پر اس کی جلالت شان ظاہر ہوئی۔ اس میں علماء، مشائخ اور ارباب علم ودانش سے واسطہ پڑتا ہے۔ اقامت دین، فرائض کی ادائیگی اور عبادت کے طور طریقوں کی معرفت کا تعلق اسی مبارک علم سے ہے''۔

(تاریخ بغداد للخطیب، ج ۱۳/ص ۳۳۱، ملخصاً)

دور فقاہت میں اگر چہ آپ مناظرہ کی طرف راغب نہ تھے، لیکن

اتفاقی طور پر کبھی کبھی شیعہ اور خوارج سے مناظرے کی نوبت آجاتی تھی۔ مناظرے کے دوران آپ کی حاضر جوابی، تبحر علمی اور ذہانت وفطانت قابل دید ہوتی تھی۔ آپ کے سیرت نگاروں نے اس زمانے کے کچھ مناظروں اور مباحثوں کے احوال لکھے ہیں۔ ان ہی میں خوارج کے ساتھ آپ کا وہ تاریخی مناظرہ بھی ہے جو کسی زانیہ اور شرابی کے مومن ہونے یا نہ ہونے سے متعلق تھا۔ امام اعظم رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی متعدد آیتیں پڑھ کر مناظرہ کرنے والے خوارج کو اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا کہ زناکار اور شرابی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہونے کے باوجود دائرۂ ایمان سے خارج نہیں ہوتے آخر کار ان خوارج نے اپنا مذہب چھوڑا اور مذہب اہل سنت اختیار کر لیا۔

اس مناظرہ کی تفصیل علامہ موفق بن احمد مکی علیہ الرحمہ نے ''مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ، ج ۱ ص ۱۲۴، ۱۲۵) پر لکھی ہے۔

علمی مقام:۔ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا علمی مقام نہایت بلند ہے، وہ علم وتفقہ کے وہ نیر تاباں ہیں جس کی درخشانی اور تابانی کے سامنے آسمان نے علم ومعرفت کے نجوم وکواکب کی درخشانی گم ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کے علمی مقام کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حدیث نبوی میں ان کے متعلق بشارت آئی ہے۔ امام ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں یہ حدیث روایت کی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو کان العلم بالثریا لتناولہ رجال من ابناء فارس۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر علم ثریا کے پاس ہوتا تو فارس کے کچھ افراد اسے حاصل کر لیتے۔ اور شیخ شیرازی نے ''الالقاب'' میں حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کی ہے۔

لو کان العلم معلقاً بالثریا لتناولہ قوم من ابناء فارس ۔ اگر علم ثریا پر آویزاں ہوتا تب بھی کچھ ابنائے فارس اسے حاصل کر لیتے۔

امام جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب ''تبییض الصحیفۃ فی مناقب الامام ابی حنیفۃ'' (ص ۳۷۳) پر اس طرح کی روایتیں جمع کی ہیں اور لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان احادیث میں امام ابوحنیفہ کے تعلق سے بشارت دی ہے۔

علامہ سیوطی کے شاگرد سیرت شامی کے مصنف علامہ محمد بن یوسف شامی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ علامہ محمد بن عابدین شامی رد المحتار میں لکھتے ہیں:

فی حاشیۃ الشبراملسی علی المواہب عن العلامۃ الشامی تلمیذ السیوطی، قال: ماجزم بہ شیخنا من ان ابا حنیفۃ ھو المراد من ھذا الحدیث ظاہر لا شک فیہ، لانہ لم یبلغ من ابناء فارس فی العلم مبلغہ احد (ردالمحتار، ج ۱، ص ۳۷)

''مواہب لدنیہ کے شبراملسی کے حاشیہ میں ہے کہ علامہ سیوطی کے شاگرد علامہ شامی نے کہا ''وہ جس پر ہمارے شیخ نے یقین کیا ہے کہ ابوحنیفہ ہی اس حدیث سے مراد ہیں بالکل ظاہر ہے کہ اس میں کچھ شک وشبہ نہیں اس لیے کہ ابنائے فارس میں سے کوئی بھی ان کے درجہ تک نہیں پہنچا''۔

علامہ ابن حجر ہیتمی مکی شافعی اپنی کتاب ''الخیرات الحسان'' میں اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فیہ معجزۃ ظاہرۃ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم حیث اخبر بما سیقع (الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان، ص ۱۳، دار الکتب العربیۃ الکبری، مصر)

''یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا ہوا معجزہ ہے کہ آئندہ ہونے والی بات کی خبر دی''۔

حدیث کی ان بشارتوں سے امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے علمی مقام ومرتبہ کی بلندی آفتاب نیم روز کی طرح نظر آتی ہے جس کا اعتراف نہ صرف ان کے مقلدین اور متبعین نے کیا ہے بلکہ دوسرے ائمہ مجتہدین بھی کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں جس کی ایک جھلک آپ نے ابھی ملاحظہ فرمائی۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

اور آپ کے علمی مقام کی بلندی کی سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ آپ کی ذات میں ایک مجتہد کے سارے اوصاف کامل طریقے پر موجود تھے، تمام اہل علم نے آپ کو ''مجتہد مطلق'' مانا ہے۔ اب مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان اوصاف وشرائط کو ذکر کر دیا جائے جو ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے تاکہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے کہ اس مجتہد مطلق، مجتہدوں کے سرخیل، فقہ واجتہاد کے امام اعظم کا علمی مقام کتنا بلند ہے۔

شرائط اجتہاد:۔ امام غزالی لکھتے ہیں: کہ مجتہد کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ اس کا علم تمام علوم شرعیہ کا احاطہ کیے ہوئے ہو اور وہ غور وفکر سے

حکم شرعی معلوم کرسکتا ہو، در یہ جانتا ہو کہ مسائل کے استنباط میں کون سے علوم مقدم ہیں اور کون سے علوم مؤخر ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ نیک اور پرہیز گار ہو اور وہ گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہو جو اس کی بدنامی کا باعث اور پرہیزگاری کے خلاف ہوں۔

شرعی علوم میں کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور وہ علوم عقلیہ ہیں جن کی مدد سے استدلال کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کتاب اللہ کے علم سے یہ مراد نہیں کہ قرآن مجید کی تمام آیتوں کا علم ہو، بلکہ ان آیتوں کا علم ضروری ہے جن کا تعلق احکام سے ہے اور وہ پانچ سو آیتیں ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ پانچ سو آیات حفظ ہوں، بلکہ اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ آیات قرآن مجید میں کہاں کہاں ہیں تاکہ ضرورت کے وقت ان کو تلاش کرسکے۔ اسی طرح حدیث کا عالم ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ تمام احادیث مرویہ کا حافظ ہو بلکہ یہ ضروری ہے کہ احکام سے متعلق احادیث کا اسے علم ہو۔ مثلاً سنن ابوداؤد یا سنن بیہقی میں کن احکام سے متعلق حدیثیں ہیں۔ اور مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ اسے معلوم ہو کہ کس حکم سے متعلق حدیث سنن ابوداؤد یا سنن بیہقی میں کس جگہ مذکور ہے تاکہ ضرورت کے وقت وہ حدیث تلاش کرسکے۔

اجماع کا علم ہونے سے یہ مراد ہے کہ مجتہد کو اس کا علم ہو کہ اس سے پہلے کن کن مسائل پر اجماع ہو چکا ہے تاکہ اسکا حکم خلاف اجماع نہ ہو۔ یا اس کو یہ علم ہو کہ یہ مسئلہ اس زمانے میں پیدا ہوا ہے اور اس سے پہلے اس پر اجماع نہیں تھا، علوم عقلیہ سے مراد یہ ہے کہ مثلاً ایجاب صغریٰ وکلیت کبریٰ شکل اول کے نتیجہ دینے کی شرط ہے۔ اسی طرح (قیاس کی) باقی تینوں شکلوں کی شرطیں بھی وہ جانتا ہو، تاکہ نتیجہ تک پہنچنے میں غلطی نہ کرے۔ کتاب وسنت کے علم کے لیے کچھ علوم مشترک ہیں جن کا مجتہد کو جاننا ضروری ہے۔ ان میں سے لغت، نحو، صرف اور علم بلاغت ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ مجتہد ان علوم میں زمخشری، اصمعی، خلیل اور سیبویہ کی طرح ہو، بلکہ ضروری یہ ہے کہ اس کو ان علوم میں اس قدر مہارت ہو کہ وہ قرآن اور حدیث کے معنی عربی اسلوب کے مطابق صحیح طور پر سمجھ سکے۔ مجتہد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عقائد کے دلائل سے واقف ہو، یہاں تک کہ وہ عقلی دلائل سے عالم کا حادث ہونا، اللہ تعالیٰ کا موجود ہونا اور اس کا واجب الوجود اور ایک ہونا ثابت کرسکے، اور ضرورت نبوت قرآن مجید کی وجہ اعجاز اور نبی اکرم ﷺ کی نبوت اور ختم نبوت، عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کرسکے، تاکہ مسائل کلام وعقائد میں اس کا علم مقلد سے ممتاز ہو۔ لغت، صرف ونحو، علم بلاغت اور علم کلام کے علاوہ مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کلام صریح، کلام مجمل، حقیقت، مجاز، عام، خاص، محکم، متشابہ، مطلق، مقید وغیرہ کا بھی عالم ہو۔ ان علوم کے علاوہ مجتہد کے لئے کتاب وسنت کے ناسخ اور منسوخ کا علم بھی ضروری ہے اس لئے کہیں وہ ایسا حکم نہ بیان کردے جو قرآن یا حدیث میں منسوخ ہو چکا ہو۔

یہ تو وہ علوم تھے جو کتاب وسنت میں مشترک ہیں۔ اور جو کچھ علوم وہ ہیں جو سنت (حدیث) کے ساتھ خاص ہیں۔ جن کی وجہ سے اسے صحیح اور غیر صحیح روایت اور مقبول اور نہ مقبول حدیث کے درمیان تمیز ہو سکے۔ اسی طرح اس کے لئے علم درایت حدیث اور علم اسماء الرجال کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ اسے حدیث کے راویوں کی معرفت اور انکی عدالت کا علم ہو سکے۔ (المستصفیٰ للامام محمد الغزالی، جلد ۲، ص ۳۵۰ تا ۳۴۵ (ملخصا) مطبوعہ مطبعہ کبریٰ، بولاق، مصر ۱۲۹۴ھ، علامہ آمدی الاحکام فی اصول الاحکام للعلامہ سیف الدین الآمدی، ج ۳، ص ۱۳۹ تا ۱۴۰، مطبعہ محمد علی واولادہ، مصر اور علامہ بزدوی، الموافقات للعلامہ ابراہیم بن موسی الشاطبی، ج ۴، ص ۶۷، مطبعہ محمد علی واولادہ، مصر نے بھی مجتہد کی یہی شرائط بیان کی ہیں۔ امام غزالی نے مذکورہ بالا تفصیل شرائط اجتہاد لکھنے کے بعد یہ صراحت بھی کی ہے۔

''ہم نے اجتہاد کی شرائط میں جو علم قرآن، علم حدیث، علم اصول قرآن، علم اصول حدیث، علم اسماء ارجال، علم اجماع، علم استدلال، علم لغت ونحو اور عقائد کے ضروری مسائل کی جانکاری ہونے کا ذکر کیا ہے۔ یہ شرط مجتہد مطلق کے لیے ہے جو تمام شرعی احکام میں اجتہاد کرتا ہے۔ مجتہد کے لیے یہ شرط نہیں کہ وہ ہر مسئلہ کا جواب دے سکے، کیوں امام مالک علیہ الرحمہ سے چالیس مسائل پوچھے گئے جن میں سے چھتیس کے بارے میں انھوں نے کہا ''میں نہیں جانتا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بہت سے مسائل میں توقف کیا، بلکہ صحابہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی بہت سے مسائل میں توقف کیا تو جس کا اسے علم ہو اس میں فتوی دے اور جس کا علم نہ ہو اس میں توقف کرے۔'' (المستصفیٰ للغزالی ج ۲، ص ۳۵۴ (ملخصا) ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آئی کہ مجتہد کے لیے قرآن وحدیث اور ان کے متعلقات کا زبر

دست علم ضروری ہے۔اور سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ، شرائط اجتہاد کے جامع کامل تھے۔اس کا عملی ثبوت وہ ہزاروں شرعی اور قانونی مسائل ہیں جوان کے اجتہاد کے نتیجہ میں منقح ہو کر سامنے آئے۔

ارباب فضل وکمال کا اعتراف: - اسی بنیاد پر ایک جہان علم آپ کا مداح اور آپ کی علمی جلالت، فقہی بصیرت اور مجتہدانہ صلاحیت کا خطبہ پڑھتا نظر آتا ہے۔خود آپ کے ہم عصر علماء، محدثین اور قرآن وحدیث کے رمز شناس آپ کی علمی جلالت کی شہادت دے رہے ہیں۔ آئندہ سطور میں ارباب فضل وکمال کی شہادتیں پڑھیے اور حضرت امام کی عظمتوں کو سلام عقیدت پیش کیجیے۔

امام محمد بن ادریس شافعی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

الناس فی الفقه عیال علی ابی حنیفة: لوگ فقہ میں ابو حنیفہ کے محتاج ہیں۔

اور یہ بھی فرمایا: **من اراد ان یعرف الفقه فلیلزم ابا حنیفة و اصحابه**- جو شخص فقہ کی معرفت حاصل کرنا چاہے اسے چاہیے کہ ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کا دامن پکڑے۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ والرضوان جب بغداد گئے تو اما اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ والرضوان کی قبر پر حاضر ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی، جس میں (تکبیر تحریمہ کے علاوہ) کسی بھی تکبیر میں رفع یدین نہیں کیا۔اور ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ فجر کی نماز تھی۔پھر انہوں نے اس میں دعاے قنوت نہیں پڑھی (جب کہ ان کے یہاں فجر کی نماز میں دعاے قنوت پڑھی جاتی ہے) کسی نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو امام شافعی نے جواب دیا اس امام کے ادب وتعظیم کی وجہ سے مجھے گوارا نہ ہوا کہ میں ان کی بارگاہ میں ان کے مذہب کے خلاف عمل کروں۔

امام مالک علیہ الرحمۃ والرضوان سے امام شافعی نے پوچھا: آپ نے امام ابوحنیفہ کو کیسا پایا؟ تو انہوں فرمایا:

رایت رجلا لو کلمک فی الساریة ان یجعلها ذهبا لقام بحجته - میں نے انہیں ایسا باکمال آدمی پایا کہ اگر وہ اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہتے تو اپنی دلیل سے ثابت کر دیتے۔

حضرت فضیل بن عیاض نے فرمایا: امام ابوحنیفہ کی جلالت شان کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ مشہور فقیہ اور صاحب ورع وتقوی تھے۔

حضرت نضر بن شمیل کا بیان ہے کہ لوگ فقہ کے معاملے میں خوابیدہ تھے۔یہاں تک کہ ابوحنیفہ نے انہیں بیدار کر دیا۔

(الخیرات الحسان، ص۵ مطبوعہ دار الکتب العربیۃ الکبری، مصر)

امام المحدثین جلیل القدر تابعی سیمان اعمش، صحابی رسول سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے ممتاز شاگرد ہیں۔ان سے کسی شخص نے چند مسائل پوچھے۔اس وقت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی عنہ بھی وہاں حاضر تھے۔امام اعمش رضی اللہ عنہ نے وہ مسائل امام اعظم سے پوچھے، آپ نے فوراً ان کے جوابات دیے، امام اعمش نے کہا یہ جواب آپ نے کہاں سے دیے؟ آپ نے فرمایا ان حدیثوں سے جو میں نے خود آپ ہی سے سنی ہیں، پھر آپ نے وہ حدیثیں سند کے ساتھ سنا دیں۔امام اعمش نے کہا

حسبک ماحدثتک به فی مائة یوم تحدثنی به فی ساعة واحدة ، ماعلمت انک تعمل بهذه الاحادیث ، یا معشر الفقهاء ، انتم الاطباء و نحن الصیادلة، وانت ایها الرجل اخذت بکلا الطرفین (مصدر سابق، ص ۶۱) بس کیجیے، جو حدیثیں میں نے سو دن میں آپ کو سنائیں آپ گھڑی بھر میں مجھے سنا دیتے ہیں، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ان حدیثوں میں یوں عمل کرتے ہیں۔اے گروہ فقہاء! تم طبیب ہو اور ہم (محدثین) دوا فروش ہیں اور اے ابوحنیفہ! تم تو فقہ وحدیث دونوں کے جامع ہو۔

حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا: کوئی شخص امام ابوحنیفہ سے زیادہ اس لائق نہیں ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، کیوں کہ وہ متقی، پرہیز گار، صاحب ورع وتقوی عالم اور فقیہ ہیں، انہوں نے علم کو اس طرح منکشف کیا جس طرح کسی نے نہیں کیا۔

امام احمد بن حنبل نے ان کے بارے میں کہا کہ وہ علم، تقوی، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی دل چسپی میں اس مقام پر فائز تھے کہ اسے کوئی دوسرا حاصل نہیں کر سکتا۔خلیفہ منصور کی طرف سے انہیں قاضی (جج) کا عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، یہاں تک کہ انہیں اس کے لیے کوڑے مارے گئے، مگر انہوں نے یہ عہدہ قبول نہ کیا۔

(امام بخاری کے استاذ) مکی ابن ابراہیم فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔حضرت معمر فرماتے ہیں: میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو عربی زبان وادب کے معاملے میں اچھی طرح گفتگو کر سکتا ہو، قیاس بھی کر سکتا ہو، حدیث کی شرح بھی کر سکتا ہو، اور ان امور میں امام ابوحنیفہ سے زیادہ علم رکھتا ہو۔

خلف بن ایوب فرماتے ہیں اللہ تعالی نے رسول اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم عطا فرمایا، آپ سے صحابۂ کرام کو ملا، ان سے تابعین کی طرف منتقل ہوا، پھر امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کو ملا، جو شخص چاہے راضی ہو اور جو چاہے ناراض ہو۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں: اگر اللہ تعالی امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری رضی اللہ عنہما کے ذریعہ میری مدد نہ فرماتا تو میں عوام الناس میں سے ہوتا۔ یہ بھی فرمایا کہ اگر میں نے امام ابوحنیفہ کی زیارت نہ کی ہوتی تو میں بھی سکے (کرسی) بیچنے والوں میں سے ہوتا۔ اور اگر ابوحنیفہ نہ ہوتے تو میں مبتدعین میں سے ہوتا۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو فرماتے: حضرت عبد اللہ بن مسعود نے اس طرح فرمایا، اور امام ابو حنیفہ نے اس طرح فرمایا۔ حاضرین میں سے کوئی شخص کہتا کہ آپ ابوحنیفہ کو ابن مسعود کے ساتھ ملا رہے ہیں تو فرماتے اگر تو امام ابوحنیفہ کو دیکھتا تو عظیم شخصیت کو دیکھتا۔

حضرت سفیان ثوری علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں ''ہم امام ابوحنیفہ کے سامنے ایسے تھے جیسے باز کے سامنے چڑیاں ہو، ابوحنیفہ علماء کے سردار ہیں۔''

حضرت جعفر بن ربیع کہتے ہیں: ''میں پانچ سال امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر رہا، میں نے ان سے زیادہ طویل خاموشی والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ جب ان سے کسی مسئلے کے بارے میں سوال کیا جاتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے علم کا دریا بہ رہا ہو'' ۔ یہ بھی فرمایا کہ سب سے بڑے فقیہ امام ابوحنیفہ ہیں، میں نے فقاہت میں ان جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا ۔(تحصیل التعریف فی معرفۃ الفقہ والتصوف للشیخ عبد الحق المحدث الدہلوی (مترجم) ص ۲۱۹، ۲۲۰، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)

حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں: میں امام اوزاعی علیہ الرحمہ سے ملنے شام گیا۔ بیروت میں ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھ سے کہا اے خراسانی! کوفہ میں یہ کون بدعتی پیدا ہوا ہے؟ یہ سن کر میں گھر آیا۔ امام ابوحنیفہ کی کتابیں نکالیں اور ان سے چیدہ چیدہ مسائل چھانٹ کر جمع کیے اس کام میں مجھے تین دن لگ گئے پھر میں امام اوزاعی کے پاس گیا، وہ مسجد کے مؤذن بھی تھے اور امام بھی۔ میرے ہاتھ میں کتابیں دیکھ کر کہا: یہ کیا ہے؟ میں نے ہاتھ بڑھا کر کتابیں ان کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے ایک مسئلہ پر نظر ڈالی، جس پر لکھا تھا ''قال النعمان'' (نعمان نے فرمایا) اذان کہہ کر کھڑے کھڑے پہلا حصہ پڑھ لیا۔ پھر کتاب آستین میں رکھ لی، پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر کتاب آستین سے نکالی اور پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ دیکھ کر کہا: یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ میں نے کہا: ایک شیخ ہیں جن سے عراق میں ملاقات ہوئی تھی۔ کہا: ''بڑی شان کے شیخ ہیں۔ جاؤ ان سے بہت سا فیض حاصل کرو۔ میں نے کہا: یہ وہی ابوحنیفہ ہیں جن سے آپ نے مجھے روکا تھا (تاریخ بغداد للخطیب البغدادی، ج ۱۳، ص ۳۳۸)

امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ''میں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ حدیث کے معنی یا حدیث کے نکات جاننے والا کسی کو نہیں دیکھا اور میں نے جس مسئلے میں بھی امام ابوحنیفہ سے مخالفت کی، اور غور کیا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ ان کا مذہب آخرت کی نجات کے لیے زیادہ کار آمد ہے۔ اور جب بھی مسائل کی استنباط میں میرا جھکاؤ ایک حدیث کی طرف ہوتا تھا تو حال یہ ہوتا کہ وہ حدیث صحیح کی مجھ سے کہیں زیادہ بصیرت رکھتے تھے میں اپنے والدین سے پہلے امام ابوحنیفہ کے لیے دعا کرتا ہوں'' ۔(مصدر سابق ص ۳۴۰)

حضرت ابو مطیع حکم بن عبد اللہ کہتے ہیں: ''میں نے کسی محدث کو سفیان ثوری سے زیادہ فقیہ نہیں دیکھا مگر امام ابوحنیفہ ان سے کہیں زیادہ فقیہ تھے۔'' (مصدر سابق ص ۳۴۱)

حضرت یزید بن ہارون سے پوچھا گیا کہ امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری میں کون بڑا فقیہ ہے تو انہوں نے کہا: ''سفیان ثوری حفظ حدیث میں بڑھے ہوئے ہیں اور امام ابوحنیفہ فقہ میں، پھر فرمایا کہ میں نے حضرت ابو عاصم نبیل سے یہی سوال کیا تھا کہ ان دونوں میں کون بڑا فقیہ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ کا ایک غلام بھی سفیان ثوری سے بڑا فقیہ ہے۔'' (مصدر سابق ص ۳۴۲)

حضرت علی بن عاصم نے فرمایا: کہ اگر ابوحنیفہ کے علم کو ان کے زمانے کے علماء کے علم کے ساتھ تولا جائے تو امام ابوحنیفہ کے علم کا پلہ بھاری رہے گا۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ مقاضی الصمیری، بحوالہ سوانح بے بہائے امام اعظم ابوحنیفہ ص ۹۵)

امام اعظم ابوحنیفہ اور قرآن کریم:- امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو قرآن کریم سے حد درجہ شغف تھا۔ آپ قرآن مجید کے حافظ تھے، کثرت سے قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اور نماز میں قرآن مجید ختم کیا

کرتے تھے قاضی ابوعبداللہ صیمری نے خارجہ بن مصعب کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ نے ایک رکعت میں قرآن مجید ختم فرمایا ہے۔
(اخبار ابی حنیفہ واصحابہ، ص ۴۵)

حضرت خارجہ بن مصعب کہتے ہیں: خانۂ کعبہ میں چار اماموں نے پورا قرآن مجید ختم کیا ہے، حضرت عثمان بن عفان، حضرت تمیم داری، حضرت سعید بن زبیر، حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ حضرت یحیٰ بن نصر کہتے ہیں: کان ابو حنیفة ربما ختم القرآن فی شهر رمضان ستین ختمة۔ (ترجمہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ امام ابوحنیفہ صرف رمضان کے مہینہ میں ساٹھ مرتبہ قرآن مجید ختم کرتے تھے) مذکورہ بالا روایت سے خوب واضح ہوگیا کہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا تلاوت قرآن سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، وہ قرآن سے شرعی احکام کا استنباط بھی فرماتے تھے اور کثرت سے تلاوت بھی فرماتے تھے۔

امام اعظم اور حدیث:۔ اوپر شرائط اجتہاد کے بیان میں گذرا کہ ایک مجتہد کے لیے دیگر اسلامی علوم کے ساتھ علم حدیث میں بھی مہارت ضروری ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ علم حدیث میں مرتبہ کمال پر فائز تھے یہ اور بات ہے کہ انہوں نے وقت کے تقاضے کے پیش نظر روایت حدیث کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، بلکہ ان سے مسائل کا استخراج فرماکر امت مسلمہ کے لیے آسانیاں پیدا فرمادیں۔ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کی مشکلات حل فرمادیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ وہ زمانہ ہے جس میں حدیث کا درس شباب پر تھا، تمام بلاد اسلامیہ میں اس کا درس زور وشور سے جاری تھا، اور آپ کا وطن کوفہ تو اس خصوص میں ممتاز تھا، علم حدیث میں اس شہر کا امتیاز امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کے دور تک باقی رہا۔ اسی لیے موصوف اتنی بار کوفہ گئے کہ خود فرمایا کہ میں کوفہ کتنی بار گیا شمار نہیں کرسکتا۔''

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ والرضوان نے حدیث کی تحصیل کی ابتداء اپنے وطن کوفہ سے کی۔ کوفہ میں کوئی ایسا محدث نہ تھا جس سے آپ نے حدیث کا علم حاصل نہ کیا ہو۔ ابوالمحاسن شافعی ہیں، مگر انہوں نے کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ ترانوے وہ مشائخ ہیں جو کوفے کے رہنے والے تھے یا کوفہ میں تشریف لائے جن سے امام اعظم نے حدیث اخذ کی۔

امام اعظم کے مشائخ حدیث میں امام شعبہ بن حجاج بھی ہیں، انہیں دو ہزار حدیثیں یاد تھیں، امام سفیان ثوری نے انہیں ''امیر المومنین فی الحدیث'' کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا ''اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث اتنی عام نہ ہوتی'' ۱۶۰ھ میں ان کا وصال ہوا۔ جب سفیان ثوری کو ان کی وفات کی خبر پہونچی تو فرمایا آج علم حدیث مر گیا۔ امام شعبہ کو حضرت امام اعظم سے قلبی لگاؤ تھا غائبانہ ان کی ذہانت اور خدا رسی کی تعریف کرتے رہتے۔ ایک بار امام اعظم کا ذکر آیا تو امام شعبہ نے فرمایا ''جس طرح مجھے یقین ہے کہ آفتاب روشن ہے اسی یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم اور ابوحنیفہ ہم نشین ہیں''۔

امام بخاری کے استاذ حضرت یحیٰ بن معین سے کسی نے امام اعظم کے بارے میں پوچھا کہ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ تو فرمایا۔ اس قدر کافی ہے کہ شعبہ نے انہیں حدیث روایت کرنے کی اجازت دی، شعبہ آخر شعبہ ہی تھے''۔ (عقود الجمان باب دہم)

کوفہ کے علاوہ حضرت امام نے بصرہ کے محدثین سے حدیثیں حاصل کیں اس وقت بصرہ بھی علم وفضل خصوصاً علم حدیث کا بہت اہم مرکز تھا۔ یہ شہر بھی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بسایا تھا اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ شہر مرکز حدیث بن گیا تھا۔ علامہ ذہبی جیسے علم حدیث کے ماہر نے دوسرے اور تیسرے دور میں جن عظیم شخصیتوں کو محدث کا خطاب دیا ہے وہ بصرہ یا کوفہ کے رہنے والے یا یہاں اکثر آمد ورفت رکھنے والے تھے۔

جب امام اعظم نے ان دونوں مراکز سے ہزاروں ہزار احادیث حاصل کیں مگر امام اعظم ہونے کے لیے ابھی اور بہت کچھ ضرورت باقی تھی، یہ کمی حرمین طیبین سے پوری فرمائی۔ یہ گذر چکا کہ آپ نے پہلا سفر حج ۹۶ھ میں کیا تھا، اور آپ نے اپنی عمر میں پچپن حج کیے ۱۵۰ھ میں آپ کا وصال ہوا تو اس سے ثابت ہوا کہ ۹۶ھ کے بعد کسی سال حج ناغہ نہ ہوا اس لیے حرمین طیبین کی حاضری کا التزام ۹۶ھ کے بعد پچپن بار مسلسل بلاناغہ ہوئی۔ اس عہد میں حضرت عطا بن رباح مکہ معظمہ میں سرتاج محدثین تھے، یہ تابعی تھے دو سو صحابہ کرام کی صحبت کا شرف انہیں حاصل تھا خصوصاً حضرت ابن عباس، ابن عمر، اسامہ، جابر، زید بن ارقم، عبداللہ بن سائب، عقیل بن رافع، ابو دردا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے احادیث سنی تھیں۔ یہ محدث ہونے کے ساتھ بہت عظیم مجتہد بھی تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ عطاء کے ہوتے ہوئے لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں'' ایام حج میں حکومت کی طرف

سے اعلان عام ہو جاتا تھا کہ عطا کے علاوہ اور کوئی فتویٰ نہ دے۔ اساطین محدثین، امام اوزاعی، امام زہری، امام عمر بن دینار، انھیں کے تلمیذ خاص تھے۔ امام اعظم جب ان کی خدمت میں تلمذ کے لیے حاضر ہوئے تو حضرت عطا نے ان کا عقیدہ پوچھا، امام اعظم نے کہا: میں اسلاف کو برا نہیں کہتا، گنہگاروں کو کافر نہیں کہتا، تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں اس کے بعد عطا نے آپ کو حلقہ درس میں شامل کر لیا۔ دن بدن حضرت امام کی ذکاوت وفطانت روشن ہوتی گئی، جس سے حضرت عطا ان کو اپنے قریب سے قریب تر کرتے گئے یہاں تک کہ حضرت عطا دوسروں کو ہٹا کر حضرت امام اعظم کو اپنے پہلو میں بٹھاتے۔ حضرت امام جب مکہ حاضر ہوتے تو اکثر حضرت عطا کی خدمت میں حاضر رہتے۔ ان کا وصال ۱۱۵ھ میں ہوا تو ثابت ہوا کہ تقریباً بیس سال ان سے استفادہ کرتے رہے۔

مکہ معظمہ میں حضرت امام نے وقت کے ایک اور امام حضرت عکرمہ سے علم حاصل کیا۔ عکرمہ سے کون واقف نہیں یہ حضرت علی، ابن عمر، عقبہ بن عمرو، صفوان، جابر، ابو قتادہ، ابن عباس رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شاگرد ہیں۔ تفسیر وحدیث میں تقریباً ستر مشہور ائمہ تابعین ان کے شاگرد ہیں۔ جب حضرت امام اعظم مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے تو فقہائے سبعہ میں سے دو بزرگ باحیات تھے ایک سلیمان جن کا دوسرا نمبر تھا۔ یہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے۔ دوسرے حضرت سالم جو حضرت فاروق اعظم کے پوتے، اور حضرت عبد اللہ بن عمر کے صاحبزادے تھے۔ حضرت امام اعظم نے خصوصیت سے ان دونوں اماموں سے احادیث اخذ کیں، ان کے علاوہ دوسرے ائمہ احادیث سے بھی فیض پایا۔ (نزہۃ القاری ج۱ ص ۱۲۰/۱۲۲ مطبوعہ دائرۃ البرکات گھوسی۔ مئو، ۱۹۸۴ھ)

علامہ ابن حجر ہیتمی شافعی نے لکھا ہے کہ "حضرت امام اعظم نے چار ہزار مشائخ سے جو کہ ائمہ تابعین تھے اور دوسرے حضرات سے حدیثیں اخذ کی ہیں۔ اسی بنا پر علامہ ذہبی اور دوسرے علماء نے حضرت امام کا شمار محدثین کے طبقہ حفاظ میں کیا ہے۔"

پھر آگے لکھتے ہیں: "جس نے یہ خیال کیا کہ آپ حدیث کا بہت کم اہتمام کرتے تھے اس نے تساہل سے کام لیا، یا حسد کی بنا پر یہ بات کہی ہے یہ بات ایسے شخص کے متعلق کیسے صحیح ہو سکتی ہے جس نے بے شمار مسائل کا استنباط فرمایا ہو، اور دلائل کے ذریعہ مخصوص طریقہ استنباط میں پہلا شخص ہو۔ جس کا بیان اس کے اصحاب نے اپنی تالیفات میں کیا ہے۔ بات در اصل یہ ہے کہ وہ مسائل کے استخراج واستنباط کے کام میں مصروف تھے۔ اس لیے ان کی روایتیں نہیں پھیلیں، جس طرح حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی روایتیں ان کی مصروفیات کی وجہ سے کم ہوئیں کہ یہ حضرات عام مسلمانوں کے فلاح وبہبود کے کاموں میں مصروف تھے۔ اس کے برخلاف ان صحابہ کی روایتیں زیادہ پھیلیں جو عمر اور علم دونوں میں ان سے کم تھے۔ یہی حال امام شافعی اور امام مالک کا ہے کہ ان کی روایتیں ان افراد سے کم ہیں جو صرف احادیث روایت کرنے کا کام کرتے تھے۔ جیسے ابو زرعہ اور ابن معین۔ کیوں کہ حضرت امام مالک اور امام شافعی مسائل کے استنباط میں مصروف رہتے تھے، پھر یہ بھی واضح رہے کہ روایت حدیث بغیر درایت کے بہت زیادہ قابل تعریف نہیں ہے۔ علامہ ابن عبد البر نے اس کی مذمت میں ایک باب قائم کیا ہے"۔

(الخیرات الحسان، ص ۶۰، مطبعہ دار الکتب العربیہ الکبری، مصر)

حضرت امام اعظم کے عظیم ترین محدث ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے روشن دلیل فقہ حنفی ہے۔ فقہ حنفی کے کلیات وجزئیات کو اٹھا کر دیکھیے، جن جن ابواب اور جن جن مسائل میں صحیح اور غیر معمول، غیر منسوخ، کتاب اللہ کے غیر معارض احادیث ہیں وہ سب فقہ حنفی کے مطابق ہیں۔ اس کی تصدیق کے لیے امام طحاوی کی معانی الآثار، علامہ بدر الدین کی عمدۃ القاری شرح بخاری، علامہ کمال الدین ابن ہمام کی فتح القدیر، شرح ہدایہ، شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی فتح المنان فی تائید مذہب النعمان، اور لمعات التنقیح شرح مشکوٰۃ مصابیح، اور ملا علی بن سلطان قاری کی مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح کا مطالعہ کیا جائے اور کچھ خلجان رہ جائے تو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کے مجموعہ فتویٰ "العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ" کا مطالعہ کیا جائے تو میرے دعوے کی حرف بہ حرف تصدیق ہو جائے گی۔

امام اعظم کی اجتہادی خدمات:۔ امام اعظم علیہ الرحمۃ والرضوان کی اجتہادی خدمات بھی گوناگوں ہیں، ان میں دو خدمات بہت اہم ہیں (۱) علم شریعت کی باضابطہ تدوین (۲) ائمہ مجتہدین اور فقہائے اسلام کی زبردست ٹیم تیار کرنا۔

مگر ان خدمات اور کارناموں کی اہمیت سمجھنے کے لیے خلافت راشدہ کے زمانے سے لے کر ان کے عہد تک کے حالات کا ایک سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔ خلافت راشدہ حقیقت میں محض ایک سیاسی

حکومت نہ تھی، بلکہ نبوت کی مکمل نیابت تھی۔اس کا کام صرف اتنا نہ تھا کہ ملک کا نظم ونسق چلائے، امن قائم کرلے اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کرے، بلکہ وہ مسلمانوں کی سماجی اور معاشرتی زندگی میں معلم، مربی اور مرشد کے وہ تمام فرائض انجام دیتی تھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ظاہری حیات طیبہ میں انجام دیا کرتے تھے اور اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ اسلامی حکومت میں دین حق کے پورے نظام کو اس کی اصلی شکل وروح کے ساتھ چلائے، اور دنیا میں مسلمانوں کی پوری اجتماعی طاقت دین حق اور کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کی خدمت پر لگادے۔اس بنا پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ صرف خلافت راشدہ ہی نہ تھی بلکہ خلافت مرشدہ بھی تھی۔

مگر خلافت راشدہ کے ختم ہوتے ہی امت مسلمہ کی قیادت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ایک سیاسی قیادت جس کی باگ ڈور امراء اور سلاطین کے ہاتھوں میں رہی اور دوسری دینی ومذہبی قیادت، جسے امت کے علما اور صلحا نے سنبھال لیا تھا اس دور تفریق میں سیاسی قیادت اور سربراہی عام طور پر امور سلطنت، جہانگیری، اور ملکی نظام کو چلانے کا کام کرتی تھی اور اسے اس کی پرواہ نہ تھی کہ یہ کام شرعی نقطہ نظر سے جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام۔اس طرح مذہبی اور سیاسی قیادت کی تفریق سے اسلام کا قانونی نظام عملی طور پر حد درجہ متاثر ہو چکا تھا۔

قانون شریعت کی تدوین:-امام ابوحنیفہ کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے انھیں اسلامی تاریخ میں لازوال عظمت عطا کی، یہ تھا کہ انھوں نے اس عظیم خلا کو اپنے بل بوتے پر پر کردیا جو خلافت راشدہ کے بعد شوریٰ کا سدباب ہوجانے سے اسلام کے قانونی نظام میں واقع ہو چکا تھا۔

ایک صدی کے قریب اس حالت پر گزر جانے سے جو نقصان رونما ہو رہا تھا اسے ہر صاحب فکر آدمی محسوس کررہا تھا۔ایک طرف مسلم ریاست کی حدود سندھ سے اسپین تک پھیل چکی تھی۔بیسوں قومیں اپنے الگ الگ تمدن رسم ورواج اور حالات کے ساتھ اس میں شامل ہو چکی تھیں۔اندرون ملک مالیات کے مسائل، تجارت وزراعت کے مسائل اور صنعت وحرفت کے مسائل، شادی بیاہ کے مسائل، دیوانی اور فوج داری قوانین وضوابط کے مسائل روز بروز سامنے آرہے تھے۔بیرون ملک دنیا بھر کی قوموں سے اس عظیم ترین سلطنت کے تعلقات تھے اور ان میں جنگ، صلح، سفارتی روابط، تجارتی لین دین، بحری وبری مسافرت، کسٹم وغیرہ کے مسائل پیدا ہو رہے تھے اور مسلمان چونکہ اپنا ایک مستقل نظریہ، اصول حیات اور بنیادی قانون رکھتے تھے، اس لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے ہی نظام قانون کے تحت ان بے شمار نت نئے مسائل کو حل کریں۔غرض ایک طرف وقت کا یہ زبردست چیلنج تھا، جس سے اسلام کو سابقہ درپیش تھا اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ ملوکیت کے دور میں کوئی ایسا مسلّم آئینی ادارہ باقی نہ رہا تھا جس میں مسلمانوں کے معتمد علیہ اہل علم اور فقیہ اور مدبرین بیٹھ کر ان مسائل کو سوچتے اور شریعت کے اصولوں کے مطابق ان کا مستند حل پیش کرتے جو سلطنت کی عدالتوں اور اس کے سرکاری محکموں کے لئے قانون قرار پاتا اور پوری مملکت میں یکسانی کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا۔

اس نقصان کو خلفاء، گورنر، حکام اور قاضی سب محسوس کررہے تھے، کیونکہ انفرادی اجتہاد اور معلومات کے بل پر روز مرہ پیش آنے والے اتنے مختلف مسائل کو بروقت حل کرلینا ہر مفتی، حاکم، جج اور ناظم محکمہ کے بس کا کام نہ تھا، اور اگر فرداً فرداً انھیں حل بھی کیا جاتا تھا تو اس سے بے شمار متضاد فیصلوں کا ایک جنگل پیدا ہو رہا تھا۔مگر دشواری یہ تھی کہ ایسا ایک ادارہ حکومت ہی قائم کرسکتی تھی، اور حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو خود جانتے تھے کہ مسلمانوں میں ان کا کوئی اخلاقی وقار واعتماد نہیں ہے۔ان کے بنائے فقہی کا سامنا کرنا تو درکنار ان کو برداشت کرنا بھی مشکل تھا۔ان کے تحت بنے ہوئے قوانین کسی حالت میں بھی مسلمانوں کے نزدیک اسلامی نظام قانون کا جز نہ بن سکتے تھے۔ابن المقفع نے اپنے رسالۃ الصحابۃ میں اس خلا کو پر کرنے کے لیے المنصور کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ خلیفہ اہل علم کی ایک کونسل بنائے جس میں ہر نقطہ نظر کے علماء پیش آمدہ مسائل پر اپنا اپنا علم اور خیال پیش کریں، پھر خلیفہ خود ہر مسئلہ پر اپنا فیصلہ دے اور وہی قانون ہو لیکن منصور اپنی حقیقت سے اتنا بے خبر نہ تھا کہ یہ حماقت کرتا۔اس کے فیصلے ابوبکر وعمر کے فیصلے نہ بن سکتے تھے۔اس کے فیصلوں کی عمر خود اس کی اپنی عمر سے زیادہ نہ ہوسکتی تھی، بلکہ اس کی زندگی میں بھی یہ توقع نہ تھی کہ پوری مملکت میں کوئی ایک مسلمان ہی ایسا مل جائے گا جو اس کے منظور کیے ہوئے قانون کی مخلصانہ پابندی کرے۔وہ ایک لادینی اور غیر مذہبی قانون تو ہوسکتا تھا مگر اسلامی قانون کا ایک حصہ ہرگز نہ ہوسکتا تھا۔

اس صورت حال میں امام ابوحنیفہ کو ایک بالکل نرالا راستہ سوجھا اور وہ یہ تھا کہ وہ حکومت سے بے نیاز رہ کر خود ایک غیر سرکاری مجلس وضع

قانون قائم کریں۔ یہ تجویز ایک انتہائی بدیع الفکر آدمی ہی سوچ سکتا تھا، اور مزید برآں اس کی ہمت صرف وہی شخص کرسکتا تھا جو اپنی قابلیت پر، اپنے کردار پر، اور اپنے اخلاقی وقار پر اتنا اعتماد رکھتا ہو کہ اگر وہ ایسا کوئی ادارہ قائم کر کے قوانین مدون کرے گا تو کسی سیاسی قوت نافذہ اور حکومتی دباؤ کے بغیر اس کے مدون کردہ قوانین اپنی خوبی، اپنی صحت، اپنی مطابقت اصول اور اپنے مدون کرنے والوں کے اخلاقی اثر کے بل پر خود نافذ ہوں گے، قوم خود ان کو قبول کرے گی اور سلطنتیں آپ سے آپ ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گی۔ امام اعظم اعلیٰ درجہ کے دوراندیش تھے، اپنی فراست ایمانی سے انہوں نے ان نتائج کو بھانپ لیا تھا جو فی الواقع ان کے بعد نصف صدی کے اندر ہی برآمد ہونے والے تھے وہ اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو جانتے تھے، مسلمانوں کے اجتماعی مزاج سے واقف تھے، اور وقت کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے انہوں نے ایک کمال درجہ کے دانا و دور اندیش انسان کی حیثیت سے بالکل صحیح اندازہ کرلیا کہ وہ اس خلا کو اپنی نجی حیثیت سے پُر کرسکتے ہیں اور ان کے پُر کرنے سے یہ خلا واقعی پُر ہوجائے گا۔

مجلس وضع قانون: -اس مجلس کے شرکا امام کے اپنے شاگرد تھے جن کو سالہا سال تک انہوں نے اپنے مدرسۂ قانون میں باقاعدہ قانونی مسائل پر سوچنے، علمی طرز پر تحقیقات کرنے اور دلائل سے نتائج مستنبط کرنے کی تربیت دی تھی ان میں سے قریب قریب ہر شخص امام کے علاوہ وقت کے دوسرے بڑے بڑے اساتذہ سے بھی قرآن حدیث، فقہ اور دوسرے مددگار علوم مثلاً لغت، نحو، ادب اور تاریخ وسیر کی تعلیم حاصل کرچکا تھا، مختلف شاگرد مختلف علوم کے متخصص اور ماہر سمجھے جاتے تھے مثلاً کسی کو قیاس اور علوم عقلیہ میں نمایاں مقام حاصل تھا، کسی کے پاس احادیث اور صحابہ کے فتاوی اور پچھلے خلفاء وقضاۃ کے نظائر کی وسیع معلومات تھیں، اور کوئی علم تفسیر یا قانون کے کسی خاص شعبے، یا لغت اور نحو یا مغازی کے علم میں اختصاص رکھتا تھا ایک دفعہ امام نے خود اپنی ایک گفتگو میں بتایا کہ یہ کس مرتبے کے لوگ تھے۔

''یہ ۳۶ رآدمی ہیں جن میں سے ۲۸ ر قاضی ہونے کے لائق ہیں، ۶ رفتوی دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور دو اس درجے کے آدمی ہیں کہ قاضی اور مفتی تیار کرسکتے ہیں''۔

(مناقب الامام الاعظم موفق المکی ج ۲/ ۲۴۶)

اس مجلس کا طریق کار جو امام کے معتبر سوانح نگاروں نے لکھا ہے وہ ہم خود انہیں کے الفاظ میں یہاں نقل کرتے ہیں علامہ موفق بن احمد المکی (م ۵۶۸ھ/۱۱۷۲ء) لکھتے ہیں

''ابو حنیفہ نے اپنا مذہب ان کے (یعنی اپنے فاضل شاگردوں کے) مشورے سے مرتب کیا ہے وہ اپنی حد وسع تک دین کی خاطر زیادہ سے زیادہ جاں فشانی کرنے کا جذبہ رکھتے تھے اور خدا اور رسول اور اہل ایمان کے لئے جو کمال درجہ کا اخلاص ان کے دل میں تھا اس کی وجہ سے انہوں نے شاگردوں کو چھوڑ کر یہ کام محض اپنی انفرادی رائے سے کر ڈالنا پسند نہ کیا وہ ایک ایک مسئلہ ان کے سامنے پیش کرتے تھے، اس کے مختلف پہلو ان کے سامنے لاتے تھے، جو کچھ ان کے پاس علم اور خیال ہوتا اسے سنتے اور اپنی رائے بھی بیان کرتے حتی کہ بعض اوقات ایک ایک مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مہینہ مہینہ بھر اور اس سے بھی زیادہ لگ جاتا تھا۔ آخر جب ایک رائے قرار پاجاتی تو اسے قاضی ابو یوسف کتب اصول میں ثبت کرتے''۔ (مرجع سابق، ص:۱۳۳)

عبد اللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ''ایک مرتبہ اس مجلس میں تین دن تک مسلسل ایک مسئلے پر بحث ہوتی رہی تیسرے دن شام کے وقت میں نے جب اللہ اکبر کی آوازیں سنیں تو پتہ چلا کہ اس بحث کا فیصلہ ہو گیا۔ (مناقب الامام الاعظم لکردری، ۲/ ۱۰۸)

امام کے ایک اور شاگرد ابو عبد اللہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں امام ابو حنیفہ اپنی جو رائیں ظاہر کرتے تھے انہیں وہ بعد میں پڑھوا کر سن لیا کرتے تھے چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''میں امام کے اقوال ان کو پڑھ کر سنا تا تھا ابو یوسف (مجلس کے فیصلے ثبت کرتے ہوئے) ساتھ ساتھ اپنے اقوال بھی درج کر دیا کرتے تھے اس لیے پڑھتے وقت میں کوشش کرتا تھا کہ ان کے اقوال چھوڑ تا جاؤں اور صرف امام کے اپنے اقوال انہیں سناؤں ایک روز میں چوک گیا اور دوسرا قول بھی میں نے پڑھ دیا امام نے پوچھا یہ دوسرا قول کس کا ہے؟ (مرجع سابق ۲/ ۱۳۶)

اس کے ساتھ المکی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کے جو فیصلے لکھے جاتے تھے ان کو الگ الگ عنوانات کے تحت کتابوں اور ابواب میں مرتب بھی امام ابو حنیفہ کی زندگی میں کر دیا گیا تھا۔

''ابو حنیفہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس شریعت کے علم کو مدون کیا

ان سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا تھا ابوحنیفہ نے اس کو کتابوں اور جدا جدا عنوانات کے تحت ابواب کی شکل میں مرتب کردیا تھا" (مرجع ص:۴۱)

اس مجلس میں جیسا کہ ہم پہلے موفق المکی ہی کے حوالے سے بتا چکے ہیں، ۸۳؍ ہزار قانونی مسائل طے کیے گئے تھے اس میں صرف وہی مسائل زیر بحث نہیں آتے تھے جو اس وقت تک عملاً لوگوں کو یا ریاست کو پیش آچکے تھے، بلکہ معاملات کی امکانی صورتیں فرض کرکر کے ان پر بھی بحث کی جاتی اور ان کا حل تلاش کیا جاتا تھا، تاکہ آئندہ اگر کبھی کوئی نئی صورت پیش آجائے جواب تک نہ پیش آئی ہو تو قانون میں پہلے سے اس کا حل موجود ہو یہ مسائل قریب قریب ہر شعبہ قانون سے متعلق تھے، بین الاقوامی قانون (جس کے لیے "السیر" کی اصطلاح مستعمل تھی) دستوری قانون، دیوانی وفوج داری قانون قانون شہادت ضابطۂ عدالت، معاشی زندگی کے ہر شعبے کے الگ قوانین، نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ شخصی احوال کے قوانین، اور عبادات کے احکام، یہ سب عنوانات ہم کو ان کتابوں کی فہرستوں میں ملتے ہیں جو اس مجلس کے فراہم کردہ مواد سے امام ابو یوسف نے اور پھر امام محمد بن حسن الشیبانی نے بعد میں مرتب کیں۔

اس باقاعدہ تدوین قانون اور اجتماعی وضع قانون کا اثر یہ ہوا کہ انفرادی طور پر کام کرنے والے مجتہدوں، مفتیوں اور قاضیوں کا کام ساقط الاعتبار ہوتا چلا گیا قرآن وحدیث کے احکام اور سابقہ فیصلوں اور فتاوی کے نظائر کی چھان بین کرکے اہل علم کی ایک مجلس نے ابوحنیفہ جیسے نکتہ رس آدمی کی صدارت ورہنمائی میں شریعت کے جو احکام منقح صورت میں نکال کر رکھ دیئے تھے اور پھر اصول شریعت کے تحت وسیع پیمانے پر اجتہاد کرکے زندگی کے ہر پہلو میں پیش آنے والی امکانی ضرورتوں کے لیے جو قابل عمل قوانین مرتب کردیے تھے، ان کے بعد متفرق افراد کے مدون کیے ہوئے احکام مشکل ہی سے وقیع ہوسکتے تھے، اس لیے جوں ہی یہ کام منظر عام پر آیا عوام اور حکام اور قضاۃ، سب اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوگئے، کیوں کہ یہ وقت کی مانگ تھی اور لوگ مدت سے اسی چیز کے حاجت مند تھے، چنانچہ مشہور فقیہ یحییٰ بن آدم (م:۲۰۳ھ ۸۱۸ء) کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کے اقوال کے آگے دوسرے فقہا کے اقوال کا بازار سرد پڑ گیا، انہیں کا علم مختلف علاقوں میں پھیل گیا اسی پر خلفا اور ائمہ اور حکام فیصلے کرنے لگے اور معاملات کا چلن کی پر ہوگیا (مرجع سابق ص ۴۱) خلیفہ مامون (۱۹۸-۲۱۸ھ ۸۱۳-۸۳۳ء) کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے یہ حالت ہو گئی کہ ایک دفعہ وزیر اعظم فضل بن سہیل کو ابوحنیفہ کے ایک مخالف فقیہ نے مشورہ دیا کہ حنفی فقہ کا استعمال بند کرنے کے احکام جاری کردیے جائیں وزیر اعظم نے باخبر اور معاملہ فہم لوگوں کو بلاکر اس معاملے میں رائے لی، انہوں نے بالاتفاق کہا یہ بات نہیں چلے گی" اور سارا ملک آپ لوگوں پر ٹوٹ پڑے گا جس شخص نے آپ کو یہ مشورہ دیا ہے، وہ ناقص العقل ہے" وزیر نے کہا، میں خود بھی اس خیال سے متفق نہیں ہوں اور امیر المومنین بھی اس قول پر راضی نہ ہوں گے (مصدر سابق ۲،۱۵۷،۱۵۸) اس طرح تاریخ کا یہ اہم واقعہ رونما ہو کہ شخص واحد کی قائم کی ہوئی نجی مجلس وضع قوانین کا مرتب کیا ہوا قانون محض اپنے اوصاف اور اپنے مرتب کرنے والوں کی اخلاقی ساکھ کے بل پر ملکوں اور سلطنتوں کا قانون بن کر رہا اس کے ساتھ دوسرا اہم نتیجہ اس کا یہ بھی ہوا کہ اس نے مسلم مفکرین قانون کے لیے اسلامی قوانین کی تدوین کا ایک نیا راستہ کھول دیا بعد میں جتنے دوسرے بڑے بڑے فقہی نظام بنے اور اپنے طرز اجتہاد اور نتائج اجتہاد میں چاہے اس سے مختلف ہوں، مگر ان کے لیے نمونہ یہی تھا جسے سامنے رکھ کر ان کی تعمیر کی گئی ہذا باضابطہ قانون اسلام اور قانون شریعت کے مدون سب سے پہلے شخص امام اعظم ابوحنیفہ ہی ہیں۔

علامہ شمس الدین محمد بن یوسف صالحی شافعی دمشقی لکھتے ہیں:

"یقیناً امام ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم شریعت کی تدوین کی ہے اور اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے پھر امام مالک بن انس نے مؤطا کی ترتیب میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کی ہے، امام ابوحنیفہ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں ہے، کیونکہ حضرات صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کا اعتماد اپنی قوت حافظہ پر تھا، جب امام ابوحنیفہ نے دیکھا کہ علم شریعت اکناف عالم میں پھیل گیا ہے تو آپ کو اس علم کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا لہٰذا آپ نے اس کو ابواب اور کتابوں پر مرتب اور منضبط کیا، ابتدا کتاب الطہارت سے کی، پھر کتاب الصلوٰۃ، کتاب العبادات، کتاب المعاملات کو بیان کیا اور کتاب المیراث پر اس سلسلہ کو ختم کیا کیوں کہ اس کا تعلق انسان کی آخرت سے ہے امام ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے کتاب الفرائض اور کتاب الشروط تصنیف کی"

فقہائے مجتہدین کی ٹیم تیار کرنا:۔ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالی

عنہ کا دوسرا اہم کارنامہ اپنے شاگردوں کی صورت میں فقہائے مجتہدین کی ایک زبردست ٹیم تیار کرنا ہے، اس خصوص میں بھی امام اعظم دیگر ائمۂ مجتہدین سے منفرد نظر آتے ہیں یوں کہ آپ نے اپنی مجلس علمی میں جہاں قانون اسلام کی باضابطہ تدوین کی وہیں اجتہادی میدان میں اپنے شاگردوں کی زبردست تربیت بھی فرمائی، اور ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا فرمادی کہ وہ کسی بھی جدید مسئلے کا حکم اصول شریعت کی روشنی میں نکال سکتے تھے علامہ محمد بن احمد ذہبی مالکی نے ''مناقب الامام ابی حنیفۃ وصاحبیہ'' میں لکھا ہے کہ علمائے کبار کی ایک جماعت نے حضرت امام ابوحنیفہ سے فقاہت حاصل کی ان میں سے مندرجہ ذیل اہل علم خاص ہیں:

(۱) زفر بن ہذیل (۲) قاضی ابویوسف (۳) آپ کے صاحب زادے حماد (۴) نوح بن ابی مریم معروف بہ نوح جامع (۵) ابومطیع حکم بن عبداللہ بلخی (۶) حسن بن زید دولوی (۷) محمد بن حسن شیبانی (۸) قاضی اسد بن عمرو۔

اور آپ سے بے شمار محدثین اور فقہاء نے روایت کی، ان میں سے درج ذیل افراد بھی ہیں

(۱) مغیرہ بن مقسم (۲) زکریہ بن ابی زائدہ (۳) مسعر بن کدام (۴) سفیان ثوری (۵) مالک بن مغول () یونس بن ابو اسحاق (۷) شریک (۹) حسن بن صالح (۱۰) ابوبکر بن عیاش (۱۱) عیسیٰ بن یونس (۱۲) علی بن مسہر (۱۳) حفص بن غیاث (۱۴) جریر بن عبدالحمید (۱۵) عبداللہ بن مبارک (۱۶) ابومعاویہ (۱۷) وکیع (۱۸) المحاربی (۱۹) ابواسحاق فزاری (۲۰) یزید بن ہارون (۲۱) اسحاق بن یوسف ازرق (۲۲) معافی بن عمران (۲۳) زید الحباب (۲۴) سعد بن صلت (۲۵) مکی بن ابراہیم (۲۶) ابوعاصم نبیل (۲۷) عبدالرزاق بن ہمام (۲۸) حفص بن عبدالرحمٰن سلمی (۲۹) عبیداللہ بن موسیٰ (۳۰) ابوعبد الرحمٰن مقری (۳۱) محمد بن عبداللہ انصاری (۳۲) ابونعیم (۳۳) ہوذہ بن خلیفہ (۳۴) ابو اسامہ (۳۵) ابویحییٰ حمانی (۳۶) ابن نمیر (۳۷) جعفر بن عون (۳۸) اسحاق بن سلیمان رازی وغیرہ۔ (مناقب الامام ابی حنیفۃ وصاحبیہ ص:۱۱)

امام اعظم علیہ الرحمہ والرضوان نے اپنے شاگردوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

انتم مسار قلبی وجلاء حزنی ،اسریت لکم الفقه وا لجمته ،وقد ترکت الناس یطؤن أعقابکم ،ویلتمسون الفاظکم ،ما منکم آحد الآ وهو یصلح للقضاء، فسألتکم بالله وبقدر ما وهب الله لکم من جلالة العلم لما صنتموه عن ذلّ الاستیجار (ابو حنیفه: حیاته و عصره، آراؤه وفقهه: ابو زهرة ،ص:۱۸۷)

''تم میری مسرت وشادمانی کا سامان اور میرے غم واندوہ کو دور کرنے والے ہو، میں نے تمہارے لیے فقہ پر زین کس دی ہے، ور لگام لگا دی ہے اور لوگوں کو اس حال میں چھوڑ رہا ہوں کہ تمہارے نقش قدم پر چلیں، اور تمہارے ارشادات کے طلب گار ہوں تم میں سے ہر ایک قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے میں نے تم سے اللہ کا اور اس رتبہ کا جو اللہ تعالیٰ نے تم کو علم کی عظمت کا عطا فرمایا ہے واسطہ دے کر یہ چاہتا ہوں کہ اس علم کو اجرت لینے کی ذلت سے بچانا۔''

بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ کے تلامذہ کی ایک لمبی تعداد تھی، جنھوں نے آپ سے فقہ واجتہاد کی تربیت لی تھی خود حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ نے اپنے ان تلامذہ کی جلالت علمی کا اعتراف فرمایا شیخ محمد ابوزہرہ مصری نے اپنی کتاب ''ابو حنیفة حیاته وعصره، آراؤه وفقهه'' میں اسے لکھا ہے وہ فرماتے ہیں:''حضرت امام اعظم کے اصحاب اور تلامذہ بہ کثرت تھے ایک جماعت وہ تھی کہ کچھ مدت تک آپ کی خدمت میں رہ کر اور فضل وکمال حاصل کر کے اپنے وطن چلی گئی اور ایک جماعت وہ تھی جو آپ ہی سے وابستہ رہی چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا ''یہ میرے چھتیس اصحاب ہیں، ان میں سے اٹھائیس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قاضی بن سکیں، چھ افراد میں مفتی بننے کی صلاحیت ہے، اور دو یعنی ابو یوسف اور زفر قاضیوں اور مفتیوں کو ترتیب دینے کی لیاقت رکھتے ہیں۔'' (مرجع سابق)

خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے گراں قدر کارناموں میں یہ دو کارنامے اور علمی واجتہادی خدمات ایسی ہیں جن میں حضرت امام کی ذات منفرد ہے اللہ تعالیٰ آپ کی قبر انور پر قیامت تک رحمت و نور کی موسلا دھار بارش برسائے اور آپ کو آپ کی ان خدمات جلیلہ کا وہ بدلہ عطا فرمائے جو اس کی شان کریمی کے لائق ہے۔

☆☆☆

مولانا ذکی اللہ مصباحی☆

امام مالکؒ کی علمی و اجتہادی خدمات

پیدائش اور سلسلہ نسب:- حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینے میں ولید بن عبدالملک اموی کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے، چنانچہ ۹۰، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۸ھ آپ کی تاریخ پیدائش بتائی جاتی ہے۔ لیکن اکثر کی رائے ۹۳ھ کی ہے۔ اس بابت ایک روایت خود امام مالک سے ہے" ولدت سنة ثلاث وتسعين ،، میں ۹۳ھ میں پیدا ہوا۔ **وفات:** ۱۴/ربیع الثانی ۱۷۹ھ کو رشید عباسی کے زمانے میں ہوئی۔

آپ کا سلسلہ نسب ذواصبح نامی ایک یمنی قبیلہ سے ملتا ہے۔ آپ کا پورا نام مالک بن انس بن مالک ابو عامر اصبحی یمنی ہے۔ آپ کی والدہ کا نام عالیہ بنت شریک ازدیہ ہے۔

پرورش و پرداخت:- آپ نے ایک ایسے خاندان اور ماحول میں آنکھ کھولی جہاں اثر اور حدیث کا دول بالا تھا۔ پہلے آپ اسلامی گھرانے کے دستور و رواج کے مطابق قرآن پاک کا حفظ فرماتے ہیں پھر اس کے بعد حفظ حدیث کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مدینے میں علم حدیث سیکھنے کا جو خوش گوار ماحول قائم تھا اس سے متاثر ہو کر آپ اپنی ماں سے اس کا اظہار فرماتے ہیں۔ چنانچہ والدۂ مکرمہ اجازت مرحمت کرتے ہوئے فرماتی ہیں: "اذهب الى ربيعة فتعلم علمه قبل أدبه" ربیعہ کے پاس جاؤ اور اس کے ادب سے پہلے اس کا علم سیکھو۔ آپ کو حدیث سیکھنے کا ذوق وشوق اس قدر تھا کہ ربیعہ کے حلقۂ درس سے جو کچھ سنتے یا سیکھتے اس کو درختوں کے سایے میں بیٹھ کر اعادہ کرتے۔ ایک بار ایسا کرتے ہوئے آپ کی بہن نے دیکھ لیا تو اس کا تذکرہ اپنے والد سے کی۔ انہوں نے جو ابا کہا:"يا بنية! انه يحفظ أحاديث رسول الله صلى الله عليه وسلم" بیٹی! وہ رسول ﷺ کی حدیثیں یاد کیا کرتا ہے۔

درس و افتاء:- حضرت امام مالک نے آثار و فتویٰ نویسی کی تعلیم سے فراغت کے بعد مسجد نبوی میں درس و افتاء کے لیے ایک مجلس کا انتخاب فرمایا۔ جس میں دور دراز سے لوگ آیا کرتے تھے اس کام کو کس عمر میں آپ نے شروع کیا؟ یہ تحقیق سے معلوم نہیں۔ پھر اپنی زندگی کے آخری ایام میں بیماری کی وجہ سے گھر پر ہی درس دینے لگے۔ بہت سے اخبار و روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس وقت یہ کام شروع کیا جب ربیعہ باحیات تھے۔ ربیعہ کی وفات سن ۱۳۶ھ میں ہوئی اور آپ کی پیدائش راجح روایت کے مطابق ۹۳ھ میں ہوئی اس حساب سے آپ کی عمر شریف اس وقت ۴۳ برس کی ہوئی۔

ایک نکتہ:- جس طرح آپ کے بارے میں یہ غلط روایت ہے کہ آپ والدہ کے حمل میں تین برس رہے اسی طرح کچھ لوگوں کی روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے درس واقعہ ۱۷/برس کی مدت میں شروع کر دیا تھا وہ بھی اپنے شیخ ربیعہ سے ناراض ہونے کے بعد، جہاں تک مذکورہ مدت حمل کی روایت کی بات ہے تو وہ طب کی روشنی میں صحیح نہیں۔ علم طب کے مطابق حمل کی مدت زیادہ سے زیادہ سال بھر کی ہو سکتی ہے۔ عقیدہ و ایمان کے حساب سے حمل کی مدت نو ماہ سے زائد کی نہیں ہو سکتی۔ رہی بات ربیعہ سے ناراضگی کی یا ۱۷ برس میں درس و افتاء کے آغاز کی تو وہ صحیح نہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ربیعہ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر ۴۳ برس ہو رہی تھی اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ اس سے پہلے اس کام کو شروع کیا ہو بلکہ ایسا اس سے پہلے ضروری بھی ہے۔

پیشہ اور حکام سے تعلق:- آپ کی روزی کا ذریعہ کیا تھا؟ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آپ کے والد کا پیشہ تیر سازی تھا۔ اور آپ بچپن ہی میں حصول علم حدیث کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے علم کے ساتھ یہ پیشہ بھی بطور روزی کمانے کے لیے اختیار کیا ہو۔ دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے بھائی نضر روئی کے کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور وہ خود علم اور طلب حدیث میں مشغول تھے۔ حضرت امام مالک ان کے ساتھ اس کو بیچا کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی روزی کا ذریعہ تجارت رہی ہو۔

☆ Jamia Hazrat Nizamuddin Aulia, 22, Zakir Nagar, Okhla New Delhi

آپ کے خلفاء اور حکام سے بھی تعلقات تھے- ان کے طرف سے آنے والے ہدایا وتحائف کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ جب کہ آپ کے معاصر حضرت امام ابوحنیفہ نہ تو اموی خلفا کے ہدایا قبول فرماتے اور نہ بنو عباس کے خلفا کے- ایک بار آپ سے خلفاء کے اموال قبول کرنے کی بابت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "اما الخلفاء فلا شک ،یعنی انه لا باس به، واما من دونهم فان فيه شيئا" رہی بات خلفاء کی تو اس میں کوئی شک نہیں۔ یعنی ان سے کچھ لینے میں کوئی حرج نہیں، جہاں تک ان کے علاوہ کی بات ہے تو اس میں باعث حرج ہے- اس کی وجہ آپ کی نظر میں یہی رہی ہوگی کہ خلفاء اپنی خواہش کی چیزوں کو اپنے سے جمع کر لیا کرتے تھے اس میں سے نکال کر بھیجا کرتے تھے جسے قبول کرنے میں آپ کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رشید نے آپ کے لیے تین ہزار دینار بطور وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا "لو كان امام عدل فانصف اهل المروءة لم ار به باسا" اگر امام عدل ہوتا تو صاحب مروت شخص ضرور انصاف کرتے لہذا میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا ہوں۔

حکام کے ساتھ آپ کا سلوک:- حکماء اور خلفاء سے تعلق کے باوجود علم اور علماء کی عظمت کو ان کی شان وشوکت پر ترجیح دیتے، چنانچہ طاش کبری زادہ اپنی تصنیف مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۸۶ میں فرماتے ہیں: ہارون نے آپ کے پاس اپنی مجلس میں حاضر ہونے کا پیغام بھیجا تا کہ آپ سے ان کے دونوں بیٹے امین اور مامون موطا سن سکیں۔ چنانچہ انہوں نے آپ سے یہ درخواست کی کہ اے بندۂ خدا! بہتر یہ ہے کہ آپ ہمارے پاس آئیں تا کہ ہمارے بچے موطا سن سکیں- اس پر آپ نے فرمایا امیر المومنین کو اللہ عزت بخشے! علم آپ کی جانب سے نکلا ہے، اگر آپ اس کی عزت کریں گے تو وہ باعزت ہوگا اور اگر آپ کو رسوا کرتے ہیں تو ذلیل ہوگا۔ علم کے پاس آیا جاتا ہے وہ خود کسی کے پاس نہیں جاتا- اس پر مامون نے کہا آپ نے سچ کہا، پھر انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو مسجد جانے کو کہا تا کہ وہ دونوں لوگوں کے ساتھ موطا کی سماعت کر سکیں۔ حضرت مالک نے فرمایا لیکن شرط یہ ہے کہ وہ لوگوں کی گردنوں کو پھلانگے نہیں اور مجلس جہاں ختم ہو رہی ہو وہیں بیٹھیں۔ اس شرط کے ساتھ دونوں مسجد میں حاضر ہوئے۔ اسی طرح کا واقعہ رشید کے ساتھ پیش آیا کہ انہوں نے اسی کتاب موطا کو اپنے پاس لانے کو کہا تو آپ نے اس کے پاس جانے سے انکار فرمادیا چنانچہ خلیفہ کو کہنا پڑا "والله لا نسمعه الا في بيتك" بخدا! ہم آپ کے گھر میں ہی اسے سماعت کریں گے۔

حدیث وفقہ میں آپ کا مرتبہ:- حضرت امام شافعی آپ کے مرتبۂ حدیث وفقہ کے بارے میں فرماتے ہیں: "اذا ذكر العلماء ،فمالک النجم، وما احد امن علي من مالک" جب علما کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو مالک ستارے کی مانند بلند ہوتے ہیں۔ اور مجھ پر مالک سے زیادہ کسی کا احسان نہیں۔ امام محمد ابو زہرہ فرماتے ہیں امام مالک رضی اللہ تعالی عنہ کی فقہ میں دو باتیں نمایاں ہیں "ایک یہ۔ مالک رضی اللہ تعالی عنہ جہاں فقیہ اثر تھے وہیں فقیہ رائے بھی تھے۔ جس طرح اپنی فقہ کے اندر اثر کا بکثرت استعمال کرتے وہیں رائے کو بھی خوب استعمال کرتے ہیں- متقدمین ان کو فقہائے رائے میں شمار کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ سے جو فقہ مروی ہے اور اس کا جو طریقہ ہے وہ ان کے اس قول پر شہادت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت امام مالک کے یہاں رائے کے بہت سے مسائل تھے لیکن ان کا مرجع ایک ہی اصل تھا اور وہ تھا جلب مصلحت اور رفع حرج۔

آپ کے شیوخ کرام:- آپ کے شیوخ کرام میں ابن ہرمز ہیں جن سے آپ نے مسلسل سات برس یا اس سے کچھ زائد عرصہ تک استفادہ کیا۔ اس دوران کسی اور سے استفادہ نہیں کیا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان سے استفادہ کرتے رہے- ایک قول میں یہ ہے کہ آپ کا ان سے تقریباً سترہ برس تک علمی رابطہ رہا۔ ایک دوسرے قول میں یہ ہے کہ آپ کا ان سے تقریباً تیس برس تک علمی رابطہ رہا۔

نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر -ان سے امام مالک نے حضرت عبد اللہ کی فقہ اور ان سے پوچھے جانے والے مسائل کے سلسلے میں جواب اور افتا کا علم سیکھا۔ حضرت نافع اس سلسلۃ الذہب کی کڑی ہیں جس کے بارے میں خود حضرت ابوداؤد نے اصح الاسانید فرمایا۔ وہ سلسلۂ ذہب اس طرح ہے۔ مالک عن نافع عن ابن عمر- آپ کا انتقال باختلاف روایت ۱۱۷ھ یا ۱۲۰ھ میں ہوا-

ابن شہاب زہری:- ان سے حضرت مالک نے علم حدیث سیکھا۔ آپ ان کے سب سے بڑے راوی ہیں۔ موطا میں بھی ابن شہاب کے واسطے سے بہت سی احادیث ہیں۔

ابوزناد:- یہ امام مالک کے سب سے آخری استاذ ہیں جن کا پورا

نام عبداللہ بن ذکوان ہے جو موالی میں سے تھے اور ان کی اصل ہمدان سے تھی۔ کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی لیکن ابوزناد کی کنیت ان پر غالب آگئی۔ ان کا انتقال ۶۶ برس میں رمضان ۱۳۰ھ یا ۱۳۱ھ میں غسل خانے کے اندر اچانک ہوا۔ ان سے آپ نے صرف صحابہ اور تابعین سے منقول حدیث اور فقہ پڑھی۔

ربیعۃ الرائی:- آپ حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پہلے استاذ ہیں۔ ان سے انہوں نے فقہ اثر سیکھی جس کا معنی ومطلب اثر پر ہی مبنی ہوتا ایسا نہیں کہ اس کے معانی اپنی طرف سے نکالے گئے ہوں۔ آپ کے فتویٰ دینے کا طریقہ یہ تھا کہ اس کا حل اثر میں تلاش کرتے تب فتویٰ دیتے اگر اس کے بارے میں کوئی اثر نہیں ملتا تو اثر پر مبنی معانی اخذ کر کے فتویٰ دیتے۔

ایک نکتہ:- بعض روایت میں امام مالک کے پہلے استاذ حضرت ربیعۃ الرائی کو بتایا گیا ہے جب کہ بعض روایت میں ابن ہرمز کو۔ ان دونوں روایت میں تطبیق کی صورت یہ ہوگی کہ طلب علم کے لیے سب سے پہلے اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں آپ ربیعہ کے پاس گئے ہوں پھر آپ کے والد نے آپ کے بچپن ہی میں یہ خیال کیا ہو کہ ربیعہ سے آپ کا استفادہ محدود شکل میں ہے تو مالک نے ابن ہرمز کی طرف رخ کیا ہو۔

دیگر علماء سے روابط - آپ کی شخصیت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا ربط وتعلق اپنے شیوخ کے علاوہ دیگر علماء سے بھی رہا خواہ وہ فقہا ہوں یا نہ ہوں۔ ان علماء سے آپ کا تعلق تین نوعیت کا تھا (۱) حج کے موقع پر براہ راست علماء سے ملتے (۲) مدینے کے علماء کے ساتھ مسلسل نشست ہوتی (۳) اور کتابوں سے۔

دولت عباسیہ میں مختلف فرقوں کا ظہور - مامون، معتصم اور واثق جن کے دور کو آپ نے پایا، ان کے دور میں دو قسم کے فرقوں کا ظہور ہوا ایک سیاسی، دوسرا اعتقادی۔ ان کے بارے میں آپ کا موقف کیا تھا؟ اس کو بیان کرنے سے پہلے ان کے نظریات کو بیان کرنا ضروری ہے تاکہ بہ آسانی ان کے تئیں آپ کے موقف تک رسائی حاصل کی جاسکے۔

سیاسی فرقوں میں شیعہ اور خوارج تھے۔ اعتقادی فرقوں میں قدریہ، جہمیہ (جبریہ) اور مرجئہ۔

شیعی فرقہ: تمام اسلامی فرقوں میں قدیم ہے جو حضرت عثمان کے آخری دور میں ظہور پذیر ہوا۔ اس کا ماننا تھا کہ حضرت علی بن ابو طالب خلافت کے زیادہ حق دار تھے، پھر اس میں بھی مختلف فرقے کا ظہور ہوا جنہوں نے حضرت علی کی تقدیس میں دینی حد سے تجاوز اختیار کیا۔ ان میں سے سبئیہ اور غرابیہ تھے۔

سبئیہ:- عبداللہ بن سبا کے پیروکار تھے۔ انہوں نے حضرت علی کو صفت الوہیت سے متصف کیا، تو ان میں سے بعض کو حضرت علی نے نذر آتش کردیا۔

غرابیہ:- اس کا ماننا تھا کہ نبوت حضرت علی کو ملنی تھی لیکن حضرت جبرئیل بھٹک گئے اور غلطی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے۔ پھر اس میں سے دوسرے گروہ ظاہر ہوئے ان میں ایک معتدل اور میانہ روی اختیار کیے ہوئے تھا۔ دوسرا غالی اور حد اعتدال سے متجاوز تھا۔ پہلے کو زیدیہ کہا جاتا ہے جو زید بن علی زین العابدین کا پیرو تھا جو شیخین حضرت ابوبکر وعمر کی امامت کو صحیح نہیں مانتا تھا اور دیگر صحابہ پر طعنہ زنی نہیں کرتا۔ دوسرا گروہ جو غالی اور حد اعتدال سے متجاوز تھا اس میں بھی مختلف گروہ کا ظہور ہوا (۱) کیسانیہ (۲) امامیہ اثناعشریہ (۳) اسماعیلیہ۔

کیسانیہ:- مختار کا پیرو تھا جو دولت مروانیہ کا پہلا شخص تھا۔ **امامیہ اثناعشریہ:** اس کا ماننا تھا کہ اس کے بارہ امام ہیں جو سُر من رائ میں غائب ہوگئے ہیں وہ آخری زمانہ میں ظہور پذیر ہوکر دنیا کو حق وصداقت اور عدل وانصاف سے معمور کریں گے، اس فرقے کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے، یہ فرقے زیادہ فارس میں پائے جاتے ہیں۔

اسماعیلیہ:- اس فرقے کے کچھ لوگوں نے فاطمیوں کے نام پر حکومت مصر کی باگ ڈور سنبھالی۔

دوسرا سیاسی گروہ **خوارج** کا تھا جس کا ظہور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آپ کے ثالث اور فیصل کا کردار ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ہوا پھر اس نے آپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور کہا کہ اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا، بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ حضرت علی نے تحکیم کی ذمہ داری قبول کر کے کفر کیا لہٰذا اس کو چھوڑنا اور آپ پر توبہ کرنا ضروری ہے پھر اس نے ہی آپ کو شہید کرڈالا۔

دولت امویہ میں مختلف گروہوں کا ظہور - دولت عباسیہ میں ظہور پذیر ہونے والے گروہ ایک تو ایسے ہی دولت امویہ کے لیے خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں تھے دوسرا یہ کہ مزید دوسرے فرقوں کا ظہور دولت امویہ میں ہو رہا تھا جن کے نظریات کا لب لباب اور خلاصہ یہی تھا کہ خلافت کا کوئی مستحق نہیں، خلیفہ آزادانہ اختیار حاصل کرلیتا ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس کے تئیں طرفداری یا عصبیت نہیں برتی جائے تاکہ اس

کا تختہ پلٹنے میں آسانی ہو- یہ گروہ گناہ کے مرتکبین کی تکفیر کیا کرتے تھے ان میں بھی مختلف فرقے ہوئے- اعتدال وغلو کے اعتبار سے ان کے اعمال اور نظریات میں ایک دوسرے سے تفاوت تھا- ان میں سے ازارقہ اور اباضیہ ہیں-

ازارقہ نافع بن ازرق حنفی کے متبعین تھے جو غالی قسم کے تھے- جماعت اسلامی سے یہ بہت قریب تھے-**اباضیہ:** یہ عبداللہ بن اباض مری التیمی کا پیروکار تھا- ان کا ماننا تھا کہ ان کے مخالفین نہ کفار ہیں اور نہ مشرک بلکہ وہ کفار نعمت ہیں- ان کے مخالفین کا خون حرام ہے، ان کی شہادت جائز ہے- اس فرقے کے کچھ لوگ مراکش میں پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ عمان، مشرقی افریقہ، طرابلس الغرب اور جنوبی الجزائر میں بھی پائے جاتے ہیں، استعراض "یعنی قتل" کے منکر ہیں، غیر اباضیوں سے نکاح کی اجازت ان کے یہاں ہے، پھر اباضیہ اور ازارقہ میں بھی مختلف فرقے کا ظہور ہوا جن میں نجدات، صفریہ اور عجاردۃ ہیں-**نجدات** نجدۃ بن عویمر جو بنی حنیفہ کے قبیلے سے تھا، اس کے متبعین تھے-**صفریہ:** زیاد بن اصفر کے متبعین تھے-**عجاردۃ** عبدالکریم بن عجرد کے متبعین تھے-

خوارج:- اس میں کچھ وہ لوگ تھے جو اپنی بعض آرا میں اسلام سے خارج تھے- ان کے دو فرقے ہیں: یزیدیہ اور میمونیہ- یزیدیہ: یزید بن انیسہ کے متبعین تھے- ان کا ماننا تھا کہ اللہ تعالیٰ عجمیوں میں سے ایک رسول بھیجے گا جسے کتاب دی جائے گی جو شریعت محمدی کو منسوخ کرے گی-

میمونیہ:- میمون عجردی کے متبعین تھے اس نے نواسیوں، پوتیوں بھتیجیوں اور بھانجیوں سے نکاح کو جائز قرار دیا- ان کا ماننا تھا کہ ان کا ذکر قرآن میں نہیں ہے- اس کے بارے میں یہ بھی مروی ہے کہ اس نے سورۂ یوسف کا انکار کیا، اس کو وہ قرآن شمار نہیں کرتے-

اعتقادی فرقوں کا ظہور:- جن اعتقادی فرقوں کا ظہور آپ کے دور میں ہوا- وہ مرجئہ، جبریہ (جہمیہ) اور قدریہ ہیں-

مرجئہ:- یہ اصول دین کو سیاست سے مربوط کرتا تھا- جب یہ مسئلہ اٹھا کہ آیا گناہ کا مرتکب جہنم میں ہمیشہ رہے گا یا نہیں؟ تو اس فرقے نے کہا کہ ایمان کے ساتھ معصیت نقصان نہیں دیتی جس طرح کفر کے ساتھ عمل فائدہ مند نہیں ہوتا-**معتزلہ** مرجی ہر شخص کو کہتے تھے جو یہ نہیں مانتا تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب جہنم میں ہمیشہ رہے گا- اس بنا پر حضرت ابو حنیفہ کو مرجی کہا گیا جب کہ شہرستانی نے آپ کو مرجی اللہ گردانا یعنی گناہ گاروں کے لیے عفو الٰہی کی امید کرنے والا نہ کہ منکرات کو مباح تسلیم کرنے والا-

جبریہ:- (جہمیہ)، اس کا ماننا تھا کہ انسان کو اپنے افعال میں کوئی ارادہ نہیں ہوتا- اللہ تعالیٰ ہی ہر طرح کے عمل خواہ وہ برا ہو یا اچھا، کا خالق ہوتا ہے جو بندہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتا ہے- بندہ اپنے افعال کے تئیں اس پر کی مانند ہے جس کو ہلکی سی ہوا بھی حرکت دے دیتی ہے- اس عقیدہ کا پرچار اموی دور میں خوب ہوا- اس نظریہ کی جس نے تشہیر کی اس کا نام جہم بن صفوان تھا اسی وجہ سے اس کا نام جہمیہ پڑ گیا-

قدریہ:- اس کا ماننا تھا کہ انسان اپنے اختیاری افعال کا خالق ہے- ان میں کچھ وہ لوگ تھے جن کو تاریخ اسلام میں معتزلہ کہا جاتا ہے- جن کی عباسی دور میں اسلامی فکر میں زبردست اہمیت حاصل تھی کیوں کہ انہوں نے زندیقوں کی تردید کی- اس فرقہ کے پانچ بنیادی اصول ہیں-

توحید - ان کی نظر میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں ایک ہے لہٰذا کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کا شریک نہیں، اسی وجہ سے انہوں نے رویت باری کا انکار کیا-

(۱) عدالت من جانب اللہ: لہٰذا اس کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں اور اس کے افعال کا خالق ہو، تاکہ ثواب وعقاب اور تکلیف عام طور پر ملے-

(۳) وعد ووعید من جانب اللہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محسن کو احسان کا اور مسیٔ کو اساءۃ (برائی) کا بدلہ دے گا اور مرتکب گناہ کبیرہ کو معاف نہیں فرمائے گا-

(۴) مرتکب کبیرہ مومن اور کافر کے درمیانی درجہ میں ہے اس کا نام مومن فاسق ہے، اس کا نام مومن کبھی نہیں ہوسکتا وہ جہنم میں ہمیشہ رہے گا-

(۵) **امر بالمعروف ونہی عن المنکر:**- ان دونوں چیزوں کو دعوت اسلامی کی اشاعت اور گمراہوں کی ہدایت کے لیے واجب قرار دیا ہے، لہٰذا استطاعت بھر ہر شخص پر دعوت کا فریضہ نبھانا ضروری ہے جو بزور تلوار دعوت کی خدمت انجام دے سکتے ہیں وہ تلوار سے اور جو صاحب لسان ہوں وہ زبان سے اس فریضہ کو انجام دیں-

عقائد کے سلسلے میں آپ کا موقف - جب عقائد سے متعلق کسی ایسے مسئلے میں جس پر مختلف فرقوں نے خوب بحث وتمحیص کی ہو اس میں پڑنے کی بجائے مختصر جواب دیتے جس میں اثر پر اعتماد ہوتا اور کتاب وسنت میں صریح جواب نہ ملنے کی صورت میں اجتناب کرتے-

چنانچہ ایک بار آپ سے ایک شخص نے "الرحمن علی

العرش استوی " پڑھ کر کہا کیسے اللہ نے استوا فرمایا؟ حضرت امام مالک تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے یہاں تک کہ آپ پسینے سے شرابور ہو گئے۔ جب یہ کیفیت دور ہوگئی '' تو آپ نے فرمایا استوا معلوم ہے لیکن کیفیت عقل میں نہیں آنے والی ہے۔ اس قسم کا سوال بدعت ہے اور استوا پر ایمان واجب ہے۔ میں تجھے گمراہ خیال کرتا ہوں۔ اس پر اس شخص نے کہا اے بندۂ خدا اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہی سوال میں نے اہل بصرہ، کوفہ اور عراق سے پوچھا، لیکن کسی کو ایسے جواب کی توفیق نہ دی گئی جس جواب کی توفیق آپ کو عنایت کی گئی۔

ایمان کے نقص وزیادت کے بارے میں آپ کا موقف:-
حضرت امام مالک ایمان کو نہ صرف اعتقادی اور نہ صرف قولی مانتے تھے بلکہ یہ مانتے تھے کہ ایمان اعتقاد، قول اور عمل کا مجموعہ ہے۔ آپ کی نظر میں طاعت ایمان تھی یونہی نماز پڑھنا بھی۔ اس پر استشہاد یوں پیش کرتے ہیں کہ نماز پہلے بیت المقدس کی طرف منھ کر کے پڑھی جاتی تھی۔ پھر خانۂ کعبہ کی طرف پڑھی جانے لگی۔ مومنین کو ڈر ہوا کہ کہیں ان کی گذشتہ نمازیں اکارت نہ چلی جائیں تو اللہ تعالی نے فرمایا" وما كان الله ليضيع ايمانكم " اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں۔ یہ آیت اس پر دال ہے کہ نماز ایمان ہے اور نماز فعل ہے لہذا ایمان قول اور فعل کا مجموعہ ہوا۔ آپ قرآن وسنت کے ظاہری لفظ سے بھی استشہاد کرتے تھے لہذا پہلے آپ ایمان کی زیادت اور نقص اور بعض ایمان کا بعض سے افضل ہونے کا قول کرتے تھے لیکن جب دیکھا کہ زیادت ایمان کے بارے میں آیت مذکور ہیں تو صرف زیادت کا قول کرنے لگے اور نقص ایمان کے بارے میں خاموشی اختیار کرلی۔

تقدیر اور افعال انسان کے بارے میں آپ کا موقف:-
پیچھے اس سلسلے میں اعتقادی فرقوں کے بارے میں ان کے موقف کا بیان کیا جا چکا ہے کہ تقدیر اور افعال انسان کا مسئلہ خلفاء راشدین کے آخری دور میں اٹھا مگر اموی دور میں اس نظریے کی خوب تشہیر ہوئی۔ دو اعتقادی گروہوں کا موقف ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھا۔ جبریہ جس کا سرغنہ جہم بن صفوان تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ انسان کو اپنے اعمال میں کوئی ارادہ ودخل نہیں ہوتا۔ اگر فعل کی نسبت انسان کی طرف کی بھی جائے تو اس میں انسان کا کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ قدریہ جس کا سرخیل غیلان ثقفی تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ انسان اپنے افعال مکلفہ میں بالکل آزاد ہے، لہذا انسان اگر اچھا عمل کرتا ہے تو اچھا بدلہ پائے گا اور برا کرتا ہے تو برا۔ حضرت امام مالک قدریہ کے اعتقاد کو ناپسند کرنے کے باوجود ان کو مشرک نہیں مانتے اور نہ یہ کہ وہ دین سے خارج ہیں کہ ان سے نکاح، ان کی اقتدا میں نماز پڑھنا اور ان کا جنازہ پڑھنا جائز نہ ہو۔ یونہی جبریہ کے اعتقاد کی موافقت میں آپ سے کوئی صریح قول منقول نہیں۔ کیوں کہ آپ کا ماننا تھا کہ ان جیسی چیزوں میں پڑنا جمال دین کے لئے نقصان دہ اور لوگوں کو پریشانیوں میں مبتلا کرتا ہے۔

خلق قرآن کے بارے میں آپ کا موقف:- خلق قرآن کا مسئلہ جب خوب زور وشور سے اٹھا جس کو قدریہ ومعتزلہ خوب ہوا دے رہے تھے تو آپ نے اس میں پڑنے سے خود کو روکے رکھا اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اس میں پڑنے والے کو مستحق سزا قرار دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "القرآن كلام الله، ومن قال: القرآن مخلوق، يوجع ضرباً ويحبس حتى يتوب" قرآن اللہ کا کلام ہے لہذا جو قرآن کو مخلوق کہے اسے درد ناک پٹائی کی جائے اور قید کر دیا جائے تا آں کہ وہ اس سے توبہ کر لے۔

رویت باری کے بارے میں آپ کا موقف:- اس مسئلہ کو معتزلہ نے اٹھایا اور کہا کہ رویت باری تعالی محال ہے کیوں کہ اس سے اللہ کے لئے مکان ہونا لازم آئے گا حالانکہ اس کے لئے مکان نہیں۔ کیوں کہ جو مکان میں ہوتا ہے وہ اجسام کے قبیل سے ہوتا ہے اور اللہ جسم وجسمانیات سے منزہ ہے اور ہر قسم کے حدوث سے مبرا ہے اس لئے کہ وہ واجب الوجود ہے لہذا حدوث کی صفت واجب الوجود کے لئے صحیح نہیں۔ حضرت امام مالک رضی اللہ تعالی عنہ نے رویت کی نفی میں قرآن میں موجود آیتوں کی تاویل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ رویت باری تعالی آخرت میں ہوگی نہ کہ دنیا میں۔

اعتقادی اور سیاسی فرقوں کے بارے میں آپ کا موقف:-
اس بارے میں آپ کا موقف بیان کرنا اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ آپ کی زندگی میں خوارج، شیعہ، حکومت امویہ اور دولت عباسیہ کا ظہور ہوا۔ ان میں سے ہر گروہ ایک دوسرے کے موقف کے خلاف تھا۔ چنانچہ شیعہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان پر طعنہ زنی کرتے، خوارج حضرت عثمان، علی، عمرو بن العاص اور معاویہ بن ابوسفیان وغیرہ کو برا بھلا کہتے۔ عباسیہ: خلافت کو بنو ہاشم میں سے صرف بنو عباس میں مانتے۔ امویہ

خلافت کو صرف قریش میں مانتے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ سے مروی حدیث ہے "الائمۃ من قریش" ائمہ قریش سے ہیں، کو دلیل میں پیش کرتے۔ ایسے عالم میں ان کے خلاف جو اصحاب رسول ﷺ کو برا بھلا کہتے آپ نے فرمایا: یہ جرم عظیم ہے، اور ایسے شہر میں جہاں ان کے خلاف طعنہ زنی کی جاتی ہو ٹھیک اس شہر کی مانند ہے جہاں پر حق پر عمل نہ ہو سکے، ان کو غنیمت کا بھی مستحق نہیں مانتے تھے، البتہ آپ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان کے علاوہ دوسرے صحابہ کو ایک دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے، چنانچہ آپ سے منقول ہے کہ کسی علوی نے سوال کیا رسول ﷺ کے بعد لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ابوبکر، پھر اس نے پوچھا، پھر کون؟ آپ نے فرمایا: عمر، پھر اس نے کہا: پھر کون؟ آپ نے ارشاد فرمایا: وہ خلیفہ جو ظلما شہید کیا گیا یعنی عثمان، اس پر علوی نے کہا "واللہ، لا أجالسک ابدا" میں آپ کے ساتھ کبھی نہیں بیٹھوں گا، آپ نے فرمایا "الخیار لک" تمہیں اختیار ہے۔ رہی بات خلافت کے حوالے سے تو آپ کا موقف اس بارے میں یہ تھا کہ خلافت نہ تو صرف علوی گھرانے اور نہ صرف قریشی گھرانے پر موقوف مانتے۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکر، عمر، اور عثمان کی خلافت کو اختیار نبوی مانا جس میں سے کوئی ہاشمی گھرانے سے نہ تھے بلکہ وہ قریشی تھے۔ یونہی حضرت علی کی عظمت کو ان کی عظمت سے نہ ملایا جب کہ آپ ہاشمی تھے۔

آپ کی کتاب "موطا": حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ نے الموطا کی تالیف عباسی خلیفہ منصور (۱۳۶ھ/۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ/۷۷۵ء) کے حکم کے تحت شروع کی اور اس کے آخری زمانہ خلافت تک اس کے مسودے سے فارغ ہوئے، خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ/۱۶۹ھ) کے زمانہ خلافت میں یہ بہ شکل روایت اور کتاب، منظر عام پر آئی اس کی تالیف میں آپ چالیس سال تک مشغول و مصروف رہے۔ اس کتاب کے تقریبا ایک ہزار راوی ہوئے۔ اس کتاب کی روایت متعدد طرق سے ہوئی ہے مگر اس کے متداول نسخے دو ہیں ایک بروایت یحیی بن یحیی اللیثی المصمودی الاندلسی (م ۲۳۴ھ/۸۴۸ء) دوسری بروایت امام محمد بن حسن شیبانی (م ۱۸۹ھ/۸۰۴ء) اس کی تصنیف مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کو دھیان میں رکھ کر ہوئی، کیوں کہ قاضی اور مفتی وسیع اسلامی سلطنت میں جو احکام نافذ کرتے تھے ان میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس لیے ارباب سیاست یہ مانتے تھے کہ فیصلوں میں استحکام نہیں ہے۔ لہذا خلیفہ کوئی ایسی جامع الاحکام کتاب مقرر کرے جس کی روشنی میں مقدمات کا تصفیہ ہو اور جو اس کے خلاف فیصلہ صادر کرے اس کے خلاف حکم امتناعی صادر کیا جائے۔ اس کتاب کے حوالے سے خود امام شافعی فرماتے ہیں: میری کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے، صحابہ کے اقوال ہیں پھر تابعین کے اقوال ہیں اور رائی یعنی اجماع اہل مدینہ ہے۔ میں ان سے باہر نہیں نکلا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی فقہ کے اصول: سنت، فتاوی صحابہ، فتاوی تابعین اور اجماع ہیں، لیکن امام محمد ابوزہرہ نے اس کے علاوہ حسب ذیل اصول آپ کی فقہ سے متعلق گنائے ہیں۔

عمل اہل مدینہ، قیاس، استحسان، استصحاب، مصالح مرسلہ مصلحت ونصوص، ذرائع اور عادت وعرف۔

مذکورہ قول کی روشنی میں یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ الموطا کو حدیث کی کتاب شمار کی جائے لیکن چوں کہ اس کا مواد، ترتیب اور مقصد عملی امور وحالات سے متعلق ہے اور یہی فقہ ہے۔ حضرت امام مالک کے زمانے میں فقہ وحدیث دو الگ الگ چیزیں نہ تھیں اور ان کے مفہوم میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ بعد میں اس میں ارتقاء اور نشو ونما ہونے کی وجہ سے یہ دو الگ الگ چیزیں ہوئیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ الموطا کے اندر کچھ فقہ ہے کچھ اصول فقہ اور کچھ حدیث۔

وہ کتابیں جن سے آپ کے فقہی مذہب کو فروغ ملا: جن کتابوں سے آپ کے مذہب مالکی کو فروغ ملا وہ مدونہ، واضحہ، عتبیہ اور موازیہ ہیں، اس کی قدرے تفصیل یوں ہے کہ حضرت عبد الملک بن حبیب اندلس آئے وہاں انہوں نے "واضحہ" نام کی کتاب مدون کیا اور مذہب مالکی کو عام کیا۔ پھر محمد بن احمد بن عبد العزیز عتبی نے عتبیہ مدون کیا۔ اسد بن فرات نے اصحاب امام ابوحنیفہ کے بارے میں لکھا تب مذہب مالکی کی جانب رخ کیا۔ چنانچہ انہوں نے عبد الرحمن بن قاسم کے پاس رہ کر تمام فقہی ابواب سے متعلق لکھ کر قیروان آئے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا تھا اسی کا نام اسد بن فرات کی طرف نسبت کرتے ہوئے اسدیہ نام رکھا۔ پھر اسی اسدیہ کو سحنون نے اسد بن فرات کو پڑھ کر سنایا اور مشرق چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ابن قاسم سے ملاقات کی۔ یہاں انہوں نے ان سے اسدیہ کے مسائل کے بارے میں بحث کیا اور ان سے سیکھا انہوں نے اس کتاب کے بہت سے مسائل سے رجوع کیا اور

اسدیہ کے مسائل کو لکھ کر مدون کرنا شروع کیا اور جن مسائل سے انہوں نے رجوع کیا تھا اس کو باقی رکھا۔ اور مدونہ نام رکھا۔ اس کے بعد انہوں نے اسد کے نام لکھا کہ وہ کتاب سحنون (مدونہ) کی پیروی کریں۔ اس پر اسد نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اس لیے لوگوں نے اسدیہ کو چھوڑ کر مدونہ کی پیروی میں لگ گئے، حالاں کہ اس کے اندر بھی بہت سے مسائل میں اختلاط تھا یہی وجہ ہے اس کو مختلطہ بھی کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اہل قیروان مدونہ اور اہل اندلس نے واضحہ اور عتبیہ پر سارا دھیان دیا، پھر ابن ابی زید نے اسی مدونہ یا مختلطہ کا اختصار پیش کیا اور ''المختصر'' نام رکھا پھر اسی کتاب ''المختصر'' کی تلخیص ابو سعید ابرادعی جو قیروان کے ایک فقیہ تھے، نے کی اور اس کا نام تہذیب رکھا۔ اس کے بعد اہل افریقہ نے اس تہذیب پر اعتماد کر کے واضحہ اور دیگر کتابوں کو چھوڑ دیا۔ اہل اندلس نے عتبیہ پر اعتماد کر کے واضحہ اور دیگر کتابوں کو چھوڑ دیا۔ بعد میں بھی امہات الکتب کی تشریح و توضیح اور جمع و تالیف علمائے مالکیہ کرتے رہے۔ موازیہ: یہ حضرت محمد بن ابراہیم بن زیاد اسکندری کی تصنیف ہے جو ابن مواز کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کا انتقال سن ۲۶۹ھ میں ہوا۔ اس کتاب کے بارے میں مدارک میں اجل کتاب ألفه المالكيون، أصح مسائل، و أبسطه كلاما، وأوعبه (یہ مالکیوں کی لکھی کتابوں میں سب سے ممتاز، اس کے مسائل صحیح ترین اور اس میں شرح و بسط کے ساتھ مسائل مذکور ہیں) جب کہ اسی کتاب کو ابو الحسن القابسی نے مذہب مالکی کی تمام امہات الکتب پر ترجیح دی۔

آپ کے تلامذہ: میں حضرت عبد اللہ بن وہب، عبد الرحمٰن بن القاسم، اشہب بن عبد العزیز القیسی العامری، اسد بن فرات بن سنان اور عبد الملک بن الماجشون ہیں۔

عبد اللہ بن وہب: آپ بربری نژاد ہیں جب کہ آپ کی رشتہ داری قریش سے ہے۔ آپ حضرت امام مالک کی صحبت میں بیس برس رہے۔ مصر میں فقہ مالکی کو عام کیا۔ مصر، حجاز اور عراق کے چار سو سے زائد شیوخ سے استفادہ کیا۔ آپ کی وفات ۱۹۷ھ میں ۷۲ سال کی عمر میں ہوئی۔ پیدائش ۱۲۵ھ یا ۱۲۴ھ بتائی ہے۔

عبد الرحمٰن بن القاسم - آپ تقریباً ۲۰ برس حضرت امام مالک کی صحبت میں رہے۔ آپ کی موطا کی روایت صحیح ترین شمار کی جاتی ہے۔ آپ سے سحنون نے مدونہ سیکھی۔ اس بنا پر آپ اس کے ناقل ہیں۔ آپ متقی، زاہد اور عابد تھے۔ بادشاہ کے انعامات کو قبول نہیں کرتے۔ بھائیوں کی کثرت کو غلامی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: ایاک ورق الأحرار۔ آزاد لوگوں کی غلامی سے بچو۔ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: کثرة الاخوان۔ بھائیوں کی کثرت۔ آپ کا انتقال ۱۹۱ھ میں ۶۳ برس میں ہوئی۔ ولادت ۱۲۸ھ میں ہوئی۔

اشہب بن عبد العزیز قیسی عامری: انہوں نے لیث، یحییٰ بن ایوب، ابن لہیعہ سے سیکھا پھر امام مالک کی صحبت میں رہ کر آپ کی فقہ سیکھی، آپ فقہ مالکی کے ایک راوی ہیں۔ آپ ابن قاسم کے ہم پلہ تھے لیکن عمر میں اس سے چھوٹے تھے۔ سحنون جوان دونوں حضرات کے شاگرد تھے، ان سے پوچھا گیا: أيهما أفقه؟ ان دونوں میں کون بڑا فقیہ ہے۔ انہوں نے کہا: كانا كفرسي رهان، ربما وفق هذا، وخذل هذا، وربما خذل هذا، ووفق هذا، دونوں بازی کے گھوڑے کی طرح ہیں۔ کبھی ایک غالب آ جاتا ہے اور دوسرا شکست کھا جاتا تو کبھی دوسرا غالب آ جاتا ہے اور پہلا شکست کھا جاتا ہے۔ آپ کی بھی ایک کتاب کا نام مدونہ ہے جو سحنون کے علاوہ ہے اس کے علاوہ آپ کی دوسری کتابیں ہے ایک کتاب الاختلاف في القسامة اور دوسری فضائل عمر بن عبد العزیز میں ہے۔

آپ کی پیدائش ۱۴۰ھ میں ہوئی اور وفات ۲۰۴ھ میں امام شافعی کی وفات کے کچھ دن بعد ہوئی۔

اسد بن فرات بن سنان: آپ خراسان نژاد ہیں، مگر پیدائش حران میں ہوئی مگر آپ کے والد تونس لے گئے۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد فقہ سیکھی پھر مشرق چلے گئے اور مالک سے موطا وغیرہ سنی پھر عراق گئے جہاں آپ سے ابو یوسف اور محمد بن حسن کی ملاقات ہوئی اور اسدیہ جو مدونہ سحنون کی اصل ہے اس میں ابن القاسم کے اقوال کو مصر کے اندر جمع کیا پھر قیروان گئے جہاں سحنون نے اسدیہ سیکھی۔ آپ نے قیروان کی قضا کا عہدہ سنبھالا، آپ کی وفات سرقوسہ کے حصار میں ہوئی۔ ولادت ۱۴۰ھ ہے۔

عبد الملک بن ماجشون: آپ بنی تمیم کے آزاد کردہ غلام تھے آپ کے والد عبد العزیز بن ماجشون حضرت مالک کے قریبی تھے۔ ایک قول میں ہے کہ موطا امام مالک کے لکھنے سے پہلے انہوں نے لکھا۔ آپ فصیح فقیہ تھے۔ آپ کی خدمت میں تا وقت وفات فتویٰ پیش کیا جاتا رہا اس سے پہلے آپ کے والد جو خود فقیہ تھے کے پاس فتوے آیا کرتے

تھے۔ آپ اندھے تھے۔ موسیقی سننے کے بڑے دلدادہ تھے۔ ابن حبیب مصنف واضحہ نے آپ کی خوب تعریف کی ہے اور خوب استفادہ کیا۔ وہ آپ کو تمام اصحاب مالک پر فہم میں اونچا مقام دیتے تھے۔

اجتہاد میں فقہ مالکی کی اہمیت - حضرت امام مالک نے سات فقہا اور دیگر فقہا کی فقہ اور ان سے حدیث پڑھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے یہاں ہر چہار جانب سے فتاوی آتے۔ آپ نے جو حدیث اور فقہ پڑھی تھی اس کے مطابق فتوی دیتے اگر ان سے مسائل کا تصفیہ نہیں ہو پاتا تو اس سے ملتی جلتی حدیث اور فقہ کے مطابق فتوی صادر فرماتے۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تب اجتہاد کرتے، اور کتاب اللہ، سنت رسول نص کی، یا اس کے نچوڑ یا اس کے اشارہ یا مفہوم سے احکام کا استخراج کرتے۔ لیکن اس سے پہلے نصوص کے درمیان موازنہ کرتے چنانچہ سنت اور کتاب کا موازنہ کرتے ہوئے نص میں تعارض نہ ہونے پر قیاس کا استعمال کرکے حکم صادر فرماتے اور اسی کو صحیح مانتے۔ پھر اگر کوئی ایسی مصلحت ہوتی تو اس مصلحت کے مطابق فتوی صادر کرتے جس میں شارع کی طرف سے نہ کوئی نص موجود ہو اور نہ اس کے اختیار میں کوئی حرج ہو۔ کیوں کہ فقہ مالکی میں مصلحت ان اصول میں سے تھی جن پر اس فقہ کا دارومدار تھا۔

آپ کی آزمائش:- ۱۴۶ھ یا ۱۴۷ھ میں مدینے کے حاکم جعفر بن سلیمان نے ایک بار آپ پر کوڑے برسایا تھا اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آپ بیعت اکراہ کو صحیح نہیں مانتے تھے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بنو عباس کی بیعت صحیح نہ تھی۔ جب کہ بعض مورخین کا ماننا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے متعہ کو حرام قرار دیا جب کہ خلفاے بنو عباس اس کو درست مانتے تھے۔ وجہ جو بھی رہی ہو۔ لیکن یہ طے ہے کہ آپ پر کوڑے برسایا گیا تھا۔

خلاصہ:- حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ جہاں فقیہ اثر تھے وہیں فقیہ رائے بھی تھے۔ آپ کی فقہ منجمد نہ تھی جیسا کہ ابن خلدون نے اس فقہ پر یہ الزام لگایا ہے۔ آپ کی فقہ حالات اور مقتضیات زمانہ پر منطبق تھی۔ جس کی اصل بنیاد کتاب اور سنت کے ساتھ دیگر اصول فقہ مالکی تھی۔ فقہ مالکی آج بھی حجاز، بصرہ، مصر، بلاد افریقہ، اندلس، صقلیہ، مراکش، اسلم، سودان میں پائی جاتی ہے۔ بغداد میں بھی خوب اس کا ظہور ہوا لیکن چار سو تک کچھ کمزور شکل میں رہی۔ نیشاپور میں اس کا فروغ ہوا جہاں پر اس فقہ کے ائمہ اور مدرسین پائے گئے۔

مراجع:- (۱) مالک: حیاته وعصره - آراؤه وفقهه امام محمد ابوزہرہ دار الفکر العربی۔ (۲) الفقہ الاسلامی: ومرونته وتطوره۔ جاد الحق علی جاد الحق ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۰م شیخ الازہر
(۳) نشأة الفقه الاجتهادی واطواره۔ محمد علی سائس مطبوعہ ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵م
(۴) المدخل للدراسة الفقه الاسلامی محمد یوسف موسیٰ دار الفکر العربی
(۵) اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب۔ جلد نمبر ۱۸، مطبوعہ ۱۴۰۵/۱۹۸۵ھ

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالحکیم ازہری☆

امام شافعی کی علمی واجتہادی خدمات

امام شافعی اہل سنت کے ان چار عظیم وجلیل اماموں میں سے ایک ہیں جن کے علم واجتہاد، فضل وکمال اور زہد وورع پر اس امت کا اتفاق ہے، امت اسلامیہ کا ایک بہت بڑا طبقہ آپ کا مقلد ہے اور آپ ہی کی طرف نسبت کرتے ہوئے خود کو شافعی کہتا ہے۔ آپ کا اسم گرامی ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع الہاشمی القرشی المطلبی ہے۔ آپ کے سلسلہ نسب میں ایک نام حضرت شافع ہے، جو صغار صحابہ میں سے ہیں، حضرت شافع ہی کی طرف نسبت کرتے ہوئے آپ کو شافعی کہا جاتا ہے۔ حضرت شافعی کے والد حضرت سائب ہیں، یہ بدر کے دن مشرکین مکہ کے ساتھ تھے اور مددواوں کی شکست کے بعد دیگر قیدیوں کے ساتھ آپ بھی قیدی بنالئے گئے، آپ نے قید سے رہائی کے لئے فدیہ ادا کیا، اور اس کے بعد آپ ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ امام شافعی کا نسب عبد مناف میں جاکر حضور اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے، آپ ہاشمی، اور قرشی ہیں اس اعتبار سے آپ میں یہ ایک ایسا وصف ہے جو باقی تینوں ائمہ مجتہدین سے آپ کو ممتاز کرتا ہے۔

آپ کے والد گرامی نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی، اور فلسطین کے شہر غزہ کا رخ کیا، آپ کا یہ سفر طلب معاش کے لئے تھا۔ آپ کے والد نے غزہ میں سکونت اختیار کرلی اسی شہر میں سن ۱۵۰ ہجری میں امام شافعی کی ولادت ہوئی۔ آپ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت عبداللہ محض ہیں، یہ برگزیدہ خاتون حضرت حسن مثنی کی پوتی اور سبط رسول سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالی کی پرپوتی ہیں۔ ابھی امام شافعی کی عمر صرف دو سال تھی کہ آپ کے والد کی وفات ہوگئی، جس کی وجہ سے آپ کی پرورش یتیمی، عسرت اور تنگ دستی کے عالم میں ہوئی، آپ کی والدہ آپ کو لے کر غزہ سے واپس مکہ مکرمہ آگئیں، لہذا آپ کی پرورش اور ابتدائی تعلیم مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ آپ سن تمیز ہی سے علوم وفنون کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوگئے تھے، ابتدا میں شعر، لغت اور تاریخ عرب کی طرف توجہ فرمائی، اس کے بعد تجوید وقرأت اور حدیث وفقہ کی تحصیل شروع کی۔ آپ نے لغت وشعر میں وہ کمال حاصل کیا کہ آپ کا شمار ائمہ لغت میں ہونے لگا۔ امام اصمعی فرماتے ہیں: "صححت اشعار هذيل على فتىً من قريش يقال له محمد بن ادريس" (میں نے ہذیل کے بہت سے اشعار کی صحت ایک قریشی نوجوان سے معلوم کی، اس قریشی نوجوان کا نام محمد بن ادریس ہے) امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے "كان الشافعي من افصح الناس" (شافعی لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح اللسان تھے) امام مالک کو امام شافعی کی قرأت بہت پسند تھی، کیونکہ آپ کی زبان میں بڑی فصاحت تھی۔ امام شافعی نے جب حدیث کی تحصیل کی طرف توجہ فرمائی تو صرف تیرہ سال کی عمر میں امام مالک کی کتاب "موطا" حفظ فرمالی، اس کے بعد آپ کی والدہ آپ کو مدینہ منورہ لے کر امام مالک کی خدمت میں لے کر پہنچیں اور آپ کو امام مالک کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے امام مالک کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا، امام شافعی نے امام مالک کی درسگاہ میں ان کی کتاب موطا کی قرأت کی۔ آپ علوم دینیہ کی طرف اپنے رجحان کا واقعہ خود اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "ایک دن میں ذوق وشوق سے لبید کے اشعار پڑھ رہا تھا کہ ناگاہ نصیحت آمیز غیبی آواز آئی، اشعار میں پڑ کر یوں وقت ضائع کرتے ہو، جاکر فقہ کا علم حاصل کرو، میرے دل پر اس آواز کا بہت اثر ہوا، اور میں نے مکہ میں سفیان بن عیینہ کی درسگاہ میں حاضری دی، ان کے بعد مسلم بن خالد زنجی، اور پھر مدینہ منورہ میں امام مالک کی خدمت میں پہنچا"۔ امام شافعی نے حضرت مسلم بن خالد کی درسگاہ سے فیض حاصل کیا، اور ان سے فقہ وحدیث کی تحصیل فرمائی، آپ کے استاذ آپ سے اتنے مطمئن تھے کہ انہوں نے امام شافعی کو بہت کم عمری میں افتاء کی اجازت مرحمت فرمائی۔ امام شافعی نہایت ذہین وفطین اور ذکی وعقل مند تھے۔ ابو عبید کہتے ہیں "ما رأيت احدا اعقل من الشافعي" (میں نے امام شافعی سے بڑھ کر کسی کو عقل مند نہیں پایا) اسی طرح یونس بن عبدالاعلی فرماتے ہیں "لو جمعت امة لوسعهم

☆Markazu Ssaqaafath Ssunniyya Po Karanthur, Kunnamangalam, Kozhikode-673571 (Kerala)

عقلہ" (اگر پوری امت بھی ایک طرف جمع ہو جائے تو امام شافعی کی عقل سب کو وسعت کر یگی)۔ مدینہ منورہ میں امام شافعی امام مالک کے علوم وفنون سے مستفید ہوتے رہے، اور ان سے حدیث وفقہ کی تحصیل کرتے رہے، آپ نے امام شافعی کی خدمت میں ۱۹ سال گزرے، یہاں تک کے امام مالک کی وفات ہوگئی۔

امام شافعی کے فضل وکمال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا "**عالم قریش یملأ طباق الارض علما**" (قریش کا ایک عالم دنیا کو علم سے بھر دے گا) ہمارے اصحاب شوافع کے علاوہ دوسرے علماء متقدمین نے بھی یہی فرمایا ہے کہ اس حدیث پاک میں امام شافعی کی طرف اشارہ ہے۔ امام احمد بن حنبل نے امام شافعی کے علم وفضل اور ان کی خدمت کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے "**ما مس احد محبرة ولا قلماً الا وللشافعی فی عنقه منة**" (جس شخص نے بھی قلم اور دوات کا استعمال کیا ہے، اس کی گردن پر امام شافعی کا احسان ہے۔ امام احمد مزید فرماتے ہیں کہ "امام شافعی دوسری صدی کے مجدد ہیں جس طرح کہ حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز پہلی صدی کے" ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا کہ تیس سال میں میری کوئی رات ایسی نہیں گزری جس میں میں نے امام شافعی کے لئے دعا نہ کی ہو"۔

اس علم وفضل کے ساتھ امام شافعی زہد وتقوی میں بھی بے مثال تھے، آپ عابد، زاہد، متقی اور نہایت پرہیز گار تھے، آپ کے زہد وورع کا تذکرہ کرتے ہوئے ربیع بن سلیمان کہتے ہیں "امام شافعی رات کے تین حصہ کرتے تھے، پہلے حصے میں تصنیف وتالیف، دوسرے میں نوافل اور تیسرے میں آرام فرماتے تھے"۔ ابراہیم بن محمد نے فرمایا "میں نے امام شافعی سے عمدہ کسی شخص کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، آپ کی نماز مسلم بن خالد کی نماز کے مشابہ تھی، اور ان کی مسلم جریج کی نماز کے مماثل، اور ان کی عطا بن ابی رباح کے، اور ان کی عبد اللہ بن زبیر کے اور ان کی حضرت ابو بکر صدیق کی نماز کے مشابہ تھی، حضرت ابو بکر صدیق کی نماز کے بارے میں کیا پوچھتے ہو ان کی نماز تو بالکل حضور ﷺ کی نماز کے مشابہ تھی"۔

امام شافعی کا منہج اجتہاد: امام شافعی نے اپنے مقرر کردہ اصول وقواعد کی روشنی میں کتاب وسنت سے مسائل کا استنباط واستخراج کیا، آپ کے قواعد اجتہاد آپ کی کتاب "الرسالۃ" میں درج ہیں جن کو بروئے کار لاکر آپ نے اجتہاد فرمایا، اور ان اصول وقواعد کے مطابق آپ نے اپنے فقہ کے جزئیات مدون فرمائے، آپ کے یہ اصول وقواعد عملی تھے محض نظری نہیں تھے۔ آپ کے ان اصولوں کے عملی ہونے کا بین ثبوت آپ کی مشہور زمانہ کتاب "الام" سے فراہم ہوتا ہے، جہاں آپ نے اپنے استخراج کردہ مسائل کے ساتھ ساتھ ان کے دلائل بھی درج کئے ہیں، اور ساتھ ہی آپ نے اپنے قواعد اجتہاد اور اصول استنباط کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کو منطبق کر کے ثابت کیا ہے کہ آپ نے یہ مسئلہ کس طرح مستخرج کیا ہے۔

آپ کے قواعد اجتہاد میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ آپ اولا مسئلہ کی دلیل کتاب اللہ میں دیکھتے ہیں، اور مسئلہ کی بنیاد کتاب اللہ کے ظاہر کو بناتے ہیں، اور اس وقت تک نص کے ظاہر میں تاویل سے گریز کرتے ہیں جب تک نص میں تاویل کے وجوب پر کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے۔ کتاب اللہ کے بعد آپ سنت رسول اللہ پر نظر کرتے ہیں، اور اپنے نظریہ کی بنیاد سنت رسول پر رکھتے ہیں، یہاں تک کہ آپ ایسی خبر واحد کو بھی اختیار کرتے ہیں جس میں کوئی راوی منفرد ہو، بشرطیکہ وہ منفرد راوی ثقہ ہو صدق میں معروف اور ضبط میں مشہور ہو۔ امام شافعی کے منہج استنباط اور طریقہ اجتہاد کو بغور دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ سنت رسول ﷺ کو قرآن فہمی کا بنیادی ماخذ قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ سنت رسول سے بے نیاز ہو کر قرآن کریم کو سمجھنا ایک امر دشوار ہے، یہ سنت رسول ہی ہے جو قرآن کریم کی تشریح وتفسیر کی منزل میں ہے۔ قرآن کریم میں صرف احکام عامہ اور قواعد کلیہ بیان کئے گئے ہیں، اب یہ حدیث کا کام ہے کہ وہ ان احکام عامہ اور قواعد کلیہ کی تشریح وتفسیر کرے، یہی حدیث ہے جو قرآن کے عام کو خاص کرتی ہے، مطلق کو مقید کرتی ہے، اور مجمل کو بیان کرتی ہے۔

اسی لیے امام شافعی نے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ حدیث نبوی کی حفاظت اور اس کے دفاع میں صرف کیا۔ اور آپ نے خبر واحد کے حجت ہونے پر دلائل قائم فرمائے۔ امام شافعی کی اسی خدمت حدیث اور دفاع سنت نے اصحاب حدیث کے درمیان ان کی قدر ومنزلت میں اضافہ کردیا، یہاں تک کہ آپ کا لقب ہی "ناصر السنۃ" پڑ گیا۔ آپ نہ صرف یہ کہ حافظ حدیث تھے بلکہ علل حدیث کی معرفت میں درجہ اجتہاد

پر فائز تھے۔ حسن بن محمد زعفرانی نے آپ کی اس خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا "كان اصحاب الحديث رقودا فأيقظهم الشافعي فتيقظوا" (اصحاب حدیث محو خواب تھے ان کو امام شافعی نے بیدار کیا تو وہ جاگے)

امام نووی شافعی مجموع میں تحریر فرماتے ہیں "ومن ذلك شدة اجتهاده في نصرة الحديث واتباع السنة وجمعه في مذهبه بين اطراف الادلةمع الاتقان والتحقيق والعوص التام على المعاني والتدقيق حتى لقب حين قدم العراق بناصر الحديث وغلب في عرف العلماء المتقدمين والفقهاء الخراسانيين على متبعي مذهبه لقب اصحاب الحديث في القديم والحديث" (المجموع: ج ۱ /ص ۱۰)۔ (امام شافعی کے فضائل ومراتب میں سے آپ کی نصرت حدیث کے سلسلہ میں جدو جہد، آپ کا اتباع سنت، اور آپ کا اپنے مذہب کو دلائل کے ساتھ جمع کرنا ہے، وہ دلائل جو اتقان، تحقیق، تدقیق اور معانی پر غور وفکر پر مبنی ہیں، یہاں تک کہ جب آپ عراق میں جلوہ گر ہوئے تو آپ کا لقب "ناصر الحدیث" رکھ دیا گیا، علمائے متقدمین اور خراسان کے فقہاء کے عرف میں آپ کے مذہب کا اتباع کرنے والے حضرات کو اصحاب حدیث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اہل فقہ، اہل اصول، اہل حدیث اور اہل لغت سب کے سب امام شافعی کی امانت، عدالت، زہد، ورع، تقویٰ اور علو قدر ومنزلت پر متفق ہیں۔ امام شافعی کی حیات میں ہمیں ان کا ایک خاص وصف ان کی فن مناظرہ میں مہارت بھی نظر آتا ہے، آپ بہترین مناظر تھے مگر آپ کا مناظرہ کرنا نہ اپنے مخالف کو زیر کرنے کے لئے تھا اور نہ شہرت وناموری کی خاطر، بلکہ آپ ہمیشہ مناظرے میں حق کے طالب ہوا کرتے تھے اور صرف اسی لئے مناظرے کے میدان میں آتے تھے کہ حق واضح ہوجائے، اس سلسلہ میں آپ کا یہ قول مشہور ہے۔ "ما ناظرت احداً الا ولم ابالي بيين الله الحق على لسانه او لساني" (میں نے جب بھی کسی سے مناظرہ کیا تو مجھے اس کی پرواہ نہیں رہی کہ اللہ میری زبان سے حق ظاہر فرمائے گا یا میرے مخالف کی زبان سے)

امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ نے ان سے دریافت کیا کہ "أي رجل كان الشافعي؟فأني رأيتك تكثر الدعاء له" (اے والد محترم! یہ شافعی کون شخص تھے جن کے لئے آپ بہت دعا فرماتے ہیں؟) امام احمد بن حنبل نے جواب دیا "كان الشافعي كالشمس للنهار وكالعافية للناس ،فانظر هل لهذين خلف او عنهما عوض" (امام شافعی ایسے ہی ہیں جیسے دن کے لئے سورج اور انسان کے لئے صحت، تو دیکھو کہ کیا ان دونوں چیزوں کا کوئی بدل ہے؟)

تصانیف: امام شافعی کی زندگی کا کثر حصہ درس وتدریس، علمی مباحث، استنباط مسائل، اور فقہ وافتا کی خدمت میں گزرا، اس کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر گراں قدر تصانیف بھی آپ نے اس امت کو عطا فرمائیں۔

ایک مرتبہ امام شافعی سے عبدالرحمن بن مہدی نے عرض کیا کہ میرے لئے کوئی ایسی کتاب تصنیف فرمادیں جس میں قرآن عظیم کے معانی معتبرہ، احادیث، اجماع اور ناسخ ومنسوخ کا بھی بیان ہو، آپ نے ان کی طلب پر عین عنفوان شباب میں اپنی مشہور زمانہ کتاب "الرسالہ" تصنیف فرمائی، جو مذکورہ تمام مقاصد اور خوبیوں پر مشتمل تھی۔

مسند شافعی کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے، یہ کتاب ان احادیث مرفوعہ کا مجموعہ ہے، جنہیں امام شافعی خود اپنے طلبہ کے سامنے بیان کیا کرتے تھے، امام شافعی کی بعض روایات کو ابو العباس محمد بن یعقوب اصم نے ربیع بن سلیمان مرادی سے سماع کرکے ان کو کتاب الام اور مبسوط کے ضمن میں جمع کردیا ہے، ابو العباس اصم نے ان تمام روایت کو یک جا کرکے اس کا نام مسند شافعی رکھ دیا ہے۔

وصال: ---مزنی روایت کرتے ہیں کہ جب امام شافعی کے وصال کا وقت قریب آیا تو میں ان کے پاس موجود تھا، میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ امام شافعی نے جواب دیا کہ دنیا سے روانگی اور احباب سے جدا ہونے کا وقت ہے، موت کا پیالہ پیش ہونے والا ہے اور نتیجہ اعمال نکلنے والا ہے، بہت جلد اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہوگی، کون جانے میری روح کدھر لے جائے گی۔

آپ کا وصال ۳۰ رجب المرجب سن ۲۰۴ ہجری میں جمعہ کی شب بعد نماز مغرب ہوا، آپ کا مزار مبارک مصر میں ہے جو آج بھی زیارت گاہ خاص وعام ہے، اور آپ کے علمی اور روحانی فیوض وبرکات کا دریا آج بھی رواں ہے۔

☆☆☆☆

مولانا انوار احمد بغدادی ☆

امام احمد بن حنبل کی علمی و اجتہادی خدمات

ایک لمبی کشمکش اور خوں ریز تاریخ کے ساتھ خلافت امویہ کی فائل ۱۳۲ھ میں دمشق کے کھنڈرات میں بند ہوگئی اور زمام اقتدار عباسیوں کے ہاتھ آگئی جنھوں نے ایک طرف اپنے خلاف سلگنے والی ہر قسم کی بغاوت کی آگ بڑے سفاکانہ انداز سے بجھانے کی کوشش کی۔ تو دوسری طرف عام رفاہی کام، امور سلطنت میں عام اصلاحات اور علم و علما کی خدمت بھی خوب کی۔ جس کے نتیجے میں جہاں ایک طرف بغاوتوں میں کمی آئی، عام لوگوں نے سکون کی سانس لی اور امن وامان کا ماحول پیدا ہوا تو دوسری طرف علمی تحریک کو بھی تقویت ملی، علوم وفنون کے سوتے پھوٹ پڑے، تدوین وتالیف اور ترجمہ نگاری کا ایسا حسین آغاز ہوا کہ دوسری قوموں کے بھی موروثی ذخیرے محفوظ کر لیے گئے۔ سسکتی اور دم توڑتی افلاطونی اور سقراطی فکریں عربی تحریروں میں قید کر لی گئیں۔ علم ومعرفت کا کوئی ایسا گوشہ نہیں بچا جس کی اپنی باضابطہ فوج نہ تیار ہوگئی ہو، روایت ودرایت، حدیث وفقہ، نحو وصرف، لغت وادب، تفسیر وکلام، منطق وفلسفہ، ہر میدان میں ہر سمت قابل قدر علمی پیش رفت عمل میں آئی۔ علامہ ذہبی کہتے ہیں:

"۱۴۳ھ میں علمائے اسلام نے حدیث وفقہ اور تفسیر کی تدوین شروع کردی، چنانچہ مکہ میں ابن جریج نے تدوین کی، مدینہ میں امام مالک نے موطا لکھی، شام میں اوزاعی، بصرہ میں ابن ابی عروبہ اور حماد بن سلمہ وغیرھما نے تصنیفی کام کیے، یمن میں معمر، کوفہ میں سفیان ثوری نے تدوین کا کام انجام دیا، ابن اسحاق نے مغازی لکھا جبکہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ اور قیاس میں تصنیف کی، پھر کچھ ہی عرصے کے بعد ہشیم، لیث اور ابن لہیعہ نے تصنیف کیا، پھر ابن مبارک، ابو یوسف اور ابن وہب نے تصنیف کیا اور علم کی تدوین وتبویب کی کثرت ہوگئی۔ علوم عربیہ، لغت وتاریخ اور سیر وحروب کی کتابیں مدون ہوگئیں۔ جبکہ اس زمانہ سے پہلے ائمہ کرام کا اعتماد اپنی یادداشت پر تھا یا غیر مرتب صحیح صحائف سے علم کی روایت کیا کرتے تھے"(۱)

"خلافت امویہ کے آخری دور اور دور عباسی کے آغاز میں صرف پچاس سال کے اندر ہی بیشتر علوم وفنون کی ترتیب وتدوین عمل میں آچکی تھی۔ خواہ علوم نقلیہ ہو، مثلاً علوم قرآن، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور لغت وادب کے مختلف علوم وفنون یا علوم عقلیہ ہو، مثلاً علوم ریاضیات، منطق، فلسفہ اور کلام" (۲)

یہی وہ زمانہ تھا جب معتزلیوں کی تحریک جوان تھی اور اس کی لپٹ خلافت عباسیہ کے قصر شاہیں کو جھلسا رہی تھی۔ مامون، (م: ۲۱۸ھ) معتصم (م ۲۲۷ھ) اور واثق باللہ (م ۲۳۲ھ) اعتزال کے مبلغ وداعی بن گئے تھے۔ (۳) منطق وفلسفہ کا عقل وشعور پر اس طرح غلبہ ہوا کہ "العقل هي السلطان" کے دلخراش نعرہ سے خلافت کی گلی، کوچے گونج اٹھے۔ ہر جگہ بحث ومباحثہ کا بازار گرم ہوگیا۔ اسلام کی تعلیمات میں محض عقلی گھوڑے دوڑنے لگے، فطرتاً لوگ حدیث وسنت سے دور اور بدعت، محدثات اور طرح طرح کی خرافات سے قریب ہوگئے۔ ایسے دور میں اللہ تعالیٰ نے محی السنۃ، ماحی بدعت حضرت امام احمد بن حنبل کو پیدا فرمایا جنھوں نے نہایت بیباکی کے ساتھ اعلان حق فرمایا۔ کوڑے کھاتے رہے مگر حق گوئی سے مہر بلب نہ ہوئے۔ جسم سے خون رس کر بہتا رہا مگر "القرآن مخلوق" کا قول نہ کیا۔

ہزار خوف ہو لیکن زبان دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
جن کی بڑھتی ہوئی بیتابی وبیباکی سے
تازہ ہر عہد میں قصہ فرعون وکلیم

حسب ونسب:- آپ کا نام احمد بن حنبل اور کنیت ابو عبد اللہ ہے، آپ کا تعلق خالص عربی قبیلہ "شیبان" سے ہے، آپ کا نسب شریف حضرت امام بیہقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ "مناقب احمد" میں اپنے شیخ حضرت ابو عبد اللہ الحاکم صاحب مستدرک سے یوں نقل کرتے ہیں۔

احمد بن محمّد بن حَنبل بن هِلال بن أَسَد بن إدريس

بن عبد الله بن حيّان بن عبد الله بن أنس بن عوف بن قاسط بن مازن بن شيبان بن ذُهْل بن ثعلبة بن عُكابة بن صعب بن عليّ بن بكر بن وائل بن قاسط بن هنب بن أفصى بن دُعمى بن جديلة بن أسد بن ربيعة بن نزار بن معدّ بن عدنان بن أُدّ بن أُدَدِ بن الهُمَيْسَع بن حَمَل بن النبت بن قيدار بن إسماعيل بن إبراهيم الخليل عليهما السلام .(۳)

قاضی ابوالحسین محمد بن ابی یعلی بغدادی نے بھی اسی طرح کا شجرۂ نسب معمولی اختلاف کے ساتھ مبارک بن عبد الجبار بن احمد سے روایت کرتے ہوئے ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے "مازن بن شيبان بن ذهل بن ثعلبة" کی جگہ "مازن بن ذهل بن شيبان بن ثعلبة" رقم فرمایا ہے(۴)

آپ کا یہ وہ ارفع واعلی اور مبارک ومسعود شجرۂ نسب ہے جسے سرکار دوعالم ﷺ کے شجرۂ نسب سے ملنے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ یہ مبارک سلسلہ نبی کریم ﷺ کے جد امجد نزار بن معد بن عدنان سے ملتا ہے۔ نزار کے دو بیٹے تھے مضر اور ربیعہ۔ مضر کی نسل پاک سے آپ ﷺ ہیں اور ربیعہ کی نسل سے حضرت امام احمد بن حنبل ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پیدائش:۔ آپ کی پیدائش بغداد شریف میں ۱۶۴ھ میں ہوئی، آپ کی عمر تین برس تھی کہ آپ کے سر سے آپ کے والد بزرگوار کا سایہ اٹھ گیا، آپ کی پوری کفالت آپ کی والدہ محترمہ نے کی۔

تعلیم وتربیت :۔ کم عمری ہی میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا اور حسب ضرورت لغت کے مسائل سیکھنے کے بعد تحریر وکتابت کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں: "میں ابھی بالکل بچہ ہی تھا کہ حفظ قرآن سے فارغ ہو گیا۔ چودہ سال کا تھا کہ تحریر وکتابت کی مشق وتحصیل میں منہمک ہو گیا"

حضرت کی نجابت اور استقامت، دیانت اور ثقاہت، سعادت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ہم نشینوں کے لئے موجب تقلید اور ان کے آباء کے لئے باعث رشک بن گئے تھے۔ یہ لوگ اپنے بچوں کے لئے آپ کو نمونہ اور ماڈل سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے: "میں نے اپنے لڑکے پر اتنا خرچ کیا، اسے اتنے استاذوں کے حوالے کیا، اسے ادب اور تمیز سکھائی لیکن کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا اور احمد بن حنبل کو دیکھو یہ یتیم لڑکا اپنے ادب اور حسن عمل کے باعث کیسے پسندیدہ و قابل رشک خصائص کا حامل بن گیا۔

شعور بلوغ کے مراحل میں داخل ہوتے ہی آپ نے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ کی درسگاہ کا رخ کیا۔ مگر بعد میں آپ نے قاضی صاحب کی مجلس چھوڑ دی اور ۱۶ برس کی عمر میں طلب حدیث کی طرف متوجہ ہو گئے، پانچ مرتبہ آپ نے حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا اور حجازی علماء ومحدثین سے خوب خوب استفادہ کیا، علاوہ ازیں آپ نے کئی بار بصرہ کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے استفادہ کیا، اس کے علاوہ شام، یمن، کوفہ وغیرہ کا بھی سفر کیا ہے۔

طلب حدیث میں آپ چالیس برس کی عمر تک مختلف بلاد اسلامیہ کے سفر کی مشقتیں برداشت کرتے رہے۔ کبھی کوفہ، کبھی بصرہ اور کبھی سرزمین حجاز یہاں تک کہ آپ کے کسی سفر میں آپ کے کسی جاننے والے نے استعجاباً کہا "کب تک کوفہ و بصرہ کا سفر ہوتا رہے گا" بلاشبہ آپ کا یہ کمال احتیاط تھا اور آپ کی نظر میں سنت مصطفی کی کمال جلوہ گری تھی کہ جب آپ کی عمر چالیس برس ہوگئی تب آپ مسند حدیث وافتاء پر جلوہ گر ہوئے اور خلق کثیر نے آپ کی ذات بابرکت سے اکتساب فیض کیا۔ امام ابن جوزی نے اس سلسلے میں ایک روایت بھی بیان کی ہے: "امام احمد کا ایک معاصر ۲۰۳ھ میں سلسلۂ طلب حدیث ان کے پاس پہنچا لیکن انھوں نے حدیث بیان کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ امام عبدالرزاق بن ہمام کے پاس یمن گیا پھر وہ ۲۰۴ھ میں بغداد آیا تو دیکھا کہ امام حدیث بیان کر رہے ہیں اور لوگ ان پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں" (۶)

سفر آخرت:۔ امام احمد بن حنبل کا انتقال مختصر سی علالت کے بعد بروز جمعہ مبارکہ ۱۲/ ربیع الاول ۲۴۱ھ میں ہوا، آپ نے ۷۵ برس کی عمر پائی اور شہیدوں کے قبرستان (مقبرالشہداء) میں حرب دروازے کے قریب دفن ہوئے۔ آپ کی نماز جنازہ میں بے شمار مردوں اور عورتوں نے شرکت کی۔ امیر محمد بن طاہر نے مردم شماری کا حکم دیا تو آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد تیرہ لاکھ تھی، ایک روایت میں ہے کہ سات لاکھ تھی۔ خلافت کے تقریباً سوار باب اقتدار بھی موجود رہے۔ آپ کی نماز جنازہ نائب شہر محمد بن عبد اللہ نے

پڑھائی، بھیڑ کی وجہ سے آپ کی کئی مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی بلکہ بعد تدفین قبر پر بھی پڑھی گئی اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تدفین کی کاروائی نماز عصر کے بعد تک چلتی رہی۔(۷)

مستشرق لاؤسٹ لکھتا ہے: ''آپ کے جنازے کی تفصیلات سے جو کسی حد تک افسانے کا رنگ رکھتی ہیں، یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ آپ کے متعلق عوام کے دل میں درحقیقت محبت کے مخصوصانہ جذبات تھے، چنانچہ آپ کے مقبرے پر جوش وعقیدت کے ایسے مظاہرے ہوئے کہ مقامی حکام کو قبرستان کی حفاظت کے لئے پہرا لگانا پڑا، بغداد میں آپ کا مقبرہ سب سے بڑی زیارت گاہ بن گیا'' (۸)

۵۷۴ھ میں خلیفہ المستضئی نے اس پر ایک کتبہ لگوادیا، جس میں اس یگانہ روزگار محدث کو سنت کے زبردست ترین حامی کے طور پر بہت سراہا گیا۔ آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی میلادی میں دریائے دجلہ کے ایک سیلاب میں یہ مقبرہ بہہ گیا۔(۹)

امام احمد بن حنبل کا زہد وتقوی:-آپ ایک جامع کمالات، گونا گوں خوبیوں کے حامل، درویش صفت، متقی پرہیزگار، صالح اور نیک طبیعت کے مالک تھے، دینداری آپ کے رگ رگ میں بسی تھی، آپ زہد وتقوی کی اعلی مثال تھے، ابن کثیر نے ابوداود کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ کی مجلسوں میں کبھی دنیا کی باتیں نہیں ہوتیں اور نہ ہی آپ کبھی دنیا کا ذکر کرتے تھے۔

بیہقی نے مزنی سے، انھوں نے شافعی سے روایت کی ہے، شافعی نے رشید سے کہا کہ یمن کو ایک قاضی کی ضرورت ہے، رشید نے کہا: کسی کو چن کر یمن کا قاضی بنادیں، تو حضرت امام شافعی نے حضرت امام ابن حنبل سے کہا جو آپ کے من جملہ شاگردوں میں تھے: کیا آپ یمن کی قضا قبول کریں گے؟ تو آپ نے اس پیشکش کو سرے سے ٹھکرادیا اور امام شافعی سے فرمایا کہ میں آپ کے پاس صرف علم کی بنیاد پر آتا ہوں اور آپ مجھے یمن کا قاضی بنانا چاہتے ہیں، اگر علم کی بات نہ ہوتی تو میں آج کے بعد سے آپ سے بات نہ کرتا۔

آپ کے زہد وتقوی کا عالم یہ تھا کہ اپنے چچا اسحاق بن حنبل اور اپنے بیٹوں کے پیچھے صرف اس لیے نماز پڑھتے تھے اور نہ ان سے باتیں کرتے تھے کہ ان لوگوں نے خلیفہ متوکل باللہ کے انعامات قبول کر لئے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ آپ کو تین دنوں تک کچھ کھانے کو نہیں ملا، آپ نے اپنے کسی دوست سے آٹا قرض لیا، اتفاق سے آپ کے گھر والوں کو اس کی اطلاع ہوگئی، ان لوگوں نے جلدی سے آٹا گوندھا اور روٹی تیار کرکے آپ کی خدمت میں حاضر کردیا، آپ نے پوچھا اتنی جلد؟! گھر والوں نے جواب دیا کہ صالح (آپ کے فرزند) کے گھر میں تنور جل رہا تھا، ہم نے وہاں روٹی پکالی ہے، اس پر آپ نے فرمایا اسے فوراً اٹھالو! اور آپ کھانے سے باز رہے، بیہقی کہتے ہیں کہ صالح نے چونکہ بادشاہ وقت کا انعام قبول کرلیا تھا اس لیے ان کے تعلق سے آپ نے یہ موقف اختیار کیا۔

بیہقی کہتے ہیں کہ خلیفہ متوکل انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات سے سجا دسترخوان بھیجا کرتا تھا مگر آپ اس میں سے کچھ بھی نہیں تناول فرماتے تھے۔(۱۰)

اس طرح بیشار واقعات ہیں جو آپ کے زہد سے متعلق ہیں جن کی یہاں گنجائش نہیں۔

امام احمد بن حنبل کے شیوخ واساتذہ:-آپ ایک زمانہ تک مختلف بلاد اسلامیہ کا سفر کرکے محدثین زمانہ اور فقہا وقت سے استفادہ کرتے رہے، اس لئے آپ کے اساتذہ وشیوخ کی فہرست لمبی ہے، علامہ ابن جوزی نے ''مناقب'' میں آپ کے اساتذہ وشیوخ کی فہرست ترتیب ابجدی کے اعتبار سے تیار کی ہے جو سو سے متجاوز ہے، جن میں ظاہر ہے کہ آپ کے وہ سبھی شیوخ و اساتذہ شامل ہیں جن سے آپ نے یا تو فقہ میں استفادہ کیا ہے یا کوئی حدیث اخذ کی ہے یا کسی حدیث کی روایت کی ہے۔ ان میں چند اہم اساتذہ کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں

بغداد شریف میں آپ نے سب سے پہلے حضرت امام ابو یوسف (م: ۱۸۲ھ) سے استفادہ کیا، پھر سولہ برس کی عمر میں طلب حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور باقاعدگی کے ساتھ ہشیم بن بشیر کے درس میں جو حضرت ابراہیم النخعی کے شاگرد تھے (۱۷۹ھ) سے لے کر (۱۸۳ھ) تک شریک رہے۔ آپ کے بڑے اساتذہ میں حضرت سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ) ہیں جو دبستان حجاز کے سب سے بڑے مستند عالم تھے۔ آپ کے دوسرے اساتذہ میں بصرہ کے عبدالرحمن بن مہدی (م: ۱۹۸ھ) اور کوفے کے واقع بن الجراح (۱۹۷ھ) تھے (۱۱)

ابن کثیر نے امام بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل کے من جملہ اساتذہ میں حضرت امام شافعی بھی ہیں- امام احمد

بن حنبل نے شافعی سے فقہ میں استفادہ کیا ہے اور مسند وغیرہ میں آپ سے روایت بھی کی ہے۔ جب امام احمد بن حنبل اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ کے ترکے میں حضرت امام شافعی کے دونوں قدیم و جدید رسالے پائے گئے۔(۱۲)

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام احمد بن حنبل کی فکر میں عراق و حجاز اور کوفہ و بصرہ کی خمیر شامل ہے جو متنوع ہونے کے ساتھ کافی زرخیز بھی ہے۔ امام صاحب کا یہ علمی پس منظر آپ کو ایسی غذا فراہم کرتا ہے جس سے ایک ایسے مسلک فقہی کی تشکیل ہوتی ہے، جسے مدینہ شریف کے مدرسہ حدیث اور عراق کے مدرسہ قیاس کا حسین سنگم کہا جا سکتا ہے۔ جس میں جہاں ایک طرف نقلی دلائل کی چاشنی ملتی ہے تو دوسری طرف حسب ضرورت عقلی دلائل کی صلابت بھی محسوس کی جاتی ہے۔ اس لیے یہ حقیقت پر ظلم کرنے کے مترادف ہوگا کہ امام کے اساتذہ کا دائرہ تنگ کر کے آپ کے فکری پس منظر کو کسی خاص مدرسہ فکر کے احاطہ میں محدود کر دیا جائے۔ جیسا کہ مستشرق لاؤسٹ ابن تیمیہ کے حوالے سے لکھتا ہے:

"لیکن جیسا کہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے (منہاج السنہ ۴/۱۴۳) علم فقہ میں آپ کی تعلیم و تربیت زیادہ تر اہل حدیث اور دبستان حجاز کی مرہون منت ہے۔"(۱۳)

حلقۂ درس اور تلامذہ:- مسند درس و افتاء پر جلوہ فرما ہونے سے پہلے آفاق اسلامیہ کے کونے کونے میں آپ کی شہرت ہو چکی تھی لہٰذا لازمی تھا کہ آپ کا حلقہ درس انبوہ خلائق ہو چنانچہ بعض رواۃ کا بیان ہے کہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد پانچ ہزار نفوس کے قریب تھی، ان میں سے پانچ سو کے قریب وہ تھے جو لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بغداد میں اتنے آدمیوں کی گنجائش جہاں ہو سکتی تھی وہ جامع مسجد کے سوا اور کوئی جگہ نہیں تھی چنانچہ ضروری ہوا کہ امام احمد وہیں اپنا درس قائم کریں۔ گرچہ آپ کی مجلس میں شریک ہونے والے سبھی لوگ آپ سے علم کے جویاں نہ تھے بلکہ کچھ تو حصول برکت کی خاطر حاضر ہوتے تھے اور کچھ اخلاق و کردار سے سبق سیکھتے تھے۔

اس کے علاوہ امام صاحب کی ایک خصوصی مجلس بھی تھی جو آپ کے گھر میں سجتی تھی۔ اس میں آپ کے صاحبزادوں کے علاوہ خاص خاص شاگرد استفادہ کرتے تھے۔(۱۹)

امام احمد بن حنبل کی تصانیف:- زہد و تقویٰ، بے نیازی اور احیاء قرآن و سنت کا جذبہ اخلاص ہی تھا کہ حضرت امام احمد بن حنبل اپنے متبعین کو اپنے افکار و نظریات کی تدوین و تالیف سے منع فرماتے تھے کہ مبادا کہیں ان کے افکار قرآن و سنت سے دوری کے اسباب نہ بن جائیں، یہی وجہ تھی کہ حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ کے برعکس فقہ میں آپ کی کوئی کتاب آپ کی حیات طیبہ میں مدون نہ ہو سکی اور جو کتابیں آپ کی حیات طیبہ میں منظر عام پر آئیں وہ فی الجملہ حدیث ہیں جس کی تدوین میں آپ حرج نہیں تصور فرماتے تھے۔ وہ کتابیں یہ ہیں: المسند، التاریخ، الناسخ والمنسوخ، المقدم والمؤخر فی کتاب اللہ، فضائل الصحابۃ، المناسک الکبیر، المناسک الصغیر، کتاب الزہد، کتاب الرد علی الجہمیۃ اور کتاب الرد علی الزنادقۃ۔ ان کے علاوہ چند رسائل ایسے ہیں جس میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے اور اس کو مدلل کیا ہے۔(۲۰)

داستان صبر و عزیمت مسئلہ خلق قرآن کے تناظر میں:- کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے یہ کہا کہ قرآن مخلوق ہے وہ جعد بن درہم تھا جو عہد اموی کا ایک فرد تھا، اسے عید اضحیٰ کے دن کوفہ میں خالد بن عبداللہ القسری نے اس جرم کے پاداش میں قتل کر ڈالا مگر اس کی فکر عربی معاشرے میں پنپتی بڑھتی رہی۔ جہم بن صفوان اور حارث بن سُریج کو مروان بن محمد کے زمانے میں سیاسی اسباب کی بنیاد پر قتل کر دیا گیا۔(۲۱)

ایک قول یہ بھی ہے کہ واصل بن عطا نے جو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کا خوشہ چیں تھا۔ آپ کی مجلس سے باضابطہ اعتزالی اصولوں کے ساتھ اعتزال پسندی کا اعلان کیا اور اس تحریک کی داغ بیل ڈال دی۔ امویوں کے دور میں یہ تحریک زیادہ کامیاب نہ ہو سکی مگر جوں ہی عباسیوں کا دور شروع ہوا۔ نئے عناصر سے عرب متعارف ہوئے۔ یونانی اور سریانی زبانوں سے علوم فلسفیہ کے ترجمے ہوئے۔ پس پردہ اسلام کے خلاف برسر پیکار فکری یورشوں کو بھی پنپنے اور بڑھنے کا موقع مل گیا۔ جس کے نتیجے میں منطق و فلسفہ اور عقل مضطرب کے سائے تلے پرورش پانے والی اعتزالی تحریک کو بھی تقویت ملتی گئی۔ چند ہی سالوں میں یہ تحریک بصرہ و بغداد کی مسجدوں کے محراب سے نکل کر تخت سلطنت پر قابض ہو گئی۔ ہارون کا زمانہ ختم ہوتے ہی مامون اعتزالی تحریک کے سلک میں باضابطہ طور پر پرو دیا گیا۔

مامون ایک معتدل علم دوست، دینی جذبہ سے سرشار اور صاحب فکر و تدبر بادشاہ تھا۔ اپنے بڑے بھائی محمد امین کی حرص بے جا اور بے راہ

روی کی وجہ سے اس کا تختہ پلٹ کر ۱۹۸ھ سے ۲۱۸ھ تک بلا اشتراک غیر خلافت عباسیہ کا بادشاہ رہا- اس نے اپنے دور خلافت میں علماء وشعراء کو اپنے والد ہی کی طرح خوب نوازا- ارباب فکر ونظر کو قریب کیا جس کے نتیجے میں علم وفن کے ہر شعبے میں قابل قدر پیش رفت ہوئی-

چونکہ مامون ادیان ومذاہب میں ابو ہذیل علاف کا شاگرد تھا، ابو ہذیل وہ شخص ہے جس کا شمار معتزلہ کے سربراہوں میں ہوتا ہے۔ مامون نے جب افکار وعقائد کی چھان پھٹک کے لئے مجلس مناظرہ منعقد کیں تو یہ معتزلہ سب سے آگے تھے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اس لئے کہ یہ لوگ عقلی طور پر مسائل کی بحث میں خصوصیت وامتیاز رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ مامون پر ان لوگوں کا اثر بہت زیادہ ہوگیا انھیں اپنے سے قریب کیا مناصب وزارت بھی تفویض کی بلکہ اس جماعت کے ایک فرد ابو عبد اللہ احمد ابی داؤد کو تو اتنا نوازا کہ اپنے بھائی معتصم کو وصیت کردی کہ امور مہمہ میں اس کی فکر ورائے کو شریک رکھا کرے۔ چنانچہ وہ اپنی وصیت میں لکھتا ہے: "ابو عبد اللہ بن ابی داؤد کو اپنے ہر معاملہ میں شریک کار رکھنا"

جب معتزلیوں نے دربار خلافت میں اپنی دال گلتی ہوئی دیکھی تو انھوں نے سوچا کہ اب مامون سے خلق قرآن کے عقیدہ کا اعلان کروا دیا جائے چنانچہ یہ بات مامون کے دل میں بیٹھ گئی اور اس نے ۲۱۲ھ میں اس عقیدہ کا اعلان کردیا اور معتزلیوں نے اسے ان علماء اور محدثین کے خلاف خوب ورغلایا جو اس فکر کے قائل نہ تھے بالخصوص حضرت امام احمد بن حنبل کے خلاف یہاں تک کہ ان برگزیدہ ہستیوں پر ظلم وتشدد کے پہاڑ بھی توڑنے سے نہ چوکے۔

مامون اپنی موت سے چند ماہ قبل طرسوس میں رومیوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا، معتزلیوں کے اکسانے پر اس نے وہیں سے حاکم بغداد اسحاق بن ابراھیم کو خط لکھا کہ لوگوں کو خلق قرآن کے عقیدے سے قائل کراؤ جو انکار کرے اسے ہمارے پاس بھیج دو۔ حاکم بغداد نے حکم پورا کیا اور کچھ علماء کو اس فکر سے رجوع بھی کرالیا مگر حضرت امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح نے صبر وثبات سے کام لیا اور اعتزالی فکر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے صاف انکار کردیا جس کے پاداش میں ان دونوں کو بیڑیوں میں ڈال کر طرسوس روانہ کردیا گیا مگر ابھی یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ مامون اس دنیا سے چل بسا اور ان لوگوں کو بغداد واپس بھیج دیا گیا-

مامون کے بعد اس کا بھائی تخت نشین ہوا۔ یہ علم سے کورا اور تلوار کا دھنی تھا۔ مجاہدانہ صفت کا حامل جنگی مزاج بادشاہ تھا۔ اسی کے ہاتھوں عموریہ اور ترکی کے بیشتر علاقے فتح ہوئے۔ معتصم کے اس مزاج کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معتزلیوں نے اسے منکرین خلق قرآن کے ساتھ تشدد برتنے پر اکسایا۔ چنانچہ اس نے معتزلیوں کے حریفوں پر خوب ظلم ڈھایا۔ بالخصوص امام احمد بن حنبل جو معتزیوں کے سب سے بڑے حریف تھے، آپ کو قید وبند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، آپ پر کوڑے برسائے گئے، جسم سے خون رس کر بہ نکلتا- آپ پر بیہوشی طاری ہوجاتی تو آپ کو تلوار کی نوک سے جگایا جاتا، پھر کوڑے کی برسات کی جاتی مگر آپ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، آپ نے کسی بھی حال میں خلق قرآن کا قول نہ کیا۔ صبر وعزم کا پہاڑ بن کر باطل کا مقابلہ کرتے رہے- یہاں تک کہ ظلم ہار گیا اور مظلوم کی فتح ہوگئی- ۲۲۷ھ میں معتصم کا انتقال ہوگیا اور اس کے لڑکے واثق باللہ نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی- اس کا رویہ حضرت امام احمد بن حنبل کے ساتھ گرچہ اپنے والد کی طرح سفاکانہ نہ رہا اور اس نے آپ کو جسمانی اذیت دینے سے گریز کیا مگر اس نے آپ کو لوگوں میں گھلنے ملنے سے منع کردیا اور امام صاحب کے لیے یہ حکم صادر کردیا کہ: "تمہارے پاس کسی کو ملنے اور آنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ تم اس شہر میں اقامت اختیار کرو جہاں میرا قیام ہو"-

اس حکم کے بعد امام صاحب اپنے گھر میں محصور ہوگئے حتی کہ نماز وغیرہ کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے- آپ کا دور ابتلاء وآزمائش یوں ہی گزرتا رہا یہاں تک کہ ۲۳۲ھ میں واثق کا بھی انتقال ہوگیا اور متوکل باللہ نے زمام اقتدار سنبھالا- اسی کے ساتھ معتزلیوں کا سورج ڈھلنے لگا اور احیاء سنت کا دور شروع ہوا- (۲۲)

جس طرح سونا دہکتے انگاروں پر جلنے کے بعد نکھر جاتا ہے یوں ہی حضرت امام کی شخصیت اس آزمائش سے گزرنے کے بعد سونا ہوگئی۔ معتزلیوں کے ظلم وتشدد اور حضرت امام احمد بن حنبل کے صبر واستقلال نے جہاں ایک طرف معتزلی تحریک کو موت کے گھاٹ اتار دیا وہیں لوگوں کو ظلم کے سائے میں جرأت مندی کے ساتھ جینے کا حوصلہ عطا کیا اور امام کی فکر کو بقاء وخلود بخش دیا- شرق وغرب میں آپ کی مقبولیت میں بے تحاشہ اضافہ ہوگیا، علی الاطلاق آپ کو اس زمانے کی سب سے بڑی شخصیت تسلیم کرلیا گیا، مگر ہمارے امام کو یہ سب راس نہ آیا بلکہ خشیت وتقوی میں مزید اضافہ ہوگیا اور آپ کی نظر میں اگر آزمائش کا ایک دور

ختم ہوا تھا تو اس سے کہیں سخت دور کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ پر متوکل کی کرم فرمائیاں شروع ہوئیں۔

امام احمد بن حنبل کی محدثانہ عظمت:۔ حضرت امام احمد بن حنبل ایک بلند پایہ جلیل القدر محدث تھے۔ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ آپ کو تقریباً سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں اور ایک روایت میں ہے کہ دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں (۲۳) آپ کی حدیث دانی پر ائمہ زمانہ کو اعتماد تھا چنانچہ حضرت امام شافعی آپ کے تعلق سے فرماتے ہیں

''اگر آپ کے پاس کوئی صحیح حدیث پہنچ جایا کرے تو مجھے بھی اس سے باخبر کر دیا کیجیے خواہ وہ کسی حجازی سے پہنچی ہو یا شامی سے یا عراقی سے یا یمنی سے'' (۲۴)

قاضی ابوالحسین محمد بن ابی یعلی البغدادی کہتے ہیں کہ: حضرت امام احمد بن حنبل متفقہ طور پر بلا چون وچرا امام فی احادیث تھے۔ (۲۵)

امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی محدثانہ عظمت کا سب سے بڑا شاہکار آپ کی مسند ہے جس کا عبوری جائزہ لینے سے قبل مناسب ہوگا کہ تدوین کا ایک مختصر تاریخی پس منظر پیش کر دیا جائے تاکہ علم حدیث پر آپ کی گراں قدر خدمات کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

ابتدائے امر میں صحابہ کرام کا اس بات میں اختلاف رہا کہ حدیثیں جمع کی جائیں یا نہیں لیکن پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہی ارباب عقل وتدبر کو یہ بات شدت سے محسوس ہونے لگی کہ سرچشمہ حدیث خشک ہوتا جا رہا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یکے بعد دیگرے اس روئے زمین سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اس لئے تدوین حدیث کی طرف پہلا قدم بڑھاتے ہوئے حضرت عمر بن عبد العزیز نے قاضی مدینہ ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں جمع کرو! مجھے اندیشہ ہے کہ علماء کوچ کر جائیں اور علم کا نام ونشان مٹ جائے۔ ابونعیم نے تاریخ اصفہان میں تخریج کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پوری اسلامی سلطنت کے اہل علم کو لکھا کہ رسول اکرم ﷺ کی حدیثیں تلاش کرو اور جمع کرو۔ (۲۶)

یہ ۹۹ھ کی بات ہے جب ذخیرہ حدیث باضابطہ طور سے صفحہ قرطاس پر نہیں بلکہ صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی خلیفۃ المومنین نے تدوین حدیث کا حکم نامہ جاری فرمایا مگر نوشت تقدیر کہ جلد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا اور یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا مگر جب دور عباسی کا آغاز ہوا اور اسی کے ساتھ علوم وفنون کی تدوین میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا تو سب سے پہلے جس علم نے تدوین کے چہرہ زیبا کی زیارت کی وہ تھا علم حدیث۔ چنانچہ درجنوں علمائے حدیث نے تدوین حدیث کا کام انجام دیا، بہتہ کتاب کی شکل میں ہم تک صرف موطا امام مالک پہنچ سکی ہے جسے محدث مدینہ نے فقہی ابواب کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے، اس کتاب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابتداء امر میں جمع حدیث کا پہلا مقصد خدمت فقہ تھی (۲۷)

تدوین حدیث کا یہ پہلا مرحلہ تھا جس میں ابواب فقہ کی رعایت تھی۔ لیکن دوسری صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے بعض ائمہ حدیث کی توجہ اس بات کی طرف مبذول ہوئی کہ حدیث نبوی کو اقوال صحابہ سے الگ کر دیا جائے جیسا کہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ بخاری شریف کی شرح میں تدوین حدیث کے دور اول کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''دور اول کی تدوین ابواب کے اعتبار سے ہوئی جس میں کسی حد تک اقوال رسول ﷺ واقوال صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور فتاوی تابعین ایک دوسرے میں ملے ہوئے تھے یہاں تک کہ بعض ائمہ نے حدیث نبوی کو مستقل طور پر جمع کرنے کا خیال کیا۔ یہ ۲۰۰ھ کا زمانہ تھا، چنانچہ عبیداللہ بن موسیٰ العبسی الکوفی، مسدد بن مسرہد البصری، اسد بن موسی الاموی اور نعیم بن حماد الخزاعی نے ایک ایک مسند ترتیب دی پھر ائمہ نے انہیں کی تقلید کی چنانچہ بہت کم ہی حافظ حدیث ہوں گے جنہوں نے مسانید کی ترتیب نہ دی ہو۔ (۲۸)

یہ تدوین حدیث کا دوسرا دور تھا جس میں حدیث کی تدوین مسانید کے اعتبار سے عمل میں آئی۔ کتب مسانید میں عام طور پر ابواب فقہ کی رعایت نہیں کی جاتی ہے۔ بلکہ یہ کتابیں صحابی کے اعتبار سے ترتیب دی جاتی ہیں، چنانچہ ایک جگہ ایک صحابی سے روایت شدہ تمام حدیثیں ذکر کرنے کے بعد ہی دوسرے صحابی کی روایت شدہ احادیث ذکر کی جاتی ہیں۔ ترتیب میں صحابی کے مرتبہ ومقام کا خیال رکھا جاتا ہے۔

اسی دوسرے مرحلے کی جمع شدہ مسانید میں حضرت امام احمد بن حنبل کی مسند ہے جو ثقہ راویوں سے روایت کردہ حدیثوں کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے جو حضرت کا علم حدیث پر گراں قدر علمی کارنامہ ہے، جس کی جمع وتدوین کے لئے آپ نے خدا کی اس وسیع وعریض سرزمین کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ چھان مارا۔ اس کی راہ میں آپ نے دور دراز مملکت اسلامیہ

کے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آپ کا یہ بیش بہا علمی سرمایہ آپ کی پوری حیات طیبہ کی علمی تگ و دو کا نتیجہ ہے۔ اس کی جمع و تدوین کا کام آپ نے ۱۸۰ھ میں شروع کیا جو تاحیات جاری رہا، چنانچہ اس کتاب کی جمع و تدوین کے تعلق سے حضرت شمس الدین جزری فرماتے ہیں

"امام احمد نے مسند کی جمع و تدوین کا کام شروع کیا، اسے الگ الگ ورقوں میں لکھا، پھر اسے جدا جدا اجزا میں تقسیم کیا، یہاں تک کہ اس نے ایک مسودہ کی صورت اختیار کرلی، مگر قبل اس کے کہ آرزو پوری ہو پیام اجل آپہنچا تو آپ نے اپنی اولاد اور اہل بیت کو اسے پہلی فرصت میں سنا ڈالا اور قبل اس کے کہ اس کی تہذیب و تنقیح اتمام تک پہنچتی وہ اس دنیا سے رخصت کر گئے اور مسودہ جوں کا توں قائم رہا، پھر ان کے صاحبزادے عبداللہ نے ان روایات کے مشابہ اور مماثل مسموعات اس میں شامل کردیئے"(۲۹)

ان سطروں سے صاف ظاہر ہے کہ مسند کی ترتیب حضرت امام احمد بن حنبل نے نہیں دی ہے بلکہ آپ کا کارنامہ جمع و تدوین کا ہے اور آپ کے صاحبزادے نے مسانید کے اعتبار سے خاص ترتیب دی۔

بہر حال اس کتاب کی ترتیب میں گرچہ آپ کے صاحبزادے اور ان کے ایک شاگرد کا بھی کارنامہ رہا ہے تاہم یہ کتاب آپ ہی کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے، جسے جمع فرماکر آپ نے امت پر احسان عظیم کیا ہے۔ آپ کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ کتابیں مرتب کرنے سے کیوں منع کرتے ہیں حالانکہ آپ نے خود بھی مسند لکھی ہے؟ جواب میں آپ نے فرمایا یہ کتاب میں نے لوگوں کی رہنمائی کے لئے لکھی ہے جب سنت رسول اللہ ﷺ کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان اختلافات رونما ہوں گے تو لوگ اس کی طرف رجوع کریں گے۔(۳۲)

مسند کے علاوہ حدیث کے موضوع پر آپ کی اور بھی تصنیفات ہیں جن کا تذکرہ ہم پہلے کرچکے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی جتنی بھی تصنیفات ہیں خواہ وہ کسی بھی موضوع پر ہوں سب کو مجموعہ احادیث تصور کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ آپ نے اپنی ہر تحریر و تقریر میں اپنا مطمح نظر حدیث و خبر ہی کو بنایا ہے۔ اسی لئے آپ کی ہر تحریر سے آپ کی محدثانہ عظمت بالکل عیاں ہے جس کی شہادت میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مانند ہوگا۔ آپ کی علمی شخصیت میں یہ اتنا ابھرا ہوا پہلو تھا کہ بعض لوگوں نے آپ کے فقہی پہلو کو نظر انداز کرکے آپ کو صرف محدثین کی فہرست میں شمار کیا۔

حضرت امام احمد بن حنبل کی شان تفقہ اور مقام اجتہاد:۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ پر حدیث و آثار کا یہ غلبہ تھا کہ بعض حضرات آپ کو فقہاء میں شمار نہیں کرتے بلکہ آپ کو صرف محدثین کی فہرست میں رکھتے ہیں جیسا کہ ابن جریر طبری نے آپ کا مذہب مجتہد فقہی مذہب میں شمار نہیں کرایا ہے بلکہ وہ آپ کے تعلق سے کہتے ہیں کہ (إنما هو رجل حديث لا رجل فقه) "وہ صاحب حدیث تھے صاحب فقہ نہیں تھے" اسی طرح مقدسی نے بھی آپ کو فقہاء میں نہ شمار کرکے محدثین کی فہرست میں رکھا ہے، اسی طرح ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "المعارف" میں اور ابن عبد البر نے اپنی کتاب "الانتقاء" میں جہاں ائمہ ثلاثہ ابوحنیفہ، مالک اور امام شافعی کا تذکرہ کیا ہے، امام احمد بن حنبل کو نہیں شمار کیا ہے۔(۳۳)

مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل جہاں ایک بلند پایہ محدث تھے وہیں ایک جلیل القدر، صاحب مذہب، بڑے فقیہ اور عظیم الشان مجتہد بھی تھے۔ حضرت امام شافعی فرماتے ہیں

"حضرت امام احمد بن حنبل دس چیزوں میں امام زمانہ تھے: حدیث وفقہ، لغت وقرآن، فقر و زہد، تقوی و پرہیز گاری اور سنت مصطفی ﷺ" (۳۴)

اور حضرت ابوعبید القاسم بن سلام (م:۲۲۴ھ) کہتے ہیں

"علم چار شخصیتوں پر ختم ہوجاتا ہے: احمد بن حنبل، علی بن المدینی، یحیی بن معین اور بکر بن ابی شیبہ، مگر احمد بن حنبل ان میں سب سے بڑے فقیہ تھے"(۳۵) بلکہ بعض حضرات نے تو حضرت امام احمد بن حنبل کو سفیان ثوری سے اعلم وافقہ بتایا ہے۔ جیسا کہ ابوثور البغدادی نے کہا: "احمد بن حنبل أعلم من الثوري وأفقه" (۳۶)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پایۂ علم اور فقہی منزلت کے بارے میں عبدالوہاب الوراق سے بھی روایت کرتے ہیں: "ما رأيت مثل أحمد بن حنبل، فقالوا له وأي شيء بان لك من فضله، فقال: رجل سئل عن ستين ألف مسألة، فأجاب فيها: وحدثنا وأخبرنا" (۳۷)

"میں نے احمد بن حنبل کا مثل کوئی اور شخص نہیں دیکھا لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی بنا پر آپ امام احمد کے فضل

کا یوں اعتراف کرتے ہیں، جواب دیا کہ وہ ایسے شخص تھے جن سے ساٹھ ہزار مسائل پوچھے گئے اور ان کا جواب "حدثنا" اور "اخبرنا" کہہ کر دیا۔ یعنی حدیث و خبر کی روشنی میں دیا"

مگر آپ کی شان تفقہ اور مقام اجتہاد کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل مناسب ہوگا کہ اسلام میں فقہ و اجتہاد کا سرسری جائزہ پیش کر دیا جائے۔

نبی کریم ﷺ کی ظاہری حیات طیبہ سے انتقال فرما جانے کے بعد امت مسلمہ کو قرآن اور آپ کے اقوال و افعال ملے، جنھیں صحابہ کرام نے دیکھا اور اس پر عمل کیا، تقلید کی یہ خشت اول تھی، مگر جیسے جیسے دائرۂ اسلام بڑھتا گیا اور نت نئے مسائل پیش آئے، صحابہ نے قرآن و حدیث کے علاوہ اجتہاد سے کام لیا، یہ فطری ضرورت تھی اس سے احتراز غیر ممکن تھا۔ یہ اجتہاد کا پہلا دور تھا۔

ابن قیم اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں کہتے ہیں:

"کان اصحاب رسول الله ﷺ یجتھدون فی النوازل ویقیسون بعض الأحکام علی بعض ویعتبرون النظیر بنظیرہ"(۳۸)

"رسول اکرم ﷺ کے صحابہ نئے پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد فرماتے تھے اور بعض احکام کو بعض پر قیاس کرتے تھے اور ایک نظیر سے دوسری نظیر قائم کرتے تھے"۔

احمد امین صحابہ کرام کی شان اجتہاد کے تعلق سے لکھتے ہیں

وظھر بعد ذلک مصدر آخر وھو أن کبار الصحابة وعلمائھم کانت تعرض علیھم بعض الأحداث ممن لم یعرفوا فیھا نصا من کتاب ولا حدیث، فیجتھد برأیه، ویقول فیھا قولا، وکان ھذا القول فیما بعد یعد مستندا من مستندات التشریع لأنه صدر عن صحابي کبیر عاشر النبي ﷺ زمنا طویلا وعرف مناحي الشریعة ومجراھا (۳۹)

"زمانہ رسالت کے بعد قرآن و حدیث کے علاوہ شریعت کا ایک دوسرا ماخذ معرض وجود میں آیا اور یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے بڑے علما کے سامنے نئے مسائل پیش کیے جاتے تو جس کے سلسلے میں کوئی نص نہ ملتی تو صحابہ اپنی رائے سے اجتہاد فرماتے۔ جو بعد میں شریعت کے مآخذ میں سے ایک ماخذ شمار کیا جاتا کیوں کہ یہ حکم کسی ایسے بڑے صحابی سے صادر ہوا ہوتا جس نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک عرصہ گزارا ہے اور شریعت کے مصدر و ماخذ کو قاعدے سے پہچانتے"۔

جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تعلق سے مروی ہے کہ آپ سے ایک بار اس عورت کے تعلق سے سوال کیا گیا جس کا شوہر مر گیا ہو اور مہر متعین نہ ہو تو آپ نے جواب دینے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو اس مسئلہ میں فیصلہ صادر فرماتے ہوئے نہیں پایا ہے، مگر جب لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے اپنی اجتہادی رائے سے یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ ایسی عورت کی مہر بلا کمی اور زیادتی کے مہر مثل ہوگی، اسے عدت بھی گزارنی پڑے گی اور وہ وراثت کی بھی حقدار ہوگی، اس پر حضرت معقل بن یسار کھڑے ہوئے اور شہادت دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسی عورت کے حق میں اسی طرح کا فیصلہ صادر فرماتے ہوئے سنا ہے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مسعود اتنا خوش ہو گئے کہ اتنی خوشی انہیں اسلام لانے کے بعد کبھی نہیں ہوئی تھی۔ (۴۰)

پھر صحابہ کے بعد تابعین کرام کا دور آیا جس کا افق پہلے دور سے کہیں وسیع تھا، اس زمانے کے مسائل پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور نت نئے تھے۔ اس نے جہاں تابعین کرام کے لئے قرآن و حدیث کے علاوہ صحابہ کے فتاوے قابل تقلید نمونہ بنے وہیں اجتہاد سے چھٹکارا نہ مل سکا بلکہ زمانے کی نزاکت کے پیش نظر اجتہاد کا دروازہ وسیع ہو گیا۔ اسے اجتہاد و تقلید کا دوسرا دور مانا جا سکتا ہے۔

تبع تابعین کے زمانے میں مسائل اور بڑھ گئے، جغرافیہ اسلام کا نقشہ بدلنے لگا، حدود میں وسعت ہونے لگی، اسلام میں نئی نئی قوموں کے دخول اور نئے نئے امور کے اندراج نے علمائے امت اور اساطین اسلام کو اجتہاد پر مجبور کر دیا، پھر اجتہاد و تقلید کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ اسلام میں چار مستقل مذاہب رونما ہوئے جن میں اجتہاد و تقلید کے عناصر بالکل عیاں تھے۔ چنانچہ ہر امام کسی نہ کسی کا جزوی طور پر ہی صحیح مقلد رہا ہے مثل فقہائے عراق حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی بن ابی طالب کے خطوط کے مقلد رہے ہیں جیسا کہ امام اعظم کی فقہ سے عیاں ہے اور اسی طرح فقہائے مدینہ حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ کی فقہ و اجتہاد کے مقلد رہے ہیں جیسا کہ حضرت امام مالک کی فقہ کے اوراق شاہد ہیں۔

غرض یہ کہ ائمہ اربعہ کے اجتہادات بدعت نہیں بلکہ سنت صحابہ اور نزاکت زمانہ کی فطری ضرورت کے عکاس تھے۔ ان اماموں کی تقلید اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں تھی بلکہ صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کے بعد

راست مقلد تھے، پھر تابعین کرم نے صحابہ کے اجتہادی فتوؤں میں ان کی تقلید کی، کیوں کہ صحابہ، رسول اکرم ﷺ کی تعبیر میں مثل نجوم ہیں۔ ان میں سے کسی کی بھی اقتدا کی جائے منزل مقصود ہی ملے گا، پھر اسی طرح تبع تابعین نے تابعین کی اقتدا یہاں تک کہ ائمہ اربعہ کے مستقل مذاہب معرض وجود میں آئے، مگر خیر القرون قرنی ثم الذی یلیہ کے تناظر میں دائرہ اجتہاد سمٹتا گیا اور تقلید کے دروازے ہر کسی کے لئے وا ہوتے گئے تاکہ نظام اسلام درہم برہم نہ ہو۔

اسی تقلید فطری کے مذاہب اربعہ میں سے چوتھا اور آخری مذہب حضرت امام احمد بن حنبل کا ہے جس کا ایک خاص مزاج ہے اور خاص رنگ۔

امام احمد بن حنبل کے اصول استنباط: ابن قیم الجوزیہ نے امام احمد بن حنبل کے پانچ فقہی اصول بیان کی ہیں جو بقول علامہ ابوزہرہ چار ہیں اور وہ یہ ہیں: قرآن وسنت، صحابہ کے فتاوے اور قیاس۔ اس کے علاوہ بھی امام کی طرف بعض اصول منسوب کئے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں: استصحاب، مصالح مرسلہ، اور سد ذرائع۔ لیکن ہم یہاں آپ کی قیاس کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ آپ کی شان اجتہاد کا پہلو واضح ہو جائے اور ان لوگوں کی تردید بھی ہو جائے جو یہ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل قیاس سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ آپ کا اعتماد صرف احادیث واخبار پر تھا۔ گویا قیاس دین میں کوئی بدعت ہے جو امام کی سلفیت کے خلاف ہے جب کہ قیاس زمانہ صحابہ ہی سے اسلام کے اہم اصول استنباط میں سے شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت امام شافعی کے شاگرد علامہ مزنی کہتے ہیں:

"الفقهاء من عصر رسول الله ﷺ الى يومنا استعملوا المقاييس في الفقه في جميع الاحكام في امر دينهم واجمعوا بان نظير الحق حق ونظير الباطل باطل فلا يجوز لا حد انكار القياس لانه التشبيه بالامور والتمثيل عليها.(۴۱)

روى الخلال عن أحمد : سألت الشافعي عن القياس فقال: "إنما يصار إليه عند الضرورة أو هذا معناه (۴۲)

"خلال کی روایت حضرت امام احمد سے کہ انھوں نے حضرت امام شافعی سے قیاس کے تعلق سے پوچھا تو حضرت امام شافعی نے فرمایا: "ضرورت کے وقت اس سے کام لیا جا سکتا ہے"

جیسا کہ اس سے پہلے گزرا کہ ابن قیم امام کے اصول استنباط میں قیاس کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ یہی تمام حنابلہ کا موقف ہے کہ امام نے ضرورت کے وقت قیاس سے کام لیا ہے جیسا کہ ابوزہرہ لکھتے ہیں:

"تمام حنابلہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ قیاس فرماتے تھے۔ اس بات کی تائید میں آپ سے منقول عبارت اور فروع پیش کرتے ہیں جن سے طریقۂ استنباط کی طرف صاف اشارہ ہوتا ہے کہ آپ منکرین قیاس میں نہیں تھے بلکہ آپ مثبتین میں تھے" (۴۳)

ابوزہرہ مزید لکھتے ہیں: "آثار وخبر کی روشنی میں وہ ہر سوال کا جواب دیتے۔ کبھی کبھی رائے اور قیاس سے بھی کام لیتے تھے لیکن ان کا قیاس آثار اخبار کا پرتو ہوتا تھا۔ (۴۴)

البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ امام بن حنبل کے یہاں قیاس کا وجود بہت محتاط مقدار میں ہے۔ ضرورت قصوی کے وقت ہی قیاس کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا ہے، آپ کی بیشتر فقہ نصوص اور فتاوے صحابہ سے ماخوذ ہیں۔ ابوزہرہ امام کی فقہ کے اوصاف کچھ یوں بیان کرتے ہیں

"امام احمد کے فتاوی احادیث واخبار اور سلف صالح کے آثار پرمبنی تھے۔ اس سلسلے میں ان کا علم بہت وسیع تھا اور آپ کے یہاں روایت کا ذخیرہ تھا، وہ قول رسول ﷺ اور صحابہ کرام کے فتاوی پر فتاوی دیا کرتے تھے۔ فتوی اس قول پر دیتے تھے جو مختلف فیہ نہ ہو، مختلف فیہ ہونے کی صورت میں کسی ایک قول کو اختیار کر لیتے تھے اور اگر ترجیح کی کوئی وجہ نہ دیکھتے تھے تو زیر بحث مسئلے میں دونوں کے قول مان لیتے تھے۔ اگر انہیں کسی صحابی کا فتوی نہ ملتا تو پھر وہ کسی تابعی کی رائے اختیار کر لیتے، یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو پھر کسی ایسے فقیہ کا قول قبول کر لیتے جو علم حدیث میں مشہور ہوتا۔ جیسے امام مالک اور امام اوزاعی وغیرہ حالانکہ وہ مسائل فقہیہ میں مقلد نہیں بلکہ مجتہد تھے، ان کے اجتہادی مسائل کم نہیں بہت زیادہ ہیں، اگرچہ آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ آپ کی رائے کسی امام کی رائے سے بہر حال مطابقت رکھتی ہو اس لئے کہ وہ دینی معاملات میں نئی راہ پسند کرتے تھے اور نہ ہی ندرت واغراب کو صحابہ سے فرط تاثر کی بنیاد پر اپنا طریقہ کار بناتے تھے"۔ (۴۵)

یہ تھا آپ کے فتوی دینے کا انداز اور قیاس کے تعلق سے آپ کا محتاط موقف، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ قیاس سے بے نیاز تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو حنابلہ کی کتابوں میں قیاس کے انبار نہ ملتے۔ ابو زہرہ فقہ حنبلی میں قیاس کے وجود کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

"امام احمد کے قیاس سے کام لینے کی وجہ سے فقہ حنبلی میں قیاس کو

خاص مقام حاصل ہے بلکہ حنبلی فقہاء امام احمد سے زیادہ قیاس سے کام لینے کے عادی رہے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اس بات پر انہیں زمانہ کی ضروریات نے مجبور کردیا لوگوں کے حادثات اور مسائل جیسے جیسے گوناگوں شکل اختیار کرتے گئے فقہائے حنابلہ اس بات پر مجبور ہوتے گئے کہ فتاویٰ صحابہ اور امور منصوص پر قیاس کریں اور فتویٰ دیں۔ وہ مجبور ہو گئے کہ اپنے امام کے اقوال سے تخریج کریں اور یہ کام بغیر قیاس کے ممکن نہ تھا لہٰذا وہ اسی طریقہ پر چلے، انھوں نے اجتہاد کیا بھی اور استنباط سے بھی کام لیا اور اجتہاد بالرأی کی دوسری صورتوں سے بھی مثلاً استصحاب، مصالح مرسلہ اور استحسان وغیرہ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے حنابلہ اصول فقہ کے سلسلے میں متعدد بلند پایہ اور مفید کتابیں لکھی ہیں، ان میں علی بن محمد بن عقیل البغدادی ہیں ۵۱۳ھ، ابویعلی محمد بن الحسین الفراء ۴۵۸ھ، ابوالخطاب محفوظ بن احمد بن الحسین البغدادی ۶۹۵ھ اور ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اصول فقہ پر کئی کتابیں لکھیں۔ اس علم کے قواعد مرتب کرنے اور ان کی توضیح و تشریح کرنے میں کافی جدوجہد کی اور قیاس پر خصوصیت کے ساتھ قلم اٹھایا اور پھر ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فقہ اسلامی کی اس شاخ قیاس پر بہت زیادہ تفصیل اور تکمیل کے ساتھ بحث کی ہے۔(۴۶)

امام احمد بن حنبل کی فکر سے وہابیت کے انتساب کا شاخسانہ:- عجیب وغریب تماشہ ہے کہ آج کی غالی سلفیت اپنا قبیح چہرہ چھپانے کے لئے امام احمد بن حنبل کی اس چادر معطر کا سہارا لیتی ہے جس کے ہر ہر دھاگے سے محبت اسلاف اور تقلید واجتہاد کی خوشبو پھوٹتی ہے۔ تاریخی حقائق اور بنیادی فروق کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے حنبلیت کا ڈھنڈھورا کرتے پھرتی ہے حالاں کہ اللہ شاہد ہے کہ غالی سلفیت اور امام احمد سے موروث اصول وافکار میں زمین وآسمان کا بھی رشتہ نہیں ہے، مگر سر چھپانے کے لئے کم ازکم آسمان چاہئے۔ ملاحظہ کیجئے مستشرق لاؤسٹ لکھتا ہے

''آپ (امام احمد بن حنبل) اہل سنت کے چار مذاہب میں سے مذہب حنبلی کے بانی ہیں، اور اپنے شاگرد ابن تیمیہ کے ذریعے وہابیت کے مورث اعلیٰ اور کسی حد تک سلفیہ کی قدامت پسندانہ تحریک کے بھی محرک ہیں'' (۴۷)

اس تحریر میں لاؤسٹ نے اپنا ''استشراقی تیور'' دکھاتے ہوئے جہاں ''وہابیت'' کی کڑی کو امام کی ذات سے جوڑنے کی بے جا کوشش کی وہیں ایک مغالطہ کی بنیاد ڈالی [illegible] ابن تیمیہ [illegible] ڈالا جو قطعا درست نہیں ہے۔ ہاں اگر ہم مجاز بعید کا سہارا لیں تو [illegible] ان کو امام صاحب کا شاگرد گردانا جاسکتا ہے مگر اس تکلف کی اس شخص کے حق میں کیا ضرورت جس نے مجاز کا ہی انکار کیا ہو؟

مصر کے ایک مشہور قلم کار ڈاکٹر شوقی ضیف نے بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر عصر حاضر کے ''وہابیوں'' کو حنبلی المذہب بتایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: (غیر أن مذهبه لم يكتب له الانتشار كما كتب للمذاهب الثلاثة السالفة، وإن كان قد ازدهر حديثا بين الوهابيين)(۴۸) ''مگر امام احمد بن حنبل کا مذہب سابقہ تین مذاہب کی طرح رواج نہ پاسکا گرچہ عصر حاضر میں وہابیوں کے مابین اس مذہب کی ترقی ہوئی''

ان تحریروں کے پس منظر میں وہابیوں کا وہ شور شامل ہے جس کا راگ وہ الاپتے رہتے ہیں اور ایک طرف تو اپنے حنبلی کا دعویٰ کرتے ہیں تو دوسری طرف تقلید اور دوسری شرعیات [illegible] مذاق اڑاتے ہیں۔ درحقیقت یہی مزاج متناقض [illegible] سے فکری [illegible] عکاس ہے۔ اب ہم پیش کرتے ہیں امام کی چند ایک فکریں جن سے خود بخود وہابیت کے حنبلی تانے بانے ان سے بیزار دکھائی دیں گے۔

امام احمد بن حنبل کی نظر میں تقلید کا مقام:- ابن قیم نے اعلام الموقعین میں حضرت امام احمد بن حنبل کے تعلق سے لکھا ہے

(وقال الإمام أحمد لبعض أصحابه :إياك أن تتكلم في مسألة ليس لك فيه إمام) (۴۹)

''حضرت امام احمد نے اپنے بعض شاگرد سے کہا: خبردار! کسی ایسے مسئلے میں کلام مت کرو جس میں تمہارا کوئی امام نہ ہو''

علاوہ ازیں صحابہ کرام اور تابعین عظام کے فتاویٰ سے تعلق سے آپ کا پرعزم اور محتاط موقف تقلید کے لئے زریں دلیل ہے کہ آپ اس وقت تک اجتہاد اور قیاس سے کام نہیں لیتے تھے جب تک کہ آپ کے سامنے نصوص یا صحابہ اور تابعین کے فتاوے موجود رہتے بلکہ آپ ایسی صورت میں صحابہ اور تابعین یا کسی بڑے امام کے مقلد ہوتے۔ ہاں جب یہ سب کچھ آپ کا ساتھ چھوڑ دیتے تب آپ اجتہادی رائے قائم فرماتے جس سے جہاں یہ واضح ہوتا کہ آپ ایک بہت بڑے مجتہد صاحب مذہب فقیہ تھے وہیں آپ کے سلوک وعمل سے تقلید کا بھی ثبوت

ہوتا ہے۔ سامانِ عقل چھپائیے سالمِ فکر کے لئے!

امام احمد کی نظر میں تبرکات کا مقام - عام طور پر غالی سلفیت تبرکات کی توہین میں پیش پیش رہتی ہے۔ بزرگوں کے آثار و اسلاف کی تعظیم سے اس جماعت کو ہمیشہ شرک کی بو آتی ہے۔ ایسی نشانیوں کو مٹانا اور ان کے خلاف جنگی پیمانے پر تحریک چھیڑنا جن سے بزرگوں کی محبت کی خوشبو پھوٹے، اس جماعت کا اولین مقصد اور جہاد فی سبیل اللہ ہوتا ہے، مگر آیئے دیکھیں تبرکات کے تعلق سے اس ذات کا کیا موقف ہے جس کی طرف یہ جماعت اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے۔

مروی ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو آزمائش کے دنوں میں خلیفہ کے حکم سے ٹکٹکی کے پاس لے جا کر کھڑا کیا گیا۔ جلادوں نے آگے بڑھ کر ان کا کرتہ اتار لیا، اس میں ایک طرف یک گرہ میں کوئی چیز بندھی تھی، ان سے پوچھا اس گرہ میں کیا ہے، انھوں نے جواب دیا: اس میں میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ کے مبارک بال ہیں جو ابن فضل بن ربیع نے مجھے بطور عطیہ دیے تھے۔ (۵۰)

سبحان اللہ! چہ نسبت خاک را با عالم پاک! ایسی ستودہ صفات ہستی جس کی نبی کریم ﷺ سے محبت کا عالم یہ تھا اور آج کا حنبلی جسے اسی ذات گرامی ﷺ کے روضے کی زیارت میں شرک نظر آیا تو کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی کذب و افترا ہے؟ (فلیعلم الذین ظلموا أي منقلب ینقلبون)

مآخذ و مراجع

(۱) دیکھئے: تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص: ۱۰۱ طبع مصر
(۲) ضحی الإسلام ۲/ ۱۹
(۳) البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ۱۰/ ۳۱۷ طبع مصر
(۴) طبقات الحنابلۃ محمد بن أبي یعلی الفراء، ۸
(۶) دیکھئے ابوزہرہ کی کتاب "ابن حنبل" حیاتہ و عصرہ ... ص ۳۵-۳۶
(۷) دیکھئے البدایۃ والنہایۃ ۱۰/ ۳۳۵-۳۳۷
(۸) دائرۃ معارف اسلامیہ (اردو) ۲/ ۹۳
(۹) دیکھئے دائرۃ معارف اسلامیہ (اردو) ۲/ ۹۳
(۱۰) دیکھئے البدایۃ والنہایۃ ۱۰، ۳۳۰-۳۳۳
(۱۱) دائرۃ معارف اسلامیہ (اردو) ۲/ ۹۳
(۱۲) دیکھئے البدایۃ والنہایۃ، ۱۰، ۳۱۸
(۱۳) دائرۃ معارف اسلامیہ (اردو) ۲/ ۹۲
(۱۹) ابن حنبل ابوزہرہ، ص ۳۵-۳۶
(۲۰) ابن حنبل: ابوزہرہ، ص ۱۲۸
(۲۱) دیکھئے تحریک اعتزال کی تفصیل ظہر الاسلام احمد امین طبع مصر ۳/ ۹
(۲۲) دیکھئے: داستان عزیمت البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ۱۰/ ۳۳۳-۳۲۹ اور ملاحظہ کریں ابن حنبل ابوزہرہ، ص ۳۰-۶۸
(۲۳) طبقات حنابلہ ۱/ ۱۰
(۲۴) البدایۃ والنہایۃ ۱۰، ۳۱۸
(۲۵) طبقات حنابلہ ۱/ ۱۰
(۲۶) دیکھئے ضحی الاسلام احمد امین ۲، ۱۰۶
(۲۷) دیکھئے ضحی الاسلام: احمد امین ۲/ ۱۰۷
(۲۸) دیکھئے ضحی الاسلام احمد امین ۲، ۱۰۸، ۱۰۹
(۲۹) ابن حنبل: ابوزہرہ، ص ۱۰۹
(۳۲) ابن حنبل، ص ۱۵۹
(۳۳) ضحی الاسلام ۲/ ۲۳۵
(۳۴) طبقات حنابلہ ۱، ۱۰
(۳۵) طبقات حنابلہ ۱، ۱۲
(۳۶) طبقات حنابلہ ۱/ ۱۵-۱۶
(۳۷) ابن حنبل محمد ابوزہرہ، ص ۱۹۹
(۳۸) ابن حنبل محمد ابوزہرہ، ص ۲۷۳
(۳۹) ضحی الاسلام: احمد امین
(۴۰) ضحی الاسلام، ۲ / ۱۵۷، ۱۵۸.)
(۴۱) ضحی الاسلام ۲/ ۱۵۸
(۴۲) ابن حنبل: ابوزہرہ، ص: ۲۷۳
(۴۳) ابن حنبل، ص ۲۷۳
(۴۴) ابن حنبل، ص ۲۷۳
(۴۵) ابن حنبل، ص ۲۰۱
(۴۶) ابن حنبل، ص ۱۹۹، ۲۰۰
(۴۷) ابن حنبل، ص ۲۷۳-۲۷۴
(۴۸) دیکھئے: دائرۃ معارف اسلامیہ اردو ۲/ ۹۳
(۴۹) تاریخ الادب العربي - العصر العباسي الاول شوقی ضیف، ص ۳۲
(۵۰) دیکھئے ابن حنبل ابی زہرۃ، ص ۲۰
(۵۱) دیکھئے البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ۱۰، ۳۲۷، ۳۲۸ ☆☆☆

باب

(۳)

تحقیق و تنقید

مولانا منظر الاسلام ازہری☆

امام اعظمؒ کے مخالفین اور ان کے الزامات کا تحقیقی جائزہ

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۸۰ھ/۱۵۰ھ) کے حاسدین یا مخالفین پر قلم اٹھانا جرأت کا کام ہے کیونکہ اس ضمن میں بڑے بڑے سلاطین عصر، علماء وقت، فقہاء بے مثال اور محدثین زمانہ یکساں نظر آتے ہیں، کسی کے اختلاف یا حسد کی وجہ غلط فہمی تھی تو کسی کا عناد اور تعصب ان کے علم کا بڑھتا ہوا اثر تھا. کسی نے اپنی حکومت وریاست کے لئے نہیں خطرہ سمجھا تو کسی نے امراء وخلفاء کے نزدیک اپنی مقبولیت کے آگے انہیں چٹان جانا، کوئی تشبیہ وتجسیم کا قائل تھا تو کوئی جبر وقدر کے فروغ میں انہیں روڑا سمجھتا تھا، وجہ کچھ بھی ہو اتنا طے ہے کہ امام اعظم کی بڑھتی ہوئی علمی مقبولیت نے لوگوں کو آپ سے حسد کرنے پر مجبور کر دیا۔

ائمہ ومحدثین، علماء اور سلاطین نے جن مسائل کو بنیاد بنا کر امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۸۰ھ۔۱۵۰ھ) کو ہدف تنقید بنایا ہے ان میں ''ایمان کی کمی بیشی''، ''قرآن مخلوق ہے یا نہیں''، ''حدیث رسول کے خلاف قیاس سے استدلال'' اہم مسائل ہیں، جن محدثین نے ان مسائل کو ہوا دیا اور اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ان میں علامہ ابن عدی (م۳۶۵ھ) علامہ عقیلی (م۳۲۲ھ) عبدالرحمن بن ابی حاتم (م۳۲۷ھ) علامہ ابن حبان بستی (م۳۵۴ھ) علامہ ابوبکر بیہقی (م۴۵۸ھ) ابونعیم (م۴۳۰ھ) اور خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) سرفہرست ہیں، ان علماء کی تمام عبارتوں اور اس پر جرح وقدح کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں تاہم اول الذکرتین کی بعض روایتوں کا ذکر کر کے ان کا تجزیہ ضرور کریں گے، یوں ہی تمام الزامات پر تحقیقی گفتگو نہ کر کے صرف اس بات کا محاسبہ کریں گے کہ اس اعتراض میں کس حد تک دم ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حدیث کی قسم ''مرسل'' (جو بعض محدثین کے نزدیک ضعیف بعض کے نزدیک کچھ شرطوں کے ساتھ صحیح سمجھی جاتی ہے) اور ''خبر واحد'' کے بالمقابل ''قیاس'' کو ترجیح دی ہے۔ واضح رہے کہ ہماری اس تحریر کا مقصد کسی بھی امام کی پگڑی اچھالنا یا ان کی گستاخی کرنا نہیں، جس طرح امام اعظم ابوحنیفہ ہمارے لئے قابل احترام ہیں اسی طرح دیگر ائمہ کرام کا احترام بھی ہمارے قلبی سکون کا باعث ہے، میزان کے مقدمہ میں علامہ ذہبی (۷۴۸ھ) کا یہ قول میرے لئے نقش راہ ہے:

لا أذكر في كتابي من الأئمة المتبوعين في الفروع أحدا لجلالتهم في الاسلام و عظمتهم في النفوس مثل ابي حنيفة والشافعي والبخاري، فان ذكرت أحدا منهم فأذكره على الانصاف ذلك عند الله ولا عند الناس.

علامہ عقیلی (۳۲۲ھ) اور امام اعظم ابوحنیفہ (۱۵۰ھ): - علامہ ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسیٰ عقیلی علم درایت اور رجال حدیث کا ایک بڑا نام ہے، علم رجال کے مصنفین نے آپ کی بہت تعریف کی ہے، اپنے وقت کے مسلم امام تھے، حفظ واتقان میں آپ کا کوئی مثل نہیں تھا، متعدد تصانیف کے مالک ہیں ان سب کے باوجود تشدد اور تعصب مذہبی میں بھی نمایاں تھے، تشدد کی مثال تو یہ ہے کہ صحیح بخاری اور مسلم کے متعدد رجال پر کلام کر دیا، حد تو یہ کہ علم حدیث کے متفق امام، رجال حدیث پر گہری نظر رکھنے والے، علامہ امام علی بن مدینی (م۲۳۴ھ) بخاری و مسلم میں جن کی روایت بھری پڑی ہے اور جن کے بارے میں امام بخاری جیسا عظیم محدث نے فرمایا میں نے اپنے آپ کو اگر کسی محدث کے نزدیک چھوٹا پایا تو وہ علی بن مدینی کی شخصیت ہے، اور اپنی کتاب میں علی بن مدینی، اصحاب محمد وراان کے شیخ عبدالرزاق کی حدیث کا ذکر نہ کروں تو مطلب یہ ہے کہ علم حدیث کا دروازہ اسی جگہ بند ہو گیا، مرویات وآثار کی انتہا ہو گئی اور علم حدیث پر زنادقہ کا قبضہ ہو چکا اور دجال پیدا ہو رہے ہیں۔ (میزان الاعتدال ۱۶۹/۵، تذکرہ علی بن مدینی) ایسی بلند قد شخصیت کو علامہ عقیلی نے اپنی کتاب ''ضعفاء'' میں شامل کر کے ان کی تضعیف کر دی، اس واقعہ نے علامہ ذہبی اور دیگر ائمہ کو اس حد تک تعجب میں ڈال دیا کہ وہ پکار اٹھے.

افمالک عقل یا عقیلي اتدری فیمن تتکلم وانما تبعاک في ذکر هذا النمط لتذب عنهم ولتزيف ما قيل فيهم

☆ 200 W Market Centre Dr High Point N Carolina (U S A) E-mail manzarulislamq@yahoo com

کانک لا تدری ان کل واحد من ھؤلاء اوثق منک بطبقات، بل و أوثق من ثقات کثیرین لم توردھم فی کتابک فھذا مما لا یرتاب فیہ محدث۔ (میزان الاعتدال ۵/۱۵۹)

عقیلی تمہاری عقل کو کیا ہوگیا ہے، !کس کے بارے میں زبان کھول رہے ہو!! ہم نے یہ طریقہ صرف اس لئے اپنایا ہے تاکہ ان ائمہ کرام کا دفاع کرسکیں، گویا تمہیں پتہ ہی نہیں کہ ان میں ہر ایک تم سے کئی گنا زیادہ ثقہ ہیں، بلکہ بہت سارے ان ثقات سے بھی زیادہ ثقہ ہیں جن کا ذکر تم نے اپنی کتاب میں نہیں کیا، اس میں کسی محدث کو شک بھی نہیں۔

یہ تو علامہ عقیلی کے تشدد کی مثال تھی اور مذہبی تعصب کی انوکھی مثال ملاحظہ کرنے کے لئے ان کی کتاب "الضعفاء" کے تذکرے بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ کا تذکرہ پڑھنا چاہئے، امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ سے متعلق انہوں نے ایسی ایسی بے بنیاد روایتیں نقل کی ہیں کہ امان والحفیظ، '' یہ جدا انہوں نے امام سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) کے حوالہ سے لکھ کہ انہوں نے فرمایا: ابوحنیفہ جیسا خطرناک بچہ اسلام میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا (کتاب الضعفاء ۴/۲۱۸)، حضرت عبداللہ بن مبارک (م ۱۸۱ھ) کی طرف منسوب کرتے ہوئے ایک قول نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا: ابوحنیفہ کی حدیث کو کچل ڈالو۔ (کتاب الضعفاء ۴/۲۸۲) اور اس طرح کی نہ معلوم کیسی کیسی بے بنیاد حکایتیں ائمہ اسلام کے حوالے سے نقل کیا ہے جن کے ساتھ امام اعظم کا اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا اور اگر ہم نشینی نہ بھی ہو تو ایسے پاک طینت لوگوں کے بارے میں کبھی بھی یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی رائے امام اعظم کے بارے میں اس درجہ غلط تھی'' آیئے ذیل میں ہم ان دونوں قول کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں

سند حکایت: عقیلی کہتے ہیں: ہم سے حاتم بن منصور نے بیان کیا، ان سے حمیدی نے، انہوں نے سفیان کو کہتے ہوئے سنا:

اس کی سند میں "حمیدی" ہیں، امام سبکی شافعی نے اپنی کتاب "طبقات ۱/۲۲۳" میں علامہ محمد بن عبداللہ بن الحکم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ "حمیدی" لوگوں سے بات چیت کے دوران جھوٹ بولا کرتے تھے، تعصب ان کی رگوں میں بسا ہوا تھا، ان کی روایتوں میں سخت اضطراب ہوتا ہے، کبھی تو وہ "حمزہ بن حارث" سے روایت کرتے ہیں اور کبھی بلا واسطہ "حارث" سے روایت کرتے ہیں۔ (تانیب الخطیب، ۴۷)

ٹھیک یہی قول خطیب نے بھی اپنی کتاب "تاریخ بغداد" میں اپنی سند سے امام اوزاعی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، خطیب کی سند میں متواتر تین ایسے راوی ہیں جن میں سے ایک کو امام احمد بن حنبل نے "ضعیف جدا" کہا، ابوحاتم نے اپنے نزدیک ان کی ثقاہت سے انکار کیا، جبکہ دیگر دو رواۃ پر دوسرے ائمہ نے جرح کی ہے، لہذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ امام سفیان ثوری نے کبھی بھی اس طرح کا قول امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے متعلق نہیں کیا، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سفیان ثوری امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔

سفیان ثوری اور امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ - اگر سفیان ثوری کے پاس کوئی جاتا اور کہتا کہ میں امام ابوحنیفہ کے پاس سے آرہا ہوں تو فرماتے تم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہو کہ روئے زمین پر اس جیسا فقیہ عالم نہیں ہے (خیرات الحسان، ص ۸۲)

ایک شخص سفیان ثوری کی مجلس میں آیا وہ مروجہ علوم کا ماہر تھا، اس نے سفیان ثوری سے پوچھا، آپ امام ابوحنیفہ کی بدگوئی کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے پوچھا وہ کیسے؟ اس نے کہا میں نے سنا ہے وہ ہر بات نہایت تحقیق صحت اور انصاف سے کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں ہر مسئلہ کتاب اللہ سے بیان کرتا ہوں، اس میں نہ ملے تو سنت رسول سے لیتا ہوں، اس میں نہ ہو تو صحابہ کرام کے اقوال و اعمال سے لیتا ہوں، اگر صحابہ کے اقوال و افعال میں اختلاف ہو تو کبھی کبھی بعض اقوال کو چھوڑ دیتا ہوں، جہاں جمہور صحابہ کی رائے ہو قبول کرتا ہوں، جہاں ایک صحابی کا قول ہو اس کو چھوڑ بھی دیتا ہوں، میں صحابہ کے اعمال و اقوال پر کسی دوسرے کی رائے کو ترجیح نہیں دیتا، مثلاً ابراہیم شعبی، حسن، ابن سیرین، سعید بن مسیب اور دوسرے جلیل القدر تابعی علماء کے اقوال کو صحابہ کے اقوال کے سامنے وزن نہیں دیتا- ان بزرگوں نے اجتہاد کیا ہے، میں نے بھی ایسے مسائل میں اجتہاد کیا ہے اور یہ میرا حق ہے- یہ بات سن کر حضرت سفیان ثوری تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے، پھر فرمایا (آپ کے یہ کلمات حاضرین مجلس نے لکھ لئے ہیں) ہم حدیث کی شہادت سن کر خوفزدہ ہوتے ہیں، اور لوگوں کی بد اعمالیوں پر سرزنش کرتے ہیں، زندوں کا محاسبہ کرتے ہیں، مرنے والوں کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں، ان کی باتیں سنتے ہیں، جو قابل قبول ہو مان لیتے ہیں، جن امور پر ہم آگاہ نہیں ہوتے علماء کرام کے سپرد کردیتے ہیں- ہم اپنی رائے کو متہم کرسکتے ہیں، لیکن علماء اسلام کو متہم نہیں کرسکتے۔ (مناقب امام اعظم،

صدر الائمہ امام موفق بن احمد مکی، متوفی ۵۶۸ھ، ترجمہ مطبوعہ، مکتبہ نبویہ، لاہور، مولانا فیض احمد اویسی)

عبداللہ بن مبارک اور امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ:- اس سند میں ''ابراہیم بن شماش'' کا وجود ہی اس بات پر دال ہے کہ ''عبداللہ بن مبارک'' کی طرف منسوب اس قول میں کچھ صداقت نہیں، اتنی بات ضرور ہے کہ ابتداء میں ''ابن مبارک'' امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے متعلق اچھا تاثر نہیں رکھتے تھے لیکن جب دونوں کی ملاقات ہوگئی تو اس کے بعد امام صاحب کے اتنے مداح ہوگئے کہ یہ فرمایا کرتے فقہ میں ابوحنیفہ کا ثانی کوئی نظر نہیں آیا!!

علامہ ابن عبدالبر نے یہاں تک نقل کیا ہے کہ سلمہ سلیمان نے ایک مرتبہ ''ابن مبارک'' سے کہا آپ ابوحنیفہ کی رائے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جبکہ امام مالک کو آپ اس قدر اہمیت نہیں دیتے؟ جواب دیا مجھے اس میں گہرائی نظر نہیں آتی ہے'' (جامع بیان العلم ۲/۱۵۷)

عبداللہ بن مبارک نے فرمایا امام ابوحنیفہ اللہ کی آیات میں سے ایک آیت ہیں، کسی نے آپ سے سوال کیا کہ آیت خیر ہیں یا آیت شر؟ ابن مبارک نے کہا: اے بندہ خدا، تم قرآن مجید کی روشنی میں اس آیت کے لفظ کو تلاش کرو ''وجعلنا ابن مریم وامه آیة'' کیا آیت شر سے بھی بن سکتی ہیں؟ (سابق، ص ۱۷۱)

ابن مبارک نے فرمایا: جب میں امام مالک کے پاس تھا تو آپ کے پاس ایک شخص آیا، میں نے ابھی امام ابوحنیفہ کو نہیں دیکھا تھا، امام مالک نے مجھ سے پوچھا جانتے ہو یہ کون ہیں، میں نے عرض کیا میں نہیں جانتا، آپ نے فرمایا، یہ اتنے ذہین وفطین ہیں کہ اگر کہہ دیں کہ یہ سونے کا ستون ہے تو ثابت کردیں گے واقعی سونا کا ہے، وہ فقہ میں اس قدر بلند رتبہ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس علم میں بے پناہ توفیق بخشی ہے، یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ امام مالک کی مجلس میں سفیان ثوری آگئے۔ آپ نے بیٹھنے کے لئے آپ کو وہ جگہ نہ دی جہاں امام ابوحنیفہ بیٹھے تھے جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے آپ سے پوچھا آپ نے سفیان ثوری کو اس احترام سے نہیں بٹھایا جس احترام سے امام ابوحنیفہ کو بٹھایا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ جو ورع وتقویٰ امام ابوحنیفہ میں پایا جاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔ (سابق ص ۳۱۷، ۳۱۸)

ایک مرتبہ فرمایا: میں نے مسعر بن کدام کو ابوحنیفہ کے درس میں مستفید ہوتے دیکھا، اگر خدا تعالیٰ ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کے سبب میری دست گیری نہ کرتا، تو میں بھی اور عام آدمیوں کی طرح ایک آدمی ہوتا (مناقب امام اعظم، کردری ۱/۱۰۸)

قارئین کرام! دیکھا آپ نے عبداللہ ابن مبارک جیسی قد آور شخصیت امام ابوحنیفہ کی تعریف کس طرح کر رہی ہے، کیا اس کے باوجود یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی حدیث کو چھوڑ دینے کا حکم دیا ہو!! قاتل الله التعصب المقیت۔

سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) -حمیدی کہتے ہیں سفیان بن عیینہ نے فرمایا دو چیزیں ایسی ہیں کہ ہم کو تصور بھی نہ تھا کہ وہ کوفہ کے پل کے آگے نکلیں گی ایک حمزہ کی قرأت اور دوسری ابوحنیفہ کی فقہ لیکن وہ دونوں تمام آفاق میں پہنچ گئیں۔ (مناقب الائمہ، ص ۲۰)

غالباً عقیلی کا یہی وہ تعصب تھا جس نے ان کے شاگرد علامہ ابن دخیل کو اپنے استاذ کا رد کرنے پر مجبور کردیا، اور امام اعظم ابوحنیفہ کے مناقب میں ایک رسالہ تحریر فرمایا جس میں عقیلی کی روایت اور اس جیسی دیگر بے بنیاد باتوں کا بہت اچھی طرح تجزیہ کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا، یونہی علامہ ابن عبدالبر مالکی نے اپنی کتاب ''الانتقاء فی فضائل الثلاثة الائمة'' میں بھی شرح وبسط کے ساتھ ان باطل حکایتوں کا جائزہ لیا ہے، جس کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا۔

عقیلی کا علم حدیث میں اگر ایک طرف بلند و بالا مقام ہے تو دوسری طرف چوک بھی کوئی کم نہیں، انہوں نے متعدد قابل قبول حدیثوں کو رد کرنے کی کوشش بھی کی ہے، جس کا بڑا تحقیقی جائزہ علامہ ابن قیم جوزیہ نے اپنی کتاب ''المنار المنیف فی الصحیح والضعیف'' میں لیا ہے۔

عقیلی سے متعلق ائمہ اسلام کی ان آراء کے بعد کیا اب بھی بخاری کی دو حدیث رٹ لینے والے کسی غیر مقلد کے لئے یہ روا ہے کہ ''کتاب الضعفاء'' کے حوالہ سے امام اعظم ابوحنیفہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے؟؟

امام اعظم اور علامہ ابن عدی (م ۳۶۵ھ):- امام علامہ حافظ ابواحمد عبداللہ بن عدی جرجانی (۲۷۷ھ۔۳۶۵ھ) محدثین اور اہل علم کے مابین مشہور نام ہے، محدثین نے آپ کی بہت تعریف کی ہے، حفظ حدیث اور ضبط رجال میں خاصہ مہارت رکھتے تھے، دیگر محدثین کے مقابلہ میں آپ کی قوت حافظہ کو طبعی اور فطری بتایا گیا ہے، حفظ، اتقان اور علم وفضل کے باوجود، تعصب مذہبی سے محفوظ نہیں رہ سکے، روات

حدیث بالخصوص امام اعظم ابوحنیفہ کی شان میں جب روایتیں نقل کرنے لگے تو اخذ روایت کے تمام ضابطوں کو نظر انداز کر گئے اور تذکرہ میں وضاع، کذاب اور ضعیف راویوں کی حکایت کو بھی لینے سے باز نہ آئے، امام اعظم ابوحنیفہ سے متعلق ان کی تمام روایتوں کا بالاستیعاب جائزہ لینے کے لئے تو دفتر درکار ہے ہم یہاں "الکامل" میں مذکور صرف ایک روایت مع سند ذکر کرتے ہیں اور پھر اس کا تجزیہ کریں گے۔

ابن عدی "الکامل" جلد ۷، صفحہ ۹۷ پر نقل کرتے ہیں:

اخبرنا عبد الله بن محمد بن حيان بن مقير، اخبرنا محمود بن عيلان، ثنا مؤمل قال: كنت مع سفيان الثورى فى الحجر فجاء رجل فسأله عن مسألة فاجاب، فقال الرجل: ان أبا حنيفة قال كذا و كذا، فخرق سفيان نعليه حتى خرق الطواف ثم قال: لا ثقة و لا مامان.

ابن عدی اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ مؤمل کا بیان ہے کہ وہ سفیان ثوری کے ساتھ حرم اقدس میں حجر اسود کے پاس تھے کہ ایک شخص آیا اور ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، سفیان ثوری نے مسئلہ کا جواب دے دیا، پھر اس شخص نے کہا ابوحنیفہ اس مسئلہ میں کچھ الگ نظریہ رکھتے ہیں، مؤمل کا بیان ہے کہ سفیان ثوری نے اپنی جوتی سنبھالی اور طواف سے جب فارغ ہو گئے تو کہا: ابوحنیفہ نہ تو ثقہ ہیں اور نہ ہی مامون۔ (لہذا ان کی بات معتبر نہیں ہوگی)

یہ اور اس طرح کی درجنوں روایتیں ابن عدی نے اپنی کتاب "الکامل" میں نقل کی ہیں، گہرائی میں اتر کر ان روایتوں کا مطالعہ کیجئے تو اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی، اور ان کے رواۃ متکلم فیہ نظر آتے ہیں، بالخصوص "مؤمل" کو ائمہ حدیث نے "متروک" کہا ہے۔

ابن عدی کی ان تمام روایتوں کا بھرم اس وقت کھل جاتا ہے جب امام اعظم کا تذکرہ رقم کرتے ہوئے اخیر میں لکھتے ہیں:

قال الشيخ و ابو حنيفه له أحاديث صالحة و عامة ما يرويه غلط و تصاحيف و زيادات فى أسانيدها و متونها وتصاحيف فى الرجال و عامة مايرويه كذلك، ولم يصح له فى جميع مايرويه الا بضعة عشر حديثا، وقد روى من الحديث لعله أرجح من ثلاثماة حديث من مشاهير و غرائب و كله على هذه الصورة لأنه ليس هو من أهل الحديث، ولا يحمل على من تكون هذه صورته فى الحديث.

یہ تو میرا موضوع نہیں ہے کہ ابوحنیفہ کو کتنی حدیث میں مہارت تھی کیا انہیں صرف چوبیس پچیس حدیثوں کا علم تھا اور غریب و مشہور کو شمار کرنے کے بعد ابن عدی کے شیخ کے نزدیک ان کی تعداد صرف تین سو تک پہنچتی ہے، یا کچھ اور؟ ورنہ میں ثابت کر دکھاتا کہ ابوحنیفہ کا علم حدیث میں کیا مقام تھا، یہاں قارئین کرام یہ ملاحظہ کرتے چلیں کہ جو کچھ بھی ابن عدی کہہ رہے ہیں اپنے شیخ کے حوالے سے کہہ رہے ہیں جن کا نام "ابان بن جعفر نجیرمی" ہے، علماء حدیث نے ان کو کذاب کہا ہے، علامہ ذہبی ابوحاتم البستی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں

رايته وضع على ابى حنيفة اكثر من ثلاثماة حديث مالم يحدث به ابو حنيفة قط. (ميزان الاعتدال ۱۰/۸)

ابوحاتم بستی کہتے ہیں کہ "ابان بن جعفر نجیرمی" کو میں نے دیکھا ہے کہ ابوحنیفہ کے بارے میں تین سو سے زیادہ ایسی حدیثیں گڑھی ہیں جنہیں کبھی بھی ابوحنیفہ نے بیان نہیں کیا۔

ٹھیک یہی بات ابوحاتم نے بھی "المجروحین" ۱۸۴ پر درج کی ہے مگر اس میں اتنا اضافہ ہے:

فقلت له يا شيخ اتق الله و لا تكذب على رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم فما زادنى على ان قال لى لست منى فى حل فقمت و تركته وانما ذكرته لأن أحداث اصحابنا لعلهم يشتغلون بشئى من روايته. (المجروحين ۱۸۴)

یہ بات ایک واقعہ کے ضمن میں صاحب "مجروحین" نے کہی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جب انہوں نے ابوحنیفہ کے بارے میں حدیثیں گڑھ کر سنائیں تو میں نے کہا اے شیخ اللہ کا خوف کرو، نبی اکرم ﷺ پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ۔ میری اس بات پر اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکے کہ تمہارا میرے نزدیک کوئی مقام نہیں، پھر کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس سے چلا گیا، میں نے صرف اس لئے بیان کیا تاکہ میرے اصحاب اس سے ہوشیار رہیں۔

ابن عدی کا تو یہ حال تھا کہ بخاری کے رجال پر بھی کلام کرنے سے باز نہ آئے، چنانچہ "ابان بن یزید" بخاری، مسلم اور ابوداؤد کے رواۃ میں سے ہیں، ابن عدی نے ان پر کلام کرتے ہوئے کہا کہ یہ "حسن الحدیث ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ اہل صدق میں ہوں گے" علامہ ذہبی نے اس پر یہ تعاقب کیا ہے:

بلکہ وہ ثقہ ہیں، حجت ہیں، یہ دیکھو امام احمد بن حنبل جب ان کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں وہ اپنے تمام مشائخ میں ثبت ہیں، ابن معین اور نسائی نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ (میزان الاعتدال ۱/۱۳۱، تذکرہ ابان بن یزید)

ابن عدی کا یہی وہ افراط تھا جس کی بنیاد پر ذہبی نے اپنے ''میزان'' کے مقدمہ میں یہ لکھا ہے:

فلولا أن ابن عدى أو غيره من مولفى كتب الجرح ذكروا ذلك الشخص لما ذكرته لثقته ولم أر من الرأى أن أحذف اسم أحد ممن له ذكر بتليين ما فى كتب الأئمة المذكورين خوفا من أن يتعقب على لا انى ذكرته لضعف فيه عندى الا ما كان فى كتاب البخارى و ابن عدى و غيرهما من الصحابة فانى نحتمل لجلالة الصحابة ولا اذكرهم فى هذا المصنف فان الضعف انما جاء من جهة الرواة اليهم وكذا لا اذكر فى كتابى من الأئمة المتبوعين فى الفروع أحدا لجلالتهم فى الاسلام و عظمتهم فى النفوس مثل ابى حنيفة والشافعى والبخارى۔

محترم قارئین! یہ ہے علامہ ذہبی کا کمال احتیاط اور ائمہ مجتہدین کا ادب، امام ذہبی ابن عدی کے افراط سے جس طرح بخوبی واقف تھے اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام و مراتب کا بھی انہیں پورا لحاظ تھا۔ اس لئے ابن عدی کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر امام اعظم کا ذکر کیا۔

اتنا جان لینے کے بعد کہ ابن عدی کے شیخ ناقدین رجال کے نزدیک غیر معتبر ہیں، امام اعظم کی مخالفت میں حکایتیں گڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ کیا ابن عدی یا ان کے شیخ کی ذکر کردہ روایتوں کے حوالہ سے امام اعظم ابوحنیفہ پر جرح کیا جا سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! اگر اس کا سہارا لے کر وقت کے جلیل القدر امام کی شان میں گستاخی کی گئی تو کل رب قدیر کے حضور جواب دینا بہت مشکل ہو جائے گا۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور ابو عبدالرحمٰن بن ابی حاتم (۳۲۷ھ): تیسری ہجری کے اخیر میں اہل علم کی جماعت میں اس وقت ایک اور نام کا اضافہ ہوا جب ''عبدالرحمٰن بن ابی حاتم رازی'' کی پیدائش ہوئی، دیکھتے ہی دیکھتے اکناف عالم میں آپ کی شہرت ہو گئی، محدثین نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، فن رجال میں کامل دسترس حاصل کیا اور اہل علم و تحقیق کے لئے جہاں بہت ساری تصنیف چھوڑی وہیں اہم کتاب ''الجرح والتعدیل'' بھی چھوڑ کر ۳۲۷ ہجری میں انتقال کر گئے۔

ابو حاتم کی نیک نیتی علمی کمال میں کچھ شک نہیں مگر صرف حدیث اور رجال کے حافظ تھے، قاسم نعمت کی طرف سے فقہ و فہم اور عقل و دانش کا حصہ شاید نہیں مل سکا تھا، غالب یہی وجہ تھی کہ متکلمین اہل سنت پر یہ حکم لگانے سے باز نہیں آئے کہ یہ کہنا کہ: ''قرآن کے جو الفاظ ہم ادا کرتے ہیں وہ مخلوق ہے، کفر ہے، ایسا شخص دین اسلام سے خارج ہے''،

فساد عقیدہ اور علم کلام سے دوری ہی کی وجہ سے امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری پر بھی یہ حکم لگا بیٹھے کہ: ابوزرعہ اور ابو حاتم نے ان سے روایت ترک کر دی ہے۔

انہیں اس بات کا اعتراف تھا کہ علم کلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں، دیکھئے ان کی کتاب ''الرد علی الجہمیہ''، جب امیر المومنین فی الحدیث جیسی قد آور شخصیت پر انہوں نے طعن کر دیا تو پھر ان سے کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ فقہ و حدیث کے سنگم، علم کلام اور علوم عقلیہ میں کامل دسترس رکھنے والے امام اعظم ابوحنیفہ کی شخصیت مسلم رہ سکے، چنانچہ دیگر مؤلفین جرح و تعدیل کی طرح انہوں نے بھی امام اعظم کے بارے میں بے سروپا حکایتیں آنکھ موند کر ذکر کر دیں۔ امام صاحب کے بارے میں ان کی کتاب ''الجرح والتعدیل'' سے کچھ نمونہ ہم قارئین کی نذر کرتے ہیں اور پھر اس روایت و حکایت کی حیثیت بھی اجاگر کریں گے:

۱۔ أخبرنا ابراهيم بن يعقوب الجوزجانى فيما كتب الى حدثنى اسحاق بن راهويه، قال سمعت جريرا يقول: قال محمد بن جابر اليمامى: سرق أبو حنيفة كتب حماد منى !!

ابن ابی حاتم اپنی روایت سے کہتے ہیں کہ محمد بن جابر یمامی نے کہا کہ ابوحنیفہ نے حماد کی کتاب مجھ سے چوری کر لی۔

قارئین کرام! غور کیجیے امام ابوحنیفہ جو امام حماد کے منظور نظر اور حماد کی علمی یادگار تھے، حماد کی وفات کے بعد جن کو لوگوں نے زبردستی مسند درس پر حماد کا اہل سمجھ کر بٹھا دیا تھا ان کے بارے میں ابو حاتم کی یہ حکایت کس حد تک مقبول ہو سکتی ہے؟

اس روایات کی سند کا جائزہ لیجیے تو اس کے بطلان کے لئے صرف ابراہیم بن یعقوب جوز جانی (۲۵۹ھ) کا وجود ہی کافی ہے، جن کے بارے میں تقریبا ناقدین رجال کا اتفاق ہے کہ اہل کوفہ سے متعلق

ان کی کوئی بھی بات معتبر نہیں ہوگی۔

علامہ ذہبی "اسماعیل بن ابان الوراق" پر ابن عدی کے حوالہ سے جوز جانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ حق سے دور تھے... چند سطور بعد ذہبی کہتے ہیں کہ حق سے دور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اہل کوفہ کے اندر عام طور پر تشیع (یعنی حب علی) پایا جاتا تھا اور "اسماعیل بن ابان" بھی اسی کیفیت سے دوچار تھے۔ جوز جانی چونکہ دمشق میں رہا کرتے تھے اہل دمشق کا مذہب عام طور پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں تحامل کا رہا ہے اس لئے انہوں نے راوی مذکور پر حق سے دور ہونے کا قول کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اہل دمشق عام طور پر ناصبی تھے، جیسے کہ کسی وقت رفض ان کا مذہب تھا، پھر دھیرے دھیرے ناصبیت تو ان کے اندر سے دور ہوگئی مگر رفض کا اثر برقرار رہا۔ (میزان ۱/۲۰۵، تذکرہ ابراہیم بن یعقوب جوز جانی، بیروت، الکامل ۱/۳۱۰ دار الفکر، بیروت)

جوز جانی کا حریزی یا ناصبی مذہب ہونا واضح تھا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق ان کا طرز گفتگو اچھا نہیں ہوتا تھا ملاحظہ کیجیے "تہذیب التہذیب" کی یہ عبارت:

قال السلمي عن الدارقطني بعد أن ذكر تو ثيقه لكن فيه انحراف عن علي اجتمع على بابه أصحاب الحديث فاخرجت جارية له فروجة لتذبحها فلم تجد من يذبحها فقال سبحان الله فروجة لا يوجد من يذبحها و علي يذبح في ضحوة نيفا وعشرين الف مسلم.... رايت في نسخة من كتاب ابن حبان حريزی المذهب... نسبة الى حريز بن عثمان المعروف بالنصب. (تهذيب التهذيب ۱/۱۵۹، تذكرة ابراهيم بن يعقوب الجوزجاني، دار الفكر بيروت)

سلمی دار قطنی کے حوالہ سے "ابراہیم بن یعقوب جوز جانی" کی توثیق کرنے کے بعد کہتے ہیں: حضرت علی کے بارے میں ان کے خیالات اچھے نہیں تھے، ایک مرتبہ ان کے دروازہ پر کچھ محدثین آئے تو ان کی ایک باندی نے مرغی ذبح کرنے کے لئے باہر نکالا، ذبح کرنے والا کوئی نہیں ملا تو کہا، سبحان اللہ مرغی ذبح کرنے والا کوئی نہیں مل رہا ہے اور علی نے دن کی روشنی میں چوبیس سے پچیس ہزار مسلمانوں کو ذبح کر دیا۔

علامہ ابن حجر کہتے ہیں: ابن حبان کے ایک نسخہ میں میں نے یہ لکھا دیکھا ہے کہ وہ "حریزی المذہب" تھے... یعنی حریز بن عثمان جو ناصبی ہیں ان کی طرف منسوب کرتے ہوئے ان کو حریزی کہا جاتا ہے۔

اس حکایت کے دوسرے راوی "محمد بن جابر یمامی" ہیں ان کے بارے میں بھی ناقدین رجال کے اقوال کچھ کم نہیں، امام احمد بن حنبل نے فرمایا "اس سے وہی شخص روایت کرسکتا ہے جو اس سے بدتر ہو، امام یحیی بن معین اور نسائی نے ان کو ضعیف کہا دیکھئے" الکامل ۶/۱۴۸، تذکرہ محمد بن جابر الیمامی، دار الفکر بیروت، الضعفاء الصغیر ۱/۹۹ دار الوعی، حلب، الضعفاء ۳/۱۲۱، المکتبۃ العلمیہ، بیروت)

ان جیسے راویوں کی حکایت کو ابو حاتم جیسے شخص اگر اپنی کتاب میں جگہ دے تو اسے تعصب اور حسد نہیں تو اور کیا کہا جائیگا۔ واضح رہے کہ امام اعظم کے مسلمہ اصول میں سے یہ بھی ہے کہ راوی صرف اپنے لکھے پر اعتماد کر کے روایت نہیں کرسکتا جب تک کہ مروی عنہ کا ذکر نہ کرے، ایسی کڑی شرط کے باوجود یہ کیسے متصور ہوسکتا ہے کہ ابو حنیفہ نے محمد بن جابر کی کتاب چرالیا اور مروی عنہ کا ذکر کئے بغیر حدیث بیان کرنا شروع کر دیا۔

قارئین کرام! مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر جرح و تعدیل کی ان تین ہی کتابوں اور ان کے مؤلفین کا پس منظر ذکر کیا گیا، ان تین کتابوں کا ذکر ہی اس بات کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے کہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حسد کی آگ لوگوں کے دلوں میں کس قدر بیٹھی ہوئی تھی، لہذا ان کتابوں اور ان کے مؤلفین کا سہارا لے کر اگر امام پر جرح کرنے کی کوشش کی جائے تو آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس میں کچھ صداقت نہیں، سفیان ثوری، عبد اللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ اور دیگر ائمہ کی طرف جو باتیں امام اعظم کے تعلق سے منسوب کی گئیں ہیں ان میں بھی کوئی وزن اس لئے نہیں کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ ان حضرات کے دلوں میں امام صاحب کا زبردست احترام تھا۔

امام اعظم ابو حنیفہ پر ترک حدیث کا الزام: ۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ حدیث کو ترک کر کے قیاس کا سہارا لیتے تھے، احادیث پر اگر عمل ہوتا بھی تو ضعیف حدیثوں پر عمل پیرا ہوتے، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں ابن مبارک کے حوالہ سے ذکر کیا کہ ابو حنیفہ حدیث میں یتیم تھے، ابو قطن نے کہا کہ حدیث میں بہت کمزور تھے۔

اگر انسان تعصب سے دور ہو کر، خالص تحقیق کی غرض سے اسلاف کی کتابوں کا مطالعہ کرے تو یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

اس الزام میں کہیں سے کہیں تک کوئی دم نہیں بلکہ تاریخی شواہد اس بات کی تائید بھی کرتی ہے کہ جن لوگوں نے حقائق کی جستجو کی غرض سے علمائے احناف بالخصوص امام ابوحنیفہ کی حیات کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ اعتراف کرچکے ہیں کہ احناف کے پاس حدیث نہیں احادیث کا ذخیرہ تھا، در اصل جن لوگوں نے اس الزام کو ہوا دیا انہوں نے احناف کے اخذ روایت کی شرطوں پر غور نہیں کیا، حدیث خواہ "مرسل" ہو یا "مسند" احناف نے ان کو قبول کرنے کے لیے ایسے اہم قواعد مقرر کیے ہیں جو کسی بھی محدث کے پاس نہیں ملتیں، ہماری گفتگو کا موضوع ان قواعد وضوابط سے بحث کرنا نہیں ہے اس لیے ہم ان کی تفصیلات میں نہیں جائیں گے البتہ بحث کے دوران بعض قاعدوں کی تشریح ضرور کریں گے۔

حدیث مرسل:۔ یار لوگوں نے اگر یہ تسلیم کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے متبعین حدیث سے استدلال کرتے ہیں تو ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ ان کا اعتماد حدیث ضعیف اس کی خاص قسم "مرسل" پر زیادہ ہے، لہذا ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ "حدیث مرسل" کی حجیت صرف احناف کے نزدیک ہے یا دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس کی حجیت کا اعتراف کرتے ہیں، پھر یہ کہ احناف مطلقا "مراسیل" سے استدلال کرتے ہیں یا اس کے کچھ شرائط وقیود بھی ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ "حدیث مرسل" کی قبولیت میں احناف تنہا نہیں ہیں، محدثین کی ایک جماعت "حدیث مرسل" کو قبول کرتی رہی ہے اور اس کو حجت بھی مانتی رہی ہے، سفیان ثوری، مالک بن انس اور امام اوزاعی جیسے قدآور محدثین نے "حدیث مرسل" کو قبول کیا اور اس سے استدلال کیا، تاریخ علم حدیث میں اس قسم کی حدیث پر کلام کرنے والے سب سے پہلے امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ ہیں، امام المحدثین امام ابوداؤد (مؤلف سنن ابی داؤد) اہل مکہ کے نام لکھے گئے اپنے ایک پیغام میں لکھتے ہیں:

وأما المراسيل فقد كان يحتج بها العلماء فيما مضى مثل سفيان الثوري، و مالك بن أنس، والأوزاعي حتى جاء الشافعي فتكلم فيها و تابعه على ذلك احمد بن حنبل وغيره (رسالة أبي داؤد الى أهل مكة، دار العربية، بيروت)

امام ابن جریر طبری لکھتے ہیں: **لم يزل الناس على العمل بالمرسل وقبوله حتى حدث بعد المأتين القول برده ... أجمع التابعون بأسرهم على قبول المراسيل، ولم يأت عنهم انكاره، ولا عن أحد من الأئمة بعدهم الى رأس المأتين. (الأحكام ۲/ ۱۷۸، بيروت. تدريب الراوي، ۱/ ۱۹۸ دار الكتب العلمية، بيروت. توضيح الأفكار ۱/ ۲۹۱ السعادة، مصر، تيسير التحرير ۳/ ۱۰۳ مصطفى الحلبي، مصر، جامع التحصيل، عالم الكتب، بيروت ص ۷۰)**

ابتداء سے علماء (محدثین) "مرسل حدیث" کو قبول کرتے آئے یہاں تک کہ دو سو ہجری کے بعد اسے رد کرنے کا قول سامنے آیا۔ تمام تابعین نے "مراسیل" کے قبول کرنے پر اجماع کیا، کسی نے بھی ان میں سے "مرسل" کی قبولیت سے انکار نہیں کیا اور نہ ہی ان کے بعد دوسو ہجری تک کسی امام نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔

علماء کی اس جماعت نے تنبیہ کی ہے کہ اگر مرسل کے رد کرنے کا قول کرلیا جائے تو بہت سارے معتمد رواۃ پر حرف آئے گا جبکہ علمائے اسلام اور محدثین ابتداء سے ان کی حدیثوں کو قبول کرتے آئے ہیں:

ان الراوي الثقة كان لا يرسل الحديث الا بعد صحته عنده، ماجاء عن الأعمش قال: قلت لابراهيم النخعي اذا حدثتني فاسند، فقال: اذا قلت لک: قال عبد الله فقد حدثني جماعة عنه، واذا قلت لک: حدثني فلان عن عبد الله فهو الذي حدثني... (جامع التحصيل، ص ۷۷، التمهيد، ۱/ ۳۸)

ثقہ راوی ارسال اسی وقت کرتا ہے جبکہ حدیث اس کے نزدیک صحیح ہوتی ہے، اعمش سے مروی ہے کہ انہوں نے ابراہیم نخعی سے کہا کہ جب مجھ سے حدیث بیان کیا کرو تو اسناد کے ساتھ بیان کرو، ابراہیم نے جواب دیا: اگر میں "قال عبداللہ" کہوں تو یہ سمجھ لینا کہ محدثین کی ایک ایسی جماعت سے میں روایت کررہا ہوں جنہوں نے ان سے روایت کیا ہے اور جب یہ کہوں کہ "حدثنی فلان عن عبداللہ" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک شخص نے ہی مجھ سے روایت کیا ہے۔

متعدد مذاہب کے علما کے اقوال سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حدیث "مرسل" کو قبول کرنے کا رواج ابتداء سے ہی تھا، امام ابوداؤد کے مطابق امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ نے سب سے پہلے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا، علامہ طبری کی تصریح سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ دوسو ہجری کے بعد اس بدعت کا آغاز ہوا، اگر مقام میں اتنی گنجائش

ہوتی تو یقیناً میں منکرین کے دلائل کا بھی تجزیہ کرتا، تنگیِ مقام کی وجہ سے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں، یہاں یہ ملاحظہ کیجیے کہ کیا احناف کے نزدیک "مرسل" مطلقاً حجت ہے یا اس کی کچھ شرطیں بھی ہیں؟

علمائے شافعیہ کا ایک گروہ اس بات پر مصر ہے کہ احناف "مرسل" کو مطلق حجت مانتے ہیں، اس فکر کو ترویج دینے والے سرکردہ علما میں سے علامہ شیرازی، علامہ قرافی علامہ آمدی اور امام رازی ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے اللمع فی اصول الفقہ، ص ۷۴، مطبوعہ مصطفی البابی، مصر. شرح تنقیح الفصول، ص ۲۷۹، مطبوعہ الکلیات الأزهریہ، المحصول، ۲/۶۵۰ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

سچ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک "مراسیل" مطلقاً حجت نہیں، اس کے مقبول ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ اگر ارسال کرنے والے راوی کا تعلق قرون ثلاثہ سے ہے تو اس کی "مرسل روایت" اس وقت تک قابل حجت ہوگی جبتک کہ اس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ غیر عادل اور غیر ثقہ سے روایت کرتا ہے، اگر یہ پتہ چل جائے کہ ارسال کرنے والا راوی غیر ثقہ سے روایت کرتا ہے تو اس کی "مرسل روایت" مقبول نہیں ہوگی، قرون ثلاثہ کے بعد اگر کوئی راوی "ارسال" کر رہا ہے تو اس کی روایت اس وقت تک قابل احتجاج نہیں ہوگی جب تک اس کے بارے میں یہ مشہور نہ ہو کہ وہ ثقہ اور عادل سے ہی روایت کرتا ہے، مزید وضاحت کے لئے علامہ سرخسی کی یہ عبارت ملاحظہ کیجئے

و أصح الاقاويل في هذا ما قاله ابو بكر الرازي ان مرسل من كان من القرون الثلاثة حجة مالم يعرف منه الرواية مطلقا عمن ليس بعدل ثقة، ومرسل من كان بعدهم لا يكون حجة الا من اشتهر بانه لا يروي الا عمن هو عدل ثقة، لأن النبي ﷺ شهد للقرون الثلاثة بالصدق والخيرية فكانت عدالتهم ثابتة بتلك الشهادة مالم يتبين خلافهم، وشهد على من بعدهم بالكذب بقوله "ثم يفشو الكذب" فلا تثبت عدالة من كان في زمن شهد على أهله بالكذب الا برواية من كان معلوم العدالة يعلم أنه لا يروي الا عن عدل. (أصول السرخسي ۱/۳۶۳، دار الكتاب العربي، بيروت)

علامہ نسفی کی عبارت اور بھی واضح ہے وہ فرماتے ہیں:

الفصل الأول: في الانقطاع الظاهر وهو المرسل من الأخبار، وهو على أربعة أوجه: أحدها: ما أرسله الصحابي. ثانيها: ما أرسله القرن الثاني. ثالثها: ما أرسله العدل في كل عصر. رابعها: ما أرسله من وجه، و أسند من وجه. فأما الأول: فمقبول بالاجماع. و أما الثاني فحجة عندنا وهو قول مالك و جمهور المعتزلة. و أما الثالث: فكذلك عند الكرخي فانه لا يفرق بين مراسيل أهل الأعصار ويقول: من تقبل روايته مسندا تقبل روايته مرسلا... و أما الرابع: فلا شبهة في قبوله عند من تقبل المرسل، وأما من لم يقبله فقد اختلفوا فيه. قال بعض أهل الحديث: انه مردود لأن حقيقة الارسال تمنع القبول فشبهته تمنع أيضا احتياطا. وعامتهم على أنهم حجة لأن المرسل ساكت عن حال الراوي، والمسند ناطق، والساكت لا يعارض الناطق. (أصول السرخسي ۱/۳۵۹، ۳۶۳ دار الكتاب العربي، بيروت. كشف الأسرار على أصول البزدوي ۳/۲، ۸. كشف الأسرار شرح المصنف على المنار ۲/۴۲، ۴۵، دار الكتاب الاسلامي، مصر)

پہلی فصل ظاہری انقطاع کے بارے میں یہ مرسل ہے اور اس کی چار قسمیں ہیں

اول: ارسال کرنے والا راوی صحابی ہو۔

دوم: ارسال کرنے والے راوی کا تعلق قرن ثانی سے ہو۔

سوم: کسی بھی زمانہ میں ارسال کرنے والا راوی عادل ہو۔

چہارم: ایسی روایت جو ایک سند سے مرسل ہو اور کسی دوسری سند سے "مسند" ہو

پہلی قسم بالاجماع مقبول ہے، دوسری قسم ہمارے نزدیک حجت ہے یہی امام مالک اور جمہور معتزلہ کا بھی قول ہے

تیسری قسم کرخی کے نزدیک مقبول ہے ان کے نزدیک اہل عصر کے "مراسیل" میں کوئی فرق نہیں، ان کا ماننا ہے کہ جس کی "مسند" روایت مقبول ہے اس کی "مرسل" بھی مقبول ہے۔

چوتھی قسم جو لوگ "مرسل" کو قبول کرتے ہیں ان کے نزدیک چوتھی قسم کے مقبول ہونے میں بھی کوئی شبہہ نہیں، جو لوگ اسے قبول نہیں

کرتے ان کے نزدیک اس چوتھی قسم میں اختلاف ہے، بعض اہل حدیث کا کہنا ہے کہ وہ مردود ہے کیونکہ "مرسل" (علی الاطلاق) غیر مقبول ہے احتیاطا جہاں شبہہ ہوگا وہ بھی روایت غیر مقبول ہوگی، اکثر محدثین کا ماننا ہے کہ یہ حجت ہے، کیونکہ "مرسل" ("س" کے کسرہ کے ساتھ) راوی کے حال سے خاموش ہوتا ہے اور "مسند" ("ن" کے کسرہ کے ساتھ) راوی کے حال کو بیان کرتا ہے لہذا ساکت ناطق کا معارض نہیں ہوسکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ احناف کے نزدیک حدیث "مرسل" مطلقا قابل قبول نہیں بلکہ ارسال کرنے والا اگر عادل و ثقہ ہے تو اس کا ارسال قبول کیا جائیگا اور وہ روایت حجت ہوگی، اگر ارسال کرنے والا راوی ثقہ و عادل نہیں تو اس کی روایت قابل قبول نہیں اس تصریح کے بعد اب بھی اگر کوئی یہ کہے کہ احناف "مرسل" جو کہ ضعیف ہوتی ہے، کو قبول کرتے ہیں، تو یہ اس کا اپنا نظریہ ہوگا، احناف کے اصول کی ترجمانی نہیں ہوگی، مجتہد مطلق امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ (م:۲۰۴) جو حدیث "مرسل" کی قبولیت سے انکار کرنے میں سر فہرست ہیں، کا قول مضطرب ہے کیونکہ مرسل کی قبولیت اور اس کے حجت ہونے کا تو انکار کردیا مگر جب قواعد کی تطبیق کرنے آئے تو "مراسیل" سے استدلال کر بیٹھے، کبھی انہوں نے یہ کہا کہ "مراسیل ابن مسیب کے علاوہ کوئی بھی مرسل حجت نہیں، پھر کہیں "ابن مسیب" کے "مرسل" کو بھی رد کردیا، پھر کہیں "ابن مسیب" کے علاوہ دیگر "مراسیل" کو قبول کرلیا، پھر یہ کہا کہ اگر "مرسل" کی تقویت کسی "مسند" سے ہوجائے تو اسے قبول کرلیا جائیگا، ان سب کی تفصیل اگر ملاحظہ کرنا چاہیں تو امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ کی کتاب "الرسالہ" مطبوعہ دار التراث، قاہرہ کا فقرہ نمبر ۱۲۶۴ اور اس کے بعد کا مطالعہ کریں وہاں کافی تفصیل موجود ہے اس لئے ہم ان تمام عبارت کو نقل کرنے سے قاصر ہیں، یونہی "مراسیل ابن مسیب" سے متعلق امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ کے مضطرب اقوال کو ملاحظہ کرنے کے لئے، امام شافعی کی کتاب "الام ۱۵۸/۲" پر علامہ مزنی شافعی کا مطبوع حاشیہ بنام "مختصر مزنی"، امام ابن ابی حاتم کی "المراسیل" ص ۱۲، مکتبہ مثنی بغداد، امام نووی کی کتاب "المجموع" ۹۹/۱، حافظ علائی کی کتاب "جامع التحصیل فی احکام المراسیل، الدار العربیہ بغداد، ص ۳۵ اور "تدریب الراوی" وغیرہ کا مطالعہ کیجئے۔

"تدریب الراوی" کے مطابق تو امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں "مراسیل" کی تخریج کی ہے، یہ اور بات ہے کہ اس تخریج سے ان کا مقصد استدلال نہیں ہے۔ تاہم اپنے مقدمہ میں بطور استدلال ضرور ذکر کیا ہے، اگر بعض علماء کے مطابق "مرسل" کا عام معنی یعنی جو متصل السند نہ ہو انقطاع خواہ کہیں بھی ہو کا اعتبار کیا جائے تو امام شافعی رضی اللہ تعالی عنہ کی کتاب "مسند شافعی" میں بھی آپ کو اس کی بہتیرے مثال ملے گی، ان سب کے باوجود صرف امام ابوحنیفہ کو مورد الزام ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے؟

خبر واحد اور امام اعظم ابوحنیفہ:- معترضین نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ جس طرح امام ابوحنیفہ احادیث کی دوسری قسموں کو رد کردیتے ہیں اسی طرح "خبر واحد" کو بھی رد کردیا ہے بلکہ "احاد" کی موجودگی میں قیاس کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ دیگر الزام کی طرح اس الزام میں بھی کوئی حقیقت نہیں ہے، احناف کے فقہی قواعد اور حدیثی اصول کا اگر آپ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ دوسرے ائمہ کے بہ نسبت امام ابوحنیفہ "خبر واحد" کو کہیں زیادہ قابل قبول سمجھتے ہیں، امام اعظم کا "امان عبد" کے مسئلہ سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے قول کی طرف رجوع کرلینا کوئی ڈھکا چھپا مسئلہ نہیں جو شخص حضرت عمر کی رائے کی طرف رجوع کرسکتا ہے، کیا اس کے لئے نبی اکرم ﷺ کی حدیث عمر کے قول سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں، خبر واحد کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہ کا موقف اگر جاننے کا ارادہ ہو تو امام ابو یوسف اور امام محمد کی کتاب "الآثار" کا مطالعہ کیجیے، احناف کے نزدیک خبر واحد کی کیا حیثیت ہے اس کو جاننے کے لئے امام محمد کی کتاب "المبسوط" بھی بہت مفید ثابت ہوگی جہاں انہوں نے صحابہ کرام کے مواقف کی متعدد مثال کے ذریعہ "خبر واحد" کی حجیت اور احناف کا اس سے استدلال کرنے پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

تاہم جیسا کہ گذر چکا کہ امام ابوحنیفہ کے اصول، روایت حدیث کے سلسلہ میں بہت سخت تھے ہمیں یہاں بھی وہی بات نظر آتی ہے، چنانچہ کسی خبر کے مقبول ہونے میں جس طرح تمام ائمہ نے راوی کے عادل اور ضابط ہونے کی قید لگائی ہے اسی طرح امام ابوحنیفہ نے بھی اس قید کو معتبر سمجھا ہے مگر ضبط کی جو تفسیر احناف نے کیا ہے اس کی مثال نہ تو کسی محدث کے ہاں ملتی ہے اور نہ ہی کسی فقیہ کے نزدیک، علامہ فخر الاسلام بزدوی "ضبط" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

واما الضبط فان تفسيره هو سماع الكلام كما يحق سماعه ثم فهمه بمعناه الذى اريد به ثم حفظه ببذل المجهود،

ثم الثبات عليه بمحافظة حدوده، ومراقبته بمذاكرته على اسائة الظن بنفسه الى حين أدائه، وهو نوعان: ضبط المتن بصيغته و معناه لغة، والثاني: أن يضم الى هذه الجملة ضبط معناه فقها وشريعة، وهذا أكملها والمطلق من الضبط يتناول الكامل ولهذا لم يكن خبر من اشتدت غفلته خلقة مسامحة و مجازفة حجة لعدم القسم الاول من الضبط، ولهذا قصرت رواية من لم يعرف بالفقه عند معارضة من عرف بالفقه في باب الترجيح او المراد منه (اصول فخر الاسلام ۲/۲۷)

علامہ بزدوی کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ احناف نے ضبط کی بڑی گہری تشریح کی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ راوی کی فقہ کو بھی ضبط کا حصہ شمار کیا ہے، روایتوں بالخصوص خبر واحد سے متعلق اتنی کڑی شرط کے باوجود یہ کہنا کہ احناف کے نزدیک احادیث کی کوئی حیثیت نہیں کتب ائمہ کا مطالعہ نہ ہونے کی دلیل ہے، یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جن لوگوں نے اماا عظم ابوحنیفہ پر روایتیں کم کرنے کا الزام لگایا ہے وہ درحقیقت علم حدیث میں ان کا کمال احتیاط، روایت حدیث میں ان کی ٹھوس شرطیں تھیں، کشف الاسرار میں ہے:

قلت الرواية عند ابي حنيفة حتى قال بعض الطاعنين انه لا يعرف الحديث وليس الأمر كما ظنوا بل كان أعلم عصره بالحديث ولكن لمراعاة شرط كمال الضبط قلت روايته (كشف الأسرار ۲/۲۸)

امام اعظم ابوحنیفہ سے کم تعداد میں حدیثیں مروی ہونے کی وجہ سے بعض مخالفین یہ کہہ دیا ہے کہ انہیں حدیث کا علم ہی نہیں تھا، جبکہ معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے عظیم اور سب سے بڑے محدث تھے، کمال ضبط کی شرط ان کی نگاہ میں تھی اس لئے روایتیں کم کرتے تھے۔ (کشف الاسرار ۲/۷۰۰، بیروت)

خبر واحد سے متعلق احناف کا نظریہ جان لینے کے بعد اب ذرا اس الزام کی نقاب کشائی کی جائیگی کہ امام اعظم "خبر واحد" اور "قیاس" کے تعارض کے وقت "خبر" کو چھوڑ کر "قیاس" کو ترجیح دیتے ہیں!!

علامہ ابن عبدالبر مالکی ایک قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كثير من أهل الحديث استجازوا الطعن على أبي حنيفة لرده كثيرا من أخبار الأحاد العدول، لأنه كان يذهب في ذلك الى عرضها على ما اجمع عليه من الأحاديث ومعاني القرآن الكريم فما شذ من ذلك رده وسماه شاذا.

بہت سارے محدثین نے امام اعظم ابوحنیفہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے عادل راویوں کی "اخبار آحاد" کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ خبر واحد کا قرآن کریم کے معنی اور متفق علیہ احادیث سے اگر تعارض ہو جائے تو ایسی روایت کو رد کر دیا جائیگا اور یہ روایتیں شاذ کہلائیں گی۔

خبر واحد اور قیاس کے متعارض ہونے کی صورت میں محدثین فقہاء کا ماننا ہے کہ خبر واحد کو ترجیح ہوگی خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، امام اعظم ابوحنیفہ کے موقف کو سمجھنے کے لئے اصحاب مذہب کی عبارتوں کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آراء اس باب میں مختلف ہیں علامہ عیسی ابن ابان اور فخر الاسلام علامہ بزدوی کچھ تفصیل کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ "اخبار احاد" فقیہ اور عادل راوی سے مروی ہوں تو قیاس پر اس کو مقدم کرنا واجب ہوگا اور اگر راوی عادل تو ہے مگر فقیہ نہیں تو اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے گا جیسے صحابہ کرام کے مابین راوی کے غیر فقیہ ہونے کی صورت میں ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے راوی کی روایت کو چھوڑ دیا اور قیاس پر عمل کیا، مثلا حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث "الوضوء مما مسته النار" کا پتہ جب حضرت عبد اللہ ابن عباس کو چلا تو آپ نے فرمایا اگر تم گرم پانی سے وضو کرو تو کیا دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت پڑے گی؟!" یہ اور ان جیسی کئی ایک مثال علامہ عیسی ابن ابان نے پیش کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے راوی اگر فقیہ نہیں تو اس کی روایت میں اجتہاد کے بعد قیاس کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔

ان كان راوي خبر الأحاد عادلا فقيها وجب تقديم خبره على القياس والا كان موضع الاجتهاد، (كشف الاسرار ۲/۶۹۳)

ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ قیاس کی حجیت پر سلف کا اجماع ہے لیکن خبر واحد کا نبی اکرم ﷺ تک متصل ہونے میں مشتبہ ہے، لہذا، قیاس سے ثابت ہونے والا مسئلہ گویا اقوی دلیل سے ثابت ہوا کیونکہ اس کا ثبوت اجماع سے ہے اور یہ خبر واحد سے اقوی ہوتا ہے۔ (سابق)

علامہ فخر الاسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر "خبر واحد" قیاس کے خلاف ہوگی تو اسے کسی خاص ضرورت یا قیاس کے عمل کو جاری رکھنے کی غرض سے ترک کر دیا جائے گا۔ (سابق)

دوسری طرف علامہ ابوالحسن کرخی کا ماننا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کسی بھی صورت میں قیاس کو "خبر واحد" پر مقدم نہیں کرتے تھے، کسی خاص ضرورت کا تحقق ہو یا نہ ہو یونہی قیاس کا عمل جاری رہے یا نہ رہے بہر صورت "خبر" ہی کی تقدیم ہوگی، التقریر میں ہے:

اذا تعارض خبر الواحد والقياس بحيث لا جمع بينهما ممكن قدم الخبر مطلقا عند الأكثرين، منهم أبو حنيفة والشافعي واحمد (التقرير والتحبير شرح تحرير الكمال، ۲/۳۱۸)

فقہائے احناف کے مختلف نظریات کا ذکر کرنے کے بعد راقم اپنے محدود مطالعہ کی روشنی میں علامہ ابوالحسن کرخی کی رائے اور امام اعظم ابوحنیفہ سے متعلق ان کی تشریح کو راجح قرار دیتا ہے، جہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "خبر واحد" کو چھوڑ کر قیاس کو ترجیح دی ہے، اس کی کئی توجیہ کی جاسکتی ہے اس کی تفصیل کا یہاں مقام نہیں، ایک یہ ہے کہ امام کے پاس اس حدیث کو ترک کرنے کی فخر الاسلام کی ذکر کردہ وجہوں کے علاوہ کوئی ایسی ٹھوس وجہ یقیناً رہی ہوگی جو ہماری سمجھ سے باہر ہے، کیونکہ جس کی سوچ و فکر اور تقوی کا عالم یہ ہو کہ اپنے فتوی کے خلاف کسی صحابی کا قول مل جائے تو اس کی طرف وہ رجوع کرلے تو کیا نبی اکرم ﷺ کی حدیث اس کے نزدیک تمام چیزوں سے بڑھ کر محبوب نہیں ہوگی؟

قارئین کرام!! اس مختصری بحث کے بعد آپ نے یقیناً یہ جان لیا ہوگا کہ امام اعظم ابوحنیفہ کے مخالفین جو ان پر الزامات لگاتے ہیں ان میں کوئی سچائی نہیں، مخالفت کرنے والے یا تو ایسے تھے جنہیں فقہ و فہم سے کچھ حصہ نہیں ملا تھا، یا ایسے تھے جو عقیدہ کے اعتبار سے گمراہ فرقہ "جہمیہ" یا حشویہ" سے متاثر تھے، یا مذہبی تعصب انہیں امام صاحب کے علم و فضل کا اعتراف کرنے میں مذہبی تعصب ان کے آگے دیوار بن کر حائل تھی حقیقت پسند اور نیک نیت علماء مثلاً امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام اوزاعی، امام عبد اللہ بن مبارک، امام سفیان ثوری، امام ابن عیینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جب ان کا احترام کیا، ان کی تعریف کی، فقہ و فن کا امام تسلیم کیا تو پھر کسی اور کو ان پر جرح کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے، اور اگر کسی متعصب نے کوئی الزام لگا بھی دیا تو نیر تاباں کی روشنی پر اس سے کچھ فرق بھی نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور تمام ائمہ و محدثین کا احترام کرنے کی سعادت سے بہرہ ور کرے۔

☆☆☆

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری☆

امام اعظم اور عمل بالحدیث

امام الائمہ، سراج الامۃ، امام اعظم ابوحنیفہ جیسا مجتہد، محدث اور فقیہ عطا فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امت پر عظیم احسان فرمایا، قرآن فہمی میں رسوخ، معانی حدیث کا درک، آثار صحابہ اور فتاویٰ تابعین پر گہری نظر، ملکۂ استخراج واستنباط، خداداد قوت حفظ، کمال زہد وتقویٰ اور اس خیر امت کے صلحاء، اولیاء، مفسرین، محدثین، فقہاء اور علماء کی اکثریت کا اعتماد واعتبار جب یہ ساری خوبیاں کسی شخصیت میں یکجا ہو جائیں تو کہیں جا کر ایک ابوحنیفہ بنتا ہے۔امام اعظم کے علمی اور دینی کارناموں اور خدمات پر تفصیلی گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، آپ کی جلیل القدر خدمات اپنی جگہ مگر آپ کا سب سے عظیم کارنامہ ''فقہ اسلامی کی تدوین'' ہے۔آپ نے اپنے اصحاب کی ایک ٹیم کو لے کر یہ عظیم کام شروع کیا، طہارت سے لے کر میراث تک کتاب وسنت سے لاکھوں مسائل کا استنباط فرما کر باضابطہ فقہ اسلامی کو مدون فرما دیا۔آپ کے تلامذہ نے آپ کے مستخرجہ مسائل کو اپنی کتب میں محفوظ کر دیا تاکہ آنے والی نسلیں ان سے استفادہ کر سکیں، ان تلامذہ میں امام محمد اور امام قاضی ابو یوسف کے نام سرفہرست ہیں۔

جہاں اس امت کی اکثریت نے امام اعظم کے فضل وکمال کا اعتراف کیا اور ان کے ذریعہ تدوین کی گئی فقہ کو حرز جان بنایا وہیں بعض حضرات ان کے مخالف بھی ہو گئے، امام اعظم کے مخالفین کو ہم تین طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) وہ حضرات جو محض بغض وحسد کی بنیاد پر آپ کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے، اور آپ کے خلاف مکروہ پروپگنڈہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

(۲) وہ حضرات جو امام اعظم کے بارے میں درست معلومات نہ ہونے کی وجہ سے حاسدین کے ذریعہ پھیلائے ہوئے پروپگنڈہ کا شکار ہو گئے، اور پھر خود بھی ان خلاف حقیقت باتوں کی ترویج واشاعت میں مصروف ہو گئے۔

(۳) وہ حضرات جو غلط فہمی کی بنیاد پر امام اعظم سے بدظن ہو گئے، مگر بعد میں جب حقیقت منکشف ہوئی تو اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر کے امام صاحب کے فضل وکمال کے معترف اور آپ کے گرویدہ ہو گئے۔(مگر کچھ لوگ اب بھی ان حضرات کے پہلے والے قول نقل کر کے امام اعظم کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کرنے میں رات دن کوشاں ہیں)

ان تینوں طبقوں کی نمائندگی کرنے والے حضرات کے اسماء گرامی مستند تاریخی حوالوں سے پیش کیے جا سکتے ہیں مگر ہم فی الحال ان سے قطع نظر کر رہے ہیں۔ان ''یاران نکتہ داں'' نے امام اعظم کے خلاف کیا کیا شگوفہ چھوڑے، اور کس کس طرح ان کے خلاف فضا ہموار کی یہ ایک الگ داستان ہے، اس کی اگر ایک جھلک دیکھنا ہو تو خطیب بغدادی کی ''تاریخ بغداد'' کا مطالعہ کافی ہے (۱)۔اس پروپگنڈہ کے نتیجے میں امام اعظم کے اوپر بے شمار الزامات عائد کر دیے گئے۔مثلاً

(۱) ابوحنیفہ مرجی فرقے کے تھے جو ایک گمراہ فرقہ ہے
(۲) ابوحنیفہ حدیث پاک کا بہت کم علم رکھتے تھے
(۳) ابوحنیفہ صحیح احادیث کو ترک کر کے ان کے مقابلے میں اپنی رائے اور قیاس کو ترجیح دیا کرتے تھے، اسی لئے فقہ حنفی کی بنیادیں کتاب وسنت پر نہیں بلکہ یہ ابوحنیفہ کے قیاسوں کا مجموعہ ہے جس کے اکثر مسائل سنت صحیحہ ثابتہ کے خلاف ہیں۔
(۴) فقہ حنفی کا ایک بڑا حصہ ضعیف اور منکر احادیث پر مبنی ہے۔

پہلے دونوں الزامات سے قطع نظر سر دست ہم ان آخری دو الزامات کا جائزہ لیں گے۔

تیسرے الزام کے سلسلہ میں ایک بنیادی بات یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کوئی بھی وہ شخص جس کے رتبۂ اجتہاد مطلق پر فائز ہونے کے سلسلہ میں اس امت کے اصحاب علم وفضل کا اتفاق ہو اس کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جان بوجھ کر محض اپنی ہوائے نفس کی وجہ سے حدیث کو ترک کرے گا اور رسول اکرم ﷺ کا فرمان مبارک

پس پشت ڈال کر اپنے قیاس اور رائے کی بنیاد پر فتویٰ دے گا۔ ہمارے اکابر اہل سنت نے اس سلسلہ میں بے شمار دلائل پیش کئے ہیں بلکہ خود جماعت اہل حدیث کے امام و پیشوا شیخ ابن تیمیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے "رفع الملام عن ائمة الاعلام" اس میں انہوں نے ائمہ متبوعین اور مجتہدین امت کی جانب سے اس الزام کا دفاع کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: راقم سطور کا مضمون "ائمہ مجتہدین پر ترک حدیث کا الزام" مطبوعہ جام نور، اپریل ۲۰۰۶ء)

جہاں تک صحیح احادیث کے ترک کرنے کا الزام ہے تو اس سلسلہ میں پہلے چند بنیادی مقدمات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

(۱) جس طرح بعد کے محدثین نے حدیث کی صحت وضعف اور رد و قبول کے لئے کچھ شرائط وضع کئے، ہیں جب کوئی حدیث ان کی وضع کردہ شرائط پر پوری اترتی ہے اسی وقت وہ اس پر عمل کرتے ہیں، اور اگر وہ حدیث ان کی وضع کردہ شرائط کے مطابق نہ ہو تو وہ اس کو قبول نہیں کرتے خواہ وہ کسی اور محدث کے نزدیک صحیح ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح ائمہ متقدمین اور اصحاب اجتہاد نے بھی احادیث کے رد و قبول کے کچھ اصول بنائے ہیں، جب کوئی حدیث ان کے ان اصولوں پر پوری اترتی ہے اسی وقت وہ اس پر عمل کرتے ہیں، اور اگر ان کے وضع کردہ اصولوں پر پوری نہ اترے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتے، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جب مطلوبہ شرائط نہ پائے جانے کی وجہ سے بعد کے محدثین "ترک حدیث" کرتے ہیں تو ان کے بارے میں "حسن ظن" سے کام لیا جاتا ہے، مگر جب امام ابو حنیفہ شرائط کے فقدان کی وجہ سے کوئی حدیث ترک کریں تو آخر ان کو اس حسن ظن کی "رعایت" سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے؟

(۲) دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ متقدمین کا کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینا متاخرین کے لئے تو حجت ہو سکتا ہے مگر متاخرین کی تصحیح وتضعیف متقدمین پر حجت نہیں ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ائمہ متقدمین کی اسناد عالی ہوا کرتی تھی اور وہی حدیث بعد کے محدثین کے پاس نازل سند کے ساتھ پہنچا کرتی تھی، مثلاً اگر کسی متقدم امام ومجتہد کے پاس کوئی حدیث دو یا تین واسطوں سے پہنچی تھی اب وہی حدیث آگے جا کر سو سال بعد سات آٹھ واسطوں سے کسی اور محدث کے پاس پہنچی، جس کے پاس حدیث میں صرف دو یا تین واسطے تھے اس کے نزدیک وہ حدیث صحیح اور قابل اخذ تھی، مگر پانچویں یا چھٹے واسطے کا راوی ضعیف تھا اب ظاہر ہے کہ جس کے پاس وہ حدیث آٹھ واسطوں سے پہونچی ہے اس کے نزدیک وہ حدیث ضعیف اور ناقابل عمل ہوگی، اب آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں مجتہد نے اس ضعیف حدیث پر عمل کیا ہے، اس لئے کہ یہ حدیث ضعیف تو اس مجتہد کے سو سال بعد ہوئی ہے۔

(۳) یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی مجتہد کا کسی حدیث پر عمل کرنا اس مجتہد کے نزدیک اس حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، ظاہر ہے کہ اگر ان کے نزدیک وہ حدیث صحیح اور قابل حجت نہ ہوتی تو وہ اس پر ہرگز عمل نہ کرتے۔

ان بنیادی مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب آپ دیکھیں کہ جس طرح بعد کے محدثین نے احادیث کے رد و قبول کے لئے اپنے اصول بنائے ہیں، اسی طرح امام اعظم بھی اپنے بعض اصول وقواعد کی بنیاد پر حدیث کے رد و قبول کا فیصلہ کیا کرتے تھے، حدیث اور فقہ دونوں پر گہری نگاہ رکھنے والے جلیل القدر علماء نے امام اعظم کے استخراج کردہ جزئیات فقہیہ اور احادیث احکام کے گہرے تقابلی مطالعہ کے نتیجہ میں ان اصول وقواعد کو اخذ فرمایا ہے۔ علامہ محمد بن یوسف الصالحی (صاحب سیرت شامیہ) نے اپنی کتاب "عقود الجمان فی مناقب ابی حنیفة النعمان" میں ان میں سے بعض اصول وقواعد کا ذکر فرمایا ہے، علامہ زاہد الکوثری نے بھی اپنی معرکہ آرا تصنیف "تانیب الخطیب فیما ساقه فی ترجمة ابی حنیفة من الاکاذیب" میں ان قواعد کو نقل کیا ہے، اسی سے استفادہ کرتے ہوئے ہم یہاں تلخیص واختصار کے ساتھ ان اصول وقواعد میں سے بعض کا تذکرہ کریں گے۔

(۱) اخبار احاد کو کتاب اللہ کے عمومات پر پیش کیا جائیگا، اگر وہ خبر واحد کتاب اللہ کے عموم یا ظاہر کے مخالف ہے تو اس کو ترک کر کے کتاب اللہ کے عموم وظاہر پر عمل کیا جائے۔ کیوں کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب دو دلیلیں ہوں تو ان میں سے قوی دلیل کو لیا جاتا ہے، کتاب اللہ قطعی الثبوت ہے اور اس کا عموم وظاہر قطعی الدلالہ ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ خبر واحد کے مقابلہ میں زیادہ قوی دلیل ہے۔

(۲) ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ خبر واحد کسی سنت مشہورہ کے معارض نہ ہو، یہ سنت مشہورہ خواہ قولی ہو یا فعلی، یہاں بھی مخالفت وتعارض کے وقت اقویٰ دلیل کو اختیار کیا جائے گا، اور ظاہر ہے کہ خبر واحد کے مقابلہ میں سنت مشہورہ ثبوت کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔

(۳) خبر واحد اپنی ہی طرح کی کسی دوسری خبر واحد کے معارض نہ ہو، اگر دو اخبار احاد میں تعارض ہو تو ان میں سے کسی ایک کو راجح قرار دے کر اخذ کیا جائے گا اور دوسری کو مرجوح قرار دے کر ترک کیا جائے گا، دو متعارض حدیثوں کے درمیان ترجیح دینے کے سلسلہ میں ائمہ مجتہدین کے الگ الگ نظریات اور الگ الگ وجوہ ترجیح ہیں، مثلاً دونوں روایتوں میں سے جس روایت کا راوی فقیہ ہو اس کی روایت کو ترجیح دی جائے گی اور اگر دونوں راوی فقیہ ہوں تو ان میں سے افقہ (زیادہ تفقہ والے) کی روایت کو ترجیح ہوگی، یہ احناف کی وجوہ ترجیح ہیں، جبکہ بعض مجتہدین و محدثین کے نزدیک اس خبر کو ترجیح ہوگی جس کی سند دوسری کے مقابلہ میں زیادہ عالی ہوگی۔

(۴) امام اعظم کا خبر واحد کے سلسلہ میں ایک اصول یہ ہے کہ اس خبر واحد کا راوی خود اپنی ہی روایت کے خلاف فتویٰ نہ دے، اگر ایسا ہوگا تو اس کی روایت کو ترک کر کے اس کے فتویٰ کو لیا جائیگا، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث کہ "اگر کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات بار دھویا جائے گا" مگر خود حضرت ابو ہریرہ کا فتویٰ اس کے برخلاف تھا، لہٰذا ان کے فتویٰ کو ترجیح دی جائے گی۔

(۵) حدود و عقوبات کے سلسلہ میں اگر اخبار احاد آپس میں متعارض ہوں تو ان میں سے "اخف" کو اختیار کیا جائے گا۔

(۶) اس خبر کو اخذ کیا جائیگا جس کی جانب آثار زیادہ ہونگے۔

(۷) خبر واحد پر عمل کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ صحابہ اور تابعین کے عمل متوارث کے خلاف نہ ہو۔

(۸) خبر واحد کے سلسلہ میں ایک اصول یہ ہے کہ سلف میں سے اس پر کسی کا طعن منقول نہ ہو۔

ان اصولوں کو نقل کرنے کے بعد امام صالحی تحریر فرماتے ہیں۔ "فبمقتضی هذه القواعد، ترک الامام ابو حنيفة رحمه الله العمل باحاديث كثيرة من الآحاد (۲) (ترجمہ) "انہیں قواعد کی بنیاد پر امام ابو حنیفہ نے بہت سی اخبار احاد پر عمل نہیں کیا ہے"۔

آگے چل کر فرماتے ہیں: "والحق انه لم يخالف الأحاديث عناداً، بل خالفها اجتهاداً لحجج واضحة ودلائل صالحة، وله بتقدير الخطأ اجر وبتقدير الاصابة اجران، والطاعنون عليه اما حساد، او جهال بمواقع الاجتهاد". (۳) (ترجمہ) "اور حق یہ ہے کہ انہوں نے از روئے عناد احادیث کی مخالفت یا ان کا ترک نہیں کیا ہے بلکہ ان کا ترک حدیث اجتہاد کی بنیاد پر تھا جس کے لئے ان کے پاس واضح دلائل و براہین موجود ہیں، اگر ان سے سہو ہو ہے تو ان کے لئے ایک اجر ہے اور اگر وہ صواب کو پہونچے ہیں تو ان کے لئے دو اجر ہیں، ان پر طعن کرنے والے یا تو حاسدین ہیں یا پھر مراتب اجتہاد سے ناآشنا ہیں"۔

جہاں تک اس الزام (نمبر ۳) کا سوال ہے کہ فقہ حنفی کی بنیاد ضعیف اور منکر احادیث پر ہے تو اس کے لئے آپ ہمارے بیان کردہ تین بنیادی مقدمات میں سے نمبر ۲ اور نمبر ۳ کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ مزید یہ کہ امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی کتاب "میزان شریعة الکبری" میں ایک مستقل فصل اس الزام کے جواب کے لئے وضع فرمائی ہے، اس فصل کا عنوان ہے "فصل فی تضعيف قول من قال: ان ادلة مذهب الامام ابی حنيفة ضعيفة غالباً" (فصل اس شخص کے قول کی تضعیف میں جو یہ کہتا ہے کہ مذہب امام ابو حنیفہ کی مستدل احادیث اکثر ضعیف ہیں) اس فصل میں آپ ارشاد فرماتے ہیں

"فان قيل: اذا قلتم بان ادلة مذهب الامام ابی حنيفة رضی الله عنه ليس فيها شئ ضعيف لسلامة الرواة بينه وبين رسول الله ﷺ من الصحابة والتابعين من الجرح فما جوابكم عن قول بعض الحفاظ عن شئ من ادلة الامام ابی حنيفقبانه ضعيف؟ (۴) (ترجمہ) "اگر کہا جائے کہ آپ نے کہا امام ابو حنیفہ کے مذہب کے دلائل میں کوئی ضعیف حدیث نہیں ہے، اس لئے کہ ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان کے راوی صحابہ و تابعین ہیں، اور صحابہ و تابعین جرح سے محفوظ ہیں، مگر بعض حفاظ حدیث نے امام ابو حنیفہ کی مستدل بعض احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟"۔

اس سوال کے جواب میں امام شعرانی فرماتے ہیں۔ "فالجواب يجب علينا حمل ذلك جزماً على الرواة النازلين عن الامام فی السند بعد موته رضی الله تعالی عنه اذا روا ذلك الحديث من طريق غير طريق الامام اذ كل حديث وجدناه فی مسانيد الامام الثلاثة، فهو صحيح لانه لو لا صح

عنده ما استدل به ولا يقدح في وجود كذاب او متهم بالكذب مثلاً في سنده النازل عن الامام و كفانا صحة لحديث استدلال مجتهد به ثم يجب علينا العمل به ولو لم يروه غير فتأمل هذه الدقيقة التي نبهتك عليها فلعلك تجدها في كلام احد من المحدثين،واياك ان تبادر الى تضعيف شئ من ادلة مذهب الامام ابي حنيفة الا بعد ان تطالع مسانيده الثلاثة ولم تجد ذلك الحديث فيها .(۵)

(ترجمہ)''ہم پر واجب ہے کہ ہم اس کو اس بات پر محمول کریں کہ یقینی طور پر یہ ضعف امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد ان کے نیچے کے راویوں میں پیدا ہوا ہے،اور انہوں نے یہ حدیث امام اعظم کے علاوہ کسی اور سند سے روایت کی ہے،اس لئے کہ امام اعظم کی تینوں مسانید میں ہم نے جتنی حدیثیں دیکھیں وہ سب صحیح ہیں،اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر وہ احادیث امام اعظم کے نزدیک صحیح نہ ہوتیں تو آپ ہرگز ان سے استدلال نہ کرتے،اور اگر ایسی کسی حدیث کی سند میں امام اعظم کے بعد کوئی راوی کذاب یا متہم بالکذب ہو تب بھی کوئی حرج نہیں کیوں کہ اس حدیث کی صحت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ایک مجتہد نے اس سے استدلال کیا ہے،لہٰذا ہمارے اوپر اس حدیث کے مطابق عمل کرنا واجب ہے،خواہ اس حدیث کو کسی اور نے روایت کیا ہو یا نہ کیا ہو۔اس نکتہ پر اچھی طرح غور و فکر کرو،شاید یہ نکتہ جس کی طرف ہم نے توجہ دلائی ہے تمہیں کسی اور محدث کے کلام میں نہ ملے،اور امام ابوحنیفہ کی مستدل احادیث کو ہرگز ضعیف قرار دینے میں سبقت نہ کرو جب تک کہ تم ان کی مسانید ثلاثہ کا مطالعہ نہ کرلو اور تمہیں اس میں وہ حدیث نہ ملے''۔

امام زاہد الکوثری فرماتے ہیں:''واما تضعيف بعض احاديثه من جهة بعض شيوخه ،او شيوخ شيوخه بناء على قول بعض المتاخرين فيهم ،فليس بمستساغ،لظهور انه ادرى باحوال شيوخه وشيوخ شيوخه،وليس بينه وبين الصحابي الا راويان اثنان في الغالب ".(۶)

(ترجمہ)''رہا یہ کہ بعض متاخرین کے اقوال جو امام ابوحنیفہ کے شیوخ یا شیوخ کے شیوخ کے بارے میں ہیں ان کی بنیاد پر امام ابو حنیفہ کی احادیث کو ضعیف قرار دیا جائے،تو یہ درست نہیں ہے،کیوں کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ اپنے شیوخ اور ان کے شیوخ کے شیوخ کے بارے میں (متاخرین کے مقابلے میں) زیادہ بہتر جانتے تھے،امام ابوحنیفہ اور صحابی کے درمیان عام طور پر دو راوی ہیں''۔

فقہ حنفی کے ضعیف روایت پر مبنی ہونے کے الزام کا ہم جائزہ لے رہے ہیں تو اس اہم بات کو بھی پیش نظر رکھیں کہ محدثین اور اصولیین کے درمیان حدیث مرسل کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں ایک اصولی اختلاف ہے۔ہم یہاں اس اختلاف پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔محدثین کے نزدیک مرسل وہ روایت ہے جس کی سند کے آخر سے تابعی کے بعد راوی مذکور نہ ہو،با لفظ دگر مرسل وہ روایت ہے جس کو کوئی تابعی بغیر صحابی کا ذکر کئے براہ راست حضور اکرم ﷺ سے روایت کرے،مگر اصولیین اور فقہا کے نزدیک مرسل اس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند متصل نہ ہو،یعنی کوئی ایک راوی یا چند راوی سند سے ساقط ہوں۔جمہور محدثین کے نزدیک مرسل کا حکم یہ ہے کہ یہ ضعیف و مردود ہے،اور قابل احتجاج نہیں،جب کہ امام شافعی اور بعض دیگر علما کے نزدیک مرسل کی بعض قسمیں چند شرائط اور قیود کے ساتھ معتبر ہیں،اس سلسلہ میں احناف کا اصول وہ ہے جس کو امام سرخسی حنفی نے امام ابو بکر رازی کے حوالے سے لکھا ہے،آپ فرماتے ہیں:

''و اصح الأقاويل في هذا ما قاله أبو بكر الرازي: ان مرسل من كا من القرون الثلاثة حجة مالم يعرف منه الرواية مطلقا عمن ليس بعدل ثقة ، ومرسل من كا بعدهم لا يكون حجة الا من اشتهر بانه لا يروى الا عمن هو عدل ثقة، لأن النبي ﷺ شهد للقرون الثلاثة بالصدق و الخيرية فكانت عدالتهم ثابتة بتلك الشهادة مالم يتبين خلافهم، وشهد على من بعدهم بالكذب بقوله "ثم يفشو الكذب" فلا تثبت عدالة من كان في زمن شهد على أهله بالكذب الا برواية من كان معلوم العدالة يعلم أنه لا يروى الا عن عدل.''(۷)

(ترجمہ)''اس سلسلہ (یعنی مرسل کی قبولیت یا عدم قبولیت) میں سب سے صحیح ترین بات وہ ہے جو ابو بکر رازی نے کہی ہے،کہ جس شخص کا تعلق قرون ثلاثہ سے ہے،اس کی مرسل اس وقت تک حجت ہے جب تک اس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ غیر ثقہ اور غیر عادل سے روایت کرتا تھا،قرون ثلاثہ کے بعد کے لوگوں میں اس شخص کی مرسل حجت ہے جس کے بارے میں یہ شہرت ہو کہ یہ غیر ثقہ اور غیر عادل سے روایت

نہیں رہتا، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان تینوں زمانوں کے لئے صدق اور خیر کی بشارت دی ہے، لہٰذا اس بشارت کی وجہ سے ان تین زمانوں کے لوگوں کی عدالت ثابت مانی جائے گی، جب تک کہ اس کا خلاف ثابت نہ ہو جائے، اور اس کے بعد کے زمانے کے لئے حضور ﷺ نے کذب عام ہونے کی خبر دی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا ثم یفشو الکذب "اور پھر جھوٹ عام ہو جائے گا" لہٰذا جس زمانے کے بارے میں جھوٹ کی خبر وارد ہے، اس میں کسی شخص کی عدالت اس وقت ثابت ہوگی جب کوئی ایسا شخص روایت کرے کہ جس کی عدالت ثابت ہے، اور یہ معلوم ہو کہ یہ اسی سے روایت کرتا ہے جو عادل ہو"۔

اب اگر امام اعظم سے استنباط کردہ کسی مسئلہ کی بنیاد مرسل حدیث پر ہو تو بعد کا کوئی شخص یہ کہنے کا حق نہیں رکھتا کہ فقہ حنفی کے فلاں مسئلہ کی بنیاد مرسل حدیث پر ہے اور مرسل حدیث ضعیف و نامقبول ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر بعد کے محدثین کے نزدیک مرسل سے احتجاج جائز نہ ہو تو کیا ہوا امام اعظم کے نزدیک وہ قابل احتجاج ہے۔ امام اعظم کے پاس جو احادیث پہونچیں ان میں ایک بڑا حصہ ان احادیث کا تھا جو انہوں نے براہ راست تابعین کی مقدس جماعت سے سنی تھیں، اور بے شمار احادیث آپ نے تبع تابعین سے سماعت کیں، آپ نے ان تابعین یا تبع تابعین سے رسول کا قول فرمایا، ثقہ تابعی جب تک کوئی بات اپنے ہی جیسے ثقہ شخص سے نہ سن لے اور اس پر اعتماد نہ کرے اس وقت تک کوئی بات اللہ کے رسول ﷺ کی طرف منسوب کر ہی نہیں سکتا، اسی اعتماد کی بنیاد پر قرون فاضلہ میں مراسیل کو عام طور سے قبول کرنے کا مزاج تھا، اور ان کو قابل احتجاج سمجھا جاتا تھا۔ ابن جریر کے حوالے سے امام سیوطی فرماتے ہیں: "قال ابن جریر اجمع التابعون باسرهم علی قبول المرسل ولم یات عنهم انکاره ولا عن احد من الائمه بعدهم الی راس المائتین" (۷) (ترجمہ) "ابن جریر نے کہا کہ تمام تابعین مرسل کو قبول کرنے پر متفق ہیں، نہ تابعین میں سے اور نہ ہی ان کے بعد ائمہ میں سے کسی نے دوسری صدی تک مرسل کی قبولیت کا انکار کیا"۔

علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں "والاحتجاج بالمرسل كان سنة متوارثة، جرت عليه الامة في القرون الفاضلة، حتى قال ابن جرير رد المرسل مطلقا بدعة حديث في راس المائتين" (۸)

(ترجمہ) "مرسل حدیث سے احتجاج کرنا سنت متوارثہ تھی قرون فاضلہ میں امت کا یہی طریقہ تھا، بلکہ ابن جریر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مرسل کو مطلقاً رد کر دینا یہ بدعت ہے، جو دوسری صدی میں پیدا ہوئی ہے"۔

جس طرح مرسل حدیث کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں محدثین اور فقہا کے اصول وقواعد مختلف ہیں اسی طرح مجہول راوی کی روایت قبول کرنے یا نہ کرنے میں بھی علما کے اپنے اپنے اصول ہیں، کسی کے اصول کے مطابق مجہول کی روایت مقبول نہیں، جب کہ کسی کے اصول کے مطابق کچھ شرائط کے ساتھ ایسے راوی کی روایت مقبول اور قابل احتجاج ہے۔ اب اگر کوئی مجتہد یا فقیہ اپنے اصول کے مطابق کسی مجہول کی روایت قبول کرتا ہے تو اب یہ کہنا بڑی ناانصافی اور خلاف دیانت ہے کہ فلاں مجتہد نے اس مسئلہ میں مجہول کی روایت سے احتجاج کیا ہے جب کہ مجہول کی روایت فلاں فلاں محدثین کے نزدیک غیر مقبول اور ضعیف ہے۔ یہ بات اس لئے درست نہیں کہ ایک مجتہد کے اصول وقواعد دوسرے پر حجت نہیں ہیں۔ یہاں ہم مجہول راوی کے سلسلہ میں بھی ایک سرسری اشارہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ بات اور واضح ہو سکے۔

کسی راوی کے اوپر طعن یا جرح دو طرح ہوتی ہے، کبھی راوی کی عدالت پر جرح کی وجہ سے اس کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے، اور کبھی اس کے ضبط پر جرح کے سبب اس کی روایت غیر مقبول ہوتی ہے۔ راوی کی عدالت پر طعن کی کئی وجوہ ہیں، مثلاً کذب، اتہام کذب، فسق، بدعت وغیرہ، عدالت میں طعن کی ایک وجہ "جہالت راوی" بھی ہے۔ جہالت راوی کی بھی چند قسمیں ہیں مثلاً کبھی راوی مجہول العین ہوتا ہے اور کبھی مجہول الحال ہوتا ہے، مجہول العین کا مطلب یہ ہے کہ اس سے صرف ایک ہی راوی نے روایت کی ہو، مجہول الحال کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عدالت ظاہری اور باطنی دونوں معلوم نہ ہوں، ایسے راوی کی روایت کو "مبہم" کہا جاتا ہے، مجہول کی ایک قسم مستور ہے اس سے وہ راوی مراد ہوتا ہے جس کی عدالت ظاہری تو معلوم ہو مگر عدالت باطنی کی تحقیق نہ ہو۔ مجہول الحال کی روایت جمہور محدثین کے نزدیک مقبول نہیں ہے، اور آخر الذکر دونوں قسم کے مجہولوں کی روایت محققین کے نزدیک صالح اور قابل احتجاج ہے۔ امام اعظم کے نزدیک مجہول الحال کی روایت مقبول ہے۔ امام ابن صلاح نے مقدمہ میں فرمایا ہے "احدهما في

العدالة من حيث الظاهر والباطن جميعاً وروايته غير مقبولة عند الجماهير "۔(۹)(ترجمہ)''ان میں سے ایک مجہول العدالت ہے ظاہری اور باطنی دونوں طرح، ایسے راوی کی روایت جمہور کے نزدیک غیر مقبول ہے''

اس قول کی شرح کرتے ہوئے علامہ بدرالدین ابوعبداللہ محمد ''النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح'' میں لکھتے ہیں "وانما قبل ابو حنيفة ذلك في عصر التابعين لغلبة العدالة عليهم "(۱۰)(ترجمہ)''ابوحنیفہ نے تابعین کے دور میں ایسے راوی کی روایت کو قبول کیا ہے، کیونکہ اس دور میں عدالت کا غلبہ تھا''۔

اسی طرح مجہول العین راوی کو بھی امام اعظم نے قبول کیا ہے بشرطیکہ سلف میں سے کسی نے اس کی روایت کو مردود قرار نہ دیا ہو۔ مجہول کی روایت قبول کرنے کا یہ اصول دراصل اس نظریہ پر مبنی ہے کہ جب کسی کے عادل یا غیر عادل ہونے کے بارے میں کوئی علم نہ ہو تو چونکہ مسلمان کے حق میں اصل عادل ہونا ہے، لہٰذا اس کی اصل کو دیکھتے ہوئے ایسے مجہول شخص کے عادل ہونے کو ترجیح دی جائے گی، اور اس کی روایت کو قبول کیا جائے گا۔اس اصول کی بنیاد پر امام اعظم اور بعد کے فقہائے احناف نے مجہول کی روایت قبول کی ہے، اب اگر کسی مجہول کی روایت پر امام اعظم نے کسی مسئلہ کی بنیاد رکھی ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ امام ابوحنیفہ نے ضعیف حدیث پر اس مسئلہ کی بنیاد رکھی ہے، کیونکہ یہ حدیث ضعیف تو ان مجتہدین یا محدثین کے نزدیک ہے جو جہالت راوی کی بنیاد پر حدیث پر ضعف کا حکم لگاتے ہیں، لیکن چونکہ امام اعظم اپنے مذکورہ اصول کی وجہ سے ایسے راوی کی حدیث قبول کرتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک یہ حدیث ضعیف نہیں ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ یہ محض پروپگنڈہ ہے کہ فقہ حنفی عمل بالحدیث سے بہت دور ہے یا فقہ حنفی کی بنیادیں ضعیف اور منکر روایتوں پر قائم ہیں، اور آج بھی یہ پروپگنڈہ کیا جارہا ہے، اس کے اور بھی اسباب ہوسکتے ہیں مگر شاید اس کا ایک بڑا سبب سطحی مطالعہ اور علم کی کمی ہے، امام ابوحنیفہ نے فلاں مسئلہ میں خطا کی ہے، فلاں فلاں مسائل میں حدیث کو ترک کیا ہے، فلاں فلاں مسائل میں احناف کی پیش کردہ حدیث ضعیف ہے، یہ باتیں آپ دعوی کرتے ہوئے نظر آئیں گے جو حدیث اور علوم حدیث میں مہارت تو دور کی بات شاید علم حدیث کی ابتدائی اصطلاحات سے بھی ماحقہ واقف نہیں ہیں، ان کا مبلغ علم چودہویں صدی کے بعض متعصب علماء کی غیر علمی اور غیر سنجیدہ اردو کتابیں، یا شیخ ناصرالدین البانی اور شیخ ابن باز کی کتابوں سے اردو ترجمے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید کو حرام و شرک سمجھتے ہیں مگر امام اعظم پر ترک حدیث کا الزام لگانے میں ان مذکورہ علماء کی اندھی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بات ختم کرنے سے پہلے اس روایت کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس کو خطیب بغدادی نے ابن کرامۃ سے روایت کیا ہے۔

"ابن كرامة قال كنا عند وكيع يوما، فقال رجل: اخطأ ابو حنيفة، فقال وكيع. كيف يقدر ابو حنيفة يخطى؟ ومعه مثل ابى يوسف، وزفر في قياسهما ومثل يحيىٰ بن ابى زائدة، وحفص بن غياث، وحبان، ومندل في حفظهم الحديث، والقاسم بن معين في معرفة باللغة العربية، وداؤد الطائى، وفضيل بن عياض في زهدهما وورعهما، ومن كان هولاء جلساءه، لم يكد يخطى"(۱۱) ترجمہ:''ابن کرامہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضرت وکیع کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ ایک شخص نے کہا''ابوحنیفہ نے غلطی کی ہے''اس پر حضرت وکیع نے فرمایا: ابوحنیفہ غلطی کیسے کرسکتے ہیں؟ حالانکہ ان کے ساتھ ابو یوسف اور زفر جیسے ماہرین قیاس ہیں، اور یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان، اور مندل جیسے حفاظ حدیث ہیں، ان کے پاس قاسم بن معین جیسے لغت عرب کے جاننے والے ہیں، داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے اصحاب زہد و تقوی ہیں، جس شخص کی مجلس میں بیٹھنے والے یہ حضرات ہوں وہ کیسے غلطی کرسکتا ہے''

مضمون کا اختتام ہم مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اس ایمان افروز ارشاد پر کرنا چاہتے ہیں جو آپ نے اپنی کتاب ''فیوض الحرمین'' میں فرمایا ہے۔شاہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں:''عرفني رسول الله ﷺ ان في المذهب الحنفي طريقة انيقة هي ادق الطرق بالسنة المعروفة التي جمعت ونقحت في زمان البخاري و اصحابي و ذلك ان يوخذ من اقوال الثلاثة قول اقربهم بهافي المسئلة ثم بعد ذلك يتبع اختيارات الفقهاء الحنفيين الذين كانوا من علماء

الحدیث فرب شئی سکت عنه الثلثة فی الاصول وما یعرضوا نفیه ودلت الاحادیث علیه فلیس بد من اثباته والکل مذهب حنفی". (۱۲)(ترجمہ) اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے بتایا کہ مذہب حنفی میں ایک ایسا بہترین طریق ہے جو سنت معروفہ مشہورہ کے طریقوں میں سب سے زیادہ دقیق ہے، وہ سنت معروفہ جس کی جمع وتدوین اور تنقیح امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں ہوئی ہے، اور وہ طریق یہ ہے کہ تینوں اماموں (یعنی امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد) میں سے مسئلہ میں جس کا قول سنت سے زیادہ قریب ہو اختیار کرلیا جائے، اس کے بعد حنفی فقہا میں سے جو اصحاب حدیث ہیں ان کے اختیار کردہ موقف کی اتباع کی جائے، کچھ ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں مذکورہ تینوں اماموں نے اصول میں کچھ نہیں فرمایا، اور نہ ہی ان کی نفی کی ہے، لیکن احادیث ان پر دلالت کررہی ہیں، تو ان کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اور یہ سب مذہب حنفی ہی ہے۔

مراجع

(۱) دیکھئے: تاریخ بغداد ج ۱۳، از صفحہ ۳۲۳ تا ص ۴۵۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت
(۲) عقود الجمان، بحوالہ تانیب الخطیب الکوثری، ص: ۲۴۲، المکتبة الازھریه للتراث، القاھرہ ۱۹۹۸ء
(۳) مرجع سابق
(۴) میزان شریعة الکبری، ج ۱، ص ۸۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت
(۵) مرجع سابق ص: ۸۴، ۸۵
(۶) تانیب الخطیب الکوثری، ص ۲۴۲، المکتبة الازہریہ للتراث، القاہرہ
(۷) اصول سرخسی: ج ۱، ص ۳۶۴، دار الکتاب العربی، بیروت
(۸) تدریب الراوی، امام سیوطی، ج ۱، ص ۱۹۸، مکتبة الریاض الحدیثة، الریاض
(۹) تانیب الخطیب، ص ۲۳۹، المکتبة ازهریه للتراث، القاهرہ ۱۹۹۸ء
(۱۰) مقدمہ ابن صلاح: ص ۱۱۰، دار الفکر المعاصر، بیروت، ۱۳۹۷ھ
(۱۱) النکت علی مقدمة ابن صلاح: ج ۳، ص ۳۷۴، مکتبہ اضواء السلف، الریاض، ۱۹۹۸ء
(۱۲) تاریخ بغداد خطیب بغدادی: ج ۱۳، ص ۲۴۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت
(۱۳) فیوض الحرمین: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ص ۴۸، مطبع احمدی دہلوی، ۱۳۰۸ھ۔ ☆☆☆

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟

جام نور کا زیر نظر خصوصی شمارہ "اجتہاد وتقلید" کے موضوع پر ایک معتدلانہ پیش کش ہے، ہم نے بھرپور کوشش کی ہے کہ یہ شمارہ مسئلہ کی صحیح تعبیر وتشریح کرکے امت کے لیے یسر اور اعتدال کی راہ روشن کرے۔ ہم اپنی اس کوشش میں کتنے کامیاب ہیں، براہ کرم ہمیں ضرور لکھ بھیجیں اور اپنی رائے سے مطلع کریں۔ یہ شمارہ بہت ہی کم وقت میں سامنے آیا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ بعض گوشے تشنہ بھی رہ گئے ہوں، لیکن مجموعی طور پر ہم نے اس بحث کے ہر پہلو کا احاطہ کرلیا ہے۔ اس خصوصی شمارے میں اگر کوئی بات خلاف واقع شائع ہوگئی ہو تو اہل علم اس کی جانب توجہ دلائیں ہم سراپا شکر گزار ہوں گے ....ادارہ

بقیہ شہید ناز کی تربت کہاں ہے؟

خدارا ارباب حکومت اور اصحاب دولت سے کوئی پوچھے کہ یہ نشانیاں آخر کیوں بے نام ونشان ہوئیں؟ کیوں بے نام ونشان ہوئیں یہ نشانیاں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوست کی فراوانی نے عقیدتوں میں افلاس پیدا کردیا ہے۔ شاہراہوں کی کشادگی نے دلوں میں تنگی پیدا کردی ہے۔ عمارتوں کی بلندی نے عقیدتوں میں پستی پیدا کردی ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ مکانات کی اقامت نے ان مکان کی عظمت وتقدس ختم کردی ہے۔ بجلیوں کے رنگین تیز بلب نے محبتوں کی دنیا کو تاریک کردیا ہے، کاروں کی صبار فتاری نے ایمان کے جذبات کو سست کردیا ہے اور وسعت حرم کی مہم نے صاحب حرم کی عظمت ومحبت کو پس پشت ڈال دیا ہے، اگر ایسا ہے تو دنیا کان کھول کر سن لے کہ ان سیہ گنہ گار غلاموں کو پر شکوہ عمارت نہیں، ان کے قدموں سے لگا ہوا کھنڈر چاہیے۔ صاف سڑکیں نہیں ان کے قدموں کی دھول اور خاک رہ گزر چاہیے۔ صفا ومروہ کا سائبان نہیں اسلام کی اولین خاتون کے مزار اقدس کے قبہ پاک کا سایہ چاہیے۔ تیز بلب نہیں سیدہ فاطمہ کی چکی کا ٹکڑا چاہیے۔ کوئی عبد العزیز نہیں ام ہانی کے نام کی عظمت چاہیے۔ خدا کے لیے اپنی تمام مادی آسائش وسہولتیں لے لو ہماری روحانی یادگاریں اور ایمانی نشانیاں دے دو۔

وہ اندھیرا ہی بھلا تھا کہ قدم راہ پہ تھے
روشنی لائی ہے منزل سے بہت دور ہمیں

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی☆

شاہ ولی اللہ اور مسئلہ تقلید

غالب کے میں بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے ایک صدی پہلے پیدا ہو گئے تھے، دراصل اردو ادب میں معروف و متداول اس فقرے کا اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہے کہ ان کا عہد ان کے فکر و فن کی عظمت و بلندی کی معرفت سے قاصر تھا اور ایک صدی بعد والوں کو اس کی قدر و قیمت کا ادراک ہوا۔

اگر یہ بات اسلامیان ہند میں کسی مذہبی شخصیت کے بارے میں کہی جا سکتی ہے تو شاید وہ شخصیت مسند ہندوستان حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۱۶ھ-۱۱۷۶ھ) کی ہے۔ اردو والوں نے غالب کی تعریف و توصیف اور قبولیت و اعتراف کی وہ ساری کمیاں بعد میں پوری کر دیں، جس کے غالب زندگی بھر شاکی رہے، اس طرح ان کا حقیقی عہد آ کر گزر بھی گیا۔ لیکن شاہ ولی اللہ کے عہد کا اب بھی انتظار ہے۔

اسلام و سنت کے نام پر قائم برصغیر کی ہر جماعت ان کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے اور ہر کوئی اپنے فکر و عقیدے کے لیے ان کے اقوال و فرمودات سے دلائل فراہم کرتا ہے، لیکن انہیں پوری طرح سے قبول کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہے، نہ مقلد نہ غیر مقلد، نہ صوفی نہ سلفی، اور نہ سنی نہ غیر سنی، دراصل شاہ صاحب کی تشریح میں جس قسم کی صورت گری کی گئی وہ اتنی ملفق اور غیر واقعی ہے کہ ان کی شخصیت اس شعر کا مصداق ہو گئی۔

مفتی شرع متیں نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

شاہ صاحب کی جانشینی کو لے کر شروع ہی سے دو مشہور جماعتوں میں ایسا جھگڑا پڑا کہ ان کے حقیقی وارثین اپنے حق سے ہی دست بردار ہو گئے اور اپنی کم آگہی کے سبب انہوں نے شاہ صاحب کو انہیں دونوں متحارب فریقین میں سے کسی ایک کا سمجھ لیا اور ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ علاوہ ازیں چونکہ شاہ صاحب ایک مجتہدانہ شان کے عالم تھے، لہٰذا انہوں نے معاصر کورانہ تقلید اور بے روح خانقاہی رسوم کی مخالفت و مذمت کی تھی اس کے سبب بھی ان کے بارے میں ہونے والے بہت سے پروپیگنڈے کو تسلیم کر لیا گیا اور اس طرح شاہ صاحب کے فکر و عمل سے قریب تر جماعت ان کی عظمت و عبقریت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکی، جبکہ ان کی بعض اصلاحی نوعیت کی اور بعض محرف تحریروں کا سہارا لے کر کئی ایسی جماعتوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور آج تک اٹھا رہی ہیں، جنہیں شاہ صاحب کے فکر و مسلک سے دور دور تک کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

فکر ولی اللہی میں تین طرح سے تحریف کی گئی:

۱-جعلی و فرضی کتاب

۲-ان کی معروف تصنیفات میں دسیسہ کاریاں

۳-اور ان کی فکر کی خود ساختہ تعبیرات و توجیہات

شاہ رفیع الدین کے نواسے اور حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کے ایک ناشر سید ظہیر الدین احمد نے دو جعلی کتابوں کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں کتابیں تحفۃ الموحدین اور البلاغ المبین ہیں (۱)

مشہور اہل حدیث مورخ غلام رسول مہر نے بھی شاہ صاحب کی طرف البلاغ المبین کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے (۲) علامہ شبلی نعمانی اور بابائے اردو مولوی عبد الحق نے شاہ صاحب کے نام سے دو کتاب ۱-قرۃ العینین فی ابطال شہادۃ الحسین اور ۲- الجنۃ العالیہ فی مناقب معاویہ'' کو فرضی کتابیں قرار دیا ہے (۳) شاہ صاحب کے نام سے ایک اور جعلی کتاب ملتی ہے جس کا نام ''قول سدید'' ہے (۴) وکیل احمد سکندر پوری نے تو صراحت کی ہے کہ البلاغ المبین ''فلاں'' فرقے کی طرف سے شائع کی گئی ہے (۵)

یہ پانچوں کتابیں ایسی ہیں جن کا تذکرہ نہ شاہ صاحب کی کتابوں میں ملتا ہے، نہ ان کا ذکر ان کے کسی شاگرد و مرید نے کیا ہے اور نہ ہی فقیر محمد جہلمی (۶) سے لے کر پروفیسر یسین مظہر صدیقی (۷) تک ان کے کسی معتبر سوانح نگار نے ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ (۸)

ان فرضی کتابوں سے بھی زیادہ خطرناک جو تحریف ہوئی ہے وہ

☆ Department of Arabic M A N U University,Gachchi Bawli Hyderabad 32(A P)

ان کی معروف کتابوں میں حذف و اضافہ اور تغیر و تبدیل ہے۔ حجۃ اللہ بالغۃ ہو یا **التفہیمات الالٰہیۃ** ان میں متعدد ایسے اجنبی و غریب افکار ملتے ہیں جو شاہ صاحب کی عمومی فکر سے ہم آہنگ نہیں ہیں (۹)

تحریف کی تیسری قسم وہ خود ساختہ تعبیرات و توجیہات ہیں جن کے ذریعے فکر شاہ ولی اللہی کو حسب منشا پیش کیا گیا۔ اس کی بدترین مثال یہ ہے کہ مولانا مسعود عالم ندوی نے شاہ ولی اللہ کو ہندوستان میں شیخ ابن عبد الوہاب نجدی کے مانند قرار دیا ہے (۱۰) عقل حیرت زدہ ہے کہ اس جرأت کو کیا نام دیا جائے، فیوض الحرمین، انفاس العارفین، الدر الثمین، القول الجمیل، الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ اور القول الجلی فی ذکر آثار الولی کے مصنف کا موازنہ صاحب "**کتاب التوحید فیما یجب من حق اللہ علی العبید**" سے کیا جائے اور دلائل الخیرات، حزب البحر، جواہر خمسہ، قصیدہ بردہ اور دعائے سیفی وغیرہ کے عامل، سند یافتہ اور اجازت دہندہ کو اسلامی تاریخ میں تصوف کی سب سے بڑی مخالف تحریک کے بانی کے دوش بدوش کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے (۱۱) لیکن جب حضرت شاہ صاحب کی تصوف کی کتابیں منظر عام پر آئیں اور ان کی تشہیر ہوئی تو یہ ممکن نہیں رہا کہ پہلے کی طرح شاہ صاحب کی حسب منشا صورت گری کی جائے۔ لہذا تاویلات و توجیہات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، اس کی ایک مثال پیش ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے القول الجمیل میں اصحاب کہف کے ناموں کی تاثیر بیان کی ہے کہ "یہ نام پانی میں ڈوبنے، آگ میں جلنے اور چوری ڈکیتی سے محفوظ رہنے کے لیے اکسیر و امان ہے" مولانا سید ابوالحسن ندوی صاحب نے پہلے تو اسے شاہ صاحب کے محدثانہ و مجتہدانہ مقام سے متصادم قرار دیا اور پھر اس کی یہ توجیہ کی کہ "اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کتاب سفر حرمین ۱۱۴۳-۱۱۴۵ھ سے پیشتر کی تصنیف ہے" (۱۲) اور یہ توجیہ قوم میں بہت مقبول ہے اور ہر خورد و کلاں کے نوک زبان پر رہتی ہے، جب بھی شاہ صاحب کی فکر میں کوئی بات خلاف مرضی ملی، اسے حرمین سے قبل کا قرار دے دیا گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر مظہر بقا (۱۳) اور دوسرے کئی مصنفین نے شاہ صاحب کی تصنیفات کی توقیت میں القول الجمیل کو سفر حرمین کے بعد کی تصنیف قرار دیا ہے۔

اور اس طرح ان سہ گانہ تحریفات کے ذریعے حضرت شاہ صاحب کو شیخ ابن تیمیہ اور شیخ ابن عبد الوہاب نجدی کا ہم مسلک بلکہ خود اپنے پوتے شیخ اسماعیل دہلوی کا متبع بنا کر پیش کیا گیا اور انہیں ابن حزم ظاہری، ابن قیم اور شوکانی یمنی جیسے غیر مقلدین کی صف میں کھڑا کر دیا گیا، بلکہ بعض نے تو انہیں ہندوستان میں غیر مقلدیت کا بانی قرار دے دیا حالانکہ یہ ساری باتیں خلاف واقعہ اور بے اصل ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ شاہ صاحب اپنے زمانے میں رائج کورانہ تقلید اور فقہی حداں کو پسند نہیں فرماتے تھے، متاخرین مقلدین کی وضع کردہ تقلیدی شرائط کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور فقہائے محدثین کی طرح بعض مسائل میں اختلاف کو تقلید کے منافی نہیں سمجھتے تھے، ہندوستانی مقلدین کے لیے یہ افکار بالکل نئے تھے، شاہ صاحب کی شخصی اور خاندانی وجاہت کے پیش نظر ان کے خلاف کوئی محاذ تو قائم نہیں ہوا، البتہ مقلدین کی بڑی تعداد نے ان کی طرف سے بے اعتنائی کا رویہ اختیار کر لیا اور بہتوں نے ان کے بارے میں غیر مقلدین کے پروپیگنڈے کو تسلیم کر لیا اور بعض حضرات نے خود کو نمایاں کرنے کے لیے بھی ان کی بلند قامت شخصیت سے صرف نظر اور اعراض کیا اور ان میں خانقاہی و غیر خانقاہی دونوں قسم کے افراد شامل تھے۔

بہر کیف ان تحریفات کے پیش نظر ہر مسئلے میں بالخصوص اجتہاد و تقلید کے باب میں شاہ صاحب کے نظریات کو جاننے کے لیے براہ راست ان کی کتابوں پر اعتماد کرنا چاہیے اور ان کی طرف کسی بھی بات کی نسبت کرنے میں ان کی عمومی فکر کی رعایت کرنی چاہیے۔ یوں تو شاہ صاحب نے اس موضوع پر اپنے افکار کو اپنی بہت سی کتابوں میں ذکر کیا ہے لیکن ان کی تین کتابیں اس ضمن میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ (۲) غایۃ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف (۳) اور عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید۔

یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ بے حد ضروری ہے کہ شاہ صاحب کی تحریروں اور نظریات سے قطع نظر وہ عملی طور پر ایک حنفی مقلد تھے، حرمین شریفین کے سفر سے پہلے بھی عملاً حنفی تھے اور بعد میں بھی حنفی رہے، ان کے تمام فرزندان، خلفا و تلامذہ کا اس بات پر اتفاق ہے۔

الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی کے مولف شیخ محسن تیمی، شیخ عبد الغنی کی ایک سند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ومن لطائف هذا الاسناد انه اجتمع في اوله اربعة، آخرهم ابو عبد العزيز، اشتركوا في أربعة خصال: ذلك أنهم دهلويون سكنى و عمريون صلبة، وأنهم صوفية

اصحاب الزهد والورع، و أنهم حنفيون على مذهب النعمان أبي حنيفة وصاحبيه رضي الله عنهم (۱۵)

''اس سند کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے شروع میں چار لوگ ہیں، جن کے آخری شخص ابو عبد العزیز (یعنی شاہ ولی اللہ) ہیں، یہ چاروں چار صفتوں میں باہم شریک ہیں، یہ سب دہلی کے رہنے والے ہیں اور نسباً فاروقی ہیں اور یہ سب اصحاب زہد وورع صوفی ہیں اور یہ سبھی ابو حنیفہ اور صاحبین رضی اللہ عنہم کے مطابق حنفی المسلک ہیں''۔

مشہور اہل حدیث عالم نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں کہ

ان الشاه ولي الله الدهلوي قد بنى طريقة على عرض المجتهدات على السنة والكتاب وتطبيق الفقهيات بهما في كل باب......... وطريقته هذا كله مذهب حنفي (۱۶)

''شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنا یہ طریقہ بنایا کہ وہ اجتہادی مسائل کو کتاب وسنت پر پیش کرتے تھے اور فقہی مسائل کو ان دونوں سے تطبیق دیتے تھے اور ان کا یہ سارا طریقہ مذہب حنفی ہی ہے''

اب آیئے اخود حضرت شاہ صاحب کی طرف، سب سے پہلے تقلید کی تائید میں ان کے اقوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ شاہ صاحب اپنی کتاب عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید میں باب سوم کا یہ عنوان مقرر کرتے ہیں

تاكيد الأخذ بهذه المذاهب الأربعة والتشديد في تركها والخروج عنها'' ان چاروں مسالک کو اختیار کرنے کی تاکید اور انہیں چھوڑنے اور ان سے باہر نکلنے کی ممانعت''۔

اس باب کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں:

اعلم أن في الأخذ بهذه المذاهب الأربعة مصلحة عظيمة وفي الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة ونحن نبين ذلك بوجوه.........(۱۷)

''جانو کہ ان چاروں مذاہب کو اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور ان سب سے روگردانی کرنے میں بڑی خرابی ہے، جسے ہم چند وجوہ بیان کریں گے۔''

پہلی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ شریعت کو جاننے کے لیے متقدمین پر اعتماد کیا جائے، چنانچہ صحابہ پر تابعین اور ان پر تبع تابعین نے اعتبار کیا، اور اسی طرح علماء نے اپنے سے پہلے کے علما پر بھروسہ کیا، اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کیونکہ شریعت کی معرفت دو طرح سے ہوتی ہے، ایک نقل سے، دوسرے استنباط سے اور نقل کی صحت کے لیے ضروری ہے ہر طبقہ متصلاً اپنے سے پہلے والے طبقے سے لیتا ہے اور استنباط میں بھی قدماء کے طریقوں کی معرفت ضروری ہے تاکہ ان کے اقوال کی مخالفت کر کے اجماع کی مخالفت نہ کرے (۱۸)

ائمہ اربعہ کی تقلید کے ضروری ہونے کی ایک اور وجہ بیان کرتے ہیں کہ:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اتبعوا السواد الأعظم ولما اندرست المذاهب الحقة الاهذه المذاهب كان اتباعها اتباع السواد الأعظم (۱۹)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: سواد اعظم کی پیروی کرو۔ چونکہ ان مذاہب اربعہ کے علاوہ بقیہ حق مذاہب باقی نہیں رہے، لہٰذا انہی کا اتباع ہی سواد اعظم کا اتباع ہے''۔

شاہ صاحب نے ''الحجۃ'' اور ''العقد'' دونوں میں ابن حزم ظاہری کا ایک تفصیلی قول نقل کیا ہے، جس میں تقلید کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے، بعض حضرات ابن حزم کے اس قول کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کر کے ان کی غیر مقلدیت تک ثابت کرنے لگ جاتے ہیں۔ جبکہ شاہ صاحب نے اس قول کا رد کیا ہے اور اس کا مصداق متعین کرنے کی کوشش کی ہے، فرماتے ہیں:

وليس محله فيمن لايدين الابقول النبي صلى الله عليه وسلم ولايعتقد حلا لاالاماأحله الله ورسوله، ولا حراما الا ماحرمه الله ورسوله، ولكن لما لم يكن له علم بما قاله النبي صلى الله عليه وسلم ولا بطريق الجمع بين المختلفات من كلامه ولابطريق الاستنباط من كلامه، اتبع عاملا راشدا على انه مصيب فيما يقول ويفتي'' (۲۰)

''ابن حزم کی بات اس شخص کے بارے میں بے محل ہے جو صرف فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دین سمجھتا ہے اور صرف اللہ و رسول کے بنائے ہوئے حلال وحرام کو حلال وحرام جانتا ہے۔ لیکن چونکہ اسے حضور کے فرمودہ کا علم نہیں، نہ وہ آپ کے مختلف کلاموں میں

جمع و توفیق کی صلاحیت رکھتا ہے، نہ آپ کے کلام سے استنباط کر سکتا ہے، اس لیے وہ کسی صحیح عالم کا اتباع کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے قول اور فتوی میں برحق ہے''۔

وہ عوام کے لیے ائمہ اربعہ کی تقلید کو امت کا اجماعی مسئلہ قرار دیتے ہیں اور تقلید شخصی کے مصالح کا کھل کر اعتراف کرتے ہیں:

''ان هذه المذاهب الأربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الأمة— أو من يعتد به منها— على جواز تقليدها الى يومنا هذا و ذلك من المصالح مالا يخفى لاسيما فى هذه الأيام التى قصرت فيها الهمم جدا و اشربت النفوس الهوى واعجب كل ذى راى برائه'' (۲۱)

''بے شک پوری امت یا اس کی غالب اکثریت نے ان چاروں مدون اور تنقیح شدہ مسالک کی تقلید کے جواز پر آج تک اجماع کر رکھا ہے، اور اس تقلید کی مصلحتیں پوشیدہ نہیں ہیں، خاص کر اس زمانے میں جس میں ہمتیں بہت پست ہو گئی ہیں اور انسانی نفوس خواہشات میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ہر صاحب رائے اپنی رائے میں خوش اور مست ہے''۔

یک مقام پر تو آپ نے تقلید شخصی کو الہامی راز قرار دیا ہے، لکھتے ہیں کہ

''بالجملة فالتمذهب للمجتهدين سرٌّ الهمه الله تعالىٰ العلماء و جمعهم عليه من حيث يشعرون اولايشعرون'' (۲۲)

''مختصر یہ کہ مجتہدین کرام کی تقلید ایسا راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علماء پر الہام فرمایا اور انہیں اس پر جمع کر دیا، خواہ انہیں اس کا شعور ہوا ہو خواہ نہ ہوا ہو''۔

عقد الجید میں امام بغوی سے نقل کیا ہے کہ: ''جو شرائط اجتہاد کا جامع نہیں اسے پیش آمدہ مسائل میں تقلید واجب ہے'' (۲۳) شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں عہد صحابہ سے لے کر مسالک اربعہ کے ظہور تک تقلید کے تسلسل کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''کسی بھی قابل اعتبار شخصیت نے تقلید کا انکار نہیں کیا ہے'' **ولو كان باطلا لا نكروه** '' یعنی اگر تقلید باطل ہوتی تو لوگ ضرور اس پر اعتراض کرتے (۲۴) حضرت شاہ صاحب ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ تقلید ایک ایسا فطری مظہر ہے، جس کے جواز پر صرف امت اسلامیہ ہی کا اتفاق نہیں، بلکہ دنیا کی ساری قومیں اس پر عمل کرتی ہیں، یعنی تقلید ایک فطری تقاضا ہے۔

''قد اتفقت الأمة على صحته قرنا بعد قرن بل الأمم كلها اتفقت على مثله فى شرائعهم'' (۲۵)

''تقلید کے درست ہونے پر ہر زمانے میں امت اسلامیہ کا اتفاق رہا ہے، بلکہ اپنی اپنی شریعت میں ہر قوم تقلید جیسے نظام پر اتفاق کرتی ہے۔''

بعض غیر مقلد حضرات جب شاہ صاحب کی مذکورہ بالا بیان کے مثل دوسری بہت سی عبارتوں سے روبرو ہوتے ہیں تو عموماً سفر حرمین والی تاویل کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ شاہ صاحب کے درجات بلند فرمائے کہ انہوں نے ایک ایسی تحریر چھوڑی ہے جو اس تاویل کو جڑ سے کاٹ دیتی ہے۔ ان کی کتاب فیوض الحرمین کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کی تصنیف سفر حرمین شریفین کے بعد ہوئی، شاہ صاحب اپنی اسی کتاب میں ایک مقام پر فرماتے ہیں ''میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے تین ایسی باتوں سے آگاہ ہوا جن کے بارے میں میں دوسرا خیال رکھتا تھا ... دوسری بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی کہ میں ان چار مذاہب ہی کی تقلید کروں اور ان سے باہر نہ نکلوں'' (۲۶)

اس عبارت سے تو صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب اس سفر کے بعد زیادہ بڑے مقلد ہو گئے تھے۔ لہٰذا انہیں قطب دائرہ، ترجمان حق اور صاحب الزمان ماننے والوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ کم از کم اتنے مقلد ہو جائیں، جتنے شاہ صاحب تھے، تصوف کی ان باتوں سے اتفاق کر لیں جو شاہ صاحب کی کتابوں سے صراحتاً ثابت ہیں اور ان معمولات کو شرک و بدعت کہنے سے باز آ جائیں، جن پر ساری زندگی ان کا عمل رہا ہے یا پھر شاہ صاحب سے دست برداری اختیار کر لیں۔

صرف یہی نہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ صاحب کو مسالک اربعہ کی تقلید کی وصیت کی بلکہ انہیں فقہ حنفی کی ایک امتیازی خصوصیت سے بھی مطلع فرمایا

عرفنى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن فى المذهب الحنفى طريقة أنيقة هى أوفق الطرق بالسنة المعروفة التى جمعت فى زمان البخارى و أصحابه'' (۲۷)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ حنفی مسلک میں ایک ایسا عمدہ طریقہ ہے جو دوسروں کے مقابلے میں اس سنت مشہورہ

کے زیادہ موافق ہے، جس کی جمع وتدوین کا کام امام بخاری اوران کے اصحاب کے عہد میں ہوا"۔

عام ہندوستانی کے بارے میں شاہ صاحب حنفی مسلک کی تقلید کو ضروری اوراسے چھوڑنے کو صراحت کے ساتھ حرام قرار دیتے ہیں بلکہ یہاں حنفیت کے ترک کو ترک اسلام کا مساوی مانتے ہیں:

وجب عليه أن يقلد بمذهب ابي حنيفة و يحرم عليه ان يخرج من مذهبه لأنه حينئذ يخلع من عنقه ربقة الشريعة ويبقى مهملا" (۲۸)

"اس پر واجب ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسلک کی تقلید کرے اوران کے مذہب سے باہر نکلنا اس کے لیے حرام ہے، کیونکہ ایسا کر کے وہ شریعت کی طوق ہی اپنی گردن سے اتار دے گا اور یونہی بے کار رہ جائے گا۔"

آج بہت سے غیر مقلد حضرات بھی اس حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں کہ شاہ صاحب خود کیسے بھی مقلد رہے ہوں، لیکن تھے مقلد ہی اوران کے بزرگوں اوراساتذہ نے ان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ صحیح نہیں تھا، شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام شاہ صاحب پر ہونے والے سمیناروں میں کئی لوگوں نے برملا اعتراف کیا کہ ہمارے بزرگ شاہ صاحب کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھے بعض نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ اگر شاہ صاحب کے یہی معتقدات ومعمولات تھے تو شرک وبدعت کے حوالے سے کسی خاص شخصیت کو ہی ہدف تنقید کیوں بنایا جائے اور بعض نے واقعی جرأت کا اظہار کرتے ہوئے شاہ صاحب سے اپنی براءت کا اعلان تک کر دیا۔

لیکن یہ فکر ولی اللہی کا صرف ایک رخ ہے، جس سے کم از کم اتنا واضح ہے کہ شاہ صاحب عموما مقلد تھے اور عام طور پر مذہب حنفی پر عمل پیرا تھے، اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ان کی تقلید مروجہ تقلید سے قدرے مختلف تھی، یہ اختلاف کتنا تھا، اور کس نوعیت کا تھا، آئندہ سطور میں اس کا جائزہ لیا جائے گا لیکن اس سے پہلے دو اہم باتوں کا ذکر ضروری ہے۔

(۱) شاہ صاحب نے اگر روایتی تقلید سے کہیں اور کسی قدر اختلاف کیا ہے تو اس کا اصطلاحی غیر مقلدیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، انہوں نے اپنی کتابوں میں متعدد مقامات پر فقہائے محدثین اوراصحاب ظواہر یعنی روایتی غیر مقلدین میں فرق کیا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں

"والظاهري من لا يقول بالقياس ولا بآثار الصحابة والتابعين كداؤد وابن حزم" (۲۹)

"ظاہری وہ ہے جو قیاس اور آثار صحابہ وتابعین کا قائل نہیں ہے، جیسے داؤد ظاہری اور ابن حزم۔"

عقد الجيد میں امام بغوی اورامام بیہقی کو بطور فقہائے محدثین ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"وهم غير الظاهرية من أهل الحديث الذين لا يقولون بالقياس ولا الاجماع، وغير المتقدمين من أصحاب الحديث ممن لم يلتفتوا الى اقوال المجتهدين اصلا" (۳۰)

"یہ (فقہائے محدثین) فرقہ ظاہریہ والے اہل حدیث سے الگ ہیں جو نہ قیاس کو مانتے ہیں اور نہ اجماع کو، اور یہ قدیم اصحاب حدیث سے بھی جداگانہ ہیں جنہوں نے مجتہدین کے کلام کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔"

شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات میں متعدد مقام پر فقہائے محدثین کی صحبت اختیار کرنے اوران کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے اور غیر مقلد اہل حدیث سے پرہیز کرنے کو کہا ہے:

"ولا تصحب جهال الصوفية ولا جهال المتعبدين ولا المتقشفة من الفقهاء، ولا الظاهرية من الحديث ولا الغلاة من أصحاب المعقول والكلام بل يكون عالما صوفيا زاهدا في الدنيا، دائم التوجه الى الله منصبغا بالاحوال العلية، راغبا في السنة متبعا لحديث رسول الله صلى الله عليه وسلم وآثار الصحابة، طالبا لشرحها وبيانها من كلام الفقهاء المحققين" (۳۱)

"جاہل صوفیہ، جاہل عبادت گزاروں، متقشف فقہاء، ظاہر پرست اہل حدیث اور غالی قسم کے معقولیوں اور متکلمین کی صحبت اختیار مت کرو، بلکہ ایک صوفی عالم بن کر رہو جو دنیا سے کنارہ کش اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو، بلند احوال میں رنگا ہو، سنت میں رغبت رکھتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار کا پیرو ہو اوران احادیث وآثار کا شرح وبیان محققین فقہاء کے فرمودات کی روشنی میں کرنے والا ہو"۔

التفهيمات الالهية میں اصحاب ظواہر اور غیر مقلدین سے اپنی براءت کا اعلان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

" ولیس منا من ترک ملازمۃ العلماء أعنی الصوفیۃ الذین لھم حظ من الکتاب والسنۃ أو الراسخین فی العلم الذین لھم حظ من الصوفیۃ أو المحدثین الذین لھم حظ من الفقہ، أو الفقھاء الذین لھم حظ من الحدیث، وأما الجھال من الصوفیۃ والجاحدون للتصوف فاولئک قطاع الطرق و لصوص الدین فایاک وایاھم" (۳۲)

"وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے ایسے علماء کی صحبت ترک کردی ہے جو صوفیہ ہیں اور جنہیں کتاب سنت کا معتدبہ علم ہے، یا جو ایسے علمائے راسخین سے کنارہ کش ہو گیا ہو جو تصوف آگاہ ہیں، یا ایسے محدثین کی ہم نشینی چھوڑ دی ہو جنہیں فقہ سے وافر حصہ ملا ہے، یا ایسے فقہا کی رفاقت ترک کردی جو حدیث پر نظر رکھتے ہیں- باقی رہے جاہل صوفیہ اور منکرین تصوف تو دونوں چور اور دین کے رہزن ہیں ان سے بچ کر رہو"-

ان واضح حقائق کی روشنی میں بلا تکلف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شاہ صاحب کی غیر مقلدیت کا پرچار یا شیخ ابن عبدالوہاب اور شیخ اسماعیل دہلوی سے ان کی فکری ہم آہنگی کا پروپگنڈہ ایک علمی خیانت ہے-

شاہ صاحب کے نزدیک عام روش سے تھوڑا الگ ہٹنا انہیں دائرۂ تقلید سے باہر نہیں کرتا ہے، ان کے نزدیک ہر فقہی مسلک کے علمائے محققین کا یہی طریقہ رہا ہے جنہیں اقوال فقہیہ کے قوی وضعیف اصلی والحاقی، راجح ومرجوح کی بصیرت کے ساتھ ساتھ علم حدیث پر قدرت ہوتی تھی، جیسے امام طحاوی، امام ابن ہمام، حافظ حدیث قاسم بن قطلو بغا اور ابن امیر الحاج وغیرہ- یہ وہ حضرات ہیں جو متعدد مسائل میں اپنا خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے، اس کے باوصف حنفی تھے، شاہ صاحب کے نزدیک ہر فقہی مسلک میں ایسے علمائے محققین اور فقہائے محدثین کی ایک طویل فہرست ہے-

قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے اپنے تمام تفردات میں انہی علمائے مقلدین کو سند بنایا ہے اور انہی کے اقوال پر اعتماد کیا ہے اور ان کی رائے میں ان کا طریقہ ہی جمہور مقلدین کا طریقہ ہے اور فقہائے متشددین اقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں- یعنی انہوں نے باب تقلید میں اپنے فکری توسع میں بھی تقلید سے کام لیا ہے- چونکہ ہندوستان میں یہ پہلی آواز تھی لہٰذا مقلدین حضرات کی جانب سے اس کی پذیرائی نہیں ہوئی اور میدان خالی دیکھ کر غیر مقلدین نے انہیں اپنا لیا جو ایک زمانے سے کسی بلند قامت اور گراں قدر ہمنوا و حامی کی تلاش میں تھے اور آسانی کے ساتھ ان کے توسع کو غیر مقلدیت کا نام دے دیا-

(۲) دوسری اہم بات جس کا لحاظ یہاں بے حد ضروری ہے یہ ہے کہ تقلید کی حمایت میں تو شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے اقوال پر پوری طرح سے اعتماد و یقین کیا جاسکتا ہے، لیکن اس باب میں جو ان کا تفرد و توسع ہے یا بلفظ دیگر اجتہاد کے بارے میں ان کے نظریت کو اختیار کرنے میں بڑے حزم و احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کی صحت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے، جب ان کے نام سے پوری پوری کتابیں شائع کی جاسکتی ہیں تو ان کی اپنی تصنیفات کے ساتھ کیا کیا ہوا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، خاص کر اس تناظر میں کہ ان کی "مجتہدانہ" شان رکھنے والی تمام کتابیں شروع سے یعنی مخطوط کے مرحلے ہی سے انہی ہاتھوں میں رہی ہیں جو تقلید کے قائل نہیں تھے یا اس کے بارے میں بے حد نرم و متساہل رویہ رکھتے تھے- انہیں لوگوں نے ان کتابوں کو اولاً شائع کیا اور ان کی تشریح و تعلیق کا کام کیا اور آج تک ان کتابوں کی طباعت و اشاعت انہی لوگوں کے ذریعے ہو رہی ہے-

یہاں یہ عرض کردوں کہ تحریف کا یہ الزام انہی لوگوں تک محدود ہے، جنہوں نے یہ کام کیا ہے اور کوئی پوری جماعت اور پورا گروہ مورد الزام نہیں ہے، لیکن دو باتیں متعین ہیں، اول یہ کہ شاہ صاحب کی کتابوں میں تحریف ہوئی ہے اور دوم یہ کہ اسی نے کی ہے جو تقلید یا تصوف کو پسند نہیں کرتا ہے- لہٰذا شاہ صاحب کے ان اقوال کو لینے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے، جن میں روایتی تقلید کی مخالفت یا اجتہاد کی حمایت ملتی ہے-

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی کتابوں میں تحریفات کی شہرت اور ثبوت کو ذریعہ بنا کر ان کے تمام تفردات و مختارات اور باب تقلید میں ان کے توسع کا مطلق انکار کر دیا جائے، کیوں کہ تقلید میں ان کا توسع، معاصر مقلدین کی عام روش سے ان کی علاحدگی، مذاہب و مسالک کے درمیان جمع و توفیق کی کوشش، عمل بالحدیث اور اوفق بالسنۃ کا اختیار وغیرہ فکر شاہ ولی اللہی کے وہ عناصر ہیں جو تواتر کے ساتھ منقول ہیں اور ہندوستانی تناظر میں ان کے ان تفردات پر ان کی کتابیں ہی نہیں بلکہ ان کی اولاد، ان کے تلامذہ اور مریدوں ان کے سارے تذکرہ نگار متفق ہیں-

اسی طرح یہ قاعدہ بڑی حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے توسعات و تفردات میں جو کچھ مذاہب اربعہ کے ائمہ و علماء

کے اقوال کے دائرے میں ہیں، اس کی نسبت ان کی طرف کی جاسکتی ہے اور جو بات بالاتفاق مذاہب اربعہ کے علما کے خلاف ہو اور کسی بھی فقیہ و مقلد نے اس کا قول نہ کیا تو ایسی بات ضرور محرف اور مدسوس ہوگی۔

حجة الله البالغه اور **غاية الانصاف** میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اسلام میں فقہی اختلاف کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، صحابہ و تابعین کے درمیان کے اختلاف کو بیان کیا ہے اور ان کے اسباب کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر فقہی مذاہب کے ارتقاء اور ان کے مابین ہونے والے اختلافات اور ان کے وجوہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اصحاب رائے اور علمائے حدیث کے درمیان اختلاف کا بھی جائزہ لیا ہے، شاہ صاحب کے مطابق قرون مشہود لہا بالخیر میں تقلید تھی مگر شخصی نہیں تھی، دو صدیوں کے بعد معین مجتہد کی تقلید کا رجحان پیدا ہوا اور دھیرے دھیرے تقلید شخصی کا رواج بڑھتا گیا لیکن چوتھی صدی تک کسی مذہب معین کی تقلید پر عام اتفاق نہیں تھا اور اس عہد تک اجتہاد و تقلید دونوں شانہ بشانہ چل رہے تھے اور شاہ صاحب کے نزدیک یہاں تک قابل قبول تھا۔ (۳۳)

پھر ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ لوگ تقلید پر قانع ہوتے گئے، ان میں نمایاں تین سبب تھے (۱) فقہاء کا مسلسل باہمی جدال حتی کہ صورت حال یہ ہوگئی کہ ہر مفتی (مجتہد) کے فتوے پر مناقشہ ہوتا اور اسے اپنی حقانیت کے لیے متقدمین سے نظیر لانی پڑتی اور اس طرح اجتہاد کا دائرہ غیر شعوری طور پر سمٹتا چلا گیا (۲) تقلید کے انتشار میں دوسرا سبب قاضیوں کا ظلم تھا، چونکہ لوگوں کو ان کی امانت پر بھروسہ کم ہوگیا تھا، لہٰذا ان کے اجتہاد کی ضرورت نہ رہی اور لوگ قدماء کے اقوال پر قناعت کرنے لگے (۳) تیسرا سبب علما کی ناواقفیت اور کم علمی تھی جو تقلید کے رائج ہونے میں معاون ہوئی۔ لوگوں میں توسع کے بجائے تعمق، قیل وقال، مناظرہ اور جدال نے رواج پایا اور دھیرے دھیرے نوبت یاایں جا رسید کہ آج کا فقیہ فضول گو اور منہ پھاڑ پھاڑ کر بات کرنے والا بن گیا ہے، جس نے بلا امتیاز صحت وضعف کے اقوال فقہاء کو حفظ کرلیا ہے اور جھاگ بھرے منہ سے انہیں بیان کرتا رہتا ہے اور آج محدث کا یہ حال ہے کہ صحیح وسقیم ہر قسم کی روایت کا شمار کرتا رہتا ہے اور داستان گو کی طرح انہیں بیان کرتا ہے اور ایسے علماء بہت کم ہیں جو حقیقت میں علم رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اور اس طرح ہر بعد کی صدی پہلی سے بدتر ہوتی گئی، تقلید کا رواج بڑھتا گیا اور لوگوں نے دین کے معاملے میں غور کرنا ہی بند کردیا، خدا ہی سے اس صورت حال کی فریاد ہے۔ (۳۴)

اس طویل اقتباس کے خلاصے سے یہ بات ظاہر ہے کہ شاہ صاحب اپنے دور کے تقلیدی رجحان سے اتفاق نہیں رکھتے تھے اور اجتہاد کے عمل کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

شاہ صاحب نے صاف طور پر لکھا ہے کہ چار قسم کے لوگوں کے لیے تقلید جائز نہیں ہے:

۱۔ وہ شخص جسے اجتہاد کی کسی قدر اہلیت حاصل ہے۔ خواہ کسی ایک مسئلے میں کیوں نہ ہو "**ممن له ضرب من الاجتهاد ولو في مسئلة واحدة**" (۳۵) یعنی شاہ صاحب کے نزدیک جو تمام مسائل میں مجتہد ہو اس کے لیے تمام مسائل میں جو کسی ایک مسئلے میں اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو اسے اس ایک مسئلے میں تقلید کرنا جائز نہیں ہے۔

یہاں ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب اجتہاد میں تجزی کے قائل تھے اور یہ ان کے یہاں موضوع میں توسع کی ایک بڑی وجہ ہے۔ شوکانی یمنی نے امام غزالی، امام رافعی، صفی الدین ہندی وغیرہ کو جزوی اجتہاد کے قائلین میں شمار کیا ہے (۳۶) بعض علماء نے جزوی اجتہاد کا انکار کیا ہے ان کی دلیل ہے کہ اجتہاد کا تعلق ایک یا چند مسئلے سے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ایک ملکہ اور اضافی صلاحیت ہے جس کے ذریعے انسان نصوص کو سمجھنے پر قادر ہوتا ہے اور جہاں نصوص نہ ہوں، وہاں مناط کی تحقیق، تخریج اور تطبیق کر کے استنباط کرتا ہے۔ قدماء میں جزوی اجتہاد کا انکار کرنے والے بہت ہیں، معاصرین میں عبدالوہاب خلاف (م ۱۹۵۶ء) (۳۷) اور شیخ ابوزہرہ (۳۸) جزوی اجتہاد کے جواز کے قائل نہیں ہیں، مؤخر الذکر کے نزدیک اجتہاد و تقلید دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک شخص میں جمع نہیں ہوسکتی ہیں۔

بہر کیف! شاہ صاحب کے نزدیک جو شخص جس قدر اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے اس قدر اس کے لیے تقلید روا نہیں ہے۔ دوسرے شخص کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

۲۔ دوسرا وہ شخص ہے جس پر یہ بات خوب اچھی طرح ظاہر ہو جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں بات کا حکم دیا ہے، یا فلاں بات سے منع کیا اور یہ منسوخ بھی نہیں ہے، بایں طور کہ وہ احادیث اور جانبین کے اقوال میں خوب غور کرچکا ہے لیکن نسخ کو نہیں پایا ہے، یا پھر ماہر علماء کے ایک جم غفیر کو اس قول کی حمایت میں پایا ہے اور اس کی

مخالفت میں اس کے پاس قیاس واستنباط کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۳-تیسرا وہ عامی ہے جو کسی معین فقیہ کی تقلید کرتا ہے اور اپنے امام سے صدور خطا کو محال سمجھتا ہے اور اس کے اقوال میں حق کو محصور جانتا ہے اور اس نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا ہے کہ امام کے خلاف کیسی ہی دلیل کیوں نہ ہو وہ اس کی تقلید نہیں چھوڑے گا۔

شاہ صاحب نے ایسے شخص کو اس حدیث کے مصداق بتایا ہے جسے امام ترمذی نے اپنی جامع کی کتاب التفسیر میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان **واتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابامن دون اللہ**" کے ضمن میں حضرت عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" **انھم لم یکونو ایعبدو نھم ولکنھم کانوا اذا احلوالھم شیئاً استحلوہ، و اذا حرموا علیھم شیئاً حرموہ**"

''وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کی عبادت نہیں کرتے تھے۔لیکن جس چیز کو وہ ان کے لیے حلال کرتے تھے، اسے حلال سمجھتے تھے اور جس چیز کو ان پر حرام کرتے تھے اس کو حرام سمجھتے تھے''۔

۴-چوتھا اور آخری شخص جس کے لیے تقلید جائز نہیں ہے بقول شاہ صاحب وہ ہے جو شخص یہ بات جائز نہ سمجھتا ہو کہ حنفی شافعی سے اور شافعی حنفی سے مسئلہ دریافت کرے یا کوئی حنفی شافعی امام کی اقتدا کرے (۳۹)

شاہ صاحب کی آخری بات عجیب اور نا قابل فہم ہے، کسی کے نزدیک یہ بات غیر مرغوب فیہ تو ہو سکتی ہے لیکن اس کی وجہ سے کسی پر تقلید حرام ہو جائے یہ بات سمجھ سے پرے ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے فقہ کی کتابوں میں مذکور اجتہاد کی سخت اور نا قابل حصول شرائط کا انکار کیا ہے اور اس بات کو بھی گمان فاسد قرار دیا ہے کہ آج کے زمانے میں کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا ہے۔(۴۰)

شاہ صاحب نے مجتہد کے مختلف مراتب اور ان کی تعریفات میں بھی فقہائے احناف سے اختلاف کیا ہے یا اس تقسیم کے التزام کو غیر ضروری سمجھا ہے۔انہوں نے شوافع کے طور پر مجتہدین کی تقسیم کرتے ہوئے مجتہد مطلق کو مجتہد مستقل اور مجتہد منتسب میں تقسیم کیا ہے، مجتہد منتسب احناف میں مجتہد فی المذہب کی طرح ہے۔اس کے بعد مجتہد کے دو درجے مجتہد فی المذہب اور مجتہد فی الفتویٰ کا بیان کیا ہے اور بقول شاہ صاحب یہ سب مرتبہ اجتہاد پر فائز ہوئے ہیں۔(۴۱)

شاہ صاحب اپنی بیشتر کتابوں کے متعدد مقامات پر فقہاء کے ترک حدیث اور محدثین کے فقہ واستنباط سے بے اعتنائی کا شکوی کرتے ہیں اور اسے سخت ناپسندیدہ بتاتے ہیں

"**ان التخریج علی کلام الفقھاء و تتبع لفظ الحدیث لکل منھما اصل اصیل فی الدین ولم یزل المحققون فی کل عصر یاخذون بھما**"

''فقہائے مجتہدین کے کلام پر تخریج اور الفاظ حدیث کی پیروی ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے دین میں مضبوط اصل ہے اور ہر دور میں علماء محققین ان دونوں اصل پر عمل کرتے رہے ہیں''۔

پھر محدث کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسے غلو سے کام نہیں لینا چاہیے اور صرف اپنے بزرگوں کے بتائے ہوئے قواعد کے سبب کسی حدیث یا قیاس کو رد نہیں کرنا چاہیے۔فقیہ کو بھی نصیحت کرتے ہیں انہیں اپنے اکابر کے کلام سے کوئی ایسا مسئلہ مستنبط نہیں کرنا چاہیے جو اس سے مفہوم نہ ہو رہے ہوں اور نہ کسی ثابت شدہ حدیث اور اثر صحابی کو ان قواعد کے سبب نظر انداز کرنا چاہیے، جیسے''حدیث مصراۃ'' کو احناف نے چھوڑ دیا جبکہ اس کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے۔(۴۲)

واضح رہے کہ **حدیث مصراۃ** ایک متفق علیہ روایت ہے اور **مصراۃ** اس بکری کو کہتے ہیں جس کے مالک نے خریدار کو دھوکہ دینے کے لیے اس کا دودھ روک لیا ہو، حدیث میں ہے کہ اس خریدار کو تین دن تک کا اختیار ہے چاہے تو بکری واپس کر دے اور فروخت کنندہ کو ایک صاع کھجور دے دے۔

تقلید کی تعریف کی جاتی ہے: **العمل بقول الغیر من غیر حجة**" (۴۳)" یعنی بغیر دلیل کے کسی کے قول پر عمل کرنے کا نام تقلید ہے"اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دلیل میں مطلق غور ہی نہ کیا جائے اور اس سے سروکار نہ رکھا جائے۔علماء فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اولاً دلیل کا مطالبہ نہ ہو اور نہ عمل دلیل پر موقوف ہو بلکہ صرف حسن ظن کی بنیاد پر امام کی پیروی ہو، اور اگر بعد میں دلیل معلوم ہو جائے یا اسے تلاش کیا جائے تو یہ تقلید کے منافی نہیں ہے ورنہ آج عام آدمی بھی استفتاء کرتا ہے تو مدلل جواب مانگتا ہے اور ہر مسلک والوں کی کتابیں عقلی و نقلی دلائل سے بھری ہوئی ہیں۔

لیکن ایسا لگتا ہے کہ شاہ صاحب "**من غیر حجة**" کے مبدأ سے اصلاً اتفاق نہیں رکھتے ہیں اور وہ ہر ایک کے لیے ہر مرحلے میں حسب

استطاعت دلیل کی تلاش وتتبع کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ آنکھ بند کر کے کسی بھی دلیل کو ماننے سے منع کرتے ہیں اور اپنے اس رویہ کو تمام مسالک کے قدیم وجدید محققین علماء کا طرز عمل قرار دیتے ہیں (۴۴) ان کے نزدیک فتوی دینے کے لیے بھی دلیل کی معرفت ضروری ہے، چنانچہ امام ابو یوسف اور امام زفر وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان حضرات نے فرمایا: "لایحل لأحد ان یفتی بقولنا مالم یعلم من این قلنا" (۴۵) "کسی کو بھی ہمارے قول پر فتوی دینا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ ہم نے کس دلیل سے وہ بات کہی ہے"۔

اگر کسی مقلد عالم کو اپنے مسلک کے خلاف کوئی صحیح حدیث مل جائے تو وہ کیا کرے؟ شاہ صاحب اس کا جواب ابن الصلاح (م: ۶۴۳ھ) کے حوالے سے دیتے ہیں کہ: "قال ابن الصلاح: من وجد من الشافعیة حدیثا یخالف مذهبه: نظر، ان کملت له آلة الاجتهاد مطلقا، او فی ذلک الباب او فی تلک المسئلة، کان له الاستقلال بالعمل به، و ان لم تکمل، وشق علیه مخالفة الحدیث بعد أن بحث فلم یجد جوابا شافیا، فله العمل به ان کان عمل به امام مستقل غیر الشافعی و یکون هذا عذرا له فی ترک مذهب امامه ههنا، وحسنه النووی وقرره" (۴۶)

"ابن الصلاح کہتے ہیں کہ اگر کوئی شافعی اپنے مسلک کے خلاف کوئی حدیث پائے تو غور کرے، اگر اس کے اندر اجتہاد کی صلاحیت ہے، خواہ مطلقا خواہ اس باب میں، خواہ اس مسئلے میں، تو وہ بالاستقلال اس حدیث پر عمل کر سکتا ہے اور اگر وہ قابل اجتہاد نہیں اور حدیث کی مخالفت اسے گراں گزر رہی ہے اور اسے بعد تحقیق مخالفین حدیث (یعنی شوافع) کے پاس کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا ہے تو وہ دیکھے کہ کیا کسی غیر شافعی مجتہد مطلق نے اس پر عمل کیا ہے، اگر کوئی ملے تو اس شخص کو اس امام کے مذہب پر عمل کرنا چاہیے اور اس صورت میں اس کے لیے عذر ہوگا کہ وہ اپنے امام کے مذہب کو چھوڑ دے۔ امام نووی نے ابن الصلاح کی اس بات کو پسند کیا ہے اور برقرار رکھا ہے"۔

یہاں لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ابن الصلاح کا یہ قول ان کی کتاب "ادب المفتی والمستفتی" سے نقل کیا ہے لیکن مذکورہ عبارت سے متصل ہی ابن الصلاح کے اس قول کو نظر انداز کر دیا ہے، ابن الصلاح کہتے ہیں:

"و لیس هذا بهین فلیس کل فقیه یسوغ له ان یستقل بالعمل بما یراه حجة من الحدیث" (۴۷)

"یہ کام آسان نہیں ہے، لہٰذا ہر فقیہ کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بالاستقلال اس حدیث پر عمل کرنے لگے، جسے وہ حجت مانتا ہے"۔

شاہ صاحب کے نزدیک مذاہب کے مابین فروعی مسائل میں اکثر راجح ومرجوح اور افضل وغیر افضل کا اختلاف ہے، خاص کر ان مسائل میں جن میں فریقین کے پاس صحابہ کے اقوال ہیں

"کتکبیرات التشریق و تکبیرات العیدین و نکاح المحرم و تشهد ابن عباس و ابن مسعود و الاخفاء والجهر بالبسملة و بآمین"

"جیسے تکبیرات تشریق اور تکبیرات عیدین، احرام والے کا نکاح، ابن عباس اور ابن مسعود کا تشہد اور بسم اللہ اور آمین میں خفا کیا جائے یا جہر"۔

یہاں شاہ صاحب سے واضح طور پر چوک ہو گئی ہے (بشرط عدم تحریف) کیونکہ محرم کے نکاح میں جواز وعدم جواز کا اختلاف ہے، امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک محرم کا نکاح درست ہے صرف صحبت حرام ہے، جبکہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک مجرد نکاح بھی باطل ہے۔

شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں کہ: مذاہب اربعہ کے درمیان بیشتر اختلاف چونکہ صرف اولیت اور افضلیت کا ہے لہٰذا

"لم یزل العلماء یجوزون فتاوی المفتین فی المسائل الاجتهادیة و یسلمون قضاء القضاة، ویعملون بعض الأحیان بخلاف مذهبهم .... یقول احدهم: هو أحوط، و هذا هو المختار، وهذا أحب الیّ، و یقول: ما بلغنا الا ذلک – وهذا کثیر فی المبسوط و آثار محمد رحمه الله و کلام الشافعی رحمه الله" (۴۸)

"علمائے کرام ہمیشہ اجتہادی مسائل میں سبھی مفتیوں کے فتووں کو قبول کرتے تھے اور سب قاضیوں کے فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے اور کبھی کبھی اپنے مسلک کے خلاف پر بھی عمل کرتے تھے کوئی فقیہ کہتا ہے یہ زیادہ محتاط بات ہے، یہ پسندیدہ ہے، یہ مجھے پسند ہے، کوئی کہتا ہے ہم کو صرف یہی بات معلوم ہوئی – اور یہ (تعبیرات) مبسوط میں، امام محمد

رحمہ اللہ کی کتاب الآثار میں اور امام شافعی کے کلام میں بہت ہیں''۔

شاہ صاحب کے نزدیک متقدمین کے یہاں تو یہی توسع اور فراخ نظری رہی لیکن بعد میں آنے والے اسے قائم نہیں رکھ سکے اور پھر شاہ صاحب خود ہی اس کے ایسے اسباب بیان کرتے ہیں جو معقول بھی ہیں اور مقبول بھی۔

حجۃ اللہ البالغہ میں پرزور اور مدلل انداز میں مسلکی رواداری کی ضرورت کو بیان کیا ہے اور اسے اسلاف کے عمل سے ثابت کیا ہے، جس کی کچھ باتیں تلخیص واختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں۔

''صحابہ کرام، تابعین عظام اور ان کے بعد کے لوگوں میں گہری باہمی رواداری تھی اور مسائل میں اختلاف اس پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے تھے، کوئی نماز میں بسم اللہ پڑھتا تھا تو کوئی نہیں پڑھتا تھا، کوئی زور سے پڑھتا تھا، کوئی آہستہ پڑھتا تھا، کچھ لوگ پچھنے لگانے کو اور نکسیر دتے کو ناقض وضو مانتے تھے، کچھ ایسا نہیں مانتے تھے لیکن ان اختلاف کے باجود سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، ایک بار ہارون رشید نے فصد کرایا اور بغیر نئے وضو کے امامت کی، اس نماز کے مقتدیوں میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ بھی تھے، حالانکہ ان کے نزدیک بدن سے خون نکل کر بہنے سے وضوٹوٹ جاتا ہے، صاحبین عید کی نماز پڑھاتے تھے تو بارہ تکبیر کہتے تھے کیونکہ ہارون رشید عباسی اپنے جد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول پر عمل کرنا چاہتا تھا، فتاوی بزازیہ میں ہے کہ ایک بار امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ایک حمام کے کنویں سے غسل کر کے نماز پڑھا دی بعد میں اس کنویں میں مرا ہوا چوہا پایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم اہل مدینہ (حجاز یعنی شوافع) کے قول پر عمل کر لیتے ہیں کہ جب پانی دو مقہ ہو جائے تو ناپاک نہیں ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ (۴۹)

شاہ صاحب کے نزدیک حنفی فقہ میں اصلی مسائل کے ساتھ ساتھ بہت سے مسائل بعد میں بڑھائے گئے ہیں، یہ مسائل تخریجات و مستزادات ہیں اور ان کے ساتھ ''قال ابو حنیفۃ'' کہنا درست نہیں ہے۔ مثلاً امام اعظم سے بلی کے جوٹھے کی کراہت منقول ہے، جو تحریمی وتنزیہی دونوں کا احتمال رکھتی ہے، امام طحاوی نے گوشت کی حرمت کے پیش نظر اس کے جوٹھے کو مکروہ تحریمی قرار دیا جبکہ امام کرخی نے صرف اس کا خیال کیا کہ بلی ناپاکی سے نہیں بچتی ہے اور اس کے جوٹھے کو مکروہ تنزیہی ٹھہرایا۔ یہ تخریج کی مثال ہے، مستزاد مسائل میں تعلیم قرآن اور اذان واقامت پر اجرت کے جواز کا مسئلہ ہے''۔ (۵۰)

شاہ صاحب نے احناف کے سات ایسے اصول کا ذکر کیا جو ان کی رائے میں غیر منصوص بھی ہیں اور مخدوش بھی ہیں، ذیل میں بطور نمونہ ان میں سے صرف ایک اصل اور اس پر اختصار کے ساتھ شاہ صاحب کا تبصرہ نقل کیا جاتا ہے۔

''حنفی اصول فقہ کا ایک قاعدہ ہے کہ مفہوم شرط ووصف کا قطعی اعتبار نہیں'' لیکن جب یہ حدیث سامنے آئی کہ'' چرنے والے (سائمہ) اونٹوں میں زکاۃ ہے تو اس قاعدے کا برقرار رہنا دشوار ہو گیا کیونکہ اس میں وصف سائمہ بالاتفاق معتبر ہے۔ اس کے لیے جواب دینے میں احناف کو بہت تکلف سے کام لینا پڑا۔ ایسے مستخرج اور غیر اصلی قاعدے کے لیے تکلفات کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے ترک کر کے حدیث پر عمل کرنا چاہیے۔ (۵۱)

یہ مقالہ انتہائی ہجوم کار اور مدیر ماہنامہ جام نور کے بے حد مختصر مدت نوٹس پر تحریر کیا گیا ہے، چنانچہ مواد اور پیش کش دونوں اعتبار سے ناقص ہے، یقین ہے کہ اس میں کئی اہم گوشے چھوٹ گئے ہوں گے اور بعض تشنہ رہ گئے ہوں گے۔ عجلت کے سبب ترتیب میں بھی تقدیم وتاخیر ہو گئی ہوگی، لیکن بایں ہمہ امید ہے کہ یہ کوشش تقلید واجتہاد کے باب میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کو سمجھنے میں کسی حد تک معاون ہوگی۔

حواشی وحوالے

(۱) انفاس العارفین، مطبوعہ احمدی، دہلی، غیر مورخ

سید ظہیر الدین کے اہتمام میں شائع اس کتاب کے آخر میں ''التماس ضروری'' کے عنوان سے ایک اعلان ہے، جس میں خانوادہ ولی اللہ کے بزرگوں کے نام سے شائع جعلی کتابوں کی فہرست ہے، جس میں یہ دونوں کتابیں بھی شامل ہیں۔

(۲) مقدمہ ندر الثمین، محمد اسلم علوی قادری، کتب خانہ علویہ رضویہ، فیصل آباد، بار سوم، ۱۳۸۲ھ

(۳) ان دونوں کتابوں کا ذکر مرزا علی لطف نے اپنی کتاب گلشن ہند میں کیا ہے، جس پر شبلی نعمانی کا حاشیہ اور مولوی عبد الحق کا مقدمہ ہے۔ دیکھئے گلشن ہند، حیدر آباد ۱۹۰۶ء، ۴۴، ۴۵

(۴) شاہ ولی اللہ اور تقلید، محمد علی کاندھلوی، سیالکوٹ غیر مورخ، ۵۳

(۵) وسیلۂ جلیلہ، وکیل احمد سکندر پوری، مطبع یوسفی لکھنؤ غیر مورخ، ۴۳

(۶) حدائق حنفیہ، نولکشور لکھنؤ، ۱۹۰۶ء، ۴۴۷

(۷) الشاہ ولی اللہ، عرض موجز لحیاتہ وفکرہ، یسین مظہر صدیقی، عربی ترجمہ سید علیم اشرف جائسی، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی

علی گڑھ، ۲۰۰۰ء

(۸) بعض غیر مقلدین حضرات نے شاہ صاحب کی سوانح میں ان کتابوں کا حوالہ دیا ہے، مگر اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(۹) دیکھیے راقم السطور کا مقالہ ''شاہ ولی اللہ کی تنقید تصوف اور اس کی حدیں'' مجلہ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، دسمبر ۲۰۰۴ء

(۱۰) دیکھیے ماہنامہ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر ص / ۴۰

(۱۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں پیش لفظ رسائل شاہ ولی اللہ، از سید محمد فاروق قادری، تصوف فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۹ء اور تحقیقات اسلامی کا شائع شدہ راقم کا مقالہ

(۱۲) تاریخ دعوت وعزیمت، ادارہ نشریات اسلام، کراچی، ۵/ ۲۰۸

(۱۳) اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، ڈاکٹر مظہر بقا، ادارہ تحقیقات اسلامی، پاکستان، ۲۸۰

(۱۴) دیکھیے الشاہ ولی اللہ عرض موجز لحیاتہ وفکرہ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی

(۱۵) الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی ص: ۶ بحوالہ ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، شاہ ولی اللہ نمبر ص ۴۰۰

(۱۶) ماہنامہ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، ۳۹۹

(۱۷) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۴، ۳۱

(۱۸) نفس مرجع، نفس صفحہ

(۱۹) نفس مرجع، ۳۳

(۲۰) نفس مرجع، ۳۹، وحجۃ اللہ البالغۃ، دار الکتب الحدیثۃ، قاہرہ، تعلیق سید سابق، غیر مورخ ۱/ ۳۲۸

(۲۱) حجۃ اللہ البالغۃ، ۱/ ۳۲۵

(۲۲) غایۃ الانصاف، مطبوعہ دہلی غیر مورخ، ۶۳

(۲۳) عقد الجید، ۹۰

(۲۴) نفس مرجع، ۳۳

(۲۵) نفس مرجع، ۶۹

(۲۶) غایۃ الانصاف، ۶۴

(۲۷) فیوض الحرمین، مطبع احمدی دہلی، ۱۳۰۷، ۷۰

(۲۸) غایۃ الانصاف، ۷۰، ۷۱

(۲۹) رحمۃ اللہ الواسعہ، ترجمہ وتعلیق حجۃ اللہ البالغہ، سعید احمد پالن پوری، مکتبہ حجاز، دیوبند، بار اول: ۲۰۰۲ء، ۲/ ۳۶

(۳۰) عقد الجید، ۴۴

(۳۱) القول الجمیل، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، لاہور غیر مورخ، ۱۰۷

(۳۲) التفہیمات الالہیہ، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، مطبوعہ ڈھابیل میں "الجاحدون للتصوف" کے بجائے "المجاهدون للتصوف" ہے جو تحریف کا ایک نمونہ ہے۔

(۳۳) رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۷۵

(۳۴) حجۃ اللہ البالغۃ ۱: ۲۹۶، ۳۲۴

(۳۵) حجۃ اللہ بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۸۱

(۳۶) ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من الاصول، الشیخ شوکانی یمنی، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۹۹۹ء ۲: ۳۰۲

(۳۷) علم الاصول، عبد الوہاب خلاف، دار القلم، کویت، ۱۹۷۸ء، ۲۲

(۳۸) اصول الفقہ، شیخ ابو زہرہ، دار الفکر العربی، بیروت، غیر مورخ، ۴۰۰

(۳۹) حجۃ اللہ البالغۃ بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۸۱، ۶۸۲، وعقد الجید، ۳۶-۳۹

(۴۰) عقد الجید، ۶۰، ۶۷، (۴۱) نفس مرجع، ۱۰، ۱۱، ۵۱

(۴۲) حجۃ اللہ البالغۃ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۹۰،

(۴۳) عام کتب الفقہ

(۴۴) حجۃ اللہ البالغۃ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۶۹۶-۶۹۹

(۴۵) حجۃ اللہ البالغۃ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۰۳

(۴۶) حجۃ اللہ البالغۃ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۰۹

(۴۷) ادب المفتی والمستفتی، ۱۱۸، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۰۹

(۴۸) حجۃ اللہ البالغۃ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۱۳، ۷۱۴

(۴۹) حجۃ اللہ البالغۃ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۱۶، ۷۱۷

(۵۰) حجۃ اللہ البالغۃ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۲۴

(۵۱) حجۃ اللہ البالغۃ، بحوالہ رحمۃ اللہ الواسعہ ۲: ۷۳۱

☆☆☆

بقیہ: ائمہ حدیث اور تقلید

(۷) حافظ ابن ابی العوام سعدی حنفی (۸) حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی (۹) حافظ ابو محمد حارثی حنفی (۱۰) حافظ حسین بن اسماعیل مالکی (۱۱) حافظ عبد الباقی حنفی (۱۲) حافظ ابن عبد البر مالکی (۱۳) حافظ ابو بکر رازی جصاص حنفی (۱۴) حافظ ابو الولید باجی مالکی (۱۵) حافظ ابو محمد سمرقندی حنفی (۱۶) حافظ عبد الغنی مقدسی حنبلی (۱۷) حافظ قطب الدین حلبی حنفی (۱۸) حافظ ابو الفرج بن الجوزی حنبلی (۱۹) حافظ علاء الدین ماردینی حنفی (۲۰) حافظ ابن قدامہ حنبلی (۲۱) حافظ جمال الدین زیلعی حنفی (۲۲) حافظ علاء الدین مغلطائی حنفی (۲۳) حافظ بدر الدین عینی حنفی

یہ وہ مشاہیر حفاظ ہیں جن کی حکومت پوری دنیائے علم وفن پر مسلم ہے اور تاریخی شہادت موجود ہے کہ سارے ائمہ مقلد تھے

مولانا کوثر امام قادری☆

ائمہ حدیث اور تقلید

السلسہ قرآن کی مقدس کتاب قرآن عظیم پوری انسانیت کے لیے منارۂ رشد و ہدایت ہے، جس کی توضیح، تشریح، تفصیل و تفہیم کے لیے قدرت مطلق نے اپنے پیارے رسول اللہ علیہ وسلم کو معلم کتاب و حکمت بنا کر مبعوث فرمایا، چونکہ آپ کی حیات مبارکہ کا ایک ایک لمحہ اس صحیفہ بے مثال کی روشن تفسیر تھا، اس لیے آپ کے قول، فعل، تقریر، احوال سب کو اسلامی شریعت کا سرچشمہ تسلیم کیا گیا۔ اس طرح بنیادی طور پر دو چیزیں شریعت اسلامیہ کا ماخذ بن گئیں۔ ایک ''قرآن'' دوسری ''احادیث رسول'' اور جب شریعت نبویہ کو قیامت تک کے لیے غیر متبدل شکل میں باقی رکھنا تھا تو اس کے بنیادی ماخذوں کی حفاظت بھی ضروری ٹھہری، لہٰذا تحفظ قرآن کو رب قدیر نے اپنے ذمۂ کرم کے حوالے کیا اور لوگوں کے دلوں میں اسے یاد رکھنے کا شوق پیدا کر دیا نتیجے میں ہر زمانے میں حفاظ قرآن کی خاصی تعداد دنیا میں موجود رہی اور یہ سلسلہ یوم آخر تک یونہی چلتا رہے گا۔ جبکہ دوسری طرف ایسے افراد منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے جنہوں نے احادیث مشرفہ کو یکجا و یاد رکھنے کا بیڑا اٹھایا، دور دراز سفر کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔ دردر کی خاک چھانی اور احادیث کریمہ کا گراں نقدر ذخیرہ جمع فرما دیا۔

جن لوگوں نے اس میدان کو سر کیا انہیں محدثین کا نام دیا جاتا ہے۔ ان میں بعض وہ ہیں جنہیں اس فن میں درجۂ امامت حاصل تھا، ان کے سینے عظیم لائبریری تھے، ان کی ذہانت و ذکاوت اور قوت حافظہ قدرت الٰہیہ کا نادر کرشمہ تھا، حضرت امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں۔

''امام احمد بن حنبل نے کہا میں نے مسند کو ساڑھے سات لاکھ حدیث سے منتخب کیا ہے۔ امام ابوزرعہ نے کہا: امام احمد کو دس لاکھ احادیث حفظ تھیں، یحییٰ بن معین نے کہا میں نے دس لاکھ احادیث اپنے ہاتھ سے لکھی ہیں۔ امام بخاری نے کہا مجھے ایک لاکھ احادیث صحیحہ اور دو لاکھ احادیث غیر صحیحہ حفظ تھیں، امام مسلم نے کہا میں نے اپنی مسند صحیح کو ان تین لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے، جو میں نے خود سنی تھی، حاکم نے مدخل میں لکھا ہے کہ کسی ایک حافظ حدیث کو پانچ لاکھ احادیث حفظ ہوتی تھیں اور ابوزرعہ کو سات لاکھ احادیث حفظ تھیں ان میں آثار صحابہ اور اقوال تابعین بھی شامل ہیں'' (تدریب الراوی جلد اول ص۵۴)

جس زمانے میں احادیث نبی کو سینوں سے سینوں تک اور قلوب سے سفینوں تک منتقل کرنے کی دھوم مچی ہوئی تھی، حفظ حدیث، روایت حدیث، تخریج کی گہما گہمی تھی، ایک اور طبقہ نئی شان و جدید پہچان کے ساتھ پردہ وجود پر نمودار ہوا اور اس نے مروجہ طریقہ تعلیم یعنی حفظ متون و تحقیق رواۃ پر اکتفا نہ کیا بلکہ حفظ متون کے ساتھ تفہیم حدیث کو بھی مرکز توجہ بنایا۔ استنباط مسائل کا دروازہ کھولا۔ اور جماعت فقہاء کے نام سے مشہور ہوا۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اسے صاحب رائے اور اہل رائے جیسے ناموں سے موسوم کر کے اس کی وقعت گھٹانے کی سعی لاحاصل بھی کی۔

یہاں یہ بات بھی گوشۂ ذہن میں محفوظ رہے کہ طبقۂ فقہاء کا وجود دراصل ایک بہت بڑی ضرورت کی تکمیل تھی، دور اول میں فیض نبوی کی برکت سے صحابہ کے اذہان منور و مجلی تھے اور صحابہ کے وجود سے تابعین کے قلوب مزکی و مطہر تھے اس لیے اس مبارک عہد میں محدثات کا وجود نہ ہو سکا لیکن جب یہ نادر ہستیاں یکے بعد دیگرے اٹھنے لگیں اور اسلامی سرحدوں میں وسعت پیدا ہوئی، اسلام حدود عرب سے نکل کر عجم تک کو اپنی آغوش میں لینے لگا۔ نئی نئی قومیں مسلمان ہوئیں، تو نت نئے مسائل پیدا ہونے لگے، خرافات کا دور آیا، عبادات میں قسم قسم کی غلطیاں اور معاملات میں جدید گوشے پیدا ہوئے تو ایسے ماحول میں ضرورت تھی ایک ایسے گروہ کی جس کا ذہن صرف حفظ متون ہی تک محدود نہ ہو بلکہ حفظ حدیث کے ساتھ تخریج مسائل کی بھی اہلیت سے سرفراز ہو۔

جس طرح قرآن مجید کی آیات کو تجوید کے ساتھ یاد کر لینا ایک الگ چیز ہے اور اس کے مطالب و مفاہیم تک رسائی دوسری شی ہے، اسی طرح احادیث رسول کو بھی بصحت حفظ کر لینا ایک الگ امر ہے اور اس کے مقاصد و معانی کی تہہ تک پہنچ جانا دیگر چیز ہے۔

☆Darul Uloom Quddusia Parsoni Bazar Mahra, Ganj, J P

ہاں! یہ بھی واضح رہے کہ تخریج حدیث وتعین مراتب حدیث کوئی بہت آسان کام نہیں بلکہ یہ بھی لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے، ایک محدث کو تین ایسے دشوار ترین مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جس کے تصور ہی سے آدمی لرز اٹھے، وہ مراحل کچھ اس طرح ہیں۔

پہلی منزل - نقد رجال کہ ان کے مراتب ثقہ وصدوق وحفظ وضبط اور ان کے بارے میں ائمہ شان کے اقوال ووجوہ طعن، مراتب توثیق ومواضع تقدیم جرح وتعدیل وحوامل طعن ومناشئ توثیق ومواضع تحامل وتساہل وتحقیق پر مطلع ہو۔ استخراج مرتبہ اتقان راوی بنقد روایات وضبط مخالفات واوہام وخطیات وغیرہ پر قادر ہو، ان کے اسامی والقاب وکنی وانساب ووجوہ مختلفہ تعبیر رواۃ، اصحاب تدلیس شیوخ وتعین مبہمات، ومتفق ومفترق ومختلف ومؤتلف سے ماہر ہو۔

ان کے موالید ووفیات، وبلدان ورحلات، ولقاء وسماعات واساتذہ وتلامذہ ووجوہ ادا وتدلیس وتسویہ (محدثین) واختلاط وآخذین من قبل وآخذین من بعد وسامعین وحاملین وغیرہا تمام امور ضروریہ کا حال اس پر ظاہر ہو۔ ان سب کے بعد صرف سند حدیث کی نسبت اتنا کہہ سکتا ہے کہ یہ حدیث صحیح یا حسن یا صالح یا ساقط یا باطل یا معضل یا مقطوع یا مرسل یا متصل ہے۔

دوسری منزل: - صحاح وسنن ومسانید وجوامع ومعاجیم واجزاء وغیرہا کتب احادیث میں اس کے طرق مختلفہ والفاظ متنوعہ پر نظر تام کرے کہ حدیث کے تواتر یا شہرت یا فردیت نسبیہ یا غرابت مطلقہ یا شذوذ یا نکارت واختلافات رفع ووقف وقطع ووصل ومزید فی متصل الاسانید واضطربات سند ومتن وغیرہا پر اطلاع پائے نیز اس جمع طرق واحاطہ الفاظ سے رفع ابہام ودفع اوہام وایضاح خفی واظہار مشکل وابانت مجمل وتعیین محتمل ہاتھ آئے۔

تیسری منزل - اب علل خفیہ وغوامض دقیقہ پر نظر کرے، جس پر صدہا سال سے کوئی قادر نہیں، اگر بعد احاطہ وجوہ اعلال تمام علل سے منزہ پائے تو یہ تین منزلیں طے کر کے صرف صحت حدیث بمعنی مصطلح اثر پر حکم لگا سکتا ہے۔

یہ تمام حفاظ حدیث واجلہ نقاد وناد اصلان ذروہ شامخہ اجتہاد کی رسائی صرف اس منزل تک ہے" (الفضل الموہبی ۱۳)

مذکورہ تینوں منازل کا تعلق متن حدیث وتحقیق رواۃ سے ہے نہ کہ تفہیم حدیث واستنباط مسائل سے۔ یہاں یہ شبہ نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ جنھوں نے ان مراحل کو طے کر لیا ان کے اندر ملکۂ اجتہاد بھی پیدا ہو گیا، وہ استخراج مسائل پر قادر اور فقہاء کے فکر وتدبر سے بے نیاز ہو گئے، کیونکہ تاریخ ان کے خلاف شہادت دیتی ہے۔

(۱) محمد بن یزید مستملی نے امام احمد بن حنبل سے ان کے استاذ شیخ عبدالرزاق صاحب مصنف کے متعلق پوچھا " کیا ان کو تفقہ حاصل تھا تو اس کے جواب میں امام صاحب نے فرمایا کہ اصحاب حدیث (محدثین) میں تفقہ کم پایا جاتا ہے (طبقات الحنابلہ جلد اول، ص ۳۲۹)

(۲) امام اسحٰق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ میں عراق میں احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین اور اپنے دوسرے اصحاب کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ ہم احادیث کا مذاکرہ کرتے تھے، کبھی ایک طریق سے کبھی دو طریق سے اور کبھی تین طریق سے اور ان کے درمیان یحییٰ بن معین بول پڑتے کہ فلاں طریق بھی تو ہے، میں کہتا کہ اس کی صحت پر کیا ہمارا اجماع نہیں ہو گیا؟ سب کہتے کہ بیشک۔ میں کہتا کہ اچھا اس حدیث کی مراد اور اس کی تفسیر بتاؤ اور اس سے کیا مسئلہ مستنبط ہوتا ہے؟ یہ سن کر سب خاموش ہو جاتے، صرف احمد بن حنبل بولتے (مناقب الامام احمد بن حنبل مصنفہ امام ابن جوزی ص:۶۳)

(۳) حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اختیار دیا، اس نے اپنے آپ کو اختیار کیا تو کیا مسئلہ ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس کے متعلق اہل علم سے پوچھو۔ (المآثر شمارہ ۲ جلد ۵ ص ۴۶)

(۴) ایک صاحب علم کی بیوی کا انتقال ہوا، وہ یحییٰ بن معین اور زواتی کے پاس آئے کہ ایک میت کو غسل دینے کے لیے ایک حائضہ عورت کے اور کوئی نہیں ملی۔ (انہیں پتہ نہیں تھا کیا کرنا ہے) [illegible] امام احمد بن حنبل تشریف لائے، پوچھا کیا بات ہے؟ بتایا گیا کہ ایک حائضہ عورت کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جو اسے غسل دے سکے، امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ آپ حضرات تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار نے فرمایا یا عائشہ ناولنی الخمرۃ قالت انی حائض فقال ان حیضتک لیست فی یدک۔ اے عائشہ رومال دے دو انہوں نے عرض کیا، میں حیض سے ہوں، فرمایا حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت اسے نہلا

سکتی ہے، اس پر وہ لوگ شرمندہ ہوگئے۔(طبقات الحنابلہ اول ۱۳۱)

(۵) ایک علمی مجلس میں یحییٰ بن معین، زہیر بن حارث، خلف بن صالح اور دیگر اصحاب حدیث مذاکرہ کر رہے تھے، اسی درمیان ایک خاتون نے آکر عرض کیا، حائضہ عورت میت کو غسل دے سکتی ہے؟ یہ سن کر وہ لوگ خاموش ہوگئے اور سوچنے لگے تو حضرت ابو ثور نے فرمایا ہاں غسل دے سکتی ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سرکار اقدس کے زلف مبارک میں کنگھا کرتی تھیں۔ حالانکہ وہ حائضہ ہوتیں تو اس سے معلوم ہوا کہ جب حائضہ عورت زندہ کو چھو سکتی ہے تو وہ مردہ کو بدرجہ اولیٰ چھو سکتی ہے اور غسل دے سکتی ہے۔ یہ سن کر محدثین کہنے لگے کہ یہ حدیث از فلاں از فلاں مروی ہے، اس خاتون نے کہا اب تک تم لوگ کہاں تھے، جب انہوں نے بتا دیا تو اب روایت بیان کرنے لگے(ہدایۃ الموفقین الی الصراط المستقیم ص:۴۷)

(۶) حضرت سلیمان اعمش رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کچھ مسائل پوچھے گئے، اس وقت وہاں امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ موجود تھے، امام اعمش نے ان سے دریافت کیا، امام نے فوراً جواب دیا، امام اعمش نے کہا، آپ نے یہ جواب کہاں سے پیدا کیا، کہا ان حدیثوں سے جو میں نے خود آپ سے ہی سنی اور ان احادیث کو مع سند روایت فرما دیں۔ امام اعمش نے فرمایا

حسبک ماحدثتک به مائة یوم تحدثنی به فی ساعة واحدة ما علمت انک تعمل بهذه الاحادیث یا معشر الفقهاء انتم الاطباء ونحن الصیادلة وانت ایها الرجل اخذت بکلا الطرفین(الفضل الموهبی ص:۱۳)

''بس کیجیے جو حدیثیں میں نے سو دن میں آپ کو سنائیں آپ نے گھڑی بھر میں مجھ کو سنا دی ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ان حدیثوں پر یوں عمل کرتے ہیں اے فقہاء! واتم طبیب ہو اور ہم محدث لوگ عطار ہیں یعنی دوائیں ہمارے پاس ہیں مگر ان کا طریق استعمال تم مجتہدین جانتے ہو۔ اے ابو حنیفہ تم نے تو فقہ وحدیث دونوں کنارے لے لیے''۔

چنانچہ اسی نکتہ کی طرف ذیل کی حدیث میں اشارہ فرمایا گیا:

نضر الله عبدا سمع مقالتی فحفظها و وعاها واداها فرب حامل فقه غیر فقیه ورب حامل فقه الی من هو افقه منه رواه احمد والترمذی ابو داؤد و ابن ماجه (مشکوٰۃ ص:۳۵)

اس بندے کو اللہ تروتازہ رکھے، جس نے میرے ارشاد کو سنا پھر یاد کیا، اور محفوظ رکھا اور دوسرے تک پہنچایا، کتنے فقہ کے حامل ہیں، کتنے فقہ کے حامل سے زیادہ فقیہ وہ ہے جس کو اس نے پہنچایا۔

اب لگے ہاتھوں چوتھی منزل کو بھی دیکھیں:

چوتھی منزل ۔اس کے لیے واجب ہے کہ جمیع لغت عرب وفنون ادب وجوہ تخاطب وطرق تفاہم واقسام نظمہ وصنوف معنی وادراک علل وتنقیح مناط واستخراج جامع وعرفان مانع وموارد تعدیہ ومواضع قصر ودلائل حکم آیات واحادیث واقاویل صحابہ وائمہ فقہ قدیم وحدیث ومواقع تعارض واسباب ترجیح ومناہج توفیق ومدارج دلیل ومعارک تاویل ومسالک تخصیص ومناسک تقلید ومشارع قیود وشوارح مقصود وغیرہ ذالک پر اطلاع تام وتوقف عام ونظر غائر وذہن رفیع وبصیرت منیع رکھتا ہو(الفضل الموہبی ص:۱۳)

ائمہ حدیث وہ ہیں جنہوں نے اول کی تین منزلوں کو حاصل کیا جبکہ فقیہ مجتہد وہ ہوئے جنہوں نے چاروں منازل کو بحسن وخوبی طے کیا، بایں سبب فقیہ، ائمہ حدیث پر فائق ہوگئے اور ائمہ حدیث ان کے اجتہاد سے بے نیاز نہ ہو سکے لاکھوں حدیثیں یاد ہونے کے باوجود عملی زندگی ان ہی فقہاء مجتہدین کے اقوال، فکر وتدبر پر بھروسہ کیا، ان کے استخراج کردہ مسائل ہی کو عملی جامہ پہنانے میں دین ودنیا کی بھلائی محسوس کی گویا کہ انہوں نے محدث ہونے کے باوجود کسی نہ کسی فقیہ کی تقلید ضروری سمجھا۔

تقلید کی تعریف:۔علامہ سید شریف جرجانی فرماتے ہیں التقلید عبارة عن قبول قول الغیر بلا حجة ولا دلیل (التعریفات ص: ۵۷) حجت ودلیل کے بغیر کسی کی بات مان لینا تقلید ہے۔

حاشیہ حسامی میں ہے:

التقلید اتباع الرجل غیره فیما سمعه یقول او فی فعله علی زعم انه محقق بلا نظر فی الدلیل۔ ''کسی شخص کا اپنے غیر کی اطاعت کرنا اس میں جو اس کو کہتے ہوئے سن لے یا کرتے ہوئے دیکھ لے یہ سمجھ کر کہ وہ اہل تحقیق میں سے ہے، بغیر دلیل میں نظر کیے ہوئے''(حاشیہ حسامی باب متابعت رسول ص:۸۶)

تقلید قرآن وسنت میں:۔واذاجاء هم امر من الامن اوالخوف اذاعوا به ولو ردوه الی الرسول والی اولی

الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم (النساء ص: ۸۳) اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا معاملہ آتا ہے تو اسے مشہور کردیتے ہیں اگر پیغمبر خدا یا اپنے سے اولی الامر کے پاس لے جاتے تو جو ان میں اہل استنباط ہیں اسے اچھی طرح جان لیتے۔

آیت مذکورہ میں اہل استنباط کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو اہل استنباط بتائیں کہ اس پر عمل کرنا ہوگا تو ان کی باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہی تقلید ہے۔

عن ابی حذيفة رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اقتدوا باالذين من بعدى ابى بكر و عمر۔ (ترمذی جلد دوم ص:۳۰۷) حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان دونوں کی اقتدا کرو جو میرے بعد ہوں، یعنی ابوبکر و عمر کی۔

تقلید کے وجوب پر متعدد آیات و احادیث پیش کی جاسکتی ہیں بر دست اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ لیکن دو غیر مقلد عالموں کا قول بھی نقل کردوں تو مناسب موقع ہوگا۔

غیر مقلد عالم نواب وحید الزماں حیدرآبادی فرماتے ہیں:

لا بد للعامى من تقليد مجتهد او مفت (نزل الابرار جلد اول ص: ۷) عوام کے لیے کسی مجتہد یا مفتی کی تقلید ضروری ہے۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی لکھتے ہیں:

و وجب على العامى تقليده و الاخذ بفتواه (لقطۃ العجلان ص:۱۲۷ ماخوذ مسلک غیر مقلدین ص:۲۲) عوام پر واجب ہے کہ مجتہد کی تقلید کریں اور ان کے فتوی پر عمل کریں۔

اب ہم تاریخی حقائق پیش کریں گے تا کہ معلوم ہو جائے کہ ائمہ حدیث نے کسی فقیہ کی تقلید کی ہے یا نہیں شاید اس سے ان لوگوں کو اپنے فکر و خیال پر نظر ثانی کا موقع مل سکے، جن کا عقیدہ ہے کہ تقلید ایک باطل چیز ہے، جسے اکابر علماء و ائمہ حدیث نے مخدوش تصور کیا ہے۔

(۱) امام بخاری: ۔حضرت امام قسطلانی تاج الدین سبکی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وقد ذكره ابو عاصم فى طبقات اصحابنا الشافعية۔ (ارشاد الساری اول ص ۳۶) ''ابو عاصم نے بخاری کو ہمارے طبقات شافعیہ میں بیان کیا ہے۔''

اور تاج الدین سبکی لکھتے ہیں:

وسمع بمكة عن الحميدى وعليه تفقه عن الشافعى۔ (طبقات شافعیہ کبری دوم ص:۳)

یعنی امام بخاری نے مکہ میں حمیدی سے سماع کیا اور ان ہی سے فقہ شافعی پڑھی۔

نواب صدیق حسن خاں غیر مقلد بھوپالی لکھتے ہیں

ولنذكر بعد ذالک نبذا من ائمة الشافعية ليكون الكتاب كامل الطرفين حائز الشرفين و هؤلاء صنفان احدهما من تشرف بصحبته الامام الشافعى الاخر من تلاهم من الائمة اما الاول فمنهم احمد الخلال ابو جعفر البعدادى و اما الصنف الثانى فمنهم محمد بن ادريس ابو حاتم رازى، محمد بن اسماعيل و محمد بن على الحكيم الترمذى۔ (ابجد العلوم ص:۸۱۱)

اور ہمیں چاہیے کہ اب کچھ ائمہ شافعیہ کا تذکرہ کریں تا کہ ہماری کتب حنفی اور شافعی دونوں کتابوں کی جامع ہو جائے اور ائمہ شافعیہ دو قسموں پر ہیں ایک وہ جو امام شافعی کی صحبت سے مشرف ہوئے جیسے احمد خلال، اور ابو جعفر بغدادی دوسری قسم کے ائمہ شافعیہ یہ ہیں محمد بن ادریس رازی محمد بن اسماعیل بخاری اور حکیم ترمذی۔

(۲) امام مسلم: ۔حضرت امام مسلم صاحب الجامع الصحیح بھی مقلد تھے چنانچہ مولانا محمد حنیف گنگوہی لکھتے ہیں۔

''نواب صدیق حسن خاں غیر مقلد نے انہیں شافعی شمار کیا ہے، صاحب کشف فرماتے ہیں الجامع الصحيح الامام المسلم الشافعى'' (احوال المصنفین ص:۱۱۸)

(۳) امام ابوداؤد: ۔صاحب سنن ابی داؤد کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں:

تاریخ ابن خلکان میں مذکور ہے کہ شیخ ابواسحاق شیرازی نے ان کو طبقات الفقہاء میں امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں شمار کیا ہے، حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے بھی علامہ ابن تیمیہ کے حوالے سے ان کو حنبلی فرمایا ہے (مرجع سابق ص:۱۲۶)

(۴) امام ابن ماجہ: ۔مولانا محمد حنیف لکھتے ہیں

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک امام احمد بن

حنبل کے مسلک کی طرف میلان تھا (مرجع سابق ص: ۱۴۰)

(۵) امام نسائی: -حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کے نزدیک آپ شافعی المذہب تھے جیسا کہ آپ کے مناسک سے پتہ چلتا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں نے بھی شاہ صاحب کی تائید کرتے ہوئے امام نسائی کو شوافع میں شمار کیا ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک بھی ان کا انتساب مسلک شافعی کی جانب مناسب ہے (مرجع سابق ص: ۱۵۴)

(۶) امام طحاوی: -حضرت امام طحاوی پرانی راہ مسلک شافعی کو خیر آباد کہتے ہوئے نئی راہ مسلک حنفی پر گامزن ہو گئے (مرجع سابق ص: ۱۶۲)

(۷) صاحب مصابیح -محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی صاحب مصابیح کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں: ''آپ اپنے زمانے کے مشہور محدث ومفسر اور بلند پایہ قراء میں سے ہیں، فقہ میں قاضی حسین بن محمد کے شاگرد ہیں اور صاحب تعلیقہ اور اجل شوافع میں سے ہیں'' (مرجع سابق ص: ۱۷۰)

ابو عمرو تقی الدین ابن صلاح شہرزوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کے والد صلاح الدین بڑے جلیل القدر عالم اور نہایت متبحر فقیہ تھے، اس لیے ابن صلاح نے ابتداء میں اپنے والد محترم سے علم فقہ حاصل کیا اور تھوڑی ہی مدت میں علم فقہ میں ایسا رسوخ حاصل کر لیا کہ فقہ شافعی کی کتاب المہذب کا درس دینے اور تکرار کرنے لگے'' (مرجع سابق ص: ۱۷۳)

(۹) صاحب مسند حمیدی: -ابو بکر عبد اللہ بن زبیر حمیدی صاحب مسند حمیدی امام بخاری کے شیوخ میں سے ہیں اور سفیان بن عیینہ کے شاگرد ہیں، کبار اصحاب شافعی میں شمار ہوتے ہیں۔ (قرۃ العیون ۷۱)

(۱۰) صاحب صحیح ابن عوانہ -صاحب صحیح ابن عوانہ شافعی المذہب تھے، اسفرائین میں شافعی مذہب کی ابتداء ان ہی سے ہوئی (قرۃ العیون ص ۷۴)

(۱۱) امام دار قطنی: -ابو الحسن علی بن عمر دار قطنی شافعی المذہب تھے (مرجع سابق ص: ۷۴)

(۱۲) صاحب سنن بیہقی -آپ بھی شافعی المذہب تھے، ان کی تصنیف معرفۃ الشافعی بالسنن والآثار سے واضح ہے، شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں کہ امام الحرمین نے احمد بیہقی کے بارے میں فرمایا کہ دنیا میں بیہقی کے سوا اور کسی کا امام شافعی پر احسان اتنا نہیں جتنا کہ ان کا ہے۔ مرجع سابق ص: ۸۵)

(۱۳) وکیع بن الجراح -وکیع بن جراح کی حیثیت و مقام فن حدیث کی دنیا میں محتاج بیان نہیں، فوائد بہیہ میں ہے۔

عن ابن معين ما رأيت افضل من وكيع قيل ولا ابن المبارك قال قد كان لا بن المبارك فضل ولكن ما رأيت افضل من وكيع كان يستقبل القبله و يحفظ حديثه و يقوم الليل ويفتى بقول ابى حنيفه (الفوائد البهيه فى تراجم الحنفيه ص: ۹۲)

امام ابن معین نے کہا میں نے وکیع سے افضل کوئی شخص نہیں دیکھا، کسی نے پوچھا ابن مبارک بھی نہیں؟ جواب دیا ابن مبارک کی اپنی فضیلت ہے لیکن میں نے وکیع سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں دیکھا وہ ہمیشہ قبلہ رخ بیٹھتے تھے، احادیث یاد کرتے تھے، قائم اللیل تھے، ہمیشہ امام ابو حنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔

(۱۴) یحییٰ بن سعید القطان -یہ فن جرح و تعدیل کے امام اور زبردست محدث ہیں مگر یہ بھی امام اعظم کے مطابق فتویٰ دیتے تھے، تذکرۃ الحفاظ میں ہے:

وكان يحيىٰ بن سعيد القطان يفتى بقول ابى حنيفه (مرجع سابق ص: ۹۳) (تذکرۃ الحفاظ اول ص: ۳۰۷)

''یحییٰ بن سعید القطان بھی امام اعظم کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔''

اس طرح سیرت و سوانح کی کتابوں میں مطالعہ کیا جائے تو کثیر محدثین و حفاظ حدیث کسی نہ کسی امام کی تقلید کرتے نظر آئیں گے، کوئی فقہ حنفی سے وابستہ ہے تو کوئی مسلک شافعی سے کوئی حنبلی مذہب سے کوئی مالکی فقہ کا مقلد ہے۔ یہاں اجمالاً چند ائمہ حدیث کے اسماء درج کرنے پر اکتفا کروں گا۔

مشاہیر حفاظ حدیث: -(۱) حافظ ابو بشر دولابی حنفی (۲) حافظ عز الدین بن سلام شافعی (۳) حافظ اسحٰق بن راہویہ حنفی (۴) حافظ ابن دقیق العید شافعی (۵) حافظ ابو جعفر طحاوی حنفی (۶) حافظ شمس الدین شافعی

———— بقیہ: صفحہ ۱۸۹ پر ملاحظہ کریں

مولانا رفعت رضا نوری☆

علمائے تفسیر اور تقلید

تاریخی طور پر تقلید کا باضابطہ آغاز ٹھیک اسی زمانے میں ہوا جس میں مذاہب فقہ کی تدوین ہوئی اور اکابر فقہا کے اتباع سے اس کا ظہور ہوا، کیوں کہ ہر شخص کے اندر یہ اہلیت وقابلیت نہیں تھی کہ مسائل شرعیہ اور احکام دینیہ کو اس کے اصل ماخذ سے استنباط کر سکے۔ اس لیے عام لوگوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ اکابر فقہا اور ائمہ اجتہاد کی پیروی کریں۔ تیسری صدی میں اس میں مزید وسعت آئی اور وقت کے بڑے بڑے نامور اصحاب علم وفضل نے ائمہ کی تقلید کی۔ جب کہ ان میں بعض علمائے راسخین تھے جو خود قرآن وحدیث پر گہری بصیرت اور دقیق نظر رکھتے تھے اور مذاہب اربعہ کے دلائل سے بھی واقف تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ کس دلیل کی بنا پر ایک امام کا قول دوسرے امام کے قول پر راجح ہے گویا وہ مقلد محض نہیں تھے۔ مگر پھر بھی احکام شرعیہ میں امام کی رائے کی موافقت کرتے تھے۔ اس سے ائمہ کے مذاہب کو زیادہ تقویت ملی کہ بڑے بڑے علمائے راسخین نے ان ائمہ کی اصابت رائے اور فکر کی پختگی پر مہر تصدیق ثبت کی اور دوسری طرف علمائے راسخین کی بھی عظمت بڑھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہمہ دانی کے باوجود مقلد ہی گردانا۔ تیسری صدی کے اواخر میں اس بات پر اجماع منعقد ہو گیا کہ عام آدمی کے لیے ائمہ اربعہ کی تقلید کرنا واجب ہے کیوں کہ واقعات سے ثابت ہو گیا کہ قرون اولی کے فقہا میں جو دقت نظر، باریک بینی، علم میں وسعت، گہرائی اور گیرائی پائی جاتی تھی وہ بعد کے فقہا میں نہیں پائی اور احکام شرعیہ کو اصل ماخذ سے بذات خود استنباط کرنے کا ملکہ اور مہارت اور ایسی فقہی بصیرت جس میں فقیہہ استنباط اور اجتہاد کے اصول وضع کرتا ہے متاخرین کے حصے میں نہیں آئی تو اہل علم اس پر متفق ہو گئے کہ اب ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرنا ضروری ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش کرنا فائدے سے خالی نہیں ہوگا کہ ہر چند کہ "ظاہریہ (سلفیہ، غیر مقلدین یا اہل حدیث) اپنے آپ کو تقلید سے آزاد اور اصحاب حجت کہتے ہیں لیکن نواب صدیق حسن بھوپالی نے لکھا ہے کہ داؤد بن علی ظاہری فرقہ ظاہریہ کا امام ہے۔ لہٰذا وہ بھی ان کی آرا کے مقلد ہیں۔ شیعہ حضرات بھی تقلید کے قائل ہیں لیکن وہ زندہ مجتہد کی تقلید کے قائل ہیں، حاصل یہ کہ زندہ لوگوں میں کوئی ایسا طبقہ نہیں جو تقلید سے آزاد ہے"۔

(بحوالہ شرح صحیح مسلم از مولانا غلام رسول سعیدی ۳ ۳۳۰)

جس زمانے میں مذاہب فقہ کی تدوین ہوئی اسی دور میں تفسیر قرآن بھی مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے اپنے دور تدوین میں داخل ہو چکی تھی، اسی دور میں جہاں نامور فقہا پیدا ہوئے وہیں مفسرین نے بھی قرآن کریم سے فقہی احکام کا استنباط کرنے کے لیے فقہی اصول، ضوابط کو تفسیر قرآن کے ساتھ ملایا۔ اس دور میں اہل سنت کے مفسرین نے علوم عقلیہ، علوم ادبیہ، علوم کلامیہ اور علوم فقہیہ سے متعلق متعدد تفسیریں تحریر کیں۔ تاریخی طور پر اس عصر تدوین میں تفسیر بالماثور کی کتابیں زیادہ دستیاب ہیں جو مفسرین نے صرف فقہی فروعات اور اس کے دلائل پر مشتمل تفسیریں بھی مرتب کیں مثلاً ابوبکر جصاص حنفی جبکہ مفسرین نے تاریخی واقعات واخبار پر مشتمل تفسیریں لکھیں مثلاً امام ثعلبی اور امام خازن وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ جس امام کو جس فن سے یا مذہب ومسلک سے زیادہ دلچسپی اور اس پر مہارت تھی تفسیر قرآن میں اسی علم سے متعلق نکتہ آفرینی کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی مگر تمام مفسرین میں یہ بات قدر مشترک رہی کہ انہوں نے اپنے دلچسپ فن کے علاوہ دوسرے فنون کو تفسیر میں جگہ دی ہے۔ یہ بات عرض کرنے سے جب عصر تدوین سے لے دور حاضر تک کہ مفسرین کے طبقات پر نظر کی جاتی ہے تو تاریخی ماخذ ومراجع سے پتہ چلتا ہے کہ سوائے ابن جریر طبری کے علاوہ اہل سنت سواد اعظم سے تعلق رکھنے والے تمام مفسرین ائمہ اربعہ کے پیروکار تھے۔ کسی نے اپنے آپ کو تقلید سے آزاد نہیں گردانا۔

ذیل میں علمائے تفسیر کی ایک مختصر فہرست درج کی جا رہی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تقلید شخصی پر امت کے ساتھ ہی مفسرین کا عظیم گروہ بھی شامل تھا۔ اس فہرست میں انہیں چند مفسرین کے اسمائے گرامی درج ہیں، جنہوں نے تفسیر میں نمایاں خدمات انجام دی

☆ G-9/1,Muradi Road Batla House Okhla New Delhi

ہیں- ساتھ ہی یہ خیال بھی رہے کہ مندرجہ ذیل مفسرین کے اسما کے ساتھ حنبلی، شافعی، مالکی اور حنفی کی صراحت تراجم وطبقات اور کتب تاریخ وسیر کی ان کتب میں موجود ہے جو اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیات کی سوانح میں مستند ماخذ ومراجع کی حیثیت رکھتی ہیں- جس سے ہمیں یہ ثبوت ملتا ہے کہ وہ عملی طور پر مقلد تھے، کیوں کہ اگر وہ کسی امام کے مقلد نہ ہوتے تو تاریخی ماخذ میں یہ صراحت نہیں ملتی- فہرست درج ذیل ہے:-

اسمائے علمائے تفاسیر وحوالہ جات

۱- ابو للیث نصر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی حنفی (م ۳۷۵ھ)- طبقات المفسرین از داؤودی- کشف الظنون

۲- ابو اسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی نیساپوری شافعی (م ۴۲۷ھ)- معجم الادبا- وفیات الاعیان- شذرات الذھب

۳- ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی شافعی (م ۵۱۰ھ)- طبقات المفسرین از سیوطی- وفیات الاعیان لابن خلکان- طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی-

۴- ابو محمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی غرناطی مالکی (م ۵۴۲ھ)- الدیباج المذہب لابن فرحون- الاعلام للزرکلی- بغیۃ الوعاۃ لسیوطی-

۵- عمادالدین ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بصری شافعی (م ۷۷۴ھ) - طبقات المفسرین از داؤودی- الدرر الکامنۃ- شذرات الذھب

۶- ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد بن مخلوف ثعالبی جزائری مالکی (م ۸۷۵ھ)- الضوء اللامع- نیل الابتھاج-

۷- جلال الدین ابوالفضل عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی (م ۹۱۱ھ) شذرات الذھب- الاعلام للزرکلی-

۸- ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن عمر بن محمد بیضاوی (م ۶۹۱ھ یا ۶۸۵ھ ۱۲۸۶ء)- شذرات الذھب- طبقات المفسرین طبقات الشافعیہ- کشف الظنون-

۹- ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی حنفی (م ۷۰۱ھ)- الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ- الفوائد البھیۃ فی تراجم الحنفیۃ- الاعلام للزرکلی

۱۰- علاءالدین ابوالحسن علی بن محمد بن ابراہیم خازن شافعی (م ۷۴۱ھ) الدرر الکامنۃ، طبقات المفسرین از داؤودی، شذرات الذھب-

۱۱- شہاب الدین ابوالثنا سید محمود آفندی شافعی آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) الاعلام للزرکلی- التفسیر والمفسرون از محمد حسین ذہبی-

۱۲- محمد بن محمد بن مصطفیٰ ابوالسعود دعمادی حنفی (م ۹۸۲ھ) الفوائد البھیۃ، العقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم-

۱۳- ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی (م ۳۷۰ھ)- الجواہر المضیۃ، الفوائد البھیۃ- شرح الازہار-

۱۴- ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محمد معافری اشبیلی مالکی (م ۵۴۳ھ) الدیباج المذہب- التفسیر والمفسرون- الاعلام للزرکلی

۱۵- ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی اندلسی مالکی (م ۶۷۱ھ ۱۲۷۳ء) - الدیباج المذہب- مقدمہ احکام القرآن- الاعلام للزرکلی-

۱۶- ابوالحسن علی بن محمد بن علی طبری شافعی (م ۵۰۴ھ)- البدایۃ والنھایۃ لابن کثیر- وفیات الاعیان لابن خلکان-

۱۷- قاضی ثناءاللہ پانی پتی حنفی (م ۱۲۲۵ھ- ۱۸۱۰ء)- تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی- الاعلام از عبدالحی لکھنوی- اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، حیدرآباد-

۱۸- احمد بن ابوسعید معروف بہ ملاجیون حنفی- تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی الاعلام از عبدالحی لکھنوی- اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، حیدرآباد-

۱۹- شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ دہلوی حنفی- تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی- الاعلام از عبدالحی لکھنوی- اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، حیدرآباد-

ہم نے اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان مشاہیر مفسرین کا ذکر کیا ہے جو اپنے اپنے وقت میں مسلمہ حیثیت کے مالک تھے اور جن کی ثقاہت آج تک اہل علم کے نزدیک مسلم ہے، اگر عالم اسلام کے تمام ائمہ مفسرین کے اسا جمع کیے جائیں تو ضخیم دفتر بن جائے گا جس کا یہ محل نہیں۔

تقلید کے سلسلے میں علمائے تفسیر کا نظریہ:- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" (النحل/۴۳) "جس چیز کو تم نہیں جانتے ہو جاننے والوں سے اس کی دریافت کرو" اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام جو مسائل شرعیہ اور احکام دینیہ کو بذات خود معلوم نہیں کر سکتے ان پر ضروری ہے کہ اہل علم یعنی اہل اجتہاد سے دریافت کریں کیوں کہ ائمہ مجتہدین ہی براہ راست تمام احکام شرعیہ اصل مرجع سے حاصل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور یہی تقلید ہے-

علامہ جلال الدین سیوطی، علامہ جلال الدین محلی اور علامہ

آلوسی کا نظریہ:- علامہ سید محمود آلوسی اس آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں- علامہ جلال الدین سیوطی نے الاکلیل میں اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عام آدمی کے لیے مسائل فرعیہ میں مجتہد کی تقلید ضروری ہے- آلوسی کے نزدیک فروع کی قید محل نظر ہے چنانچہ اس میں عموم پیدا کرنے کے لیے اگلی سطر میں علامہ جلال الدین محلی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غیر مجتہد خواہ وہ عام آدمی یا نہ ہو مندرجہ بالا آیت کے سبب مجتہد کی تقلید ضروری ہے خواہ مجتہد باحیات ہوں یا انتقال کر گئے ہوں۔ یونہی دریافت شدہ مسائل اعتقادی ہوں یا نہ ہوں" خود علامہ آلوسی کا بھی یہی نظریہ ہے کیوں کہ اس بحث کی آخری سطر میں ان کی فیصلہ کن بات شاہد عدل ہے-(روح المعانی از آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) ۳۸۷/۷- دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان طبع دوم ۲۰۰۵ء،۱۴۲۶ھ)

ایک بے غبار عبارت کی غلط تشریح - ہندوستان کے غالی غیر مقلدین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی صاحب تفسیر فتح العزیز کی ایک تفسیری تحریر جو آیت کریمہ "فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون" کے ذیل میں درج ہے اس کو تقلید کے خلاف بڑے طمطراق کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور سادہ لوح عوام کی آنکھوں میں بڑی چابک دستی سے دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں- جب کہ شاہ صاحب کی تحریر سے غیر مقلدین کو ذرا بھی فائدہ نہیں مل رہا ہے بلکہ وہ تحریر آج تک خود انہیں کے گلے کی ہڈی بنی ہوئی ہے- دراصل اپنی تحریر میں شاہ صاحب نے یہ فکر دینے کی کوشش کی ہے کہ اطاعت بالاستقلال اللہ ہی کو زیبا ہے۔ جو کسی دوسرے کو احکام کی تبلیغ میں اطاعت بالاستقلال کے لائق گردانے اور اللہ کی مخالفت کے باوجود غیر اللہ کی تقلید کا پٹہ اپنی گردن میں ڈالے رہے (جیسا کہ یہودی عوام علمائے یہود کی تقلید کرتے تھے) تو یہ بھی اتخاذ انداد (خدا بنانے) کی قبیل سے ہے (جو ناجائز وحرام ہے) بلا شبہ ایسی اطاعت کفر کی دہلیز تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ صرف شاہ صاحب ہی نہیں بلکہ امت کا سواد اعظم کہہ رہا ہے کیوں کہ اس بات پر ائمہ امت کا اجماع ہے کہ اصل اطاعت واتباع اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور امام صرف مبلغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اہل علم پر واجب ہے کہ جب انہیں کوئی آیت یا کوئی حدیث سند صحیح سے مل جائے جو ان کے کسی امام کے قول کے خلاف تو امام کے قول کو چھوڑ کر قرآن وحدیث پر عمل کریں۔ لیکن ایسی صورت میں وہ خارق تقلید نہیں ہوگا کیوں کہ یہ بات صحیح سند سے ثابت ہے کہ جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی ائمہ کا مذہب ہے- امام ابن عبدالبر اور امام شعرانی نے ائمہ اربعہ سے روایت کیا ہے کہ جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے (رد المحتار علی الدر المختار از ابن عابدین شامی ۶۳/۱)

اب اس تناظر میں شاہ کی تحریر پڑھیے اور یہ فیصلہ کیجیے کہ "سلفیوں کو" اس سے کون سی حمایت مل رہی ہے؟

لکھتے ہیں: "دریں جا باید دانست چنانچہ عبادت غیر خدا شرک و کفر است. اطاعت غیر او تعالی نیز بالاستقلال کفر است و معنی اطاعت غیر بالاستقلال آنست کہ اورا در مبلغ احکام ندانستہ ربقۂ تقلید او در گردن اندازد. واورا لازم شمارد و باوجود ظہور مخالفت او باحکم او تعالی است- از اتباع بر ندارد و ایں ہم نوع است از اتخاذ انداد کہ در آیت کریمہ اتخذوا احبارھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم نکوہش آن فرمودہ اند (تفسیر عزیزی ص-۱۲۸ مطبوعہ دہلی)

شاہ صاحب جس مخصوص حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں ہم نے مندرجہ بالا سطور میں عرض کر دیا ہے کہ یہ امت کا اجماعی موقف ہے نیز اکثر ائمہ تفسیر نے اسی مفہوم کو قدرے اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ درحقیقت اس مسئلے کا مسئلہ تقلید اسلامی سے کوئی تعلق نہیں، دونوں الگ نوعیت کے مسئلے ہیں۔ تقلید اسلامی میں کوئی بھی مقلد خدا ورسول کی مخالفت کر کے امام کے قول کی اطاعت نہیں کرتا جب کہ مذکورہ آیت کی روشنی میں یہود ونصاری کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ جہاں تک شاہ صاحب کا تعلق ہے ان کے سلسلے میں تو ہم دعوے کی ساری کتابیں ان کے حنفی مقلد ہونے کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔ غیر مقلدین کی محض ان کی ایک عبارت کی ناجائز تشریح کے آگے شاہ صاحب کے سلسلے میں کیا تمام تاریخی ماخذ کو بھینٹ چڑھا دیا جائے؟" ع

ہم نے ہر شخص کا معیار نظر دیکھ لیا

قاضی بیضاوی کا نظریہ:- قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (توبہ

۱۲۲) "ہر گروہ میں سے ایک جماعت علم دین حاصل کرنے کے لیے کیوں نہ نکلی تاکہ جب واپس آئے تو گروہ کو احکام پہنچائے تاکہ وہ (گناہوں سے) بچیں" امام بیضاوی لکھتے ہیں "اس آیت سے یہ دلیل فراہم ہوتی ہے کہ تفقہ اور تذکیر فروض کفایہ سے ہیں البتہ اس چیز کو حاصل کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ صاحب طلب خود سلامت رہے اور دوسرے کو سلامتی کی راہ دکھائے- لوگوں پر (علمی) بڑائی اور ممالک پر قبضہ جمانا ان کا مقصد نہیں ہونا چاہیے

(تفسیر بیضاوی ۱/۴۲۲- دار الکتب العلمیہ طبع اول ۱۴۲۰ھ ۱۹۹۹ء)

ملا احمد جیون امیٹھوی کا نظریہ - برصغیر کے مستند اور نامور مفسر ملا احمد جیون لکھتے ہیں (آیت کا ایک معنی دینی علم میں تفقہ حاصل کرنا ہے اور) تفقہ سے مراد اجتہاد ہے اور یہ بھی فرض کفایہ ہے۔ ہاں مسائل کا علم فرض عین ہے۔ تفقہ اور اجتہاد فرض عین نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "**طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة**" واللہ اعلم بالصواب۔ (تفسیرات احمدیہ فی بیان آیات الشرعیہ ص۔ ۵۶۵۔ ناشر قرآن کمپنی لمیٹیڈ، لاہور، پاکستان)

دونوں مفسر کے بقول بعض مسلمان تفقہ حاصل کریں اور باقی مسلمانوں کا ان کی اقوال پر عمل کرنا ضروری ہے کیوں کہ عمل ہی پر گناہوں سے بچنا موقوف ہے اور اصطلاح فقہا میں اسی کو تقلید کہتے ہیں- وضاحت کے لیے ذیل کی تحریر پڑھیے:

محقق عصر مولانا غلام رسول سعیدی کا نظریہ: - صاحب تفسیر تبیان القرآن سعیدی صاحب اپنی مشہور کتاب "شرح صحیح مسلم" میں اس آیت کو تقلید کی دلیل میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف بعض مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کے بعد اپنی پوری قوم کو احکام پہنچائیں یعنی صرف بعض مسلمان تفقہ حاصل کریں اور باقی تمام مسلمان ان کے اقوال پر عمل کریں۔ اس آیت میں فقہا کے اقوال کو واجب العمل قرار دیا ہے کیوں کہ اس پر گناہوں سے بچنا موقوف ہے اور یہی تقلید ہے۔ (شرح صحیح مسلم از مولانا غلام رسول سعیدی ۳/۳۳۶۔ ناشر المجمع الا مصباحی، مبارک پور، اعظم گڑھ- یو- پی-)

علامہ ابن العربی مالکی کا قول: - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول (النساء ۴/۵۹) ابن العربی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس سے امرا اور علما دونوں مراد ہیں- امرا اس لئے کہ اصل امر انہیں کی طرف سے ہے اور وہی صاحب اختیار ہیں اور علما اس لئے مراد ہیں کہ لوگوں پر (نامعلوم مسائل کی) دریافت اور علمائے فتاوے پر عمل واجب ہے۔ جب کہ علما پر ان مسائل کا جواب دینا ضروری ہے۔ (احکام القرآن از ابن العربی اندلسی ۱/۱۸۹ مطبعۃ السعادۃ بجوار محافظۃ مصر طبع دوم ۱۳۳۱ھ)-

تقلید میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ عام آدمی مسائل فرعیہ دریافت کرتا ہے اور مجتہد احکام کا استنباط کرکے ان کا جواب دیتا ہے- یا دور حاضر کی فقہی کتابوں میں جو مسائل مستخرج شدہ ہیں اور ان کے سلسلے میں ائمہ کا جو رجحان ہے عام آدمی مفتیان کرام سے مسائل دریافت کرتا ہے مفتیان کرام فتاوی نقل کرکے جواب دیتے ہیں اور یہی ائمہ کی تقلید ہے-

علامہ عبدالحق حقانی دہلوی کی چشم کشا تحریر: - صاحب تفسیر حقانی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "جو احکام کہ کتاب وسنت میں بصراحت مذکور ہیں ان میں تو ان علما کا قول عامیوں پر ماننا فرض واجب ہے۔ اس میں شاید کسی کو اختلاف نہ ہو۔ رہے وہ احکام ومسائل کہ جو بصراحت کتاب وسنت میں نہ پائے جائیں بلکہ بحکم "**تفصیلا لکل شئی**" ۔ بطور اسرار مودوعہ پردۂ الفاظ میں مستور ہوں اور علما میں سے جو خواص ومستنبط ہیں جیسا کہ اگلی آیت میں ہے "**وردوہ الی الرسول والی اولی الامر منهم لعلمه الذین یستنطو نه**" جن کو مجتہد کہتے ہیں وہ ان مسائل کو استنباط اور اجتہاد کرکے نصوص سے ظاہر کرتے ہیں- آیا ان مسائل میں بھی پیروی غیر مجتہد لوگوں کو چاہیے یا نہیں؟ (اور اس پیروی کو عرف فقہا میں تقلید کہتے ہیں)۔ اہل اسلام میں جمہور سلف سے خلف تک ان مسائل میں بھی اتباع کرنا واجب اور ضروری کہتے ہیں۔ (اس کے بعد علامہ حقانی نے اس کے وجوہات بیان کیے ہیں)- اخیر میں لکھتے ہیں کہ یہ اعتراض کی چار امام ابوحنیفہ، مالک، احمد، شافعی کو معین کرنا اور آئندہ اجتہاد کا دروازہ بند کرنا اور انہیں کی تقلید پر انحصار کرنا اور حنفی، شافعی کہلانا بدعت وشرک ہے سو یہ محض تعصب ہے۔ (تفسیر حقانی ۳/۱۹۹، ۲۰۰ دار اشاعت تفسیر حقانی، دہلی)

تقلید کے سلسلے میں اختصار کے پیش نظر ہم نے صرف چند مفسرین کا نظریہ پیش کیا ہے جس میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ چھ آیتوں کی تفسیر میں

مفسرین نے پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ نظریہ تقلید پر دلائل فراہم کیے ہیں۔ بعض مفسرین نے اگرچہ ان آیات کے ذیل میں تقلید کی بحثیں نہیں اٹھائی ہیں مگر عملاً وہ بھی مقلد ہی تھے۔ جیسا کہ ابھی چند سطور پہلے آپ نے مستند ماخذ کے حوالے سے ان کے ناموں کے ساتھ مقلد ہونے کی صراحت ملاحظہ فرمایا ہے۔ آئندہ صفحات میں کچھ مفسرین کی حالات زندگی اور ان کی تقلید کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس میں حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ احکامی آیات کے ذیل میں ان کی تفاسیر میں جس طرح کی فقہی مباحث ہیں ان کے بارے میں بھی آپ کو باخبر کر دیا جائے تاکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے کہ احکامی آیات کے ذیل میں علمائے تفاسیر نے ائمہ اربعہ کے مسالک کے مطابق ہی مسائل کا استنباط کیا ہے یا مستنبط شدہ مسائل کو نقل کیا ہے۔ ساتھ ہی کچھ تفاسیر میں مسائل کے ذیل میں مذاہب کے دلائل بھی ذکر کیے گئے ہیں بلکہ مفسر جس امام کا مقلد ہے اس مسلک کا پلڑا بھاری دکھانے کی شعوری کوشش بھی کی ہے۔ گرچہ اکثر مفسرین نے محض مسائل اور مسالک کے دلائل کی وضاحت وتشریح کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔

مشاہیر علمائے تفسیر اور ان کی تفاسیر کا مختصر جائزہ

محمد بن عمر بن حسین رازی شافعی (۵۴۴ھ/۶۰۶ھ): امام فخر الدین رازی شافعی ابن الخطیب کے نام سے مشہور تھے۔ ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے والد گرامی ضیاء الدین خطیب شافعی کے نام سے معروف تھے۔ امام رازی نے والد گرامی ہی سے علمی استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ کمال سمعانی الجد جیلی اور دیگر معاصر علمائے کرام سے بھی خوب خوب استفادہ کیا۔ آپ اپنے دور کے یگانہ روزگار عالم، بے مثال متکلم تھے، علم کلام اور علم فلسفہ میں غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ آپ نے اسلامی فلسفہ اور یونانی فلسفہ کے دوران خط فصل کھینچا۔ علم تفسیر، لغت، بلاغت، بدیع، بیان، قرأت اور علم ونقد وجرح میں آپ امامت کے مرتبے پر فائز تھے۔ (الأعلام للزرکلی ۷/۲۰۳) علوم شرعیہ کے علاوہ علم تصوف سے آپ کا گہرا لگاؤ تھا۔ اس علم میں حضرت شیخ نجم الدین کبری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے پیر ومرشد اور شیخ طریقت تھے۔ حضرت شیخ نجم الدین کبری نہ صرف عظیم صوفی تھے بلکہ حافظ ابن حجر اور صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق آپ ہی نے اپنے شاگرد کی کتاب تفسیر کبیر کا تکملہ لکھا یا اس کے ناقص حصے کی تکمیل بعینہ اسی اسلوب میں لکھی۔ اہل علم آج تک اس تفسیر میں شیخ کی تکمیل کا نقطہ آغاز تلاش کرنے سے قاصر ہیں۔ علم تفسیر کے لیے علوم شرعیہ اور دوسرے علوم پر کس قدر مہارت ضروری ہے، اہل بصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں۔

آپ کی حیات مستعار کا بیشتر حصہ علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت اور تصنیف وتالیف میں صرف ہوا۔ آپ نے متعدد علوم وفنون پر تصانیف کا خاصا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ یہ ذخیرہ اپنی قدر وقیمت کی وجہ سے ہر دور میں اپنی معنویت تسلیم کروانے پر مجبور کرتی رہی ہے۔ آپ کی مقبول تصانیف میں "تفسیر کبیر" کا نام سر فہرست ہے۔ یہ تفسیر "متعدد" خصوصیات کی جامع ہیں۔ اس کی مقبولیت اور شہرت کا سورج آج بھی نصف النہار پر ہے۔ اس کی وجہ مختلف علوم وفنون سے متعلق اس کے ٹھوس علمی اور فنی مباحث ہیں۔ بالخصوص علم کلام، علم ریاضی، علم فلسفہ اور دیگر علوم مثلاً علم الافلاک وغیرہ کا ذکر بھی کثرت سے کرتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ احکامی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے امام رازی فقہا کے مذاہب کا ذکر کرتے ہیں۔ شافعی ہونے کی وجہ سے امام شافعی کے مسلک کی تائید وحمایت میں بہ کثرت دلائل وبراہین کا ذکر کرتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ابن خلکان نے لکھا ہے کہ "امام رازی نے اس تفسیر میں ہر انوکھی بات یکجا کر دی ہے۔ (وفیات الاعیان لابن خلکان ۲/۲۶۷)۔

ابو اسحاق احمد بن ابراہیم ثعلبی نیساپوری شافعی (م ۴۲۷ھ): امام ثعلبی کا شمار اوائل پانچویں صدی کی نادر روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے۔ آپ کثیر الشیوخ تھے آپ کے شیوخ کی تعداد تین سو بتائی جاتی ہے۔ جن سے آپ نے علمی اسرار ورموز حاصل کیے۔ وہ بیک وقت مختلف علوم و فنون پر مہارت رکھتے تھے۔ علم تفسیر، علم حدیث، علم رجال، علم نقد وجرح، پر دسترس رکھتے تھے، علم تاریخ سے ان کی واقفیت گہری تھی۔ عربی زبان کے صاحب اسلوب ادیب تھے۔ اس کے علاوہ موثر خطیب اور دین دار اور باعمل واعظ بھی تھے۔ امام ثعلبی کی ثقاہت علمائے ناقدین کے درمیان متنازع فیہ ہے۔ امام ثعلبی کو علم تفسیر سے فطری دلچسپی تھی۔ اس کے حصول کے لیے انہوں نے سوجتن کیا۔ ان کے مقدمے کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عہد طفولیت ہی سے علما کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور علم تفسیر کے حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان کی محنت وکاوش کی حد یہ ہے کہ وہ رات بھر جاگتے تھے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر علم کے

دروازے وا کردیے جس سے وہ حق و باطل، ادنیٰ و اعلیٰ، جدید و قدیم، اور سنت و بدعت میں فرق کرنے لگے۔ ساتھ ہی ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوگئی کہ وہ ایک ایسی جامع تفسیر تصنیف کریں جو متقدمین کی تمام صفات کی حامل ہو۔ ارادے کو عملی جامہ پہنایا اور اپنی تفسیر کی تمام خصوصیات کی حامل بنانے کی کوشش کی ان کا بیان ہے کہ میں نے اس کتاب میں قریب سو کتابوں کا منتخب مواد جمع کردیا ہے۔ تعلیقات اور متفرق اجزا اس پر مستزاد۔ (التفسیر والمفسرون، از محمد حسین ذہبی ۱/۲۷۷- داراحیاء التراث العربی طبع دوم ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء)

امام ثعلبی امام شافعی کے مقلد تھے وہ اپنی تفسیر میں دوسری بحثوں کے علاوہ فقہی احکام و مسائل پر بہت کچھ لکھتے ہیں۔ احکام کی آیات کی تفسیر میں ائمہ دین کے فقہی اختلافات کے ساتھ ان کے دلائل و براہین پر بھی کھل کر روشنی ڈالتے ہیں کہ نفس مسئلہ کا گوشہ گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ قرآن میں فرمایا:

وان كنتم مرضى او على سفر اوْ جاء احد منكم من الغائط (النساء / ۴۳)

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا کوئی شخص حاجت پوری کرکے آئے

اس آیت کی تفسیر میں مولف نے لمس، ملامسہ کا مفہوم واضح کرنے کے بعد اس مسئلے سے متعلق فقہائے پنج مذاہب کے بارے میں بتاتے ہیں۔ بالخصوص شافعی ہونے کے ناطے امام شافعی کے مسلک کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد تیمم سے متعلق علما کے اقوال و مذاہب پر روشنی ڈالتے اور تمام مسالک کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور اس تجزیے میں امام شافعی کا مسلک باوزن ثابت کرتے ہیں۔ (دیکھیے الکشف ج ۲/ ۱۳۵)

ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی شافعی (م ۵۱۰ھ): امام بغوی شافعی المسلک فقیہ، عظیم محدث اور بے مثال مفسر تھے۔ آپ کا لقب محی السنہ ہے۔ آپ نے قاضی حسین سے حدیث و فقہ کا درس لیا۔ عابد شب زندہ دار اور نہایت ہی صابر و قانع تھے۔ صوفی ازم تحریک کے نامور اور فاضل صوفی تھے۔ ہمیشہ پاک و صاف حالت میں درس دیتے تھے، شبہات سے بچتے تھے، تعلیم و تعلم، تصنیف و تالیف، خدمت دین اور خدمت مخلوق، تزکیۂ نفس ہی آپ کی پوری زندگی تھی، علامہ سبکی لکھتے ہیں۔

''بغوی بڑے جلیل القدر امام عابد و زاہد، محدث، مفسر، فقیہ، علم و عمل کے جامع اور طریق سلف پر گامزن تھے۔ قرآن کریم کی تفسیر اور احادیث نبویہ کی مشکلات کے حل کرنے کے سلسلے میں کتابیں تصنیف کیں۔ حدیث رسول کی نقل و روایت اور درس و مطالعہ میں حد درجہ دلچسپی لیتے تھے۔

آپ کی مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) معالم التنزیل (۲) شرح السنة (۳) المصابیح (۴) الجمع بین الصحیحین (۵) التهذیب فی الفقه.

امام خازن نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ معالم التنزیل تفسیر کی بلند پایہ اور گراں قدر کتاب ہے۔ یہ تفاسیر کی جامع، احادیث نبویہ سے آراستہ اور احکام شرعیہ سے پیراستہ ہے۔ شبہات و تبدیلی سے پاک ہے۔ لیکن اس میں عجیب و غریب واقعات اور نادر و نایاب قصے اور کہانیاں بھی ہیں۔ **(التفسیر والمفسرون از محمد حسین الذهبي ۱/ ۲۳۶ داراحیاء التراث العربی ۱۹۷۶ء)**

تفسیر بغوی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آیتوں کی تشریح، فقہی احکام اور ائمہ کے مذاہب اور ان کے دلائل اور دیگر امور شرعیہ کی توضیح میں احادیث ضرور ذکر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ امام بغوی خود بتاتے ہیں کہ وہ کسی آیت کی تشریح یا حکم شرعی کی توضیح کے سلسلے میں جہاں کہیں حدیث درج ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب الہیٰ کی وضاحت و صراحت کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ کتاب اللہ کی توضیح سنت سے طلب کی جاتی ہے اور امور دین کا مدار و انحصار سنت ہی پر ہے۔ احادیث نبویہ میں نے معتبر ائمۂ حدیث کی کتب سے اخذ کی ہے اور منکر وغیرہ سے متعلق روایات سے احتراز کیا ہے **(معالم ج ۱/ ص ۹)**

ابو محمد عبد الحق بن غالب بن عطیہ اندلسی غرناطی مالکی (۴۸۱ھ/ ۵۴۲ھ): ابن عطیہ مالکی چھٹی صدی ہجری کے نامور اور عادل قاضی (Justice)، جلیل القدر فقیہ، معتمد مفسر، بلند پایہ محدث، عربی زبان کے مایہ ناز ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ علم لغت اور علم نحو کے بے مثال عالم تھے اس کے علاوہ دوسرے علوم پر بھی آپ مہارت کے درجہ پر فائز تھے۔ علم تفسیر اور علم فقہ میں مہارت کا کوئی جواب نہیں تھا **(اعلام للزرکلی ۴/ ۵۳)**۔ مشہور مفسر ابوحیان اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے بھی تفاسیر قرآن مرتب کی ہیں ان سب میں ابن عطیہ کا مقام بلند تر ہے۔'' البحر المحیط ج ۱/ ۹

بحوالہ التفسیر و المنصرون ۱/۲۳۹)

"ابن فرحون صاحب الدیباج المذہب نے آپ کو مالکی فقہ کا ستون قرار دیا ہے"

مشہور مفسر ابوحیان ہی نے کشاف اور ابن عطیہ کی تفسیر کا مقابلہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ابن عطیہ کی کتاب زیادہ جامع اور غیر صحیح مواد سے پاک ہے۔ اس کے مقابلے میں زمخشری کی تفسیر زیادہ گہری اور مختصر ہے (البحر ۱۰/۱، بحوالہ سابق ۱/۲۱۹)

"ابن عطیہ نے دینی تصانیف کا جو ذخیرہ یادگار چھوڑا ان میں ان کی تفسیر المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز جملہ مفسرین کے نزدیک کتب تفسیر میں اہم مقام رکھتی ہے۔ ابن خلدون نے اس کو جملہ تفاسیر کا نچوڑ قرار دیا ہے۔ ان کے قول اس میں صرف صحیح مواد کو جگہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب دیار مغرب و اندلس (اسپین) میں نہایت مقبول و مستحسن خیال کی جاتی ہے۔ صاحب التفسیر و المفسرون ان کے متعلق رقم طراز ہیں کہ ابن عطیہ ایک آیت ذکر کرکے نہایت شیریں اور بلیغ عبارت میں اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ پھر تفسیر میں وارد شدہ روایت و آثار تحریر کرتے ہیں۔ ابن جریر سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔ بعض اوقات ابن جریر کی عبارت نقل کرکے اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ قرآنی الفاظ کی تشریح کے سلسلے میں وہ اکثر عربی اشعار اور ادبی شواہد سے استدلال کرتے ہیں۔ نحوی مسائل سے بھی انہیں دل چسپی ہے۔ وہ اکثر مختلف قراءتیں ذکر کرکے ان کے جداگانہ معانی ومطالب پر روشنی ڈالتے ہیں"

(التفسیر والمفسرون ۱/۲۳۹ تا ۲۴۰)

عمادالدین ابوالفدا اسماعیل بن عمر بن کثیر بصری شافعی (۷۰۰ھ/۷۷۴ھ): ابن کثیر بصرہ میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں اپنے بھائی کی رفاقت میں دمشق چلے آئے۔ یہیں حصول تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ ابن شحنہ آمدی اور ابن عساکر جیسے بلند پایہ محدثین سے علمی استفادہ کیا۔ عرصہ دراز تک علامہ مزی کی صحبت میں رہے۔ ان سے تہذیب الکمال کا درس لیا۔ علامہ مزی نے آپ کو دامادی کا شرف بخشا۔ آپ نے ابن تیمیہ حرانی سے کافی استفادہ کیا۔ بعض نظریات میں آپ ان کے حامی بھی رہے۔ آپ کی وفات ماہ شعبان ۷۷۴ھ میں ہوئی۔

ابن کثیر کا علمی مقام ومرتبہ مختلف زاویے سے کافی بلند ہے۔ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت وطباعی کی وجہ سے متعدد اسلامی اور سماجی علوم پر مہارت رکھتے تھے۔ علم نقد وجرح پر بھی گہری بصیرت کے مالک تھے۔ بالخصوص اسلامی علوم میں تفسیر وحدیث، فقہ، جرح وتعدیل، رجال اور دینی علوم میں تاریخ پر عبور رکھتے تھے۔ ان کی کتاب "البدایہ و النہایہ" کو آج تک اسلامی تاریخ کا اہم ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے۔ علم فقہ سے بھی کافی دلچسپی تھی جبھی دینی احکام پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ بھی بنایا تھا۔ ایک عرصہ تک ابن کثیر مسند فقہ وافتا پر بھی فائز تھے۔

ابن کثیر نے مختلف علوم وفنون پر تصانیف کا بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا ہے۔ علم تفسیر پر ان کی تفسیر "تفسیر القرآن الکریم" چار جلدوں پر مشتمل بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ یہ تفسیر متعدد ومتنوع خوبیوں سے عبارت ہے۔ ابن کثیر آیات کی تفسیر وتشریح میں حدیث، قرآنی آیات اور سلف صالحین کے اقوال کا سہارا لیتے ہیں۔ مگر وہ لکیر کے فقیر نہیں کہ انھوں نے جو مواد دیا اس پر مہر لگا دی بلکہ اپنی ناقدانہ نگاہ سے ان کے اقوال کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں، پھر اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں۔ اس تفسیر کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ احکامی آیات کی تفسیر میں مؤلف فقہی احکام اور علما وفقہا کے اقوال و دلائل ذکر کرتے ہیں اختلافی مسائل میں مختلف مسالک ومذاہب کے دلائل کی تفصیلات بھی ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ طلاق اور صوم سے متعلق آیتوں کی تفسیر میں خاصی تفصیل سے کام لیا ہے۔ ابن کثیر فقہا کے اختلاف میں دخل دیتے اور ائمہ کے مذاہب و دلائل ذکر کرنے کے بعد اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کرتے ہیں۔ شافعی ہونے کے ناتے اسی مسلک کی تائید وحمایت اور تقویت میں دلائل کا انبار لگاتے ہیں۔

(التفسیر والمفسرون ۱/۲۴۲ تا ۲۴۶ ملخصاً)

ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد بن مخلوف ثعالبی جزائری مالکی (۷۸۶ھ/۸۷۵ھ): امام ثعالبی مالکی تھے، آپ بلند پایہ عالم دین، عظیم محدث، بے مثال مفسر، جلیل القدر محقق ہونے کے ساتھ عابد وزاہد صوفی بھی تھے اور صاحب کرامت ولی بھی۔ ابن سلام البکری لکھتے ہیں:۔ "ہمارے شیخ محترم ثعالبی نہایت عابد وزاہد اور اکابر اولیاء اللہ میں شمار ہوتے تھے" (التفسیر والمفسرون ۱/۲۴۷)

علمی مقام:۔ امام ثعالبی مشرق ومغرب کی نادر ہستیوں اور عظیم دانش وروں میں شمار کیے جاتے تھے وہ اپنا تعارف خود کراتے ہوئے رقم طراز ہیں "آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں طلب علم کے لیے الجزائر

سے نکلا۔ پہلے تونس پھر مصر پہنچا۔ پھر تونس لوٹ آیا۔ ان دنوں تونس میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو علم حدیث میں مجھ پر فائق ہو۔ میں جب بولنے لگتا تو اہل علم خاموش ہو کر میری باتیں سنتے اور حق کا ساتھ دیتے میری روایت کو قبول کر لیتے۔ جب میں مشرق سے عازم مغرب ہوا تو بعض علمائے مغرب نے کہا کہ "علم حدیث میں آپ یگانہ عالم ہیں"۔
(مرجع سابق ۱/۲۴۷)

آپ کو تصنیف و تالیف سے خاص لگاؤ تھا بالخصوص علوم قرآن سے غایت درجہ دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ آپ کی اکثر تالیفات اسی علم سے متعلق ہیں۔ آپ نے مندرجہ ذیل تصنیفات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا:۔

(۱) الجواهر الحسان فی تفسیر القرآن (۲) الذهب الابریز فی غرائب القرآن العزیز (۳) تحفة الاخوان فی اعراب بعض آیات القرآن (۴) جامع الامهات فی احکام العبادات (۵) الانوار (فی المعجزات النبویة (الصوء اللامع ۴/۱۵۲)

تفسیری خصوصیات:۔ ان کی تفسیر الجواہر الحسان متنوع خوبیوں کی وجہ سے دوسری تفاسیر سے ممتاز ہے۔ مثلاً اس میں ثقہ، مستند مفسرین کی تفسیر سے مواد کشید کیا گیا ہے بالخصوص ابن عطیہ کی تفسیر سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ تفسیری اقوال روایت کرنے میں روایت بالمعنی کی بجائے روایت باللفظ پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ یہ کتاب تقریباً سو کتابوں کا عطر مجموعہ ہے۔ اور مصنف علام کے بقول "(اس کتاب میں میں نے) ائمہ ثقات کی کتب سے مواد اخذ کر کے مفید اضافے کیے ہیں"۔ اسرائیلی واقعات ذکر کرنے کے بعد ان پر شدید نقد و جرح کیا ہے۔ کہیں کہیں فقہی مسائل کا ذکر بھی ہے مگر اس کی تفصیل سے انہوں نے احتراز کیا ہے۔
(التفسیر والمفسرون از محمد حسین ذہبی ۱/۲۴۸ تا ۲۵۱)

جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر سیوطی شافعی (م ۸۴۹ھ/۹۱۱ھ): امام سیوطی بارہویں صدی ہجری کے مجدد، عالم اسلام کے مرجع، احادیث نبویہ کے حافظ، کثیر علوم و فنون کے ماہر اور کثیر التصانیف عالم دین تھے۔ علوم اسلامیہ پر مہارت کے علاوہ کئی سماجی علوم سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے، امام سیوطی زود نویس اور بسیار نویس کے ساتھ خوب نویس بھی تھے یہ ایک ایسی خوبی ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں ہی کو عطا کرتا ہے۔

آپ کی تصانیف کی تعداد پانچ سو سے زائد بتائی جاتی ہے۔ یہ تصانیف آپ کے دور میں مشرق و مغرب میں معروف و مشہور ہوئیں۔ امام سیوطی اصلاحی، دعوتی، تدریسی اور تصنیفی خدمات کے علاوہ اپنے دور کے تقاضے کے مطابق علوم اسلامیہ میں بکھرے ہوئے مواد کو جمع کرنے کا کام زیادہ کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام سیوطی اختراعی طبیعت کے مالک نہیں تھے۔ کیوں کہ انہوں نے زمانے کی تصنیفات اور لوگوں کے حافظے کو دیکھ کر جامع کتابیں لکھنی شروع کیں ایک جگہ خود تحریر فرماتے ہیں "دور حاضر میں ہمت پست ہو چکی ہے اور لوگ اسانید سے قطع نظر صرف متن حدیث کا مطالعہ کرنا چاہتے اور طوالت سے گھبراتے ہیں"۔

تفسیر کے تعلق سے بھی آپ کے ذہن میں ایک جامع خاکہ تھا جو علم تفسیر اور قرآنی آیات کی تفسیر سے متعلق جملہ مواد پر مشتمل ایک بیش قیمت ذخیرہ ہوتا اس تفسیر کا نام بھی آپ نے "**مجمع البحرین و مطلع البدرین**" منتخب کر لیا تھا۔ حتی کہ الاتقان کو آپ نے اسی تفسیر کا مقدمہ قرار دیا ہے جو ایک زمانے سے مستقل تصنیف کے نام سے معروف ہے۔ لیکن امام کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا مگر پھر بھی اختصار کو مد نظر رکھ کر "ترجمان القرآن" کے نام سے تفسیر لکھی مگر اس میں بھی حدیثوں کی سندیں مذکور تھیں بعد میں طوالت ہی کے سبب آپ نے سندیں بھی کو حذف کر کے اس کا نام **الدر المنثور فی التفسیر الماثور** رکھ دیا۔ **(التفسیر والمفسرون ۱/۲۵۱)**

امام سیوطی نے ایک مختصر تفسیر جلالین کے نام سے بھی لکھی جو برسوں سے ہندوستانی مدارس کے درس نظامی میں داخل نصاب ہے آپ مسلکاً شافعی تھے اس لیے احکام و مسائل کی آیات کی تفسیر میں امام شافعی کے مسلک کے مطابق تفسیر بھی فرماتے ہیں۔

فتویٰ نویسی، تدریس اور وعظ گوئی آپ کے مشغلے میں شامل تھا مگر بعد میں عملی تصوف کی طرف طبیعت کا میلان بڑھ گیا تھا اس لیے چالیس سال کے بعد ذکر و عبادت میں وقت کا زیادہ حصہ صرف کرتے تھے۔ **(الاعلام للزرکلی ۴/۷۱)** آپ کے مناقب و کرامات کی خاصی تعداد ہے جن کو مورخین نے نقل کیا ہے۔

ناصر الدین ابو الخیر عبد اللہ بن عمر بن محمد بیضاوی (م ۶۹۱ھ یا ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء): قاضی بیضاوی ساتویں صدی ہجری کے نامور قاضی ایران، عظیم فقیہ، علوم اسلامیہ کے معتبر عالم، عربی زبان کے فن کار ادیب

اور لاثانی مفسر گزرے ہیں۔ آپ فارس میں شیراز کے قریب بیضا شہر میں پیدا ہوئے۔ اسی وجہ سے بیضاوی کہلائے۔ علوم اسلامیہ میں مہارت حاصل کی۔ غیر معمولی استعداد کی وجہ سے شیراز کے قاضی القضاۃ (Chief Justice) کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ آپ مدتوں اس منصب پر فائز رہ کر عدل وقسط کے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ لوگ آپ کے منصفانہ فیصلے سے مطمئن تھے۔ ایک دور میں آپ منصب قضا سے دست بردار ہو کر تبریز چلے آئے اور یہیں ۶۸۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

آپ نے بے پناہ مصروفیات کے باوجود بھی تصنیف و تالیف کا گراں قدر ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ یہ تصانیف علوم وفنون اور مواد کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) انوار التنزیل و اسرار التاویل . معروف به تفسیر بیضاوی (۲) طواع الانوار (علم توحید میں) (۳) منهاج الوصول الی علم الاصول (۴) لب اللباب فی علم الاعراب (۵) نظام التواریخ (فارسی) (۶) (کتابچه) موضوعات العلوم و تعاریفها (۷) الغایة القصوی فی دارية الفتوى (فقہ شافعی سے متعلق) (الاعلام للزرکلی ۴/ ۲۴۸)۔

تفسیر بیضاوی، کشاف، امام راغب اصفہانی اور امام رازی کی تفسیر سے کشید کی گئی ہے لیکن صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں کہ جو نکات و دقائق بیضاوی اپنی فکر رسا سے اختراع کرتے ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں۔ یہ تفسیر کئی اعتبار سے ممتاز ہے امام بیضاوی اسرائیلیات کو ضعف وقیل سے بیان کرتے ہیں۔ مختلف قرأتوں سے مختلف نکتے پیدا کرتے ہیں۔ سورت کے آخر میں ایمان کی تازگی اور روحانی تسلی کے لیے سورت اور آیتوں کی فضیلت سے متعلق حدیثیں ذکر کرتے ہیں۔ آیتوں میں بلاغت اور صنائع و بدائع دکھا کر امام بیضاوی بین السطور سے قرآن کے پنہاں مطالب ومعانی کی طرف جو اشارے دینا چاہتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ آپ مسلکاً شافعی تھے، فقہ شافعی پر مستند اور قابل قدر کتاب بھی لکھی۔ اپنی تفسیر میں احکامی آیات کی تفسیر میں فقہی مسائل کی تفصیلات شافعی مسلک کے مطابق بیان کرتے ہیں گرچہ اس سے زیادہ دل چسپی نہیں لیتے۔ فقہی مسائل کے تذکرہ کے دوران امام شافعی کے مسلک کی تائید وتقویت میں دلائل وشواہد بھی ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ **"المطلقات یتربصن بانفسهن ثلثة قروء"** میں قاضی بیضاوی نے قروء سے مراد طہر لینے پر کئی شواہد پیش کیے ہیں اور امام شافعی کے مسلک کی پوری ترجمانی کی ہے، نیز وہ اپنی تحریر کے بین السطور سے حنفیہ کی تردید بھی کر رہے ہیں۔ یہ صرف ایک مثال جو ان کے مقلد ہونے کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کافی ہے اس طرح سیکڑوں مثالیں ان کی کتاب میں موجود ہے بلکہ فقہ شافعی سے متعلق ان کی مستقل تالیف **الغایة القصوی** کا ذکر اوپر آچکا ہے جو ان کے مقلد ہونے پر شاہد عدل ہے۔

ابو البرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی حنفی (م ۷۰۱ھ): امام نسفی حنفی فقہ وتفسیر کی اس قد آور شخصیت کا نام ہے جس کا نام اہل علم کی زبان پر آتے ہی اعتبار، استناد، ثقاہت جیسے معتبر اور باعزت الفاظ کی گونج بھی ذہنوں میں محسوس ہونے لگتی ہے۔ آپ ماوراء النهر میں شہر نسف میں جلوہ بار ہوئے۔ آپ نے علامہ شمس الائمہ کردی اور احمد بن عتابی جیسے مشائخ عصر سے استفادہ کیا۔ تصوف وسلوک سے گہرا لگاؤ تھا، عبادت و ریاضت اور زہد وتقویٰ آپ کی داخلی اور شخصی زندگی کے معیارات تھے۔ حدیث، فقہ، اصول اور تفسیر ولغت میں گہری بصیرت اور بے پناہ خداداد صلاحیت کی وجہ سے علما کی نگاہ میں معتبر ومقبول تھے۔ آپ کی تصانیف علوم ومعارف کا خزانہ ہیں ان میں بیشتر اصول اور علم فقہ سے متعلق ہیں اور یہ مندرجہ ذیل ہیں: **(۱) متن الوافی (فی الفروع) (۲) الکافی فی شرح الوافی (۳) کنز الدقائق (فی الفقه) (۴) المنار (فی اصول الفقه) (۵) عمدة العقائد (۶) مدارک التنزیل و حقائق التاویل (فی التفسیر) (الاعلام للزرکلی ۴/ ۱۹۲)**

امام نسفی کی کتاب کنز الدقائق فقہ حنفی میں ایک مستند اور جامع متن کی حیثیت سے متداول ہے۔ اس میں فقہ حنفی کے مطابق مسائل بیان کیے گئے ہیں اس کی شروحات میں "البحر الرائق اور تبیین الحقائق" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تفسیر نسفی میں متنوع خصوصیات کے علاوہ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ امام نسفی نے احکامی آیات کی تفسیر میں فقہی احکام و مسائل بیان کرتے ہیں کہیں مسالک کے دلائل بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس موقع پر وہ حنفیت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہوئے دوسرے مسالک کی پرزور تردید بھی کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے طلاق وغیرہ مسائل سے متعلق آیتوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا

ہے امام نسفی نہ صرف روایتی مقلد تھے بلکہ ان کی کتابوں اور ان کی تفسیر کے ذریعے فقہ حنفی کو مزید تقویت ملی۔ انہوں نے بہت سے فقہی نکات کا اضافہ کیا۔ ان کی تفسیر کو ایک معتدل اور مستند تفسیر ہونے کی حیثیت سے خواص میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔

علاء الدین ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم خازن شافعی (م ۶۷۸ھ/۷۴۱ھ): امام خازن بغداد میں پیدا ہوئے۔ یہیں ابن الدوالیبی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر دمشق آ کر قاسم بن مظفر اور وزیرہ بنت عمر سے علمی استفادہ کیا، محنت و دل چسپی سے علم و عمل اور فکر وفن میں یگانہ روزگار بن گئے مسلکا شافعی تھے۔ مشرباً صوفی تھے، مخلوق سے ہمدردی اور محبت کرتے تھے۔ ابن شیبہ کہتے ہیں کہ "آپ عظیم عالم دین اور بہت بڑے مصنف تھے۔ متعدد علوم وفنون پر کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں مندرجہ ذیل تصانیف کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔

(۱) لباب التاویل فی معانی التنزیل معروف بہ تفسیر خازن (۲) عدۃ الأفہام فی شرح عمدۃ الاحکام (فقہ شافعی کی فروعات سے متعلق) (۳) مقبول المنقول (حدیث میں دس جلدوں پر مشتمل (شذرات الذہب ۶/۱۳۱)

امام خازن کی تفسیر لباب التاویل متعدد خوبیوں کی مالک ہے اس میں تفسیرات میں آیات اور سورتوں کی فضیلت میں امام خازن نے زیادہ تفصیلات سے کام لیا ہے۔ تاریخی واقعات بھی تفصیلاً مذکور ہیں۔ تفسیر بغوی اس کا خاص ماخذ ہے۔ اس میں زیادہ مواد نقل و انتخاب پر مشتمل ہے۔ اختر علی بہ تمام ہیں امام خازن آیتوں کی صوفیانہ تفسیر بھی کرتے ہیں۔ جن میں تزکیۂ روح اخلاق و عمل کی پاکیزگی کے لیے ترغیب وترہیب کی حدیثیں بہ کثرت ذکر کر کے ان میں ایسی نکتہ آفرینی کرتے ہیں کہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور روح جھوم اٹھتی ہے۔

فقہی مسائل:- امام خازن علم فقہ میں مسلکاً امام شافعی کے مقلد تھے انہوں نے اپنی تفسیر میں فقہی مسائل کی تفصیلات کا ذکر خوب کیا ہے۔ احکامی آیات میں فقہا کے مذاہب و دلائل پر روشنی ڈالتے ہیں اور امام شافعی کے مسلک کا پلڑا بھاری کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، نیز آیتوں سے نمبروائز مسائل نقل کرتے ہیں۔ اطمینان کے لیے نکاح، طلاق، خلع، ظہار، عدت، اور ایلاء سے متعلق احکام کی تفصیلات کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

غالباً اسی وجہ سے صاحب التفسیر والمفسرون نے ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ سب کچھ ہیں، مگر مفسر کم۔

(التفسیر والمفسرون ۱/۳۱۴-۳۱۵)

محمد بن یوسف بن علی اندلسی غرناطی شافعی معروف بہ ابوحیان (۶۵۴ھ/۷۴۵ھ) - افریقہ اور دیار مغرب کے نامور عالم دین، فاضل نحو وصرف، ماہر شعر وسخن، مختلف قراتوں کے رمز شناس، طبقات وتراجم رجال کے واقف کار علامہ ابوحیان کا نام تاریخ اسلام کے صفحات میں ہمیشہ انمٹ نقش کی طرح ثبت رہے گا۔ جن کی صلاحیتوں اور لافانی خدمات سے پورا عالم اسلام فیض یاب ہوا اور ہو رہا ہے۔ ابوحیان نے اسپین کے فضلا سے استفادہ کیا۔ بعدہ اسکندریہ میں عبدالنصیر بن علی مریوطی، ابوطاہر اسماعیل بن عبداللہ ملیجی سے علم قرأت پڑھ کر عبور حاصل کیا۔ اس کے بعد مصر میں شیخ بہاء الدین بن نحاس سے آپ نے استفادہ کیا، ابوحیان خود کہتے ہیں کہ میں نے چار سو پچاس ۴۵۰ اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ ابوحیان اپنے دور میں نحو وصرف کے یگانۂ روزگار عالم تسلیم کیے جاتے تھے۔ علم تفسیر میں بھی ابوحیان کو گہری واقفیت حاصل تھی۔ ابوحیان نے جمال الدین ابوعبداللہ محمد بن سلیمان المقدسی معروف بہ ابن النقیب کی کتاب "التحریر و التحبیر لاقوال ائمۃ التفسیر" سے خوب استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب علم تفسیر میں سو جلدوں پر مشتمل ہے۔ لکھنا، پڑھنا اور روایت سننا، سنانا ان کی زندگی کا خوبصورت مشغلہ تھا، صفدی کہتے ہیں "میں نے ہمیشہ ابوحیان کو لکھتے، پڑھتے اور روایات سنتے دیکھا اس کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا"۔ ان کی تصانیف علم وفن، نکتہ آفرینی میں لاجواب ہیں مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) البحر المحیط (علم تفسیر میں) (۲) غریب القرآن (۳) شرح التسہیل (۴) نہایۃ الاعراب (۵) خلاصۃ البیان۔

ابوحیان شافعی تھے آپ کی تفسیر میں احکامی آیات کے ذیل میں فقہ شافعی کے مطابق جزئیات پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز اس سلسلے میں مختلف آراء واقوال بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ اس تفسیر میں زیادہ تر نحوی و صرفی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان مسائل میں ابوحیان زمخشری اور ابن عطیہ جیسے بلند پایہ نحویوں کی بھی خبر لی ہے۔ مگر ان کے علمی قدو

قامت کا وہ کھلے دل سے معترف ہیں۔ اور اہل علم کی یہی شان بھی ہوتی ہے۔ (التفسیر والمفسرون ۱/۳۱۹)

محمد بن محمد بن مصطفیٰ ابو السعود عمادی حنفی (۸۹۳ھ/۹۸۲ھ):

امام ابو السعود دسویں صدی ہجری کے نامور مفسر، صاحب رائے دانش ور، نکتہ رس فقیہ، بلند پایہ ادیب اور اپنے وقت کے عادل قاضی تھے۔ آپ نے ۸۹۳ھ کو قسطنطنیہ کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھ کھولی، آپ کے علم وفضل کے بارے میں علما کی رائے ہے کہ "(آپ) علم و فضل کی گود میں پلے، بڑھے اور پروان چڑھے۔ زندگی بھر علوم وفنون کی خدمت میں مشغول رہے۔ اپنے والد سے اکثر علمی کتب پڑھیں اور دیگر اکابر علماء سے کسب فیض کیا۔ ترکی کے بہت سے مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مختلف اوقات میں بروسہ، قسطنطنیہ اور علاقہ عسکری میں منصب قضاء پر متمکن ہوئے اور برابر تیس (۳۰) سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس مدت میں انہوں نے فتویٰ نویسی میں کامل مہارت وبراعت کا ثبوت بہم پہنچایا۔

آپ کی خدمات کے متعلق مؤرخین کا بیان ہے "کہ آپ سائل کے سوال کے مطابق فتویٰ لکھتے۔ اگر سوال نظم میں ہوتا تو اسی وزن و قافیہ میں اس کا منظوم جواب دیتے۔ اگر سوال مسجع نثر میں ہوتا تو جواب بھی ویسا ہی لکھتے۔ اگر سائل ترکی یا عربی میں لکھتا تو آپ اسی زبان میں جواب دیتے۔ آپ نے جمادی الاولیٰ ۹۸۲ھ کو قسطنطنیہ میں وفات پائی۔ اور میزبان صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پڑوس میں مدفون ہوئے۔ **(التفسیر والمفسرون از محمد حسین الذہبی ۱/۳۴۵-۳۴۶ دار احیاء التراث العربی ۱۹۷۶ء۔)**

آپ نے مشاغل کے ہجوم میں زندگی کا بیشتر حصہ بتایا۔ تدریس، منصب افتاء وقضاء کے علاوہ آپ نے تالیف کے لیے بھی وقت کا کچھ حصہ صرف کیا جس میں آپ کی تفسیر **ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم معروف بہ تفسیر ابو السعود** "وجود میں آئی۔ مؤرخین فقہا اور علمائے فصاحت وبلاغت نے اس کی شان میں حقیقت پسندانہ تاثرات اور مدحیہ کلمات کا اظہار کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تفسیر حسن تعبیر اور طرز ادا کی دلکشی، بلاغی اسرار و رموز کی عقدہ کشائی، دلائل وبراہین کی ندرت اور لطائف ونکات کی جامعیت کی وجہ سے عدیم النظیر اور لاجواب ہے۔ علامہ عبد الحی لکھنوی لکھتے ہیں "(یہ تفسیر ان گنت لطائف ونکات اور فوائد واشارات کی جامع ہے۔ حسن تعبیر کی بنا پر ابو السعود کو "خطیب المفسرین" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک برہنہ حقیقت ہے کہ تفسیر کشاف اور بیضاوی کے بعد کوئی تفسیر اس مرتبہ کو نہیں پہنچی۔ **(الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیۃ، ص ۸۲)**

امام ابو السعود حنفی المسلک تھے۔ ان کی تفسیر میں بھی فقہی احکام، مسائل، اصول وفروع اور دلائل و براہین کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ فقہی تفصیلات سے وہ گریز کرتے ہیں۔ صرف ائمہ کے فقہی مسالک بیان کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں امام ابو السعود جس طرح خود معتدل مزاج اور معتدل فکر کے حامل تھے یونہی ان کی تفسیر بھی اعتدال وتوازن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ (مرجع سابق ۱/۳۵۱)

شہاب الدین ابو الثنا سید محمود آفندی شافعی آلوسی (۱۲۱۷ھ/۱۲۷۰ھ): امام آلوسی اپنے دور کے سرخیل علمائے عراق میں شمار کیے جاتے تھے، علوم اسلامیہ کے علاوہ کئی سائنسی اور دنیاوی علوم پر دسترس رکھتے تھے، بے مثال خطیب، باکمال مدرس تھے، وسیع المطالعہ فقیہ، مفتی اور عدیم النظیر محدث ومفسر تھے۔ قدرت نے آپ کو بلا کا حافظہ عطا کیا تھا۔ خود کہتے ہیں "میں نے اپنے ذہن کے حوالے کوئی ایسی امانت نہیں کی جس میں اس نے خیانت کی ہو اور اپنے ناخن فکر وتدبر کو جس مشکل کام کی گرہ کشائی کے لیے بھی استعمال کیا تو اس نے اس امر کی پرتیں نہ کھول دی ہوں"۔

وہ احکام کی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فقہا کے مذاہب و دلائل بیان کرتے ہیں اور آخر میں کبھی کبھی شافعی مسلک کو قوی قرار دیتے ہیں۔ "المطلقات یتربصن الخ" والی آیت کی تفسیر کے بعد لکھتے ہیں کہ یہاں شافعیہ کا مسلک قوی معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ جو شخص ان کے دلائل دیکھتا ہے اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات ملاحظہ کرتا ہے وہ اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتا "آپ نے ۱۲۱۷ھ میں کرخ بغداد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد گرامی، شیخ خالد نقشبندی اور شیخ علی سویدی کے علاوہ اکابر علمائے کرام سے علمی استفادہ کیا۔ تیرہ (۱۳) سال کی عمر میں تدریس وتالیف میں مصروف ہو گئے۔ کثیر طلبہ نے آپ چشمہ علم سے سیرابی حاصل کی۔ آپ طلبہ کے لیے علمی درس کے علاوہ ہوسٹل اور اس کے لوازمات کا بھی انتظام فرماتے تھے اور ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ کو اخلاق کی تہذیب، نفس کے تزکیہ، اور

انسانیت وآدمیت کی تعمیر کا سلیقہ بھی سکھاتے تھے۔ حضرت شیخ آلوسی کی زندگی کا سب سے پرکشش پہلو یہ ہے کہ انہوں نے علوم کی ترویج و اشاعت ان کی نوک پلک سنوارنے میں پوری زندگی صرف کر دی۔ بتایا جاتا ہے آپ اکثر یہ شعر گنگنایا کرتے تھے۔

سهري لتنقيح العلوم الذلي — من فصل غانية و طيب عناق

علوم (معارف) کی نوک پلک سنوارنے کے لیے میری شب بیداری حسین وجمیل عورت کی ملاقات سے لذیز تر ہے۔

۱۲۴۸ھ میں آپ کو مفتی احناف مقرر کیا گیا۔ ماہ شوال ۱۲۶۳ھ میں افتاء کے منصب سے الگ ہو کر تفسیر قرآن کی تالیف میں مصروف ہو گئے۔ ۱۲۶۷ھ میں قسطنطنیہ واپس لوٹ کر سلطان عبدالمجید خاں کی خدمت اپنی تفسیر پیش کی۔ سلطان نے اس کو خوب سراہا۔ آپ نے اس کا آغاز ۱۶/شعبان ۱۲۵۲ھ بوقت شب کیا اور اس کی تکمیل ۴/ربیع آخر ۱۲۶۷ھ کو کی۔ اس وقت کے وزیر اعظم علی رضا پاشا نے اس کا نام "روح المعاني في تفسير القرآن و السبع المثاني" تجویز کیا۔

(التفسير والمفسرون ۱/ ۳۵۳)

علامہ آلوسی ادیان و مذاہب کے زبردست عالم تھے۔ آپ مسلکاً شافعی تھے۔ لیکن کچھ مسائل میں حنفیہ کی تقلید کرتے تھے۔ آپ کی تفسیر لاتعداد ظاہری و باطنی خصوصیت کی جامع کے باوصف فقہی احکام و مسائل کی ترسیل و تفہیم میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

وہ احکامی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے مذاہب اور اس کے دلائل بیان کرتے ہیں اور آخر میں کبھی کبھی شافعی مسلک کو قوی قرار دیتے ہیں "المطلقات يتربصن" والی آیت کی تفسیر کے بعد لکھتے ہیں کہ یہاں شافعیہ کا مسلک قوی معلوم ہوتا ہے جو شخص ان کے دلائل دیکھتا ہے اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات ملاحظہ کرتا ہے وہ اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتا" امام آلوسی نہ صرف رسمی مقلد تھے بلکہ ہمہ دانی کے باوجود تقلید پر ان کا عمل اس نظریے کو مزید استحکام عطا کر رہا ہے۔

ابو بکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی (۳۰۵ھ/۳۷۰ھ):

حضرت ابو بکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ چوتھی صدی ہجری کے نامور حنفی فقیہ اور عالم قرآن تھے، اہل علم کے مشہورترین فضلا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۳۲۴ھ میں بغداد پہنچے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں علی بن الحسین الکرخی کے حلقہ درس میں فقہ کا مطالعہ کیا، العاصم اور عبد الباقی قانع استاذ دارقطنی سے احادیث کی روایت کی اور پھر علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آپ نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ علم و فن کی خدمت، درس و تدریس، فقہ و افتا اور دیگر علمی مصروفیات میں صرف کیا۔ جس زمانے میں بغداد میں آپ کا قیام تھا۔ فقہ حنفی کی مملکت میں آپ ہی کا سکہ رائج الوقت تھا۔ آپ کی خدمت سے مسلک حنفی کو استحکام اور قرار ملا، آپ کے بحر علم سے لاتعداد تشنگان علوم نے سیرابی حاصل کی، ان میں قدوری، ابو بکر خوارزمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علمی جاہ جلال کی وجہ سے منصب قضا کے لیے دو مرتبہ نامزد کیے گئے لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے محدثین اور فقہا کے درمیان تاشی کے فرائض انجام دیے جس کے نتیجہ خیز اثرات رونما ہوئے۔ آپ نے ۷/ذی الحجہ ۳۷۰ھ میں بمقام نیشاپور وفات پائی۔ آپ علمی انہماک کے باوجود بہت سی قابل قدر تصنیف یادگار چھوڑیں۔ جن میں (۱) كتاب الاصول شرح الجامع الكبير للشيباني (۲) امام طحاوی کی المختصر فی الفقہ کی شرح اور تفسیر میں "احکام القرآن" قابل ذکر ہیں۔ (التفسير والمفسرون ۲/ ۴۳۸)

علمائے اسلام کے نزدیک جصاص کی تفسیر فقہی تفسیر کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے جس میں آیات کے ذیل میں فقہی احکام، مسائل کا استنباط، اور اختلافی مسائل میں دلائل و براہین کا بکثرت تذکرہ ہے امام جصاص نے فقہی تفسیر کے نظریے کے مطابق اس کی ترتیب و تبویب بھی کی ہے۔ اور پوری تفسیر امام ابو حنیفہ کی تائید و تقویت اور دوسرے مسالک کی تردید سے عبارت ہے، یہی وجہ ہے اس میں آیتوں کی دیگر خصوصیات پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔

ابو بکر محمد بن عبد اللہ بن محمد معافری اشبیلی مالکی (۴۶۸ھ/۵۴۳ھ): اسپین (اندلس) کے مشہور قاضی اسلام، حافظ حدیث، فقہی اصول و فروغ کے بے نظیر عالم، تاریخ و ادب کے رمز شناس اور علم تفسیر کے فقید المثال عالم قرآن علامہ ابن عربی مالکی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ زرکلی لکھتے ہیں کہ "بلغ رتبة الاجتهاد في علوم الدين" کہ ابن العربی علوم دینیہ میں مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے۔

ابن بشکوال کہتے ہیں۔ "ختام علماء الاندلس و آخر ائمتها و حفاظها" کہ ابن العربی اندلسی علما کی آخری کڑی، اور حفاظ و ائمہ کرام کے سلسلے کا آخری حصہ ہیں۔ (الاعلام للزرکلی ۶/ ۱۰۶) ہیں۔

آپ اشبیلیہ (Seville) میں پیدا ہوئے۔اپنے والد کے ہمراہ آپ نے مشرق کا سفر کیا، بغداد، شام اور مصر کے مشہور فقہا مثلاً طرطوشی، ابوبکر الشاشی اور الغزالی وغیرہ سے تحصیل علم کیا۔اور علوم دینیہ پر کامل عبور حاصل کیا-بالخصوص ادب میں غیر معمولی مہارت حاصل کی ۔۴۸۹ھ میں حج کیا، ۴۹۳ھ میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو آپ دوبارہ اشبیلیہ (Seville) تشریف لائے اور یہاں قاضی القضاء (Chief Justice) کے عہدہ پر فائز کیے گئے-اس کے بعد آپ فاس آ گئے اور یہیں ۵۴۳ھ، ۱۱۴۸ء میں وفات پائی- علامہ ابن العربی نے جس جگہ بھی سکونت اختیار کی علم وفن اور تصنیف وتالیف سے ان کا تعلق ضرور جڑا رہا- آپ کی تصانیف کی تعداد ۴۰ سے زائد بتائی جاتی ہے مگر ان میں اکثر ناپید ہیں مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں-

(۱) العواصم من القواصم (۲) عارضة الاحوذی فی شرح الترمذی (۳) القبس (فی شرح المؤطا) (۴) الا نصاف فی مسائل الخلاف (۲۰ جلدیں) (۵) اعیان الاعیان (۶) المحصول (اصول فقہ میں) (۷) کتاب المتکلمین (۸) قانون التاویل (۹) احکام القرآن (تفسیر میں) (الاعلام للزرکلی ۱۰۶/۶) اردو دائرہ معارف اسلامیہ حیدرآباد ۱/۲۰۵ ان کی تفسیر فقہ مالکیہ میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے-ابن العربی مالکی تھے اس لیے فقہ مالکی کا دفاع اور اس کی پرزور تائید وحمایت کرتے ہیں-وہ احکامی آیت کی تفسیر میں نمبر وائز مسائل کا استخراج کرتے ہیں اور کسی آیت کی تفسیر میں فقہ سے متعلق اکثر چیزوں کو بیان کر ڈالتے ہیں۔ اختلافی مسائل میں ان کا مناظرانہ اسلوب خاص طور پر دیکھنے کے قابل رہتا ہے۔ابن العربی اپنی باتوں میں مخلص ہیں۔آپ افراط وتفریط سے الگ ہو کر اعتدال پسندی کی راہ پر گامزن ہیں بعض لوگ ابن العربی پر ائمہ کے تئیں تعصب کا الزام عائد کرتے ہیں جو کسی طرح درست نہیں-

ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری قرطبی اندلسی مالکی (م ۶۷۱ھ /۱۲۷۳ء): امام قرطبی عظیم عالم دین عارف باللہ اور عابد شب زندہ دار تھے- دنیاوی کاموں سے الگ ہو کر ذکر وعبادت اور اخروی کاموں میں مصروف رہتے تھے-تکلف وتصنع سے پاک صاف سادگی کے دلدادہ تھے-عالم یہ تھا کہ صرف ایک لباس زیب تن کرتے اور سر پر ایک ٹوپی رہتی تھی-تمام اوقات اللہ کی عبادت وریاضت یا تصنیف و تالیف میں بسر کرتے تھے-آپ نے تصانیف کا بیش بہا ذخیرہ یادگار چھوڑا جو مندرجہ ذیل ہے-

(۱) الجامع الاحکام القرآن (۲۰ جلدیں) معروفہ بہ تفسیر قرطبی (۲) قمع الحرص بالزھد والقناعة (۳) الاسنی فی شرح اسماء الحسنی (۴) التذکار فی افضل الاذکار (۵) التذکرة باحوال الموتیٰ واحوال الآخرة

(الأعلام ۲۱۸/۶)

تفسیر قرطبی ایک معتدل، متوسط اور پاک باز صاحب بصیرت کی تالیف ہونے کی حیثیت سے اہل علم کے نزدیک معروف ومتداول ہے۔قرطبی کے یہاں بعض دوسرے مفسرین کی طرح شدت وسختی نہیں۔ مالکی ہونے کے باوجود اگر کوئی قوی دلیل وبرہان مذہب مالکی کے خلاف ہے تو اس وقت دلیل وحدیث کی پیروی کرتے ہیں لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں، وہ تقلید کے مخالف ہیں جیسے کہ غیر مقلدین دلیل میں اس بات کو شد ومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں کیوں کہ جب حدیث صحیح مل گئی اور قرطبی نے اسی پر عمل کیا تو اب امام مالک کا صحیح مسلک ومذہب ان کے نزدیک وہی ہوا کیوں کہ امام مالک سے ثابت ہے کہ جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مسلک ہے۔ اس لیے یہ عمل تقلید کے خلاف نہیں بلکہ نظریہ تقلید کو مزید قوت عطا کر رہا ہے-قرطبی نے زیر نظر تفسیر احکام ومسائل کے استنباط و استخراج ہی کے تعلق سے مرتب کی ہے اس لیے یہی عنصر ان کے ہاں غالب ہے وہ آیتوں کی تفسیر میں نمبر وائز مسائل کا استخراج کرتے ہیں اختلافی مسائل میں تمام مسالک کے دلائل وبراہین ذکر کرنے کے بعد اپنی فیصلہ کن رائے سے نوازتے ہیں-تفصیل کے لیے کسی بھی آیت کے ذیل میں ان کی فقہی تفسیر کے شہ پارے دیکھے جا سکتے ہیں۔ (التفسیر والمفسرون ج۲ ۴۵۹، ۴۶۰)

خلاصہ یہ کہ امام قرطبی کی تفسیر اپنی جامعیت غیر جانبداری اور اعتدال وتوازن کی وجہ سے اہل علم کے نزدیک زیادہ مسلم ومقبول ہے۔ امام قرطبی کے بارے میں مؤرخین کا ماننا ہے کہ ان کی قوت استخراج و استنباط اتنی تیز اور پختہ تھی کہ ایک آیت کی تفسیر میں مسائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ امام قرطبی اس وصف کے مالک ہوتے ہوئے آیتوں کی تفسیر کو اپنی فکر کے تابع نہیں بنایا بلکہ فقہا ورائمہ مجتہدین نے جو اصول اور ضوابط فراہم کیے تھے اسی کے آئینے میں آپ

سے گفتگو کی ہے اور ان کے مسالک و مذاہب کو غیر جانب دارانہ طور پر بیان کیا۔ نیز کہیں کہیں مذہب مالکی کی قوت بھی ثابت کی ہے امام کا یہ عمل کھلے بندوں ان کے مقلد ہونے کا ثبوت فراہم کررہا ہے

قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی (۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء/ ۱۲۲۵–۱۸۱۰ء).

قاضی ثناء اللہ حنفی مجددی برصغیر کے نامور عالم دین اور بے مثال مفسر گزرے ہیں۔ مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے، دہلی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ–۱۷۶۲ء) سے حدیث کی اور دیگر اکابر علماء و مشائخ دہلی سے علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کیے۔ حافظ محمد عابد لاہوری سندی سے علم طریقت حاصل کیا نیز مشہور زمانہ صوفی حضرت شیخ مرزا مظہر جان جاناں سے بھی علم تصوف حاصل کیا۔ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی باطنی خوبیوں کو دیکھ کر "علم الہدی" کا لقب دیا۔ تحصیل علم کے بعد قاضی صاحب وطن مالوف پہنچ کر تصنیف و تالیف اور علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت میں لگ گئے چنانچہ آپ نے تفسیر و کلام، تصوف اور دیگر علوم پر اپنی بیش بہا تصانیف کا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ قاضی صاحب اپنے دور میں اپنی جودت طبع، صلابت فکر، اور پختگی عقل میں مشہور تھے اسی سبب پانی پت میں منصب قضا پر فائز رہ کر اس کا حق ادا کیا۔ آپ کی تحقیقی خدمات اور ذہانت کو دیکھ "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے آپ کو "بیہقی وقت" کا خطاب دیا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تیس سے زائد بتائی جاتی ہے۔ مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) وصیت نامہ (۲) مالا بد منہ (۳) ارشاد الطالبین (۴) جواهر القرآن (۵) شہاب ثاقب (۶) تذکرۃ المعاد (۷) رسالہ در اباحت و حرمت سرود (۸) رسالہ در مسئلہ سماع و وحدت وجود (۹) السیف المسلول (۱۰) رد مذہب شیعہ (۱۱) رسالہ حرمت متعۃ اور (۱۲) التفسیر المظہری

اپنی تفسیر میں قاضی صاحب نے محدثانہ عظمت دکھائی ہے، نیز علم قرات، لغت اور دیگر متعلقہ بحثوں کو بھی اختصاراً جگہ دی ہے۔ اس تفسیر میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ اس میں احکامی آیات کی تفسیر میں فقہی مسالک کا بیان ملتا ہے۔ اختلافی مسائل میں مختلف مسالک کے دلائل و براہین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تفسیر مظہری قدیم مفسرین کے اقوال کی جامع اور تاویلات صحیح سے مزین ہے۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۶/ ۱۰۳۲–۱۰۳۳) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں تقلید سے متعلق مفسرین اور ان کی تفاسیر کے حوالے سے جس طرح کی بحثیں پیش کی گئیں اس کا مقصد یہ ہے کہ علوم قرآن اور اللہ کے کلام کے اسرار و رموز سے واقف کاروں کی ایک مستند اور معتبر جماعت جن کے علمی جاہ و جلال پر امت کا سواد اعظم یقین و ایمان رکھتا ہے وہ جماعت بھی تقلید کے سلسلے میں نیت کے اعتبار سے نہ صرف مخلص ہے بلکہ خود ان کا عمل بھی اسی کا مطابق رہا ہے۔ یونہی قرآن کریم کی فقہی تفسیر میں بھی ان کا قلم شتر بے مہار کی طرح بہکا نہیں ہے اور نہ قلم سے خود ساختہ باتیں رقم کی ہے بلکہ مذاہب سے آئینے میں جو باتیں تنقیح ہو سکتی تھیں انہیں ہو بہو قلم بند کیا ہے۔ اگر کسی مفسر نے نکتہ آفرینی اور مسائل و احکام کے استنباط و اختراع میں داد تحریر دی ہے، تو اس میں بھی ائمہ مجتہدین کے وضع کردہ اصول و ضوابط کی پوری پوری پاسداری نظر آتی ہے۔ جب امت کا یہ تابر اطبقہ ائمہ کی تقلید سے اپنے آپ کو آزاد نہیں گردانتا تو آج کے اس علمی زوال اور قحط الرجال کے دور میں مسلمان کیوں کر شرعی احکام و مسائل تقلید سے اپنے آپ کو آزاد کر سکتا ہے۔ یہ بات ائمہ تفسیر سے اندھی عقیدت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ وقت کی ایک ٹھوس اور ناقابل انکار حقیقت کا اظہار ہے، جس کے بغیر مسلمان ہی نہیں کوئی بھی انسان ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ یونکہ یہ روایت رہی ہے ہر ناواقف کار شخص اپنے سے زیادہ جاننے والے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے اسی طرح دینی و شرعی امور و احکام جن و اللہ و رسول کے کلام سے براہ راست کوئی شخص اخذ نہیں کرسکتا ایسے مسائل میں اگر وہ مجتہدین کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس میں حیرت کیوں؟ جب کہ یہی فطری آزادی ہے، ورنہ اگر ہر شخص شریعت میں بھی ہر طرح کی آزادانہ تجدد پسندی کا مظاہرہ کرنے لگے، جیسے کہ غیر مقلدین کرتے ہیں تو اسلامی شریعت کا اللہ ہی حافظ۔ جس طرح معاشرے میں زیادہ آزادی اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے، یونہی شریعت میں بھی نا مناسب تجدد پسند اور ناموزوں آزادی کی وجہ سے عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لیے افراط و تفریط سے ہٹ توازن و اعتدال کی راہ اپنانے میں قوم، ملت اور شریعت کی بھلائی ہے۔

مولانا دلشاد احمد قادری ☆

مسانید امام اعظم

سراج امت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا علم حدیث میں جو مقام ومرتبہ ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں ہے، جہاں ایک جانب آپ امام الفقہ ہیں، وہی دوسری جانب آپ امام الحدیث بھی ہیں، بعض لوگ تعصب کی بنا پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ علم حدیث میں بہت کم درک رکھتے تھے، آپ کا علم حدیث میں مبلغ علم چند احادیث ہیں، ان متعصبین ومخالفین کی یہ الزام تراشی حقیقت سے انتہائی دور ہے، امام اعظم علیہ الرحمہ نے ہزارہا مسائل کا استخراج واستنباط فرمایا، جس کے احسان سے امت مسلمہ تا قیامت سبکدوش نہیں ہوسکتی، یہ استخراج واستنباط آپ کی وسعت علم حدیث پر واضح طور پر دلالت کررہا ہے۔

استخراج مسائل سے صرف نظر آپ کی وسعت علم حدیث پر آپ کی مسانید بین ثبوت فراہم کرتی ہیں، جس کثرت سے مسانید ابی حنیفہ لکھی گئیں، شاید ہی کسی شخص کی مسانید لکھی گئیں ہوں، صحاح، سنن، جوامع، مسانید، معاجم وغیرہ مختلف عنوانات حدیث پر بے شمار کتابیں تالیف کی گئیں۔ لیکن کسی ایک شخص کی روایت کو مستقل مجموعہ کی شکل میں قلم بند کرنے کا رواج نہ تو علمائے متقدمین کے دور میں ہوا اور نہ ہی علمائے متاخرین کے دور میں ہوسکا، میرے انتہائی ناقص ومحدود مطالعہ کی روشنی میں امام اعظم کی فرید العصر شخصیت ایسی ہے، جن کی روایات کے ساتھ معمول سے زیادہ اعتناء کیا گیا اور کثرت سے ان کی مسانید مرتب کی گئیں، مسانید ابی حنیفہ کو مرتب کرنے والے اشخاص معمولی نہیں ہیں، بلکہ اپنے زمانے کے ائمہ وقت اور حفاظ حدیث ہیں یہ حضرات خود اس لائق تھے کہ ان کی مسانید لکھی جائیں امام اعظم کی اس خصوصیت میں اگر آپ کا کوئی ہمسر ہوسکتا تھا تو وہ امام مالک علیہ الرحمہ کی ذات ہوسکتی تھی۔

ان مسانید کی موجودگی میں آپ پر یہ الزام لگانا کہ آپ کا مبلغ علم حدیث چند احادیث ہیں، انتہائی بے انصافی وبددیانتی کی بات ہے۔ اب ہم ذیل میں ان محدثین وحفاظ حدیث کی تحقیق پیش کرتے ہیں، جنہوں نے امام اعظم کی مرویات کو مستقل طور پر علیحدہ تصنیفات میں مدون فرمایا ہے۔

(۱) حافظ ابن عساکر: ابوالقاسم علی بن حسن الدمشقی الشافعی مشہور اور نامور محدث ہیں آپ کی ولادت ۴۹۹ھ میں اور وفات ۱۱ر رجب ۵۷۱ھ میں ہوئی۔ حافظ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں آپ کا ذکر ان الفاظ سے شروع کیا ہے **ابن عساکر الامام الحافظ الکبیر محدث الشام فخر الائمة صاحب التصانیف والکتب** (تذکرۃ الحفاظ ص:۱۲۲، ج:۴) ابن عساکر حافظ کبیر محدث شام فخر ائمہ اور صاحب تصنیف شخص ہیں، ان ہی ابن عساکر نے امام اعظم کی روایت کردہ احادیث کو یکجا فرمایا، ان کی تالیف کردہ کتاب مسند ابی حنیفہ کا ذکر محدث زاہد کوثری صاحب اور ڈاکٹر کردعلی صاحب نے بھی کیا ہے، ابن عساکر کی مسند ابی حنیفہ کا شمار جامع مسانید میں ہوتا ہے۔

(۲) حافظ ابن شاہین: ابوحفص بن احمد بن عثمان بغدادی معروف بہ ابن شاہین کی ولادت باسعادت ۲۹۷ھ میں ہوئی اور آپ کا وصال ۳۸۵ھ میں ہوا آپ کا شمار بلند پایہ محدثین اور نامور مصنفین میں ہوتا ہے، آپ اپنی خود نوشت میں تحریر کرتے ہیں کہ۔

''میں نے تین سو تیس کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں تفسیر بھی ہے ایک ہزار مسند کے تیرہ سو، تاریخ کے ڈیڑھ سو جزء ہیں''۔

(تذکرۃ الحفاظ ص ۱۹۶، ج ۳)

حافظ ذہبی ان کے بارے میں رقم طراز ہیں **ابن شاهين الحافظ المفيد المكثر محدث العراق صاحب التصانيف** (تذکرۃ الحفاظ ص۔۱۹۵، ج:۳) ابن شاہین محدث عراق، صاحب تصانیف، حافظ حدیث تھے۔ انہوں نے محمد بن الباغندی، محمد بن ہارون مخذر اور ابوحبیب بن العباس وغیرہ سے احادیث کی اور بہت لوگوں نے آپ سے روایت کی ہے، حافظ ابن شاہین نے امام اعظم کی جو مسند لکھی ہے، اس کا تذکرہ محمد زاہد کوثری نے اپنی تالیف تانیب الخطيب **في ماساقه في ترجمة ابي حنيفة من الاكاذيب** میں کیا ہے۔

(۳) حافظ ابن خسرو: ابوعبداللہ حسین بن محمد بن ...

المتوفی ۵۲۲ھ بڑے پائے کے محدث گزرے ہیں، فن حدیث میں حافظ ابن عساکر کو آپ سے شرف تلمذ حاصل تھا، انہوں نے طلب حدیث میں بڑی جانفشانی سے کام لیا، یہاں تک کہ ان شیوخ سے بھی سماعت حدیث کی جو خود نیچے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، دور دراز سے آنے والے تشنگان علم حدیث کو سیراب کیا اور امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی مسانید کو جمع فرمایا، آپ فقاہت میں بھی یکتائے زمانہ تھے، حافظ شمس الدین ابو المحاسن محمد علی حسینی المتوفی ۷۶۵ھ نے صحاح ستہ، موطا، مسند شافعی، مسند احمد اور مسند ابی حنیفہ کے رجال کے حالات ایک مبسوط کتاب میں تحریر فرمائے ہیں۔ جس کا نام التذکرة برجال العشر ہے اس میں حافظ حسینی نے امام ابوحنیفہ کی تمام مسانید میں سے جس مسند کا انتخاب کیا ہے، وہ حافظ ابن خسرو کی مسند ہے، اس انتخاب سے ابن خسرو کی تالیف کردہ مسند ابی حنیفہ کے مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۴) حافظ محمد بن مخلد بن حفص دوری: - ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے، دوری عطاء کی نسبت سے شہرت ہے، ۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۱ھ میں وفات ہوئی، فن حدیث کی تحصیل یعقوب دورقی زبیر بن بکار، حسن بن عرفہ اور امام مسلم بن حجاج وغیرہ سے کی، ان سے دارقطنی، ابن عقدہ اور ابن المظفر جیسے اکابر حفاظ نے اس فن عظیم کو حاصل کیا۔ ("تذکرة الحفاظ" ۳/۸۲۸، دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان ۱۳۷۴ھ) میں ذہبی لکھتے ہیں "**كان معروفا بالثقة والصلاح والاجتهاد في الطلب**" محمد مخلد ثقاہت صلاح ونیکی اور طلب حدیث کے لیے کوشش کرنے میں معروف ومشہور تھے، محدث دارقطنی سے ایک بار ان کے متعلق دریافت کیا گیا، آپ نے جواب: **يا هو ثقة مامون** وہ ثقہ مامون ہیں، حافظ ابن مخلد رحمۃ اللہ علیہ نے امام اعظم ابوحنیفہ کی روایت کو ایک مستقل تالیف میں علیحدہ جمع فرمایا ہے، جس کا ذکر محدث خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد میں متعدد جگہ آیا ہے۔ لہذا محمد ابن الحسن بن الوازع ابو داؤد الجمال کے تذکرہ میں لکھتے ہیں "**روى عنه محمد بن مخلد الدوري في جمعه حديث ابي حنيفة**" ان سے محمد بن مخلد دوری نے اپنی کتاب جمع حدیث ابی حنیفہ میں روایت کی ہے۔

(۵) حافظ محمد بن المظفر - ابوالحسین محمد بن المظفر بغدادی کی ولادت ۲۸۶ھ میں ہوئی، کم سنی سے ہی حدیث کی سماعت شروع کر دی، جب آپ کی عمر صرف چودہ سال تھی، اسی وقت سے آپ طلب حدیث میں مصروف ہو گئے۔ طلب حدیث کے سلسلے میں مصر، شام، جزیرہ اور عراق کی خاک چھانی، انہوں نے امام محمد بن جریر طبری سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا، اکابر محدثین دارقطنی، ابن شاہین، برقانی اور ابونعیم جیسے اپنے وقت کے یگانہ روزگار حضرات نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔ دارقطنی نے ہزارہا احادیث کریمہ کی سماعت آپ سے کی ہے، اسی سبب دارقطنی آپ کی انتہائی تعظیم وتکریم کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ کبھی آپ کی موجودگی میں سہارا لگا کر نہیں بیٹھے، ہمیشہ آداب تلمذ کو پیش نظر رکھ کر با ادب بیٹھتے۔ حافظ امام ذہبی اپنی شہرہ آفاق کتاب تذکرة الحفاظ میں آپ کے بارے لکھتے ہیں "**محمد بن المظفر الحافظ الامام الثقة محدث العراق**" (تذکرة الحفاظ ص: ۳/۱۸۹) حافظ امام محمد بن مظفر ثقہ اور محدث عراق تھے۔ پھر آگے چلکر لکھتے ہیں: "**وجمع والف و عن مطالق هذا الفن لم يتخلف روى عنه الدار قطني و ابن شاهين و ابو الفتح ابي الفوارس و الماليني و ابو نعيم**" انہوں نے احادیث جمع فرمائی اور کتب تالیف فرمائی، جو اس مبارک فن کے اصول سے تجاوز نہیں کرتی ہیں، ان سے دارقطنی، ابن شاہین، ابو الفتح ابی الفوارس، المالینی اور ابونعیم نے روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے "**تعجيل المنفعة بزوائد رجال الائمة الاربعة**" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے جو مسند ابی حنیفہ لکھی ہے، وہ حافظ ابوبکر المقری کی مسند ابی حنیفہ کے برابر ہے، جس میں صرف امام ابوحنیفہ سے مروی احادیث مرفوعہ درج ہیں اور یہ امام حارث کی تصنیف سے چھوٹی ہے۔

(۶) حافظ ابونعیم اصبہانی: - حافظ ابونعیم اصبہانی مشہور محدث اور مصنف ہیں ۳۳۶ھ میں ولادت ہوئی، صغرسنی میں ہی ساری دنیا کے مشہور مشائخ کرام سے روایت حدیث کی اجازت مل چکی تھی، حافظ ذہبی ان کے متعلق لکھتے ہیں: "**له تهيا له من لقى الكبار مالم يقع لحافظ**" کبار محدثین سے جس قدر ان کو شرف ملاقات حاصل ہوا وہ کسی اور حافظ حدیث کو نہ ہوسکا، امام ذہبی نے آپ کا ذکر تذکرة الحفاظ میں "**ابو نعيم الحافظ الكبير محدث العصر**" کے الفاظ سے کیا ہے (تذکرة الحافظ ص: ۲۹۱، ج: ۳ مطبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد) حافظ ابونعیم نے ضخامت کے اعتبار سے اگرچہ چھوٹی مسند ابی حنیفہ لکھی ہے۔ مگر وہ بہت جامع ہے، انہوں نے انتہائی تحقیق کے بعد اس کے

متابعات کوذکر کیا ہے، نیز رواۃ کے اوہام کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔

(۷) حافظ ابن المقری - حافظ ابن المقری اصبہانی بڑے مشہور مصنف اور اکابر حفاظ حدیث میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں، فن حدیث میں امام طحاوی کے شاگرد ہیں اور ان کی مشہور و معروف تصنیف "شرح معانی الآثار" کے ان سے راوی ہیں، کثیر لوگوں نے آپ سے روایت کی ہے، حافظ امام ذہبی ان بارے میں فرماتے ہیں "**محدث کبیر، صاحب مسانید سمع مالا یحصی کثـرة**" وہ محدث کبیر عالم مسانید ہیں اور بے شمار احادیث نبویہ کی سماعت کی، خود ابن المقری کا بیان ہے کہ میں نے طلب حدیث میں چار مرتبہ مشرق ومغرب کا سفر کیا ہے، آپ کی وفات ۳۸۱ھ میں ہوئی، انہوں نے "مسند ابی حنیفہ" لکھی، جس کا اعتراف امام ذہبی کو بھی ہے، تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں **وقد صنف مسند ابی حنیفة**" انہوں نے مسند ابی حنیفہ تصنیف فرمائی (ص ۳/۱۸۳) حافظ زین الدین قاسم بن قطلوبغا نے ابن المقری کی مسند ابی حنیفہ کے رجال کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے، حافظ قاسم نے اس مسند کی احادیث کو ابواب فقہیہ پر بھی مرتب کیا ہے۔

(۸) حافظ عصر ابن عقدہ - عقدہ آپ کے والد کا نام تھا جو ایک نیک سیرت، وجیہ صورت شخص تھے اور نحو کی تعلیم دیا کرتے تھے، حافظ ذہبی نے ابن عقدہ کو حافظ عصر اور محدث بحر کے لقب سے ملقب کیا ہے، پھر آگے چل کر ان کے بارے میں لکھتے ہیں "**وکان الیه المنتهی فی قوة الحفظ و کثرة الحدیث و صنف و جمع فی الابواب والتراجم**" (تذکرۃ الحفاظ ص ۳/۸۵) قوۃ حافظہ اور کثیر حدیث کی ان پر انتہا ہوگئی، انہوں نے ابواب و تراجم کے دونوں عنوانوں کے تحت تصنیف و تالیف کی، اور احادیث جمع فرمائی۔ حافظ ابن الجوزی المنتظم میں لکھتے ہیں کہ آں موصوف خود اکابر حفاظ میں سے تھے اور ان سے اکابر حفاظ ابوبکر بن الجعابی، عبد اللہ بن عدی طبرانی، ابن المظفر، دارقطنی اور ابن شاہین نے احادیث روایت کی ہیں، حافظ بدرالدین محمود عینی شارح بخاری نے "تاریخ کبیر" میں لکھا ہے کہ "**ان مسند ابی حنیفة لابن عقدہ یحتوی وحدہ علی مایزید علی الف حدیث**" ابن عقدہ کی مسند ابی حنیفہ ایک ہزار سے زائد احادیث پر مشتمل ہے۔

(۹) حافظ ابن عدی: - ابو عبد اللہ بن عدی کی ۲۷۷ھ میں ولادت ہوئی - فن جرح وتعدیل میں ان کا بڑا شہرہ ہے، فن جرح وتعدیل میں شہرۂ آفاق کتاب "الکامل فی الجرح والتعدیل" تصنیف فرمائی، حدیث میں امام نسائی اور ابویعلی موصلی کے شاگرد ہیں، حافظ نے بہت جامع مسند ابی حنیفہ لکھی ہے اور اس مسند کے دیباچہ میں امام ممدوح کے مناقب وفضائل بھی ذکر کیے ہیں۔

(۱۰) حافظ دارقطنی: - ابوالحسن علی بن عمر مشہور معروف محدث اور صاحب تصانیف شخص ہیں، ۳۰۶ھ میں ان کی پیدائش ہوئی اور ۳۸۵ھ میں وفات پائی، دارقطنی نے امام اعظم ابوحنیفہ کی جو مسند لکھی ہے اس کا ایک نسخہ خطیب بغدادی کے پاس بھی تھا۔

(۱۱) حافظ ابوالقاسم - عبد اللہ بن محمد ابی العوام السعدی المتوفی ۳۳۵ھ یہ امام نسائی اور امام طحاوی کے شاگرد رشید ہیں، آپ نے امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے مناقب میں بھی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، یہ مسند ابی حنیفہ بھی اسی کتاب کا ایک جزء ہے، یہ مصر میں عہدہ قضاء پر بھی فائز رہے ہیں۔

(۱۲) مسند الدنیا: - قاضی ابوبکر محمد بن عبد الباقی المعروف بقاضی المرستان بہت مشہور محدث تھے، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابوالقاسم اسماعیل اصفہانی کے تذکرہ میں ان کا ذکر بھی کیا ہے، ترانوے سال کی عمر میں بھی ان کے حواس میں ذرا تغیر نہیں ہوا۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔

المیزان میں حافظ ابن خسرو کے تذکرہ میں اس امر کے ماننے سے انکار کیا ہے کہ قاضی صاحب موصوف نے امام ابوحنیفہ کی کوئی مسند تالیف کی ہے، حالانکہ خود ان کے نامور شاگرد حافظ شمس الدین سخاوی قاضی صاحب سے ان کی مسند بسند ذیل روایت کرتے ہیں **عن التدمری عن المیدومی عن النجیب، عن ابن الجوزی عن جامع المسند قاضی المرستان** اور حافظ عبدالقادر قرشی نے "الجواہر المضیئة" میں نصر بن سیار بن صاعد کے تذکرہ میں حافظ سمعانی سے نقل کیا ہے کہ:

"میں نے نصر سے امام ابوحنیفہ کی کتاب الاحادیث کا سماع کیا، جس کو عبد اللہ بن محمد بن الانصاری نے جمع کیا ہے، نصر اس کتاب کی روایت اپنے دادا صاعد سے کرتے ہیں اور صاعد خود قاضی صاحب سے - محدث خوارزمی نے بھی جامع المسانید میں اس کتاب کی متعدد

سندیں اپنے سے لے کر قاضی مرستان تک ذکر کی ہیں۔

(۱۳) حافظ طلحہ ۔طلحہ بن محمد جعفر الشاہد ابو القاسم ۲۹۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۸۰ھ میں وفات پائی اور اپنے وقت کے بے مثال محدث ہیں، علامہ خوارزمی لکھتے ہیں، حافظ تقی الدین سبکی نے ''شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام'' میں ان کی مسند سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے، جس کی سند ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ ''**وفی مسند الامام ابی حنیفہ رحمہ اللہ** کی تصنیف **ابی القاسم طلحہ بن جعفر الشاھد العدل حدثنی**'' محدث خوارزمی نے ان کی مسند کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حروف معجم پر مرتب ہے۔

(۱۴) حافظ اشنانی ۔یہ نامور محدث اور صاحب تصانیف شخص ہیں، حافظ طلحہ بن محمد ان کے بارے میں لکھتے ہیں ''**کان من اجلۃ اصحاب الحدیث المجودین و احد الحفاظ و قد حدث حدیثا کثیرا، حمل الناس عنہ قدیما و حدیثا**'' یعنی یہ بڑے پایہ کے جلیل القدر محدثین اور حفاظ حدیث میں سے تھے، انہوں نے کثرت سے احادیث بیان کی ہیں اور لوگوں نے ہر دور میں ان سے روایات کی ہیں، انہوں نے امام ابوحنیفہ کی جو مسند تالیف کی ہے، محدث خوارزمی نے اس سے جامع المسانید میں نقل فرمائی ہے۔

(۱۵) امام حارثی ۔مشاہیر ائمہ احناف میں سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے رسالہ ''الانتباہ'' میں ان کو اصحاب الوجوہ میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اپنے زمانے میں فقہائے حنفیہ کا مرجع تھے۔ فقہ کی تحصیل آپ نے امام ابوحفص صغیر سے کی تھی، طلب حدیث میں امام حارثی نے خراسان، عراق اور حجاز کا سفر کیا اور بہت سے شیوخ وقت سے اس فن عظیم کی تحصیل کی۔ ماہر فن رجال امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں قاسم بن اصبغ کے ترجمے میں بضمن وفیات ۳۴۰ھ ان کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے، امام ذہبی لکھتے ہیں: ''**فیھا مات عالم ماوراء النھر و محدثہ الامام العلامۃ ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن یعقوب بن الحارث الحارثی البخاری الملقب بالاستاذ جمع ابی حنیفۃ الامام ولہ اثنتان و ثمانون سنۃ** (تذکرۃ الحفاظ، ص:۲۷، ج:۳)

اسی سال ماوراء النہر کے عالم حدیث علامہ ابومحمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب بن الحارث الحارثی کی وفات ہوئی، جن کا لقب استاذ تھا، انہوں نے امام ابوحنیفہ کی مسند جمع فرمائی، بیاسی سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تعجیل المنفعہ میں ان کو حافظ حدیث تسلیم کیا ہے، بڑے بڑے حفاظ حدیث جیسے حافظ ابن مندہ، حافظ ابن عقدہ اور حافظ ابوبکر جعابی فن حدیث میں ان کے شاگرد تھے۔

(۱۶) حافظ ابن القیسرانی ۔ابو الفضل محمد بن طاہر بن علی معروف بہ ابن القیسرانی ۴۴۸ھ میں پیدا ہوئے اور ماہ ربیع الاول ۵۰۷ھ کو وفات پائی۔ بہت بڑے حافظ حدیث گزرے ہیں، طلب حدیث میں اتنا سفر طے کیا کہ دو مرتبہ پیشاب سے خون آنے لگا، یہ برہنہ پا بغیر سواری کے سفر کرنے کا نتیجہ تھا، رجال و متون کی بڑی معرفت رکھتے تھے، کثیر التصانیف تھے، انہوں نے اطراف احادیث ابی حنیفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس کتاب کا ذکر ان کی مشہور تصنیف ''**الجمع بین الرجال الصحیحین**'' کے آخر میں موجود ہے، اطراف پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں متن حدیث کے ابتدائی ٹکڑے کو مع سند کے بیان کی جاتی ہیں، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں امام ابوحنیفہ کی مختلف مسانید سے ان کی حدیث کے اطراف کو لے کر جمع کر دیا ہے۔

(۱۷) محدث عیسی الجعفری المغربی ۔محدثین متاخرین میں سے ہیں، ان کی وفات ۱۰۸۰ھ ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ''**انسان العینین فی مشائخ الحرمین**'' میں ان کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

''یکے از علماء ثقلین بود و وے استاد جمہور اہل حرمین است و یک از ادعیہ حدیث'' (محدث عیسی الجعفری) ثقات میں سے ہیں اور جمہور اہل حرمین کے استاذ ہیں، نیز داعی حدیث ہیں، محدث عیسی باوجود یکہ دور آخر کی پیداوار ہیں اور ان کا زمانہ بہت ہی بعد کا ہے تاہم جس شان کی انہوں نے امام اعظم ابوحنیفہ کی مسند تالیف کی اور جن شروط کا اس میں اہتمام کیا وہ خود شاہ صاحب ہی کی زبان سے سننے کے لائق ہے فرماتے ہیں

''مسند برائے امام ابوحنیفہ تالیف کردہ در آنجا عنعنہ متصلہ ذکر کردہ در حدیث از آنجا بطلان زعم کسانیکہ گویند سلسلہ حدیث امروز متصل نماندہ واضح تر می گردد''

انہوں نے امام ابوحنیفہ کی ایک ایسی مسند تالیف کی ہے کہ جس میں اپنے سے لے کر امام موصوف تک حدیث کے اتصال سند کو بیان کیا ہے اور یہاں سے ان لوگوں کے دعوی کا باطل ہونا خوب ظاہر ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا سلسلہ آج کل متصل نہیں رہا۔

فی الجملہ یہ ان مشاہیر کرام کا تذکرہ تھا جو میدان حدیث کے ماہرین ہیں، ان میں سے ہر ایک نے امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کی مرویات کو مستقل تصانیف میں اپنی اسانید کے ساتھ جمع کیا ہے، پھر قاضی القضاۃ ابوالموید محمد بن محمد خوارزمی المتوفی ۶۵۵ھ نے جامع مسانید الامام الاعظم میں امام اعظم کی مسانید کے پندرہ نسخوں کو یکجا جمع کرنے کی قابل ستائش کوشش کی ہے۔ چنانچہ جامع مسانید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

"میں نے شام میں بعض جہلاء کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ امام ابو حنیفہ کی کوئی مسند نہیں ہے اور وہ فقط چند احادیث کے راوی ہیں، یہ سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا اور مجھے حمیت مذہبی نے آگھیرا، میں نے اسی وقت یہ عزم مصمم کر لیا کہ امام اعظم کی ان پندرہ مسانید کو جنہیں یکتائے روزگار علماء و محدثین کی جماعت نے بڑی جانفشانی کے ساتھ مرتب کیا ہے، یکجا کروں گا"

خوارزمی کی جامع مسانید کا ذکر شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی بستان المحدثین میں کیا ہے فرماتے ہیں کہ:

"مسند حضرت امام اعظم کہ بالفعل مشہور است تالیف قاضی القضاۃ ابوالموید محمد بن محمد الخوارزمی است، کہ در سنہ شش صد و ہفتاد و چہار آنرا رائج ساختہ، مسانید امام اعظم را کہ علماء سابق پر داختہ بودند دریں سند جمع کردہ بزعم خود ہیچ چیز را از مرویات امام اعظم ترک نہ کردہ وقبل از وے ہر چند مسانید بسیار برای مرویات امام اعظم ساختہ بودند چنانچہ خودش در خطبہ ایں مسند نام آنہاد مصنفین آنہا وسند خود بآں مصنفین بیوں نمودہ اما بیشہ رائج ومشہور دو مسند بود و تا حال موجود و مستند اول است اول مسند حافظ الحدیث عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی، دوئم مسند حافظ الوقت حسین بن محمد بن خسرو رحمۃ اللہ علیہ چنانچہ اجازت ایں ہر سہ براقم حروف نیز از شیوخ خود رسیدہ"

ترجمہ: مسند امام اعظم جو دور حاضر میں مشہور و معروف ہے قاضی القضاۃ ابوالموید محمد بن محمد الخوارزمی کی تالیف ہے، جس کو انہوں نے ۶۷۴ھ میں رواج دیا ہے، علمائے سابقین نے جن مسانید امام اعظم کی تالیف کی، خوارزمی نے ان کو اپنی مسند میں جمع کر دیا ہے اور اپنے خیال میں امام اعظم کی مرویات میں سے کوئی چیز ترک نہیں کی، ان سے پہلے بھی اگر چہ بہت سی مسندیں امام اعظم کی مرویات کے سلسلہ میں لکھی گئیں ہیں۔ چنانچہ خود خوارزمی نے اس مسند کے دیباچہ میں ان کے نام اور ان کے مصنفین کے نام اور ان مصنفین تک اپنی سند کو بیان کیا ہے۔ لیکن ان میں زیادہ تر مشہور اور رائج دو مسندیں رہی ہیں جو تا حال موجود و متداول ہیں، اول مسند حافظ الحدیث عبداللہ بن یعقوب الحارثی، دوم مسند حافظ الوقت حسین بن محمد بن محمد خسرو، لہٰذا ان تینوں مسندوں کی اجازت راقم الحروف (شاہ ولی اللہ) کو اپنے اساتذہ سے پہنچی ہے۔

مسند ابی حنیفہ کا علمی مقام:۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" میں مسند ابی حنیفہ کو احناف کی امہات کتب میں شمار کیا ہے، فرماتے ہیں کہ "مسند ابی حنیفہ کہ آثار محمد بنائے فقہ حنفیہ است،، فقہ حنفی کی اساس مسند ابی حنیفہ اور آثار امام محمد پر ہے، حافظ حسینی فرماتے ہیں کہ:

"مسند الشافعی موضوع لادلة علی ماصح عندہ مرویاته و کذالک مسند ابی حنیفه" مسند امام شافعی ان ادلہ پر مشتمل ہیں کہ جو امام ممدوح کی مرویات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں اور یہی حال امام ابوحنیفہ کا ہے۔

حافظ حسینی علیہ الرحمہ نے اس امر کا واضح طور پر اعتراف و اقرار کیا ہے کہ مسند امام شافعی کی طرح امام ابوحنیفہ کی مسند بھی امام ممدوح کے ان ادلہ پر مشتمل ہے، جو امام کی مرویات میں ان کے نزدیک صحیح تھے، یہ حسینی حنفی المذہب نہیں بلکہ شافعی ہیں اور ان کا شمار معمولی محدثین میں نہیں، حفاظ وقت اور ناقدین فن میں ہے، علامۃ الدہر شافعی المذہب عبدالوہاب شعرانی کی رائے مسانید امام حنیفہ کی نسبت ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں:

وقد من اللہ تعالیٰ علی بمطالعة مسانید الامام ابی حنیفه الثلاثة من نسخته صحیحة علیها خطوط الحفاظ آخرهم الحافظ الدمیاطی فرأیته لا یروی حدیثا الا عن خیار التابعین العدول الثقات الذین هم من خیر القرون بشهادة رسول اللہ علیه وسلم کالا سد و علقمة و عطاء، مجاهد و مکحول و الحسن البصری و اضرابهم رضی اللہ عنهم اجمعین۔ فکل الرواة الذین هم بینه وبین رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ولا متهم بکذب و ناهیک یا اخی بعد الته من ارتضا هم الا مام ابو حنیفه رضی اللہ عنه لان یا خذ عنهم احکام دینه مع شدة تروعه و تحرزہ و شفقته علی الامة المحمدیة۔

ترجمہ: اللہ رب العزت کا مجھ پر احسان عظیم رہا کہ امام ابوحنیفہ کی تین مسندوں کا ان کے صحیح نسخوں سے مطالعہ کرنے کی توفیق ملی، ان نسخوں پر حفاظ حدیث کے قلم کی تحریریں تھیں، جن میں آخری شخص حافظ دمیاطی ہیں، مطالعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ امام اعظم صرف ان تابعین کرام سے احادیث روایت کرتے ہیں جو اپنے وقت کے برگزیدہ ترین، عادل اور ثقہ حضرات تھے اور حدیث نبوی کی تصریح کے مطابق خیر القرون کے لوگ تھے، جیسے کہ اسود، علقمہ، عطا، مجاہد، مکحول اور حسن بصری، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ لہٰذا تمام وہ رواۃ جو امام اعظم ابوحنیفہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ہیں، سب کے سب عادل ثقہ نیک، اور برگزیدہ ہیں، ان میں کوئی شخص نہ کذاب ہے اور نہ ہی اس پر کذب کی تہمت لگائی گئی ہے۔ میرے عزیز ان کی عدالت کے لیے تمہیں یہی کافی ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے باوجود شدت ورع واحتیاط اور امت محمدیہ کا خاص خیال رکھنے کے، ان حضرات کو اس غرض کے لیے منتخب کرلیا کہ ان سے دینی احکام کو حاصل کریں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"کل حدیث وجدناہ فی مسانید الامام الثلاثۃ فھو صحیح" امام اعظم کی تینوں مسندوں میں ہم نے جو بھی حدیث پائی وہ صحیح ہے۔

یہ بات آپ کے ذہن نشیں رہے کہ اس بحث سے قبل امام شعرانی خود یہ تصریح کر چکے ہیں کہ

"انی لم اجب عن الامام ابی حنیفۃ وغیرہ بالصدر واحسان الظن کما یفعل ذالک غیری وانما اجیب عنہ بعد التتبع والفحص" میں امام ابوحنیفہ وغیرہ کے متعلق وسعت صدر اور حسن ظن کی بنا پر کوئی جواب دہی نہیں کروں گا، جیسا کہ دوسرے لوگ کرتے ہیں، بلکہ جو کچھ بھی جواب دوں گا وہ تلاش وتتبع کے بعد دوں گا۔

امام شعرانی کے اس بیان سے آپ پر روشن ہو چکا ہوگا کہ مسانید امام ابوحنیفہ کے بارے میں جو رائے انہوں نے قائم کی ہے، وہ محض حسن ظن کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ وہ پوری تحقیق اور تتبع کے بعد ہے۔

ان مسانید کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کا علم حدیث میں کیا مقام ومرتبہ ہے اور ان متعصبین کی الزام تراشی کس قدر زمینی حقیقت سے دور ہے۔ ☆☆☆

بقیہ: سعودی حکومت کے نظریات اور عملی کردار

ایک موقع سے سلفی خطیب معراج الدین ربانی سے کسی نے پوچھا کہ مسجدوں میں منارے بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جواب ملا: حرام ہے۔ سائل نے موقع گنوائے بغیر استفسار کرلیا کہ منارے تو حرمین شریفین میں بھی ہیں؟ جس کے جواب میں "فضیلۃ الشیخ" معراج الدین ربانی "گویا" ہوئے۔ شاہ فہد سے پوچھو کہ انہوں نے کیوں بنوائے ہیں۔ یہ ہے ایک بڑے ہندوستانی سلفی خطیب کا مبلغ علم واختیار، جو شب وروز سیدھے سادے عوام کو عقائد وعبادات کو گولیاں کھلاتا رہتا ہے۔ بدقسمتی سے میں مذکورہ سوال وجواب کی مجلس میں شریک تھا، یہ تو خیر کم وبیش آٹھ سال پرانا حادثہ ہے، جو میری نظروں کے سامنے پیش آیا تھا۔ حال تو یہ ہے کہ برصغیر کے سلفی معاشرہ میں شب وروز اس طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس سلفیوں سے کرنے کے لیے کچھ سوالات ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ کیا واقعی امام ابوحنیفہ عجمی تھے؟ اگر درست مان بھی لیا جائے تو کیا ان کی عجمیت منصب امامت فی الفقہ کے منافی ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ ان کو صرف سات حدیثیں یاد تھیں؟ کیا ابن خلدون کی سات حدیث والی روایت صحیحین میں موجود ہے کہ آپ نے اسے آنکھ بند کرکے تسلیم کرلیا؟ یا واقعی ہدایہ کسی کی کتاب ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے، تو یہ باتیں نوجوان سلفی طلبہ کی زبان پر کیسے آتی ہیں؟ کیا یہ سوالات عرب وعجم میں پھیلے ہوئے ملت اسلامیہ کے سواد اعظم اور ائمہ فقہ کے خلاف درون خانہ پکنے والی کھچڑی کی چغلی نہیں کھاتے؟

سلفی برادران کے لیے میری نصیحت نہیں بلکہ ان سے التجا ہے کہ اگر وہ شیخ ابن تیمیہ سے لے کر آج تک کے سعودی اور غیر سعودی علماء ہی کو اپنا مقتدی مانتے ہیں، تو مانیں۔ ہمارے کہنے سے وہ باز کیوں آئیں گے، لیکن "رفع الملام عن ائمۃ الاعلام" ابن تیمیہ کے فتاویٰ اور شیخ سلمان فہد العودہ کی کتاب "افعل ولا حرج" اور اس جیسی دوسری کتابوں کا مطالعہ کریں۔ اسلام، قوانین اسلام، ائمہ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف زبان کھولنے میں محتاط رہیں۔ اپنے معاشرہ میں احترام اور رواداری کو فروغ دیں۔ بصورت دیگر اگر ایک اور نئے فرقہ کی بنیاد مقصود ہو تو اس میں دیر نہ کریں۔ اسلام کے بیٹوں نے اسے انتشار وافتراق کے اتنے زخم دیے ہیں کہ وہ اس کا عادی ہو چکا ہے۔ ایک اور زخم کو برداشت کر لے گا۔ اللہ کی زمین بڑی ہے، جگہ بھی مل جائے گی اور دو چار ہزار ماننے والے بھی مل جائیں گے۔ لیکن اپنا نیا نام بھی منتخب کرلیں۔ ملت اسلامیہ پر احسان ہوگا۔

فقہ حنفی پر غیر مقلدوں کے اعتراضات کا ایک تنقیدی جائزہ

باب

۵

انکشافات

مولانا فیضان المصطفیٰ قادری ☆

غیر مقلدین کی بنیاد
کتاب و سنت یا ائمہ مجتہدین سے مخالفت؟

یہ چار امام کہاں سے آئے؟ ان کی تقلید کا حکم کس نے دیا؟ مذاہب فقہ کا چار میں انحصار کیوں؟ اب ان کے مقابل اجتہاد کیوں نہیں ہو سکتا؟ قول امام کو مانا جائے یا قول رسول کو؟ یہ سب سوالات بہت آسانی سے حل ہو جائیں گے اگر موجودہ دور کے علمی حقائق پر غور کیا جائے اور کسی مخاصمت کا جذبہ دل سے نکال دیا جائے۔ دراصل دین کی تعلیمات پر صحیح عمل تقلید کے بغیر ممکن نہیں۔ ورنہ عمل پر نہ کبھی مداومت ہو سکے گی نہ استقامت، اور دین میں اجتہاد مطلق کا کوئی تصور نہیں۔ ہر شخص کسی نہ کسی کا مقلد ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی نیا سوال ہوتا تو آپ وحی کا انتظار فرماتے، اور فرماتے: اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوحیٰ اِلَیَّ۔ آپ نے مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے، دو ذریعے عطا کیے کتاب اور سنت، دور صحابہ میں کتاب اور سنت کو ہی محور اجتہاد قرار دیا گیا، دونوں میں حکم نہ ملا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے مشورے سے صورت مسئلہ طے کی اور جو متفقہ فیصلہ ہوتا وہ اجماع امت قرار پاتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو قرآن وحدیث میں حکم نہ ملتا تو صرف انہیں پر اکتفا نہ کرتے بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فیصلوں میں تلاش کرتے اور یہی طرز عمل حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تھا۔ (۱) ائمہ مجتہدین نے بھی اپنی دسترس کے مطابق اپنے پیش رو فقہائے صحابہ وتابعین کے فیصلوں پر اعتماد کیا۔ لیکن ان ائمہ مجتہدین نے پہلے تو مسائل کو حل کرنے کے لیے قرآن وحدیث سے اصول مستنبط کیے، پھر ان اصول وقواعد کی روشنی میں زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو مدون کر کے علم فقہ کی شکل دیدی۔ ان کے مرتب کردہ اصول چونکہ اصول ہیں اس لیے زندگی کا کوئی گوشہ یا پہلو ان سے خارج نہ ہوگا، اور وہ قرآن وحدیث سے مستنبط ہیں اس لیے قرآن وحدیث ہی کے اصول قرار پائیں گے۔ علم فقہ کی بنیاد ڈالنے والے امام اعظم ابوحنیفہ ہیں۔ ان کے دور میں، اور ان کے بعد بہت ائمہ مجتہدین ہوئے، مثلاً امام اوزاعی، امام سفیان ثوری، امام اسحٰق بن راہویہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ، لیکن ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی کی فقہ پوری مدون نہ ہو سکی، وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ اس وجہ سے ان کی فقہ کو اپنی زندگی میں کوئی کیسے نافذ کرتا؟ دوسری طرف ائمہ اربعہ کی فقہ وفتاویٰ کی خدمت کرنے والے بہت ہوئے، تو ان پر عمل درآمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور سارے عالم اسلام میں یہ چار فقہی مذاہب پھیل گئے۔ جس امام کے فیصلے جہاں تک پہنچ سکے وہاں کے لوگوں نے انہی کی اتباع کی، گویا مختلف ذرائع سے جس کی جس تک رسائی ہوئی وہ اسی کا پیروکار رہا۔ کوئی حنفی ہوا، کوئی شافعی ہوا، کوئی مالکی ہوا، کوئی حنبلی ہوا، اب جو حنفی ہے وہ کسی اور امام کی تقلید کیسے کرتا جس کے سارے فیصلے اسے دستیاب نہیں ہیں۔

ان ائمہ مجتہدین کے فیصلوں کو ماننا اور ان پر عمل کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ ان کے فیصلے قرآن وحدیث واجماع امت کے اصول شرع پر مبنی ہیں۔ نہ یہ کہ ان اصول سے ہٹ کر خود ان کے ذاتی اقوال۔ اگر اس کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو ائمہ اربعہ مرجع امام نہ بنتے۔ ان کے اخلاص ووفور علم، قوت فیصلہ، استحضار علمی اور معیار تحقیق کی بنیاد پر ہی قوم نے ان پر اعتماد کا اظہار کیا اور جوں جوں علم گھٹتا گیا یہ اعتماد بڑھتا چلا گیا جو تقلید کی صورت اختیار کر گیا، امانت علم جوں جوں اٹھتی گئی اور آنے والا زمانہ گزرے ہوئے زمانے سے ابتر ہوتا گیا، مسلمانوں نے کسی ایک امام کی تقلید کا التزام کر لیا اور علماء نے مسلمانوں پر ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید واجب قرار دی۔ اور سارا عالم اسلام ان چار کی امامت پر متفق ہو گیا۔ مشہور مورخ ابن خلدون اپنے دور آٹھویں صدی ہجری کے بارے میں عالم اسلام میں تقلید ائمہ کے بارے میں لکھتے ہیں: وقد صار اھل الاسلام الیوم علی تقلید ھؤلاء الائمۃ الاربعۃ (۲) آج سارے مسلمان ان چار ائمہ کی تقلید پر گامزن ہو گئے۔ بالآخر تاریخی طور پر حق انہیں چار میں منحصر ہو گیا، کیونکہ ساری امت نے اس پر اتفاق کیا، اور امت باطل پر کبھی اتفاق نہ کرے گی (ان اللہ

لایجتمع امتی علی ضلالۃ)اوران میں سے کسی ایک کی اتباع کرنے کی بجائے کوئی اور راہ چلنے والا "وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی" کا مصداق قرار پائے گا۔ کیونکہ اب قرآن وحدیث کے احکام پر عمل کی یہی ایک واحد ممکنہ صورت ہے۔ اب نہ صحابہ رہے نہ تابعین، نہ تبع تابعین رہے نہ ائمہ مجتہدین، اخلاص کا دور بھی گیا، امانت علم بھی اٹھالی گئی، جو لوگ موجود ہیں ان میں اگر اخلاص عمل ہو تو نجات کے لیے یہی کافی ہے، اور خود ان کے کرنے کے کام بے انتہا۔ ورنہ آج تو ہر جگہ افتا کی میشنری قائم ہے، کہیں مفتی وقت کے پیچھے مجبوری بولتی ہو کبھی دولت، کہیں عوام یا انتظامیہ کا دباؤ، کہیں سیاسی حالات، کہیں مسلکی تعصب، کہیں کچھ، کہیں کچھ، جس کو تھوڑی سی عربی آگئی تو قرآن وحدیث پڑھ پڑھ کر جو منہ میں آتا ہے بکتا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بہت سارے امور تحقیق وتفتیش سے متعلق رکھے ہیں، سیاسی قوت واستحکام، انتظامی امور، معاشی واقتصادی وسائل کا فروغ، عقلی علوم، نو پید افقہی مسائل، ان میں جس قدر داد تحقیق دیا جائے کم ہے۔ لیکن یہ ضروری کام چھوڑ کر ہم اس چکر میں پڑجائیں کہ آخر امام ابوحنیفہ نے کس بنیاد پر اس مسئلے میں یہ فیصلہ کیا، امام شافعی نے ایسا کیوں کہا؟ امام مالک کی دلیل کتنی مضبوط ہے؟ امام احمد بن حنبل کے فیصلوں میں کتنی قوت استدلال ہے؟ ذرا معلوم تو کریں کہ کس کی دلیل مضبوط ہے اسی کے فیصلے کو مان لیا جائے؟ اور (بایں مبلغ علم) کسی کے استدلال میں کمزوری پائیں تو اسے ترک کردیں، جی ہاں، مجتہدین کو یہی حق حاصل ہے۔ ان کے لیے کچھ ضروری نہیں کہ اپنے پیش رو محقق کا فیصلہ یونہی مان لیں، یہی وجہ ہے کہ امام ابویوسف وامام محمد بن حسن شیبانی، امام زفر وامام عبداللہ بن مبارک وغیرہ اصول شرع میں تو امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہیں مگر مسائل میں تقلید نہیں کرتے بلکہ خود تحقیق کرتے ہیں۔ اور جس قدر زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے، تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اور سلسلۂ تحقیقات کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ نہ یہ کہ نشانۂ تحقیق انھیں امور کو بنایا جائے جو یگانۂ روزگار ماہرین کے ذریعہ فیصل ہو چکے ہوں، پھر تو سلسلۂ تحقیقات کو آگے کہاں بڑھایا گیا؟ بلکہ گھوم پھر کر ہم وہیں پہنچ گئے جہاں سے سفر شروع ہوا تھا۔ اسی لیے ہر دور کے ذی فہم وبصیرت علما کی ذمہ داری ہے کہ اس دور کے نو پیدا مسائل پر تحقیق کریں اور اپنی اس تحقیق میں گزشتہ ماہرین کی تحقیقات سے استفادہ کریں، دنیا جس قدر بڑھتی جائے گی مسائل بڑھتے جائیں گے، جس قدر مسائل ائمہ اربعہ کے سامنے تھے اس سے زیادہ مسائل اگلے دور میں سامنے آئے اور یہ مسائل بڑھتے ہی جائیں گے۔ کیوں نہ بڑھتے ہوئے مسائل کو ہی اپنی جولانگاہ فکر وتحقیق بنایا جائے۔ پھر یہ کون سی خدمت علم ودین ہے کہ اپنے حصے کے کام پر توجہ دینے کی بجائے اپنے پیش رو ائمہ کے کاموں پر بنام تحقیق تنقید کا بازار گرم کیا جائے؟

آخر امام کی اطاعت کا حکم تو رب نے دیا ہے۔ فرمان الٰہی ہے۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (النسا، ۵۹)اور اولوالامر میں فقہا، اور علما بھی داخل ہیں، عن ابن عباس ھم اھل الفقہ والدین (ابن کثیر) وعن جابر ومجاھد ھم اھل القرآن والعلم وقال الضحاک یعنی الفقہاء والعلماء فی الدین (قرطبی)۔ اب ذرا سوچو تو کسی اطاعت کیا ہوتی ہے، کیا یہ اطاعت ہے کہ جس کی اطاعت کی جائے پہلے اس کے دلائل دیکھ اور سمجھ لیے جائیں، مضبوط ومستحکم ہوں تو اطاعت کی جائے ورنہ نہیں، اگر دلائل کی بھرپور سمجھ اور اس کی بنا پر فیصلہ کرنے کی اہلیت ہوتی تو پھر خود ہی مطاع ہوگا نہ کہ مطیع۔ بلکہ ان ائمہ کے دلائل کی پرکھ رکھتا ہو، صحیح وسقیم سے الگ کرسکتا ہو تو پھر تو ان کا بھی امام ہوا۔ اب ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ ایسا کون ہے؟ کس نے ان کے دلائل کا تجزیہ کیا ہے؟ اگر نہیں، تو تم کو تو اطاعت اولوالامر کرنی تھی نہ کہ اتباع ہوائے نفس، کہ جو مسئلہ اچھا اور آسان لگے اسے لے لو اور جو مشکل لگے اسے چھوڑ دو۔ نفس کا حال نہیں معلوم؟ جو فیصلہ اچھا لگے گا اس کے دلائل بھی خوب بھلے معلوم ہوں گے۔ دل کی اتھاہ گہرائی سے برجستہ داد پر داد نکلے گی اور جو مسئلہ مشکل لگے گا عقل عیار اس کے دلائل میں کہیں نہ کہیں کوئی سقم یا کھوٹ نکال لے گی۔ آخر نفسانیت کا دور تو بہت پہلے شروع ہو چکا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ان اللہ لایقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤسا جھالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا (۳) اللہ تعالیٰ علم یوں نہ اٹھائے گا کہ لوگوں کے سینوں سے کھینچ لے بلکہ علما اٹھا لیے جائیں گے حتی کہ جب علما باقی نہ بچیں گے لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنائیں گے، ان سے مسائل پوچھے جائیں گے تو وہ بے علم فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں

کو بھی گمراہ کریں گے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اِنَّ مِنْ اشراط الساعۃ اَنْ یُرفَعَ العلمُ وَیظھر الجھلُ ،قیامت کی نشانی یہ بھی ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا اور جہالت عام ہوجائے گی۔
(ترمذی ابواب الفتن)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی پندرہ نشانیاں بیان فرمائیں جن میں آخری نشانی یہ ہے وَیلعن آخرُ ھذہِ الامۃ اَوَّلَھا۔اس امت کے اگلے لوگ اپنے پچھوں کو برا کہیں گے۔(۴)

خیرُ النَّاسِ قَرْنِی ثُمَّ الَّذِینَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِینَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ یاتی مِنْ بعدِھِمْ قومٌ یَتَسمَّنُوْنَ وَیُحِبُّوْنَ السِّمَنَ یُعطُوْنَ الشَّھادۃَ قَبْلَ اَنْ یُسْالُوْھا وَفی رِوَایۃٍ یَخُوْنُوْنَ وَلَا یُؤْتَمِنُوْنَ رواہ عمرانُ بنُ حُصَیْنٍ (۵) اچھے لوگ میرے عہد کے ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں پھر وہ جو ان کے بعد آئیں، پھر ان کے بعد ایسی قوم آئے گی جو ریاکار اور شہرت پرست ہوگی، بن مانگے گواہی دیں گے، امانتداری کے بجائے خیانت کریں گے۔

ہاں ان ائمہ اربعہ کا زمانہ دوسرا اور تیسرا زمانہ ہے۔امام ابوحنیفہ تو تابعی ہیں اور دوسرے ائمہ تبع تابعین سے ہیں۔امام ابوحنیفہ کا عہد ۸۰ھ تا ۱۵۰ھ ہے۔امام مالک بن انس کا ۹۳ھ تا ۱۷۹ھ ہے،امام شافعی کا ۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ ہے اور امام احمد بن حنبل کا دور ۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ ہے۔یعنی یہ ائمہ اسی دور کے ہیں جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درجۂ اعتبار دیا ہے۔

کہتے ہو کہ صحابہ کرام تو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی نہ تھے، بھلے آدمی! وہ کیوں ہوتے جب ان کے درمیان منبع شریعت موجود ہے، وہ تو صحابہ تھے ہمیں بھی صحابہ ہونا چاہیے؟ وہ تو انصار ومہاجرین، اصحاب بدر واصحاب بیعت رضوان تھے، بتاؤ اب ویسا ہی بننے کی کیا صورت ہے؟

اگر کہو، کوئی حنفی ہے تو کسی دوسرے امام کے فیصلوں کی اتباع کیوں نہیں کرسکتا؟ ہاں! اگر وہ مجتہد ہوگا تو بلاشبہ اسے ایک امام کے فیصلوں کی اتباع ضروری نہ ہوگی، بلکہ اس کے لیے تقلید منع ہے، اور اگر مجتہد نہیں تو جن مسائل پر عمل کررہا ہے آخر کس وجہ سے انہیں چھوڑے گا؟ اگر دوسرے امام کے مسائل اسے زیادہ قوی اور مدلل محسوس ہوئے تو اس کا یہ احساس کس قدر قوی اور مبنی برحقیقت ہے؟ یہ بات ائمہ مجتہدین کے حق میں ثابت ہوچکی، لیکن ذرا سوچو یہ احساس کہیں وسوسۂ شیطان تو نہیں؟ کہ رب نے فرمایا "وَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ" پھر تو احساس جو کہے اس کی موافقت ضروری ہے، اگر کہو بعض باتیں ایک امام کی مان لیں بعض دوسرے کی، یہ تمہارا منصب نہیں، ائمہ ترجیح اور اصحاب تمیز جو دلائل پر تفصیلی نظر رکھتے ہیں وہ ائمہ کرام کے اقوال میں ترجیح وتمیز کرتے ہیں کہیں فرمایا 'علیہ الفتوی'، کہیں فرمایا 'وبہ یفتی'، کہیں 'وھو الصحیح'۔

اور تحقیق مسائل کے لیے کوئی خود کو یا کسی ماہر کو ائمہ اربعہ کے درجے کا محقق ہونے کا دعوی کرے تو کیا اجتہاد کے لیے جن علوم میں مہارت اور جن امور میں دست رس ضروری ہے وہ اس میں موجود ہیں؟ مثلاً مانا کہ قرآن جو ان ائمہ کے سامنے تھا من وعن وہ ہر ایک کو میسر ہے۔لیکن کیا احادیث کے وہی وسائل اور وہی رواۃ، تحقیق سند حدیث کے وہی ذرائع یا ان سے بہتر ذرائع، اور تفتیش کے وہی یا بہتر وسائل اور اخلاص کا وہی یا اس سے بہتر ماحول میسر ہے؟ بعد کے دور میں احادیث کا سب سے معتبر ذریعہ صحاح ستہ تو خود مقلدین کی تالیف ہے۔خصوصاً بخاری ومسلم، انہیں دو کتب کو علم حدیث کا سب سے معتمد ترین ذریعہ مان کر ان ائمہ اربعہ کے فیصلوں کی تحقیق شروع کریں تو خود امام شافعی (جن کی فقہ کی موید حدیثیں اس میں جمع کی گئی ہیں) کے متعدد فیصلے کمزور ہوئے جاتے ہیں۔خود امام بخاری جو لاکھوں صحیح حدیثوں کے حافظ تھے صحیح بخاری میں صرف ساڑھے چار ہزار حدیثیں جمع کیں، آخر کیا چیز انہیں مجبور کرتی کہ ان کے مذہب فقہ کے خلاف جو احادیث ہوں وہ بھی درج کرتے۔انھوں نے ساری صحاح جمع کرنے کا التزام تو نہ کیا تھا۔لامحالہ ماننا پڑے گا کہ تحقیق حدیث کے جو ذرائع ان کو میسر تھے وہ اب یقیناً عنقا ہیں۔ذرا غور کریں اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی واضح ہدایت دی ہو تو وہ سننے والوں کے لیے بالکل قابل عمل اور مطلوب تھی، اسی حدیث کے مطابق صحابہ نے، تابعین نے، ائمہ مجتہدین نے فتوے دیے، لیکن آگے چل کر سلسلہ سند میں کوئی ضعیف راوی آگیا تو اب اس راوی کی وجہ سے وہ حدیث ضعیف ہوگئی، اب تو احکام میں وہ قابل عمل نہ ہوگی۔لہذا اگر تقلید نہ کرو تو اس حدیث کی بنیاد پر کسی امام نے جو حکم دیا تھا اب تم اسے رد کروگے حالانکہ حقیقتاً وہ مطلوب تھا۔

نہ جانے کہاں سے یہ خیال آیا کہ کسی معین امام کی تقلید کرنا اسے رب بنانا ہے۔ کبھی مشرکین سے متعلق آیات کو مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں کبھی یہود ونصاری سے متعلق آیات کو، حالانکہ معاملات میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کہتے ہیں 'جب ایک حدیث صحیح مل جائے تو اس پر عمل کرے نہ کہ قول امام پر۔ قول امام کے خلاف قول خدا وقول رسول ملے پھر بھی قول امام کو ہی ماننا شرک ہے۔ بھلے آدمی! جس امام کا قول معصیت ہو اس کی تقلید کا کون قائل ہے؟ اور ان ائمہ اربعہ میں کا کون سا قول معصیت یا داعی الی المعصیت ہے؟ ذرا نشاندہی تو کرو۔ اب آیتیں اور حدیثیں پیش کرو گے، مگر مطلب خود بھی نہ سمجھو گے۔ چلو ذرا امام ابوحنیفہ ہی کا کوئی قول دکھاؤ جو داعی الی معصیۃ الخالق ہو۔ اگر حدیثیں پیش کرو جو بظاہر مسلک حنفی کی مخالف ہیں، تو تمہارے بھی ایسے فتوے ہیں جن کے خلاف حدیثیں موجود ہیں۔ اب مطلب بتانا شروع کرو گے، تو ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ یوں تو مسئلہ کبھی حل نہ ہوگا۔ کہو کہ اگر باصلاحیت ہوں تو خود کا اپنا اجتہاد کیوں نہیں کرسکتے؟ اور امام ابوحنیفہ سے اختلاف کیوں نہیں کرسکتے؟ جی ہاں، بالکل کرسکتے ہیں، اور ائمہ مجتہدین اس کے اہل تھے، یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے بعد ان کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی نے فقہ سیکھ کر اور ان کی کتابوں سے استفادہ کرکے امام شافعی نے امام ابوحنیفہ کی تقلید کیے بغیر اجتہاد کیا اور بیشمار مقامات پر اختلاف کرتے ہوئے بھی حق بجانب رہے۔ امام احمد بن حنبل کا زمانہ تو اور بعد کا ہے۔ انھوں نے بھی صرف پیش رو ہونے کی بنا پر ان ائمہ کی تقلید نہ کی، بلکہ خود اجتہاد کیا اور سب سے اختلاف بھی کیا، خود امام ابوحنیفہ کے شاگردوں نے اصول کی حد تک ہی اپنے امام کی تقلید کی ہے، مسائل میں تو اپنے اجتہاد کو پوری جولانیت دی ہے اور ساری امت نے ان کے اجتہاد کو تسلیم کیا۔ نہیں دیکھتے کہ اصحاب افتا اپنے امام کے قول کی اندھی تقلید نہیں کرتے، بلکہ مختلف وجوہ فتاویٰ کی بنا پر کبھی قول امام ابویوسف پر فتویٰ دیتے ہیں کبھی قول امام محمد بن حسن پر فتوی دیتے اور عمل کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں قول امام کے خلاف بھی ہوسکتے ہیں۔ دیکھو حرمت خمر تو بالاتفاق مطلقاً حرام اور نجس ہے، لیکن کھجور، کشمش، شہد اور جو وغیرہ کی نبیذ ہلکی پکا کر بنائی جائے اور اس میں جوش بھی آجائے تو اس کی حرمت امام ابوحنیفہ نے حد اسکار سے مشروط رکھی، قلیل اگر مسکر نہ ہو بلکہ مقوی علی العبادت ہو تو حرج نہیں۔ اور فرمایا پوری دنیا کی دولت مجھے دی جائے کہ میں اسے حرام کہہ دوں تو نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اس میں شبہہ ہے اور اگر ساری دنیا کی دولت مجھے دی جائے کہ میں اس سے ایک قطرہ پی لوں تو ہرگز نہ پیوں کیوں کہ اس میں شبہہ ہے۔ مگر قول امام محمد تو اس کی مطلقاً حرمت کا ہے، جس میں قلیل وکثیر کا فرق نہیں اور فتویٰ امام محمد کے قول پر ہے۔-(۶)

کسی شخص کی موت کے وقت اس کی زوجہ حاملہ ہو تو حمل کے لیے بھی میراث ہوتی ہے اگر وہ زندہ پیدا ہو جائے، لہٰذا حمل کے لیے میراث سے حصہ باقی رکھا جائے گا۔ اب کس قدر حصہ باقی رکھا جائے؟ امام ابوحنیفہ کے نزدیک چار بیٹوں کا حصہ باقی رکھا جائے گا کیونکہ نہیں معلوم پیٹ میں کتنے بچے ہیں، اور امام ابویوسف کے نزدیک ایک بیٹے کا۔ اور فتویٰ امام ابویوسف کے قول پر ہے۔ وهذا هو الحق وعليه الفتوى(۷)

تکبیر تشریق کا وقت امام ابوحنیفہ کے نزدیک یوم عرفہ کی فجر سے دسویں کی عصر تک ہے، جب کہ صاحبین کے نزدیک اس کا وقت یوم عرفہ کی فجر سے آخر ایام تشریق کی عصر تک ہے۔ اور فتویٰ صاحبین کے قول پر، وَبِقَوْلِهِمَا يُعْمَلُ وعَلَيْهِ الْفَتْوى (۸)

اگر کہو اپنے امام کے مذہب کے دائرے ہی میں رہے، اس سے تو تجاوز نہ کیا۔ تو تمہیں نہیں معلوم، دیکھو زوجِ مفقود الخبر کا مسئلہ، کہ کسی خاتون کا شوہر غائب ہو جائے اور اس کا کوئی پتہ یا نشان نہ ملے تو قول امام ابوحنیفہ ستر سال تک انتظار کرنے کا ہے کہ اس دور میں وہ کسی سے نکاح نہیں کرسکتی۔ اور قول امام احمد بن حنبل مسئلہ کو دار القضا میں درج کرانے کے بعد چار سال تک انتظار کرنے کا ہے۔ اس کے بعد بحکم قاضی اس شوہر کو میت قرار دے کر عدت کے بعد عورت کسی اور سے نکاح کرسکتی ہے۔ پھر قول امام سے عدول کرکے علما نے قول امام احمد بن حنبل پر ہی فتویٰ دیا۔ ملاحظہ کرو کتب رسم المفتی جن میں قول امام سے عدول کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ پھر بتاؤ، کہاں کس نے کس کو رب کا درجہ دیا؟ لیکن تم چاہو کہ قول امام سے عدول کا حق ہر ایک کو مل جائے تو "فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" کا کیا ہوگا؟ اگر کہیے قول امام سے عدول کی ایک دو مثالوں سے کام نہ چلے گا بلکہ ان کی بندگی کا اعتراف تو جب ہو جب خاصی مقدار میں ان سے اختلاف کیا جائے، ہاں ہر مسئلے میں اختلاف تو آپ بھی نہیں کرسکتے،

ذرا بتاؤ تو ان کی بندگی کے اعتراف کے لیے ان سے کتنے مسائل میں اختلاف درکار ہے؟ اور کون کون اختلاف کرسکتا ہے؟ کتنے بڑے دار العلوم کا مدرس، یا کتنے بڑے دار الافتاء کا مفتی ہونا چاہیے؟ یا کتنی بڑی مسجد کا امام ہونا چاہیے؟ یا عرب کے کس خطے سے اس کا تعلق ہونا چاہیے؟ اگر کہو، بس دلائل پر نظر رکھنے والا ہو اور قرآن وحدیث کا ماہر ہو، تو ذرا بتاؤ تو ائمہ اربعہ کی تقلید کے خلاف بات کرتے ہی شیخ ابن تیمیہ، شیخ ابن قیم، امام شوکانی اور شیخ البانی وغیرہ کا نام کیوں لینے لگتے ہو، تمہیں تو قرآن وحدیث پیش کرنی تھی۔ جب ان کی تحقیق کا حوالہ دیا ان کے مقلد ہوئے یا نہیں؟ ذرا دل سے کہنا، کسی مقام پر ان شیوخ سے علمی غلطی ہوئی یا نہیں، اگر نہیں تو تمہارے اصول کے خلاف ہے کہ نہیں یا معصوم عن الخطا یہ بھی نہیں، اور غلطی ہوئی تو ان کی تقلید ترک کیوں نہ کی؟ بجائے اس کے کہ تم اس سے عدول کرتے تمہاری دنیا میں تو ان کی ہر بات کو حقیقت ثابتہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ مثلاً حدیث لَاتَشُدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدُ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِیْ هٰذَا وَمَسْجِدُ الْاَقْصٰی۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کسی نبی یا ولی کی قبر کی زیارت کے لیے حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس پر حاضری کی نیت سے سفر کرنا ممنوع ہے۔ اب ذرا ہوش سنبھالو اور غور کرو اس حدیث پاک میں استثنا مفرغ ہے کیوں کہ مستثنیٰ منہ محذوف ہے، اب یہاں محذوف مستثنیٰ منہ عام مانتے ہو یا خاص۔ اگر مکان یا بلد وغیرہ عام مقدر، تو معنی ہوگا کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ کہیں کا سفر نہ کرو۔ پھر تم دنیا بھر کے جو سفر کرتے ہو اس کا کیا ہوگا؟ کس قدر حرام کا ارتکاب کرتے ہو!۔ اور اگر محذوف مستثنیٰ منہ خاص ہو تو مفہوم بالکل واضح ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی "لَاتَشُدُّ الرِّحَالُ اِلٰی مَسْجِدٍ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ" تو یہاں دنیا کی ساری مساجد مستثنیٰ منہ ہوں گی اور یہ تین مسجدیں مستثنیٰ۔ کیونکہ ان تینوں مسجدوں میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے، باقی مسجدوں میں نماز پڑھنے کا ثواب برابر ہے، پھر اپنی یا اپنے علاقے کی مسجد کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں صرف نماز پڑھنے کے قصد سے سفر کرنا کون سی عقلمندی ہے، جب کہ حدیث کثرۃ خطی سے بھی اپنے علاقے کی مسجد کو ویران کرنے کی اجازت نہیں۔ اب بولو، یہاں قبور انبیا وصالحین اس ممانعت میں کہاں سے داخل ہوں گی۔ حالانکہ یہ زیارت تو شرعاً مطلوب ہے کُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ۔ حدیث شد رحال سے غیر علمی استدلال کر کے تم حاضری روضہ انور سے منع کرتے ہو، اور رب تعالیٰ کا فرمان ہے "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ" جس میں حیات وممات کی کوئی قید نہیں، اور حکم سارے مسلمانوں کو، یعنی رب کا حکم ہے مسلمانو! گناہ کرو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور تم کہتے ہو وہاں سفر کر کے مت جاؤ۔ اب رب کے حکم کی بجائے شیخ ابن تیمیہ کی بات مانی تو انہیں رب کا درجہ دیا یا نہیں؟ اور سفر شرعی کی بات بھی خوب کہی، حج کے موقع پر حجاج کرام کو شیخ ابن باز کی جو تصانیف حج وعمرہ کے متعلق دی جاتی ہیں ان میں شیخ ابن باز لکھتے ہیں کہ "مسجد نبوی میں نماز کے ارادے سے مدینے جائے اور جائے تو قبر رسول کی زیارت بھی کر لے، خاص زیارت کی نیت سے مدینے کا سفر نہ کرے۔"

یہ زیارت کی تھوڑی سی گنجائش جو نکالی ہے اس پر دراصل حدیث رسول "مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِیْ فَقَدْ جَفَانِیْ" نے تمہیں مجبور کیا، اب بتاؤ حج کے سارے ارکان تو مکہ مکرمہ میں پورے ہو جاتے ہیں، اسی لیے حدیث کے کلمات "مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِیْ" میں زیارت کو حج میں داخل نہیں فرمایا، اس حدیث پاک میں صرف زیارت کا ذکر ہے، نہ کہ مسجد نبوی میں نماز کا (وہ الگ مستقل عبادت ہے) اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا فاصلہ اتنا ہے کہ متفقہ طور پر یہ سفر سفر شرعی ہے۔ اور حدیث میں ذکر صرف زیارت کا ہے، لہٰذا اس حدیث کا واضح مفہوم یہ ہوا کہ جو میری قبر کی زیارت کے لیے حج کے بعد سفر شرعی نہ کرے وہ ظالم ہے۔ اور رسول پر ظلم کا انجام "وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (توبہ ۶۱)" اور تم کہتے ہو کہ زیارت کے لیے سفر نہ کرے، مسجد نبوی میں نماز کے لیے سفر کرے اور ساتھ میں زیارت بھی کر لے۔ ان غیر مقلدین نے اللہ ورسول کے واضح احکام کے خلاف اپنے علما کی تقلید کا پٹہ اپنی گردنوں میں ڈال رکھا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کی تقلید شرک ہے۔

تقلید ائمہ کے خلاف جو باتیں پرکشش بنا کر کہی جاتی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ عمل بالکتاب والسنہ ہونا چاہیے نہ کہ عمل بما قال الامام، بھلا تمہیں یہ بات کیسے سمجھ میں آئے گی کہ قول امام قول خدا وقول رسول کا شارح ہے، نہ کہ اس کا مقابل۔ یہی مان کر ساری امت ان کے اقوال پر عمل کرتی ہے نہ کہ ان کے اپنے ذاتی اقوال مان کر۔ تم جو

قول امام کو قول خدا اور رسول کے مقابل قرار دیکر عمل بالحدیث کی بات کرتے ہو بتاؤ کیا ساری احادیث پر عمل ممکن ہے؟ اگر روایات متعارض ہوئیں پھر کیا ہوگا؟ تطبیق نہ ہوسکے تو ترجیح کے عمل کے بغیر کیسے عمل ہوگا؟ اسی لیے دور صحابہ میں جسے ناسخ منسوخ کا علم نہ ہو وہ فتویٰ دینے کا مجاز نہ تھا۔ سچ کہا کہ صرف انبیاء معصوم عن الخطا ہیں باقی ہر ایک سے غلطی ہوسکتی ہے، اسی لیے ہر مجتہد کا ماننا ہے کہ اس کا اجتہاد جو فیصلہ کرے وہ صواب ہے لیکن اس میں احتمال خطا ہے، اگر عنداللہ بھی صواب ہو، تو کیا خوب! مجتہد کو دونا اجر ملے گا، اور ایک روایت میں ہے کہ اسے دس نیکیاں ملیں گی، اور اگر عنداللہ خطا ہو، پھر بھی اسے اجر ملے گا، اس کی گرفت نہ ہوگی، ملاحظہ ہو حدیث شریف۔

جاء رسول الله صلى الله عليه وسلم خصمان يختصمان فقال لعمرو اقض بينهما يا عمرو فقال انت اولى بذلك منى يارسول الله قال وان كان، قال فاذا قضيت بينهما فما لى؟ قال ان انت قضيت بينهما فاصبت القضاء فلك عشر حسنات وان انت اجتهدت فاخطات فلك حسنة. (۹)

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمی کوئی مسئلہ لے کر آئے تو آپ نے حضرت عمرو بن العاص سے فرمایا، کہ ان کے مابین فیصلہ کرو، عرض کی یارسول اللہ مجھ سے زیدہ اس کے آپ حق دار ہیں، فرمایا اگر چہ ایسا ہے، عرض کی میں فیصلہ کروں تو میرے لیے کیا اجر ہے؟ فرمایا اگر تم ان کے مابین فیصلہ کرو اور درست کرو تو تمہارے لیے دس نیکیاں ہیں، اور اگر تمہارے فیصلے میں خطا ہو جائے تو تمہارے لیے ایک نیکی ہے۔''

دوسری حدیث میں ہے اذا حكم الحاكم فاجتهد فاصاب فله اجران واذا حكم فاجتهد فاخطا فله اجر واحد. یعنی جب فیصلہ کرنے والا اجتہاد سے فیصلہ کرے اور وہ فیصلہ درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہے، اور اگر اس کا فیصلہ خطا ہو تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔ (۱۰)

اگر مجتہد سے خطا ہو جائے تو بھی اس کو ثواب ہے، ثابت ہوا کہ ائمہ مجتہدین کی خطا قابل گرفت نہیں۔ خطا پر جب ان کی گرفت نہیں تو ان کے اجتہاد پر عمل کرنے والے کی گرفت کیوں ہوگی؟۔ اور اجر تو آخرت میں ملے گا تو ان خطاؤں کا عقدہ بھی وہیں کھلے گا، کہ کس سے خطا ہوئی، کس سے نہیں، ابھی سے کیوں خطائیں مان بیٹھیں، خطا سے پہلے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صواب کی بات فرمائی تھی، اسے ہی پہلے مان کر عمل میں یکسوئی پیدا کی جائے جو عین مطلوب ہے۔

تقلید بالامام کی بجائے عمل بالحدیث کی بات کرتے ہو اور خود بھی کتنی حدیثوں پر عمل نہیں کرتے۔ ہاں ائمہ کے فیصلوں کے خلاف کوئی حدیث مل جائے تو اس پر عمل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے، کسی تعصب یا جذبہ مخاصمت سے بے نیاز ہو کر جب پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر احادیث پر غور کروگے تو اندازہ ہوگا کہ تقلید بالامام ہی عمل بالحدیث ہے۔ ورنہ بڑی بڑی غلطیاں کروگے، بلکہ ان ائمہ سے تو خطاؤں کا امکان تھا تم سے تمرد وسرکشی ہوئی جاتی ہے۔

یہاں امریکہ میں بہت سی مسجدوں کے امام عرب ہیں، میرے ایک کرم فرما ڈاکٹر نسیم صاحب ایسی ایک مسجد میں نماز کے لیے گئے اور امام صاحب سے اجازت لے کر اذان واقامت کہی، حسب معمول کلمات اقامت بھی اذان کی طرح دو دو بار ادا کیے، امام صاحب نے انھیں نماز کے بعد بیٹھالیا کہ آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں بخاری شریف (انگریزی ترجمے کے ساتھ) لاکر کتاب الاذان کھول کر حضرت انس بن مالک کی یہ روایت دکھائی "عن انس بن مالک قال امر بلال ان یشفع الاذان ویوتر الاقامة" (۱۱) اور کہا اس کا انگریزی ترجمہ پڑھو اس میں کیا لکھا ہے، یعنی اقامت ایک ایک بار ہونی چاہیے، ڈاکٹر صاحب نے کہا، ہم حنفی ہیں، ہم یوں ہی کہتے ہیں، بولے، حنفی ہوں یا شافعی، یہ حدیث کیا کہتی ہے؟ ساتھ میں ایک علمی دہشت گردی کا جملہ بھی جڑ دیا ''میں چیلنج کرتا ہوں کہ حدیث کی کسی کتاب میں کوئی دکھادے کہ کلمات اقامت بھی اذان کی طرح دودو بار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جب شام میں میرے پاس آئے تو اس معاملے کا ذکر کیا، میں نے کہا، معلوم ہوتا ہے صاحب دو رکعت کے امام ہیں۔ کتب حدیث کی انہیں ہوا بھی نہیں لگی، فقہ تو دور کی بات ہے۔ اولا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کو اس حدیث کے حوالے سے مطمئن کیا، پھر مختلف کتب صحاح سے کلمات اقامت کے دودو ہونے پر بلا تبصرہ نو روایتیں نقل کر کے بھیج دیں۔ اور کہہ دیا کہ یہ دے کر کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں معروف سے نہی کا نہیں بلکہ منکر سے نہی کا حکم دیا ہے۔ اور یہ حدیثیں دیکھ کر مطلب بتانا شروع کریں تو فوراً مجھے فون

کریں۔ اگر اس حدیث کا حوالہ دینے کی بجائے کسی مذہب فقہ کی تقلید میں ایک ایک بار اقامت کی حمایت اور عمل کیا ہوتا تو جان چھوٹ جاتی، اب حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہو تو سنو، اس میں اقامت کے لیے وتر کا لفظ بیان عدد میں صریح نہیں، وتر کا معنیٰ 'ایک' ہے ہی نہیں بلکہ ایک، تین، پانچ، سات، سب پر 'وتر' صادق آتا ہے، تو کلمات اقامت کا ایک ایک بار ہونا اس حدیث سے کیسے ثابت کرو گے؟ جب کہ حضرت ابومحذورہ کی روایت بیان عدد میں بالکل صریح ہے "وَعَلَّمَنِي الْإِقَامَةَ سَبْعَ عَشْرَةَ كَلِمَةً" (۱۲) اب تم کو بخاری ومسلم چھوڑ کر دیگر کتب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جہاں اقامت کے لیے فرادیٰ فرادیٰ کا لفظ ملے، تو وہاں تو مثنیٰ مثنیٰ کی بھی روایتیں ملیں گی حالانکہ بخاری کی حضرت انس کی حدیث کے مقابل حضرت عبداللہ بن زید کی روایت بھی ہے جسے ترمذی نے تخریج کی "كَانَ اَذَانُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَفْعًا شَفْعًا فِي الْاَذَانِ وَالْاِقَامَةِ" آخر کس حدیث پر عمل کرو گے؟ اور کیوں؟ دراصل حدیثوں کے حوالے سے اگر اذان واقامت کی پوری تاریخ پر نظر ہو تو اندازہ ہوگا کہ اس باب میں حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت ابومحذورہ کی روایات اصل ہیں، نہ کہ حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ بن عمر کی، رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، اور ظاہر ہے کہ اقامت کے مثل اذان ہونے یا مثنیٰ مثنیٰ ہونے کے بارے میں اول الذکر صحابہ کی، اور ایک ایک بار ہونے کے بارے میں موخر الذکر صحابہ کی مرویات ہیں۔ (ملاحظہ ہو کتب صحاح کتاب الاذان) اب ذرا سوچو کہ ایک روایت میں ایک ایک بار کلمات اقامت کہنے کا ذکر ہو دوسری روایت میں دو دو بار کہنے کا، تو احتیاط تو اسی میں ہے کہ دو دو بار کہہ لیے جائیں، کیونکہ ایک ایک بار کہنے سے دو والی روایات بالکل متروک ہو جائیں گی، جب کہ دو بار کہنے سے ایک والی روایات پر بھی یک گونہ عمل ہو جائے گا کیونکہ علم الاعداد کے اعتبار سے 'دو' میں 'ایک' داخل ہے۔ اور یوں بھی کسی کو ایک بار کہنے کو کہا جائے، وہ دو بار کہہ دے تو یہ اضافہ ہوگا نہ کہ حکم کی خلاف ورزی یا تبدیلی۔

اس موقع پر ایک اور غیر مقلد سے راقم کی گفتگو ملاحظہ کریں۔

میں ایک بار کچھ بچوں کو نماز کی تربیت دے رہا تھا، اس میں درود ابراہیمی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام مبارک کے ساتھ 'سیدنا' کا اضافہ کر کے بتایا، جو حدیث پاک میں نہیں ہے۔ اس پر ایک صاحب نے جنھیں قرآن وحدیث کے علم کا غرہ تھا، اعتراض کیا کہ یہاں 'سیدنا' کا اضافہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ دعا اللہ سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت نازل فرما، تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو 'سیدنا' نہیں کہنا چاہیے، ہاں اس کے علاوہ سید المرسلین کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کہا، علامہ شامی نے ردالمحتار میں 'سیدنا' کے اضافے کو مستحب لکھا ہے، لانہ ادخل فی الادب" بولے ہمیں کسی ایک کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے کہا، پھر کیسے عمل کیا جائے؟ بولے، جس پر علما کا اجماع ہو اس پر عمل کرنا چاہیے، میں نے کہا علما کا اجماع کیسے معلوم ہوگا؟ بولے آپ نے ابن تیمیہ کی کتب پڑھیں؟ میں نے کہا، ہم ان کی تقلید نہیں کرتے، لیکن ذرا بتائیں یہ درود ابراہیمی سنت ہے یا واجب؟ بولے نماز کا حصہ ہے۔ میں نے پھر کہا سنت ہے یا واجب؟ بولے نماز کا حصہ ہے۔ میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام التحیات میں بھی ہے اور درود ابراہیمی میں بھی، لیکن التحیات واجب ہے اور درود ابراہیمی سنت ہے، ہم نے فرائض وواجبات میں کچھ اضافہ نہ کیا کہ یہ مقام مقام اتباع ہے، اور سنت درود ابراہیمی میں نام اقدس کے ساتھ 'سیدنا' کہنا ہی ادب واحترام اور ایمان کا تقاضا ہے۔ حبر الامت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے التحیات سکھانے کے بعد فرمایا "اذا قُلْتَ هٰذا فقد تَمَّتْ صَلَاتُكَ" تو نماز تو پوری ہو چکی ہے اب درود شریف میں نام اقدس کے ساتھ سیدنا کا اضافہ کیا جائے تو کیا حرج ہے؟ بولے حدیث میں تو نہیں، میں نے کہا حدیث تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، وہ خود کو کیسے 'سیدنا' کہتے؟۔

آخر اس سمجھ کو کیا کہا جائے جو اضافہ کو خلاف ورزی یا تبدیلی سمجھتی ہو، مثلاً دس دینے کو کہا، نو دیے تو خلاف ورزی کی، گیارہ دیے تو خلاف ورزی کہاں؟ وہ تو ایکسٹرا کریڈٹ کا مستحق ہے، ہاں بیان حصر ہو تو بات دوسری ہے۔ ذرا اصول تو یاد کرو کہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے، کیا خبر واحد سے کتاب اللہ کی خلاف ورزی یا اس کی تبدیلی جائز ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت کے بارے میں 'جس کا مفاد یہ ہے کہ مطلقہ ثلاثہ کو سکنیٰ اور نفقہ نہ

ہے گا فرماتے ہیں "لَا نَدَعُ کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّۃَ نَبِیِّنَا بِقَوْلِ اِمْرَأۃٍ لَا نَدْرِیْ اَحَفِظَتْ اَمْ نَسِیَتْ" تو ثابت ہوا کہ اضافہ وزیادتی نہ حکم کی تبدیلی ہے نہ خلاف ورزی، بلکہ جنس مطلوب سے ہو تو مرغوب ہے۔

تقلید ائمہ سے روکنے کے لیے کہتے ہو کہ صرف انبیائے کرام معصوم عن الخطا ہیں باقی سب سے خطا کا صدور ہو سکتا ہے، گویا تمہارے نزدیک امکان خطا، وقوع خطا کو مستلزم ہے۔ پھر تمہیں کو اپنے اقوال میں خاطی کیوں نہ کہا جائے۔ تجربہ یہ ہے کہ اکثر اچھی بات کسی غلط مقصد کے لیے استعمال کرتے ہو مثلاً یہاں ائمہ کی خطا ثابت کرنے کے لیے انبیاء کو معصوم عن الخطا مانا اور جب انبیاء کا ذکر آئے گا تو وہاں یہ بات بھول جاؤ گے۔ اور وہاں قرآن وحدیث پڑھ پڑھ کر انبیائے کرام کی طرف خطاؤں اور بھول کی لمبی فہرست منسوب کردو گے، اور ان پر حملہ کرنے کے لیے اللہ وحدہ لاشریک کی عظمت وقدرت کا حوالہ دو گے۔

حدیث گزری کہ یہ قیامت کی نشانی ہے کہ بعد کے لوگ اپنے بزرگوں کو برا بھلا کہیں گے۔ دور جدید میں اکابر کو گالی دینے کا نیا طریقہ ایجاد ہوا ہے۔ جس کو برا بھلا کہنا ہو اس کو اس سے بڑے کے مدمقابل لاکر اسے جو چاہو بول دو، لوگ کچھ کہہ بھی نہ سکیں گے اور دل کی بھڑاس بھی نکل جائے گی۔ ائمہ مجتہدین کو بولنا ہو تو انبیا سے تقابل کرتے ہو اور انبیا کو بولنا ہو تو اللہ تعالیٰ کے مدمقابل لاکر جو چاہو بولو، یوں تو کوئی کسی کو بول سکتا ہے۔ عموماً غیر مقلدین کے توصیفی جملے بھی اعتراف عظمت کی بجائے کسی کی ہتک حرمت کے لیے ہوتے ہیں۔

جو خود سمجھتے ہیں اسی کو دین کہتے ہیں اور جب صحیح حدیثوں کی وجہ سے معاملہ پھنستا ہے تو تھوڑا سا اعتراف کر لیتے ہیں مثلاً بخاری کی حدیث اصحاب غار کی بنیاد پر اتنا مانا کہ 'اعمال کو خدا کی بارگاہ میں وسیلہ بنایا جا سکتا ہے، کیونکہ ان تینوں افراد نے اپنے اعمال کے ہی وسیلے سے دعا کی تھی جو قبول ہوئی، لیکن بارگاہ الٰہی میں کسی شخصیت کا وسیلہ درست نہیں'۔ حالانکہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کی حدیث تمہارے نزدیک بھی صحیح ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے ہی دعا کی تعلیم ہے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ وَاَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ" (۱۳) اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی دعا میں بھی بطور وسیلہ شخصیت ہی کا تو ذکر ہے نہ کہ اعمال کا، دیکھو بخاری شریف کتاب الاستسقاء 'اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَانَ اِذَا قُحِطُوْا اسْتَسْقٰی بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ اِنَّا کُنَّا نَتَوَسَّلُ بِنَبِیِّنَا فَتَسْقِیَنَا وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا فَاسْقِنَا قَالَ فَیُسْقَوْنَ" صریح حدیث کے خلاف بولتے ہو، اور دعویٰ ہے عمل بالحدیث کا۔

چند مصری حضرات مجھے بریلوی سمجھ کر میری مسجد میں آئے اور مختلف سوالات میں ایک سوال وسیلہ کا بھی کیا، میں نے کہا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ " بولے یہ تو اعمال ہیں، میں نے کہا، یہاں ذکر نہ تو اعمال کا ہے نہ شخصیات کا، اگر اعمال کا وسیلہ مطلوب ہے تو انبیا کا وسیلہ تو اور زیادہ مطلوب ہوگا کیوں کہ سورہ ماعون نے بتایا کہ بعض لوگوں کی نماز ہی انہیں جہنم میں لے جائے گی، تو بارگاہ الٰہی میں ہمارے اعمال کی مقبولیت کی ہمارے پاس کوئی ضمانت نہیں، لیکن انبیا بہر حال مقبول ہیں ورنہ وہ نبی کیوں ہوتے۔

جمع بین الصلاتین کا مسئلہ بھی عمل بالحدیث کا اہم موضوع رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے "جَمَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم بَیْنَ الظُّھْرِ وَالْعَصْرِ وَبَیْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِالْمَدِیْنَۃِ مِنْ غَیْرِ خَوْفٍ وَّلَا مَطَرٍ (۱۴) اور ابوداؤد شریف میں متعدد واقعات بیان فرمائے جن میں دوران سفر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع بین الصلاتین فرمائی۔

اس جمع بین الصلاتین کا کیا معنی سمجھتے ہو؟ دو نمازوں کو ایک نماز کے وقت میں ملا کر پڑھ لینا، یہ کہاں سے ثابت ہوگا؟ حج کے علاوہ کہاں اس کی صراحت ملتی ہے؟ اگر ایسا کریں تو قرآن پاک کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی، اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (نساء ۱۰۳) یعنی ہر نماز وقت کا فریضہ ہے، یوں ہی حدیث امامت جبریل کے آخری جملہ "اَلْوَقْتُ لَکَ مَا بَیْنَ ھٰذَیْنِ الْوَقْتَیْنِ" کی بھی مخالفت ہوگی۔ نہ صرف اسی قدر بلکہ ان تمام حدیثوں کو ترک کرو گے جن میں بے وقت نماز پڑھنے اور جان بوجھ کر نماز کو اس کے وقت سے مؤخر کرنے پر وعید شدید بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ تم تو عمل بالحدیث کے قائل تھے تمہارے لیے بڑی آسانی تھی کہ اس جمع بین الصلاتین کو اس معنی پر محمول کرتے جس کی تفصیل خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت ضرورت حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کو بتائی تھی۔ یعنی ظہر کی نماز آخر وقت میں پڑھنا اور عصر اول وقت میں، جو بظاہر جمع ہے، لیکن حقیقتاً اپنے اپنے

وقت میں ہے۔ حضرت حمنہ بنت جحش کی روایت کا آخری حصہ یہ ہے۔

فَاِنْ قَوِيْتِ عَلٰى اَنْ تُؤَخِّرِي الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِي الْعَصْرَ فَتَغْتَسِلِيْنَ وَتَجْمَعِيْنَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَتُؤَخِّرِيْنَ الْمَغْرِبَ وَتُعَجِّلِيْنَ الْعِشَاءَ ثُمَّ تَغْتَسِلِيْنَ وَتَجْمَعِيْنَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ فَافْعَلِي وَتَغْتَسِلِيْنَ مَعَ الْفَجْرِ فَافْعَلِي وَصُوْمِي اِنْ قَدَرْتِ عَلٰى ذٰلِكَ. (۱۵)

تراویح کی بیس رکعات پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پڑھ پڑھ کر واویلا مچا رکھا ہے تاکہ نیک کام جس قدر کم ہو سکے اچھا ہے، جو حدیث پیش کی اس کے الفاظ پر بھی غور نہ کیا کہ وہ کس سلسلے کی ہے، تراویح کی صرف اصل حدیث مرفوع سے ثابت ہے، لیکن باقاعدہ تراویح کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد سے شروع ہوا، جو حضرت اُبی بن کعب کی امامت میں بیس رکعتوں پر مشتمل تھی، اور اسکا ذکر حدیث کی متعدد کتب میں ہے۔ (ترمذی، موطا، بیہقی) رہی بخاری شریف کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت جو تمہارا مبلغ استدلال ہے، مَاكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَزِيْدُ فِي رَمَضَانَ وَلَافِي غَيْرِهِ عَلٰى اَحَدَ عَشَرَ رَكْعَةً يُصَلِّي اَرْبَعاً فَلَاتَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّي اَرْبَعاً فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّي ثَلَاثاً'' (۱۶) 'فِي رمضان ولافي غيره' سے تمہیں اندازہ نہ ہوا کہ یہ اس نماز کے بارے میں فرماتی ہیں جو رمضان اور غیر رمضان سب میں پڑھتے تھے، اور وہ بلا شبہ صلاۃ اللیل ہے، کیا تراویح' غیر رمضان میں بھی پڑھتے تھے؟ یہ تو تہجد تھی جسے اندرون خانہ ادا فرماتے، اسی لیے اس کی راوی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں، اور امام بخاری نے اس روایت کو تہجد کے باب میں بیان کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تراویح میں تو بڑا مجمع شامل ہو گیا تھا، جس کے وجوب کے خدشے سے تیسرے دن آپ نے وہ نماز ترک فرمادی تھی۔ حالانکہ تہجد ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ یہ ہے عمل بالحدیث، کہاں کی بات کہاں لگائی، یہ ہے ائمہ سے مخاصمت، کیوں کہ آٹھ رکعات تراویح تو کسی امام کی دریافت نہ تھی، واقعی تم نے کمال کر دیا۔ حضرت امام مالک کے نزدیک تو چھتیس رکعات تھیں، اور اہل مدینہ کا عمل اکتالیس رکعات پر تھا جسے حضرت اسحٰق بن راہویہ نے بھی اختیار کیا تھا، (۱۷) بھلا ادھر کیوں جاتے، جس قدر گنجائش نکلتی رہے نکالتے رہو، اور جب پھنس جاؤ تو مان لو، اسی حالت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ' اپنے دل سے فتویٰ پوچھو۔ الحمد للہ ہمارا مذہب ہی ہماری چوائس ہے، اور تمہارا مذہب تو تمہاری مجبوری، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْن وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ وَعَلٰى سَائِرِ الْاَئِمَّةِ الْمُجْتَهِدِيْنَ، آمِيْنَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ

حوالے

(۱) تاریخ فقہ اسلامی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۶۱
(۲) بحوالہ مقیاس الحنفیت ۱۷۴
(۳) صحیح البخاری کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم
(۴) ترمذی ابواب الفتن
(۵) ترمذی ابواب الفتن
(۶) درمختار کتاب الاشربہ
(۷) المبسوط للسرخسی کتاب الفرائض باب حمل المیراث
(۸) فقہ العبادات علی المذهب الحنفی، کتاب الصلاۃ فصل صلاۃ العیدین
(۹) مسند امام احمد، مسند الشامیین، بقیۃ حدیث عمرو بن العاص
(۱۰) صحیح البخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب اجر الحاکم اذا اجتهد فاصاب او اخطأ، والجامع الصغیر باب حرف الالف
(۱۱) رواہ البخاری ومسلم
(۱۲) ابو داؤد کتاب الاذان
(۱۳) ترمذی کتاب الدعوات
(۱۴) ترمذی باب ماجاء فی الجمع بین الصلاتین
(۱۵) ابو داؤد کتاب الطہارۃ باب من قال اذا اقبلت الحیضۃ تدع الصلاۃ
(۱۶) بخاری ابواب التہجد
(۱۷) ترمذی، قیام رمضان

☆☆☆

شمیمِ ناز کی تربت کہاں ہے؟

کاروان عقیدت کی پیہم جستجو کے باوجود متاعِ عشق و محبت کا نام و نشان نہیں ملتا- جدہ، طائف، ریاض، دمام اور مکہ کی صاف ستھری چوڑی کشادہ اور چکنی سڑکوں پر دندناتی ہوئی صبا رفتار تیز کاریں، کاروں میں قیمتی قالین، جدید طرز کے مکانات، سر بفلک ایر کنڈیشنڈ عمارتیں، عمارتوں کے اندر ٹیلی ویژن، ریفریجیٹر، شاندار صوفے، ایرانی قالین اور آرام و آسائش کی تمام جدید سہولتیں اس بات کا اعلان کر رہی ہیں کہ تیل کی بے اندازہ دولت نے ان عربوں کی زندگی اور رہائش کو بے حد شاہانہ اور شہروں کو بہت ترقی یافتہ بنا دیا ہے- ایک سیاح جب ان سڑکوں سے گزرتا ہے تو کچھ دیر ٹھہر کر یہ ضرور سوچتا ہے کہ یہ ریگستان عرب کا کوئی خطہ ہے یا یورپ کے جدید ترین شہر کا کوئی حصہ؟

بے پناہ دولت کے مالک سعودی حکمران جہاں اپنے ملک کی مادی ترقی اور عوام کے طرز معاشرت اور انداز زندگی کو مغربی ممالک کے دوش بدوش اور شانہ بشانہ کرنے کی جدوجہد میں مسلسل مصروف عمل ہیں، وہیں یہ حکمراں موسم حج کی سہولت، زائرین کی راحت اور ہر سال آنے والے حاجیوں کے آرام کے خیال سے بھی غافل نہیں- اونٹوں کے زمانے کے سفر اور آج کے سفر میں زمین و آسمان کا فرق ہے، آج سفر کی تمام تر سہولتیں محض دولت ہی کی نہیں بلکہ حکمرانوں کی بھی رہین منت ہیں-

جدہ میں وسیع ترین مدینۃ الحجاج کی تعمیر، کسٹمز کی تیز رفتار کارکردگی، میٹھے پانی کی فراوانی، سواریوں کی سہولتیں، ہر قسم کی تیز رفتار گاڑیاں پھر مکہ معظمہ میں حرم کی توسیع، جدید انداز کی بے حد خوبصورت اور پرشکوہ تعمیر، منی، مستورات کی عمارتیں، بلند مینار، جابجا قالینوں کے فرش، تیز روشنی کے ان گنت بلب، ہر لحظہ صفائی کا التزام، تقریباً ہر دروازے کے قریب وضو خانے، انہی سے متصل سیکڑوں استنجا خانے اور بیت الخلاء، صفاء اور مروہ کے ربع ربع میل کے طویل راستے پر کشادہ اور حسین تر ہال کی تعمیر، آنے جانے کی الگ الگ راہیں، پھر اس میں ضعیف، کمزور اور مجبور حجاج کا جداگانہ راستہ، منیٰ اور عرفات تک جانے والے راستے میں متعدد کشادہ سڑکیں، قدم قدم پر شفا خانے، بارونق گلیاں، قابل دید بازار اور اس طرح کی بہت ساری دوسری سہولتوں اور حسن انتظام پر سعودی حکومت یقیناً لائق تحسین ہے- ہفتوں کا تھکا ہارا مسافر جب اپنے لیے اتنی ساری سہولتوں اور حرم کی جدید ترین تعمیر کو دیکھتا ہے تو سفر کی کلفتوں کو بھول جاتا ہے-

زیارت بیت اللہ، طواف کعبہ اور دیگر ارکان و زیارت سے شادکام ہونے والے خوش نصیب زائر کی نگاہ چمن زار عقیدت کو تلاش کرتی ہے، مشام روح خوشبوئے وفا کی جستجو کرتی ہے، دل کی دنیا متاعِ گرانمایہ کے دیدار کی تمنا کرتی ہے اور جذبۂ عشق، یوسف گم گشتہ کا متلاشی ہوتا ہے- نگاہوں کی عقیدتیں اپنے اس انمول سرمائے کو کشادہ سڑکوں پر بارونق بازاروں میں، حسین گلیوں میں، سر بفلک عمارتوں میں اور ایک ایک مقام پر ڈھونڈتی ہیں- لیکن حیف صد حیف! کہ تمام تر تلاش ساری جستجو اور غریب الوطن عقیدتوں کی ہزار آبلہ پائی کے باوجود وہ متاعِ گم شدہ، وہ سرمایۂ عقیدت، وہ مرکز احترام جس کا براہ راست تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے تھا، نہیں ملتا- جسمانی آرام و آسائش کا اہتمام کرنے والی حکومت سے عقیدتیں ہر سال سوال کرتی ہیں اور قیامت کی صبح تک سوال کریں گی کہ آخر وہ متاعِ عقیدت کہاں گئی؟ وہ سرمایہ محبت کیا ہوا؟ کیا ہوا ان نایاب تبرکات کا؟ مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہاں گیا؟ مولد فاطمہ کہاں گیا؟ دار ارقم کہاں گیا؟ باب ام ہانی کہاں گیا؟ قبر خدیجۃ الکبریٰ کہاں گیا؟ تبرکات کی دنیا کیسے ختم ہوگئی؟ کہاں غائب ہوگئی؟ اور کیسے مٹا دی گئی؟ مکہ کے بازارو! تم بتاؤ، بلند عمارتو! تم کچھ کہو، حرم کی دیوارو! تمہی کوئی نشاندہی کرو، ذمہ دار حکمرانو! تم ہی کچھ بولو عشق و ایمان کی امانت میں کس نے خیانت کی ہے؟ کس نے کی ہے یہ خیانت؟ لیکن افسوس کہ عقیدتوں کی پکار اور محبتوں کی دریافت پر خاموش مایوسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا- جانے والے خوش نصیب حاجیو! اگر ہو سکے تو اس یوسف گمشدہ کو تم بھی تلاش کرنا اور اگر

کہیں مل جائے تو تشنہ کامان زیارت کی جانب سے عقیدتوں کی نذر اور محبتوں کا سلام پیش کرنا-لیکن پتا بتانے کے باوجود تحقیق ہے کہ تمہاری تلاش وجستجو بھی کامیاب نہ ہوسکے گی۔

لیے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہید ناز کی تربت کہاں ہے؟

مولد النبی - وہ مقدس وبابرکت مکان جہاں فخر آدم، تاجدار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت طیبہ ہوئی تھی، جہاں فرشتے اور سید الملائکہ دست بستہ اولین سلامی کے لیے حاضر ہوئے تھے، جہاں حوران بہشتی خدمات پر مامور کی گئی تھیں، جہاں حضرت مریم، حضرت ہاجرہ، حضرت آسیہ پیغام مبارک وسلامت کے لیے آئی تھیں، جہاں نبی کریم نے شیر خوارگی کے چند دن گزارے تھے، جہاں سے ان کے عہد طفولیت کی بہت ساری یادیں وابستہ ہیں، جس زمین نے بچپن کے ننھے ننھے قدم پاک کو چوما، جن درودیوار نے اس کے دست کرم کا شرف حاصل کیا-تاریخ بتاتی ہے کہ یہ مقدس مکان شعب بنی عامر میں واقع تھا جو حرم سے دو سو قدم کے فاصلے پر واقع ہے-تین کمروں پر مشتمل یہ مکان زمین سے ڈیڑھ میٹر کی بلندی پر واقع تھا، جس میں چند زینوں پر چڑھ کر اندر داخل ہوا جاتا تھا-مکان کے ایک کمرے میں بطور نشان ایک قبہ اور کمرے کے وسط میں ذرا سی گہرائی تھی، یہی وہ مقام تھا، جہاں سے آفتاب نبوت طلوع ہوا تھا-لیکن آج مولد پاک اور اس مقدس زیارت گاہ کے دیدار کے لیے ترستی ہوئی نگاہوں کو مایوسیوں کے سوا کچھ نہیں ملتا-اگر کوئی خوش بخت تلاش وجستجو اور رہبری ورہنمائی کے سہارے اس سرزمین تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو وہاں کوڑے کرکٹ کے سوا کچھ نہیں ملتا-

مولد فاطمہ: یہ مکان حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا تھا، یہ وہ مقدس اور باعظمت مکان تھا، جس میں نزول وحی کے بعد سب سے پہلے سرکار تشریف لائے تھے اور کمبل اوڑھانے کی فرمائش کی تھی--یہیں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک کمرے میں عبادت فرمایا کرتے تھے-یہیں قرآن کی آیتیں نازل ہوتی تھیں، یہیں جبریل امین سلامی کو حاضر ہوا کرتے تھے، یہیں سیدہ خاتون جنت پیدا ہوئی تھیں، یہیں ایک الماری میں ان کی چکی بطور تبرک کبھی موجود تھی، یہی گھر اسلام کی ابتدائی تبلیغ کا مرکز تھا، سو سال قبل کی تاریخ آج بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ محلہ دارالجو کے نشیب میں چار کمروں پر مشتمل خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا بابرکت مکان مرجع خلائق تھا-جس کی دیوار پر سنگ مرمر کی لگی تختی پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ تھی-

حضرت فاطمہ زہرہ بتول سیدۃ نساء العالمین بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر کا حکم سیدنا مولانا مفروض الطاعت امیر المومنین ناصر الدین نے اس کے منافع اور بیداوار کو پہلے اس کے مصالح پر پھر اس مقام نبوی کے مصالح پر حسب رائے متولی ونگرانی کا رخالصۃ لوجہ اللہ وقف کیا جو شخص اس میں تغیر وتبدل کرے اس پر خدا کی لعنت اور کرنے والوں کی لعنت قیامت تک ہو-۶۰۴ء کتابت (عربی عبارت کا ترجمہ)

اس عظیم تاریخی تبرک کو تلاش کرنے والے مکہ کی ایک ایک گلی میں تلاش کرتے ہیں لیکن اس بابرکت مکان کا منہ تو کجا کوئی اس کا پتا و نشان بتانے والا نہیں ملتا-

دارارقم: -یہ محترم مکان حضرت ارقم مخزومی رضی اللہ عنہ کا تھا جو تاریخی روایت کی بنیاد پر کوہ صفا کی بائیں جانب محلہ دارالخیزران کی ایک گلی میں واقع تھا-یہ وہ زیارت گاہ تھی، جس میں کفران مکہ کے مظالم سے تنگ آکر سرکار نے اقامت فرمائی تھی، یہیں سے اسلام کی خموش تبلیغ کا کام ہوا کرتا تھا، یہی وہ زمین تھی جس پر بندگان خدا ظالموں کے شر سے چھپ کر خدائے واحد کی بارگاہ میں سجدہ کیا کرتے تھے-قتل رسول پر آمادہ عمر کو، اسی مکان میں دولت ایمان کا لازوال خزانہ ملا تھا اور یہیں سے اہل حق کا قافلہ خانہ کعبہ کی سرزمین پر سجود نیاز کی نذر پیش کرنے گیا تھا اور ڈنکے کی چوٹ پر نماز باجماعت کی ابتدا ہوئی تھی، اس مرکز عقیدت کو دریافت کرنے والوں کی زبان میں کانٹے پڑ جاتے ہیں لیکن کوئی رہنمائی کرنے والا نہیں ملتا-اور حد تو یہ ہے کہ مکہ جغرافیے تک میں اس مکان کے وجود کا نشان نہیں ملتا-حالانکہ تاریخ کے صفحات پکار رہے ہیں کہ دارالخیزران میں حضرت ارقم کا وہ مکان تھا جس کی مشرقی دیوار پر مندرجہ ذیل عبارت کا کتبہ تھا-

بسم اللہ......یہ......ان گھروں میں جن کے متعلق خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ بلند کیے جائیں گے، ان میں خدا کا نام لیا جائے گا اور صبح وشام ان میں خدا کی تسبیح پڑھی جائے گی، یہ رسول اللہ کے چھپنے کی جگہ اور خیزران کا مکان ہے، اسلام کی ابتدا یہیں سے ہوئی-اس کی تجدید عمارت کا حکم امین الملک نے خالصۃ لوجہ اللہ دیا اور خدا نیکی کرنے

والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ (ترجمہ)

قبۂ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا - مکہ کا قبرستان جس کا نام جنت المعلیٰ ہے، اسی کے مشرقی دروازے کے قریب ام المومنین زوجہ سید المرسلین کی قبر انور اور قبر انور پر ایک مختصر لیکن خوبصورت سا قبہ تھا۔ ہم سارے مسلمانوں پر تو اسلام کا احسان ہے۔ لیکن بلا شبہ اسلام پر سیدہ خدیجہ کا احسان ہے، یہ وہ طیبہ طاہرہ خاتون تھیں، جنہیں بیوگی کے باوجود میرے سرکار نے اپنی زوجیت کا شرف عطا فرمایا۔ نزول وحی کے بعد جنہوں نے سب سے پہلے سرکار کی زیارت فرمائی۔ کمبل اوڑھایا اور تسکین کی باتیں کیں، سب سے پہلے حضور کی رسالت پر ایمان لاکر عورتوں میں اولین اسلامی خاتون کا اعزاز حاصل کیا۔ جن کی بے شمار دولت کی ایک ایک پائی اسلام کے لیے وقف ہوئی اور جن کا سرمایہ آڑے وقتوں میں اسلام کے کام آیا۔ جن کے شوہر رسول خدا، جن کی صاحبزادی فاطمہ زہرا، جن کے داماد شیر خدا، جن کے نواسے حسن مجتبیٰ اور حسین شہید کربلا تھے۔ حیف! آج ان کی مقدس قبر کا پتا و نشان نہیں ملتا۔ جنت المعلیٰ کے مشرقی حصے میں منہدم شدہ قبے کا ڈھیر ملتا ہے۔ توڑ پھوڑ کا مزاج نظر آتا ہے۔ عظمت و تقدس کی دھجیاں بکھری دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اس عظیم المرتبت خاتون جن کے تلووں کی دھول مل جائے تو گنہ گاروں کی نجات ہو جائے، ان کی قبر کے نشانات نہیں ملتے اور مشتاق زیارت ترستی ہوئی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے سائے میں فاتحہ پڑھ کر زخمی جذبات کے ساتھ واپس ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔

باب ام ہانی - دنیا جانتی ہے کہ معراج کی رات سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ہانی کے گھر تشریف فرما تھے، یہیں جبریل امین نے حاضر بارگاہ ہو کر سلام کے بعد دیدار الٰہی اور معراج کا مژدہ سنایا اور چلنے کی درخواست کی۔ حضور یہاں سے حرم شریف لائے، پھر شق صدر وغیرہ کے بعد ستر ہزار فرشتوں کے جلو میں حرم کعبہ سے مسجد اقصیٰ تک کے لیے روانہ ہوئے۔ خانۂ ام ہانی سے چل کر جس دروازے کے ذریعے حضور نے حرم پاک میں قدم رکھا اس دروازے کا نام اسی مناسبت سے باب ام ہانی رکھ دیا گیا تاکہ عقیدت مند نظر جب اس پر پڑے تو واقعہ معراج کی یاد تازہ ہو۔ حضرت ام ہانی کی عظمت و تکریم سے دل معمور ہو اور عقیدت و محبت کا چمن زار ایک نئی بہار سے ہم کنار ہو۔ لیکن نیاز مند آنکھیں حرم پاک کے ایک ایک دروازے کو دیکھتی ہیں، اس پر لکھی عبارتوں کو بار بار پڑھتی ہیں لیکن کسی دروازے پر باب ام ہانی لکھا نہیں ملتا۔ بہ ہزار تلاش و جستجو اور دریافت کے بعد پتا چلتا ہے کہ وہ دروازہ جس پر باب عبدالعزیز لکھا ہے، وہی دراصل کبھی باب ام ہانی تھا۔ اگر انصاف دنیا سے ختم نہیں ہو گیا اور ضمیر مردہ نہیں ہو گئے تو میں پوچھنا چاہتا ہوں اور عوامی عدالت میں استغاثہ پیش کر کے فیصلہ طلب لینا چاہتا ہوں۔ ایک زائر کا قدم جب حرم کی سرزمین پر پڑتا ہے تو اس کی نگاہ شوق عشق و ایمان کے مرکزوں کو تلاش کرتی ہے، اسلاف کی یادگاروں کو ڈھونڈتی ہے یا کسی عبدالعزیز کو؟ کاروان محبت ہر قدم پر اپنے مقدس محبوب کی نشانیوں کو تلاش کرتا ہے یا پھر ان کے چہیتوں کی یادگاروں کو؟ اور جب صورت حال یہ ہے تو پھر فیصلہ دیجیے کہ یہ سب کچھ آباء پرستی کی بدترین بدعت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس طرح کی اور بہت سی یادگاریں ہیں اور نشانیاں ہیں جو تاریخ کے صفحات پر تو ملتی ہیں لیکن مکہ معظمہ کی سرزمین پر ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔

مکہ کے بارونق بازاروں میں دنیا کے ہر ملک کی چیزیں بکتی ہیں۔ ہر قسم کا سامان ملتا ہے۔ لیکن نہیں ملتا تو مولد النبی نہیں ملتا، مولد فاطمہ نہیں ملتا، دار ارقم نہیں ملتا، قبہ خدیجہ نہیں ملتا، باب ام ہانی نہیں ملتا اور تہذیب کی چمک، تمدن کی روشنی اور دولت کی فراوانی میں یہ یادگاریں اس طرح دبائی گئی ہیں جیسے واقعات کی دنیا میں ان کا کوئی وجود تھا ہی نہیں۔

آج عقیدتوں کی دنیا ارباب اقتدار سے سوال کرتی ہے کہ کیا مولد نبی کی دیواریں لائق توقیر نہ تھیں، اس کی زمین محبتوں کی بوسہ گاہ نہ تھی، مولد فاطمہ کے بام و در قابل تکریم نہ تھے، خدا کے آخری نبی کا عبادت خانہ اور وحی الٰہی کا مقام نزول باعث عزت نہ تھا۔ کیا اسلام کی اولین خاتون کا قبہ قابل تکریم نہ تھا۔ کیا ام ہانی کا نام لائق التفات نہ تھا؟ اگر تھا اور یقیناً تھا تو ان مقامات مقدسہ کی بقا اور تحفظ کا معقول و مناسب انتظام کیوں نہیں کیا گیا؟ حرم کی توسیع پہ کروڑوں اور اربوں خرچ کرنے والوں سے کوئی دریافت کرے کہ وہ عمارتیں کیوں منہدم ہوئیں؟ وہ نشانیاں کیوں زمین بوس ہوئیں؟ وہ مآثر کیوں بے نام و نشان ہوئے؟ کیا ان یادگاروں کا تحفظ ممکن نہ تھا؟ کیا ان کی خمیدہ دیواروں کو چند ریال کے سہارے کھڑا نہیں رکھا جا سکتا تھا؟ کیا چودہ سو سال پرانی دھول مٹیوں کو دبیز شیشوں سے ڈھانک کر محافظ کا حق ادا نہ کیا جا سکتا تھا؟

بقیہ: صفحہ ۱۷۸ پر ملاحظہ کریں

اجتہاد و تقلید

جام نور دہلی کا خصوصی شمارہ

اجتہاد و تقلید پر برصغیر کے مختلف مکاتب فکر کے
نمائندوں کا دلچسپ تحریری مباحثہ اور تبادلۂ خیالات

کچھ کتاب کے بارے